کلیاتِ پطرس

پطرس بخاری

مرتبہ

نواز چودھری

مکتبہ شعروادب ۰ سمن آباد ۰ لاہور

ناشر.......نواز چودہری
مطبع.......ناصر برادرز پرنٹرز لاہور
قیمت.... ۱۵۰/= روپے
225/-

پطرس کے مضامین

اے۔ ایس۔ بخاری

بی۔ اے (کینٹب) ایم۔ اے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

سابق ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ

اظہارِ عقیدت

میں اپنے استاد محترم پروفیسر مرزا **محمد سعید صاحب**
دہلوی کا ممنون ہوں جنہوں نے اِس کتاب پر نظرثانی کی اور اسے
بعض لغزشوں سے پاک کیا۔
میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی ان سے
فیضِ تلمذ حاصل ہے۔

"پطرس"

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں" آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔

پطرس

فہرست مضامین

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کر لیا، لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی مرتبہ ملی۔ خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا؟ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا۔ وہ لڑکا جسے آج تک کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا چونکہ ——— ہمارا خاندان خدا کے فضل سے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لئے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر و مباہات کا باعث بن گیا، اور مرکزی رشتہ داروں نے اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر مستحسن کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی اس لئے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم کی اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے

رائے طلب نہیں کی گئی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے، اب تو ایک غیر جانبدار اسیان دار مصنف یونیورسٹی میں ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی، اب ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقِ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہارات دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ تعلیم کے ساتھ فرصت کے لمحات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹوگرافی تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرضیکہ بے شمار مفید و کم خرچ بالا نشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں، اور تھوڑے سے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا، کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہیں گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی، لیکن پھر بھی ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی لیکن جب اِدھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی اور بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا، بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سمجھا کر سمجھایا، بعض نے شاہدرے اور شالامار کی رومان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے، اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیحد موزوں ہے، اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام واضع کرنا شروع کر دیا جس میں پڑھنے لکھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے، اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی، اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا، لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد صاحب پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر کی پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ

ہے، ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انھوں نے بیشمار غلط بیانیوں سے کام لیا چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہوسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے۔ جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے تو اکثر شراب کے نشے میں چور کسی نالے میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزار بارہ سو روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں، یا پھر فرسٹ ایر امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور لیکن ہاسٹل ہرگز نہیں، کالج مفید مگر ہاسٹل مضر، وہ بہت ٹھیک مگر یہ نامکن، جب انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے، تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ ازحد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے

چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں، اور رہیں ماموں کے گھر۔ اس سے تحصیل علم کا جو ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے یہ سوچا ماموں صاحب اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی جمنے لگی۔ سینما جانے کی کبھی کبھار اجازت مل جاتی تھی، لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں مَیں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا؟ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا، کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو، جسے تیرنا نہ آتا ہو، وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے، اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں ان کے متعلق ہدایت بہت کڑی تھی۔ ہفتے میں دو بار خط لکھنا ضروری تھا سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔ یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں

راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن زندگی میں جو ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیے، وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماحول جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی، کس دروازے سے کس کمرے کے کونے میں جھانکنا ناممکن ہے، گھر کا کونسا دروازہ رات کے وقت کھولا جاسکتا ہے، کونسا ملازم ناموافق ہے؟ کونسا نمک حلال، جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں، لیکن پھر بھی روزانہ دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں ہے لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے، اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی۔

چنانچہ کرسمس کی تعطیلات میں، میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں، گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہوسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز مگر خیر پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا۔ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل سے واپس آرہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آگئی، دو منٹ دیر سے پہنچا، صرف دو منٹ، بس صاحب بس، پھر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے تار دے کر اس کے والد کو بلوایا، پولیس سے تحقیقات کرانے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی۔ لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی اُن پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پاکر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارہ سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں

چلا گیا پس تین دن کی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے ان کے رویّے سے بس مجھے فوراً احساس ہوا کہ

ایک روپیہ روزانہ پیسے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ لینا چاہیے تھا

باقی ماندہ تعطیلات گذر گئیں اور ہم نے پھر اسکول کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی کرسمس کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر آئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی آ گئی تھی پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں وہ اب نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں، اب ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہوا اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ ہم کو محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالوں کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے، ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جانتا ہے کہ والدین کی اغراض کے لئے واقعات کو ایک نئے اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس نئے پیرائے کا سوجھنا تو الہام اور اتفاق پر منحصر ہے بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنی حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پر منی آرڈر چلا آتا ہے ؎

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیران ماند

جب ہم دو تین ہفتے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان موضوعات پر متواتر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا۔

تمہاری شخصیت سے آخر کیا مطلب ہے؟

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض کرنے کا موقع دیں۔ میں نے کہا۔

دیکھئے نا مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے

ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بھی بات ہوتی ہے جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے، میں اس کو شخصیت کہتا ہوں اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ صرف دماغ سے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بیکار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت مکمل ہو۔ دماغ تو بیکار نہ ہونا چاہئے ورنہ انسان خبطی ہو جاتا ہے، لیکن اگر پھر بھی اگر ہو بھی ـــــ تو بھی ـــــ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ـــــ ٹھہریئے میں بھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں:

ایک منٹ کی بجائے والد صاحب نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اسکے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہئے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے، سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہئے؟"

میں نے کہا: "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے۔"

میں نے نسبتاً نحیف آواز میں کہا جی ہاں ـــــ"

یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا: "جی ہاں۔"

کہنے لگے: "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ کاش میں نے اس وقت توجہ سے سُنا ہوتا۔

اس کے بعد سال بھر میں ماموں کے گھر میں ـــــ زندگی بے ثمر اس کے دن بھی گذر

جائیں گے" گاتا رہا۔

بہرحال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، بہرحال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹی میں پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا، ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا، نئی نئی مثالیں کام میں لاتا، جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر زور دیا، اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے" اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بہت اچھی ہوتی ہے صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلباء سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے، کچھ عرصے کے بعد انھوں نے ایک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے لیکن آخر تک یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اعتبار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ بی اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا، اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلی جیسی وقعت نہیں رہی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے، اور اس کے علاوہ یونیورسٹی

کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی اے میں کیوں فیل ہوا، اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا اس لئے ہم کچھ پاس ہی ہو گئے بہر حال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے شاید اس لئے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر اس ریل میں کوئی سفر کر رہے ہوں نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔

اب ہم جب بی اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے سوچا کہ بی اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے خالی کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں معقول جواب نہیں دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے چنانچہ بی اے میں ہمارے مضامین انگریزی تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح جو صورت حالات پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا وہ باقاعدہ بانٹ کر ان تینوں مضامین کو دیتا ——

آپ یقین جانئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ بھلا فرض کیجئے اگر میں وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو کہ ہوا یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کما حقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا لیکن بی اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔ انگریزی ہماری مادری زبان نہ تھی۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچئے کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان میں صرف کرنا پڑا اگر وہ یہاں صرف نہ کرتا بلکہ اس کی بجائے مگر خیر یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے خود حیرت کا موجب ہوا، اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رُو سے ہمیں بی اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو مطالعہ نہیں کر سکتیں، کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔

ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجّہ دی اور اس میں کامیابی حاصل کی، باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے، لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں ہم چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے، لیکن اس کے بعد ہم نے تہیّہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں ــــــ لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا مشکل ہے، پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہئے چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں پاس ہو گئے۔

۱۔ انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

۲۔ انگریزی، تاریخ۔

۳۔ انگریزی۔ فارسی۔

۴۔ تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے، وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد جا کے لئے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کیا۔

۵۔ تاریخ میں فیل۔

۶۔ انگریزی میں فیل۔

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا، وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہوگا لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہیں ایک ستم کا ٹیکہ لگ جائے گا، بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے، یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس دفعہ پاس ہونے کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی۔اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں، بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے، ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والد کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقع پر طبیعت پر بڑی الجھن ہوتی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے میں پرچوں میں کیا لکھ آیا ہوں ——— اچھی طرح جانتا تھا، ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تر تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔ آخر سالوں میں والد صاحب کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ "ابھی نہیں" "اجی صاحب کیا کہہ رہے ہو" "اجی یہ بھی کوئی بات ہے"

ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے ——— بہرحال اب کے گھر پہنچتے ہی ہم نے حسبِ دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی ہوئی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے اگلے سال پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے، اب بھی ہوسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے دڑبے میں، اور جب ماموں کے دڑبے سے نکلے تو شاید اپنا آشیانہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کو ایک سال صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط جمع کیا۔ پروفیسروں سے مجھے اب ہمسری کا فخر حاصل تھا، ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا۔ اور ان سے والد کو خط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو آپ ہاسٹل ضرور بھیج دیں، بعض کامیاب طلباء کے والدین سے بھی اس مضمون کی عرضداشت بھجوا دیں۔ خود اعداد و شمار ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے طلباء پاس ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ہوسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں، میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی، کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہی غور و خوض میں تبدیل ہو گیا لیکن پھر بھی ان کے دل سے یہ شک رفع نہ ہوا، کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی، ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر العلوم میں غوطہ زن ہے، باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خاموشی طاری رہتی کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلباء علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفہ، ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں جن کو ادب، انگریزی کا شوق ہو وہ رات کو آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلباء اپنے ہر ایک خیال کو الجبرا میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلباء رباعیوں میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں، تاریخ کے دلدادہ......

والد صاحب نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار تھا کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی، اور انھیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کیلئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا، کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں آ رہے ہیں جس سے ہم نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے، اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے ان کو لکھ بھیجا کہ جب ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے، اور فلاں فلاں قواعد سے آپ کو مستثنٰی سمجھیں گے، اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پر تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی

گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں. آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے.

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے، دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کی، کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے، ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے. لیکن یہ گولہ باری تیز، لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کے چوبی دروازے لرزنے لگے صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا، مگر اب دروازہ ہے کہ برابر لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے، میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی. بہتیرا آوازیں دیتا ہوں ـــــ اچھا اچھا تھینک یو ـــــ جاگ گیا ہوں ـــــ بہت اچھا ـــــ نوازش ہے ـــــ آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں، خدایا کس آفت کا سامنا ہے ـــــ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جِلا رہے ہیں اور حضرتِ عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی قُم کہہ دیا کرتے ہوں گے. زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا کوئی مُردے کے پیچھے لٹھ لے کر تھوڑی پڑ جاتے تھے، توپیں داغا کرتے تھے. تو ہم سے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں. آخرکار جب لیمپ جلایا تو ان کو باہر سے روشنی نظر آئی اب ہم جو کھڑکی کے پاس پہنچے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے جگمگا رہے ہیں، سوچا آج پتہ چلائیں گے ـــــ یہ سورج آخر کس طرح

نکلتا ہے ــــــ لیکن جب ہم نے گھوم گھوم کر کھڑکی اور روشندان میں سے دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں، ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی ــــــ تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔

"لالہ جی!"

"لالہ جی!"

"جواب آیا۔ ہوں۔"

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے۔

کہنے لگے "اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے۔"

"تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے چونک کر پوچھا، کیا کہا تم نے؟"

"تین بجے ہیں؟"

کہنے لگے، تین ــــ تو ــــ نہیں ــــ کچھ سات، ساڑھے سات منٹ اوپر ہیں ــــ

میں نے کہا: ارے کمبخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے، میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا ــــ یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا ــــ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے اٹھا کرتے تو دادا کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے، تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیرزادے کوئی مذاق ہے؟

"لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیرباد کہہ دوں، لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ ہم نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول بھلے آدمیوں کی طرح نہایت اطمینان سے دس بجے اٹھے، بارہ بجے تک ہاتھ منہ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے، جوشِ شباب تو ہے ہی، اس پر شام کا رومان انگیز وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے سے داخل ہوئے۔

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

گاتے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر"

ہم اس وقت چٹکی بجانے لگے تھے بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں۔ اور کان آواز کی طرف لگ گئے، ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں"

میں نے کہا "جی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے"

بولے "ذرا ـــــ وہ میں ـــــ ڈسٹرب ہوتا ہوں"

بس صاحب، ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہو گئی تھی، فوراً مر گئی۔ دل ـــ نے کہا "او نابکار انسان دیکھ: پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں ـــــ" صاحب خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں، ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے"

آنسو تو پونچھ کر اور دل مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے، دانت بھینچ لئے۔ نکٹائی کھول دی، آستین چڑھائیں ـــــ لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں؟ سامنے سرخ، سبز، زرد سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا، اب ان میں کونسی پڑھیں، فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق علیحدہ رکھ کر قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد دیکھ کر سب جمع کر لیا پھر پندرہ اپریل تک کے دن گنے صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تقسیم پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا، لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پاتے؟ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے، لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ پر ملامت کی، آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے البتہ پانچ ..... چھ ..... سات

بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی، ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہئے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے بستر میں داخل ہو گئے، چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری قوتِ ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا حرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے چھر کھینچ کر مارا۔ بس ـــــ

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں، ہتلا کے درخواست کی کہ لالہ جی، صبح آپ کو بڑی زحمت ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں ......

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا ـــــ جب چھ بج چکیں تو . . . سنا آپ نے؟ چپ .....

"لالہ جی ـــــ!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا: "سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گھاٹیں فورا۔

ہم نے کہا ب ..... ب ..... ب ..... بہت اچھا ـــــ

" توبہ ـــــ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

"لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں، اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں، وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، انھوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے، بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے، اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں مل

نے کھول دی تھیں، پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی، پھر کا پتہ نہیں، شاید لحاف اوپر سے دیا، شاید سر آنکھ لپیٹ دیا، تاہیکھانسا کہ خدا جانے غرانا یا وغیرہ یہ یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے، لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا سو رہے تھے، نہیں ہمارا خیال ہے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے، بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ! لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ ہی دیر سے بجے ہوں؟ خدا کے کاموں میں آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں پھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے، جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے آپ کو سُناتا رہا مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو حد درجے کی طمانیت ظاہر کی، آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سُہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے ہی اٹھتا۔ لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا چیز بنائی ہے یعنی اگر صبح کی بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بُری طرح کٹتا۔

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد دی اور پوچھنے لگے۔

"تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں گا؟"

میں نے کہا۔

"ہاں ہاں! واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بیشک۔

شام کے وقت آنے والی صبح کے لئے مطالعے کے لئے دو کتابیں چھانٹ کر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لئے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی۔ اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ جھٹ آنکھ کھل گئی، نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے منہ نکالا، ان کو گڈ مارننگ کیا، اور نہایت بے دردانہ لہجے میں

کھانسا، لاحول جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

"ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ ہم آج فوراً ہی جاگ اُٹھے تھے۔ دل سے کہا: "دل بھیا صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے، ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔ دل نے کہا "اور کیا! تمھارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے تھے۔"

ہم نے کہا "سچ کہتے ہو۔ یعنی ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہمارے قریب سے بھی گزر جائیں، یا ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس شہر لاہور میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے خراٹے اڑاتے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ ذہنی سے جاگ رہے ہوں گے۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔ ناک کو سردی سی محسوس ہوئی تو اس کو ذرا سا یوں ہی لحاف کی اوٹ میں کر لیا۔ اور پھر سوچنے لگے ـــــــ "خوب۔ تو ہم آج کیا وقت پر جاگیں گے، بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے، آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر، نہ رسول کا خوف سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارہ یہ کہتا کہتا مر گیا، لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہ چلی، لحاف کانوں پر سرک آیا ـــــــ تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں ـــــــ بہت ہی پہلے ـــــــ یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے کی بات ہے!

خداوندا! یہ کالج والے بھی کس قدر سست ہیں، ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے۔

(لحاف سر پر) بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ آنکھیں بند تو اب چھ بجے ہیں تو گویا تین گھنٹے مطالعہ کیا جا سکتا ہے، سوال یہ ہے کہ کون سی کتاب پڑھیں شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہو گا، اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں، اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

پھر خیال آیا۔ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرانا ٹھیک نہیں، ورڈز ورتھ رہیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا، اور دل و دماغ کی خاموش لادیزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے ——— لیکن شیکسپیئر ——— نہیں ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے گا ——— شیکسپیئر ——— ہیملٹ ——— لیکن ورڈز ورتھ ——— بڈی لیکتھ ——— دیوانگی ——— سبزہ زار ——— سنجر ——— ہلو بہاری ——— صید ہوس شمیر ——— میں آفت کا پرکالا ہوں۔

یہ معمّہ اب فلسفہ مابعد الطبیعات ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا تو ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ ہی کیا، تو دس بج رہے تھے۔ اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے۔

کالج کے ہال میں لالہ جی ملے، کہنے لگے "مسٹر! صبح میں نے آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا۔

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "اوہو لالہ جی، یاد نہیں میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں ——— اس کے بعد کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی ——— آپ بولے ہی نہیں"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے انھیں دیکھا، گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں ——— اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوریاں چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے، ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے، پھر یکایک ایک محجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کے کہا "ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اس وقت ——— اے ——— اے ——— نماز پڑھ رہا تھا"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دئے، اور ہم اپنے زہد و تقویٰ کی تسکین میں سر جھکائے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ۱ چھ بجے، جاگنا نمبر ۲ دس بجے۔ اور

اس دوران للسجی آواز دیں تو سماز۔ !

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرقِ ناز محوِ بالش کم خواب نہ ہو، اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں، کمرے میں پھولوں کی خوشبوئے سحری کی روح افزائیاں کر رہی ہو، نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں، اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔ اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے، چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں سُرور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں، دلآویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت "سانوری صورت تری مَن کو بھاتی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے مسٹر بسٹر کی آواز دروازے کی نادان سامعہ نوازی کرتی، اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے، اُداس چار گھنٹے کے عرصے میں گھڑیوں کے گر پڑنے، دیگچیوں کے اُلٹ جانے، دروازوں کے بند ہو جانے، کتابوں کے جھاڑنے کرسیوں کے گھسیٹنے، کُلّیاں اور غرارے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا ابدی ٹھریاں ہیں، اندازہ کر لیجئے کہ ان سازوں میں تال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

——(۶)——

کُتے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا کیا فائدہ ہے، گائے کو لیجئے، دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے وقت سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے ہی چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔

کل ہی کی بات ہے کہ رات گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔

ایک آدھ منٹ بعد سامنے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا تو ایک حلوائی کے چولھے سے باہر لپکے اور پھنکار کر پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی آواز دی۔

اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے، بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے، کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے، وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے؟ اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں سے ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون اور کوٹ کو دیکھ کر ہی بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے، اس ذکر کو جانے ہی دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے یعنی ہمیں بارہا

ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی کہ عش عش کر کے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ایک ہلکی سی "بخ" کر دی، اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔

ایک ہمارے کتے ہیں کہ راگ نہ سُر، نہ سر نہ پیر، تان پر تان لگائے جاتے ہیں بے تالے کہیں کے، نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں، بس گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ اور گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اس ملک میں پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لو جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو نقلی سمجھیں، لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیئے کہ دافعِ بلیات ہے، لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے، حالانکہ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس قدر غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت بھی یہ اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے، یہ البتہ ٹھیک ہے، ایسے موقع پر کبھی گانے کی کوشش کروں گا تو کھرج کے سُروں کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی عادت پائی ہو تو دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی، اُس کی جگہ شاید آپ دُعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، کیونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نو مشقی کا عالم بھی ہے اس لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سُرے بھی ہو گئے ہیں تو کوئی یہی سمجھے گا کہ شاید انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے گزرے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی، ذرا تصور ملاحظہ فرمائیے۔ آنکھوں نے اسے بھی کتا ہی دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا، گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت نامعقول زاویئے پر ہوا میں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی، لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی

ہے۔ طب کا مسئلہ ہے، ایسے موقع پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں سکھا لیجیے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لیے کبھی آج تک کُتے کے کاٹنے کا اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا، تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ اس کتے کی مٹی سے کُتا گھاس پیدا ہو۔ لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دُنیا میں کُتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں سمجھ لیجیے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کُتوں کے بھونکنے کے اُصول بھی تو نرالے ہوتے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے، اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کُتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔

اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیے۔ لیکن یہ کمبخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا، اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے، اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اسے روک ہی لیں گے۔ اب یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں، لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کرے گا۔

کُتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ معطل کر دیتی ہے خصوصاً جب کسی دوکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ــــــ ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک طرف باری باری سوچنا پڑتا ہے، کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات۔ اس ہنگامے میں بھلا کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا؟ بہر صورت کُتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفریں رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ عالی جناب سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کیے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہم نے کُتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑک ناپنے میں گزار دی ہیں، لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک

یینہ حرکت ہے۔ لیکن قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں، خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس لیے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً جس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں جب چلتا ہے تو اس کی مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی رہتی ہے، سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے ——— اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں جیسی، اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا، صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی ایک نے چابک لگایا۔ آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے، اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو وہ لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا حدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے، جہاں آپ نے غلطی سے پاؤں رکھ دیا انہوں نے غیظ و غضب کے لہجے میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے، نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے، بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا نے مجھے کچھ عرصے کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائی تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے" یہ بجا سہی، لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے؟ اور کاٹنا شروع کر دے۔

اُردو کی آخری کتاب

ماں کی مُصیبت

ماں بچے کو لیے بیٹھی ہے، باپ انگوٹھا چوس رہا ہے، اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے، ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کو تک رہی ہے، اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا۔

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

(۳) دولہا کب بنے گا، اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم بڈھے کب ہوں گے؟

(۵) تو کب کمائے گا؟

(۶) آپ کب کمائے گا، اور ہمیں کب کھلائے گا، باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کلینڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے
جب ننھا ہونٹ نکال کر ——— رونی صورت بناتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے، سُلانا ہو تو افیون کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے، رات کو اپنے ساتھ سُلاتی ہے، باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے، جاگ اُٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے، کبھی نیند میں رونے لگتا ہے تو بیچاری حلق کی ماری آگ جلا کر دودھ کو اُبال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اُٹھ بیٹھتی ہے، اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے مُنہ دھلاتی ہے، آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے، اور جی کڑا کر کے کہتی ہے "کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ۔ واہ۔ واہ

کھانا خود پک رہا ہے

دیکھنا بیوی آپ بیٹھی کھانا پکا رہی ہے، ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے، ہر چیز قرینے سے رکھی ہے دھوئے دھلائے برتن دھرے ہیں، کسی میں دال ہے کسی میں آٹا۔ چکنی اور پالی کا لوٹا چولھے کے پاس ہے تاکہ جب تک چاہے آگ جلائے، اور جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھ رہا ہے، چاول پک چکے ہیں نیچے اتار کر رکھے ہیں، دال چولھے پر چڑھی ہے، غرضیکہ ہر کام ہوچکا ہے، لیکن پھر بھی پاس بیٹھی ہے، میاں جب آتا ہے کھانا لاکر سامنے رکھتی ہے، پیچھے کبھی نہیں رکھتی، کھانا کھالیتا ہے تو کھانا اٹھالیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں روپے کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں، آپ ہاتھ پاؤں جلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑتا ہے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے، شام کو بھٹی چڑھاتا ہے، دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے، کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا راستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر، تاکہ کپڑوں والے نہ پکڑ سکیں جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے، صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے، دوپہر ہونے کو آئی اب تک پانی میں کھڑا ہے اسے ضرور سرسام ہوجائے گا، درخت کے نیچے بیل بندھا ہے، جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے، دریا کے اس پار گٹھری دھری ہے، دھوبی کسی سے بھی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے، دھوبی کو ہاتھ آیا ہے، گتے نے کبھی کان کھڑے کردیئے اب دھوبن کھانا کھائے گی، دھوبی دریا سے نکلے گا، دریا کا پانی پھر نیچا ہوجائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کی کہاوت کی وجہ سے، اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں کیا مجال کوئی پاس آجائے، جو ایک دفعہ کپڑے لے جائیں پھر واپس نہیں لے جاسکتے۔ میاں دھوبی تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو، ننگا پھراتے ہو۔

——— ✿ ———

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر بات سے آگاہ کرنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں، اور ہمیشہ اس پر کاربند ہوں، خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں، اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدا نخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل، اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں، لیکن اس بات کو کیا کروں، ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے، اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر فائز ہیں لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا انہیں شوق نہیں جیب کترتے ہوئے وہ کبھی نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر تو ضرور پال رکھے ہیں۔ انہیں سے جی بہلاتے ہیں۔

ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس مزاج پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ جب کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے ...... تھکتی ہے ہمارے گھر میں موئے کبوتر باز کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی

چیل، کوّے، گدھ، شکرے، وہ دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس یہ اب کبوتر باز بنے گا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں قصیدہ شروع ہو جاتا ہے، بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا آخر سب سے مقدم ہے میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا ہے؟ چنانچہ ہم غصّے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا، کہنے لگے اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا

ہم نہیں آتے، تم باہر آؤ——خیر آخر اندر گیا——بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے کہنے لگے

بیٹھ جاؤ——ہم نے کہا "بیٹھ گئے"——معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے، مرزا بولے "کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا "کچھ نہیں"۔ کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل کے فقرے کٹنے شروع ہوئے، پہلے——ارادہ کیا کہ ایک ہی دم سب کچھ کہہ ڈالو اور چلاؤ۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا، کسی نئے ڈھنگ سے بات شروع کروں، لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا۔

"مرزا صاحب! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے۔ اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے، لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست کار آمد ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں تربیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی ہے، یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے سو کر اٹھا کرتے تھے، ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بستر

کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو کا صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے تحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے۔ "توری چھل بل ہے نیاری":

اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا، اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک سانحہ گذرا ہے جس سے میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی۔ جب سے شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ عجز و انکساری سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔

کہنے لگی۔ "تو پھر میں ڈیڑھ والی گاڑی سے چلی جاؤں"

میں نے کہا۔

"اور کیا ——؟"

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی، اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات چکر لگانے لگے، یعنی اب بیشک دوست آئیں، بیشک اودھم مچائیں۔ میں بیشک جب چاہوں کھاؤں بیشک جب چاہوں اُٹھوں، بیشک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا

"روشن آرا جلدی کرو، نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔

ساتھ اسٹیشن گیا —— جب میں گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی۔

"خط ضرور لکھتے رہئے ——

میں نے کہا۔

"ہر روز —— اور تم بھی ——"

"کھانا وقت پر کھا لیا کیجئے، اور ہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں ——"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ —— اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے ——

[illegible]

اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کتابوں کی دکان تک آیا، اور رسالوں کے ورق اُلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا، تہہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں ـــــ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصے کے لئے رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی، بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا، اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں، اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا، تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا باہر سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد ـــــ!"

"جی حضور ـــــ!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے۔ سُن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور ـــــ"

"اور گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام و نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا۔

"کیوں بے، آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا: حضور آپ تو جانتے ہی ہیں" اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا، باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں، اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ ابھی دفتر سے نہیں آئے۔ دفتر پہنچا تو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔

"تم باہر کمرے میں ٹھہرو ——— تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، بس ابھی نمٹا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"دو تھیٹر ——— !"

کہنے لگے ——— "بس بہت ٹھیک ہے، تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی، اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا ——— شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا ——— اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا ——— پھر سے پڑھنا شروع کیا ——— سب اشتہار پڑھ ڈالے ——— اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلیف یا لحاظ کے جمائی لینے لگا۔ جمائی پر جمائی، حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیا ——— لیکن اس سے بھی تھک گیا ——— پھر سیٹی پر ٹیلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا "اے یار چلتا ہے کہ مجھے انتظار میں ہی مار ڈالے گا! مردود کہیں کا ——— سارا میرا دن ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے ——— شام بڑے لطف میں کٹی، کھانا کلب میں کھایا ——— اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لے کر تھیٹر گئے، رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بیہوش کر دیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی، گھڑی دیکھی تو پونے گیارہ بجے تھے، ہاتھ بڑھا کر میز پر سے سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا۔ اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے اَجد کمرے میں داخل ہُوا، کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے ـــــ"

ہم نے کہا انہیں بلالو۔ یہ عیش و عشرت مدت کے بعد نصیب ہُوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں، اطمینان سے اُٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے، لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی اُمید لگائے بیٹھے تھے، چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے دل میں کیا خیال آیا۔ کرسی پر بیٹھ گیا، اور سودائیوں کی طرح رومال تکتا رہا۔ الماری کا ایک خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا ـــــ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی، بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا ـــــ دل بھر آیا، گھر سُونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو بہلایا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ کپڑوں کے سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بےقرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا ـــــ باہر نکلا ـــــ اور سیدھا تار گھر پہنچا، وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اُداس ہوں تم فوراً آجاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو اطمینان ہوا ـــــ یقین تھا کہ روشن آرا جس قدر ہو سکے گا جلدی آجائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی، جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لئے یہ تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی، سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا کہ حُقّے میں اگر ذرا بھی خلل ہوا تو تمہاری خیر نہیں، اور پان اس طرح سے پہنچتے رہیں کہ تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا، جوا بھی کھیلا گیا۔ بہت معقول طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتّے دیکھنے شروع کر دئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ پتّہ اڑا نہیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے ـــــ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنہ ہلا ہلا کر گا رہا ہے کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے، کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مزاحیہ فقرہ لاکھوں بار دُہرا رہا ہے لیکن تاش برابر

ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈھول دھپا شروع ہوا ـــــ ان خوش فعلیوں کے دوران ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال، اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔

سب نے کہا واہ واہ! ـــــ کیا بات کہی ہے ـــــ ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اسکی شامت آجائے گی۔

دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا، بھلا ایسا ویسا کھیل ہے، سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے۔

کھیل شروع ہوا، بدقسمتی سے ہم چور بن گئے، طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں، کوئی کہنے لگا "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جاتیے اور حلوائی کی دوکان سے مٹھائی خرید کر لاتیے۔ کوئی بولا "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑیے، اور ہر ایک سے دو چانٹے کھاتیے"۔

دوسرے نے کہا "نہیں حضور، ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ہمارے ساتھ ناچیے۔ آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ چور کو ایک لمبوتری ناک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ کیا دماغ پایا ہے حضور نے، کیا سزا تجویز کی ہے، واہ، واہ ـــــ!"

ہم بھی مزے میں آئے تھے، ہم نے کہا "تو کیا ہوا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا ـــــ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی، اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے، اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا۔ اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منھ سے برقعہ اٹھا تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا ـــــ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی ـــــ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ "تم فوراً آجاؤ، میں بہت اداس ہوں" اور اپنی یہ حالت کہ منھ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے، اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں، اور مردانے کمرے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی ـــــ اور تمام حواس نے جواب دے دیا، روشن آرا کچھ دیر تک چپکی کھڑی

دیکھتی رہی ــــــ اور پھر کہنے لگی۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی ــــــ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کی حالت میں پہونچ رہی تھی ــــــ اب تک آپ اتنا تو جان ہی گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود شریف واقع ہُوا ہوں، جہاں تک کہ میں ہوں، مجھ سے بہتر میاں بیوی دنیا پیدا نہیں کرسکتی۔ میری سسرال میں سب کی وہی رائے ہے، اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رُسوا کردیا ہے، اس لئے میں نے مُصمم ارادہ کرلیا ہے کہ اب یا تو گھر میں رہوں گا، یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا، اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا سوائے ڈاکیہ یا حجّام کے، اور اُن سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں ــــــ!"

"دیئے جاؤ، چلے جاؤ ــــــ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

بس اس سے زیادہ گفتگو نہ کروں گا۔ آپ دیکھئے تو سہی۔

ــــــ ۵ (۱۰) ۵ ــــــ

مُریدپُور کا پِیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا، بعض اس بات پر حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں، اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا، اس کی وجہ سے روپوش ہے، کوئی کہتا وہاں کہیں ملازم تھا، غبن کا الزام تھا ہجرت کرنے ہی بنی، کوئی کہتا والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں، خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصّہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں، اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ رونما نہ ہوئی تھی، وہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں تو اس کے نزدیک ایک دیوتا ہوں، یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے، اس کی وجہ میں بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں نے شائستہ سے شائستہ وضع داروں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ میں جس شہر میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں، اور اب بھی بانگِ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ

اس میں میرا ذرا بھی تصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تحسینِ نخوت کیلئے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرالیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدطینتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ایک گمنام شہری کا رہا ہے۔ بس، اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا جلسہ سالانہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا مُتّقی ہوگا جو جلسے سے گریز کرے ہر زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا، چنانچہ میں نے شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک تقریر سنی، دن بھر تو جلسے میں رہتا، رات کو آکر اُسی دن مختصر حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بیحد ادب اور احترام کے ساتھ، بلکہ بعض باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ حفظ بھی کرلیتے تھے، خط کو خود پڑھتے پھر دوستوں کو سُناتے۔ پھر اخبار کے ایجنٹ کی دوکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر سُناتے۔ پھر مقامی اخبار کے ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپتا۔ اس اخبار کا نام "مُریدپور گزٹ" ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس مَوجود نہیں ——— دو مہینے تک جاری رہا پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ ایڈیٹر کا حلیہ حسبِ ذیل ہے۔

رنگ گندمی، گفتگو فلسفیانہ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مُریدپور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عنداللہ ماجور ہوں، نیز کوئی صاحب ان کو چندہ نہ دیں، ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دوکان پر نظر آتے ہیں، بہرحال مُریدپور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انشاء پردازی، وسیع الدماغی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مُریدپور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں لکھیں جو وقتاً فوقتاً مُریدپور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے بے خبر تھا ——— سچ ہے خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہموطنوں کے دل میں

اس قدر گھر کر لیا ہے؟ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازار میں سے گذر جاتا ہے، مرید پور میں جاتا ہے میں خطوط لکھنے کے بعد کانگرس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا بھتیجے نے میری بزرگی کے رُعب کی وجہ سے کبھی برسبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہرحال مجھے تو معلوم ہوتا تھا کہ میں ترقی کر کے کہاں تک پہنچا ہوں۔

کچھ عرصے کے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جابجا جلسے نکل آئے جس کو ایک میز کرسی اور ایک گلدان میسر آیا، اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانانِ ہند کی طرف سے میرے نام سے اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں، یہاں تک کہ آپ کے رُوئے انور کو دیکھنے اور پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔

مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی ازحد ضرورت ہے، لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے، چونکہ ؎ خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر۔ اس طرح کی تین چار برابر ان قاطعے مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، لیکن جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو رفتہ رفتہ باشندگانِ مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں، اور پھر لیڈری کا نشہ ایک ہی لمحے میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت پیارا معلوم ہونے لگا، اہلِ وطن کی بے حسی پہ بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا، ان بیچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے، تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے، ہزارہا انسان تیرے منتظر کھڑے ہیں، اُٹھ کہ سینکڑوں لوگ تیرے لئے ماحضر لئے بیٹھے ہوں گے، چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن پر کوئی نہ آئے ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے کیونکہ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری

میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے نعرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے "ہندو مسلم بھائی ہیں"
"ہندو مسلم شیر و شکر ہیں"
"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیئے' اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں"
"جن قوموں نے اتفاق کی رسّی کو مضبوط پکڑا وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔
جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں" وغیرہ وغیرہ۔
بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں سُنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے' ایک والا واقعہ پڑھا تھا' اُسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا کہ ایک اور کہانی پڑھی تھی' جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑ دو۔ وہ توڑ نہیں سکے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں' اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کرتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز ہوا۔ سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب ہوئی کہ
"پیارے ہم وطنو ــــــ!

گھٹا سر پہ اَدبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے ہوا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے' ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پہلے یہ اشعار قلم بند کیے تھے اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اُس کے المناک الفاظ روز بروز صحیح ثابت ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے۔ وغیرہ وغیرہ ــــــ"
اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس، غربت، بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا' اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا جو لوگ

اکثر بیان کرتے ہیں، مثلاً غیر ملکی حکومت، آب وہوا، مغربی تہذیب، لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا۔ اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق ہے۔ پھر میں آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا۔ اور تقریر کو اس اشعار پر ختم کرتا ہوں کہ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا، اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا، تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں، وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

(۱)۔ تمہید۔ اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)

(۲)۔ ہندوستان کی موجودہ حالت۔

الف۔ افلاس

ب۔ بغض

ج۔ قومی رہنماؤں کی خود غرضی

(۳)۔ اس کی وجہ۔

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں۔

کیا آب وہوا ہے؟ نہیں۔

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں۔

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ، جس کے دوران مسکراتے ہوئے تمام حاضرین پر ایک نظر ڈالو)

(۴) پھر بتاؤ کیا وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے (نعروں کے لئے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو، فسادات وغیرہ کا ذکر کرتے وقت رقت انگیز آواز میں کرو۔

(۵) خاتمہ۔ عام نصائح، خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر) کے بعد شاید پھر چند نعرے بلند ہوں، ان کے لئے ٹھہر جاؤ ــــ اس کے بعد انکساری کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ، اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو۔

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا اور آئینے کے

سامنے کھڑے ہوکر بعض معرکتہ الآرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ نمبر ۳ کے بعد کی مسکراہٹ کو خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہوکر دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب تک پہنچ سکے، اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن سکیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ راستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑی تھی۔ انجمن نوجوانانِ ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبالیہ کے لئے آئے ہوئے تھے، انھوں نے ہار پہنائے اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا جب گاڑی مرید پور پہونچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے انھوں نے کہا "سر باہر نکالئے، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں" میں نے حکم کی تعمیل کی، ہار میرے گلے میں تھے، ایک سنترہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو اور لوگ بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا، اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا جو ایک آواز ہوکر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سرخ جھنڈیوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے، مثلاً "ہندوستان کی نجات تمھیں سے ہے" "مرید پور کے فرزند خوش آمدید" "ہندستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے"

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدرِ جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا، اور پھر اپنی تعریفی تقریر اس طرح شروع ہوئی۔

حضرات! ہندوستان کے جس بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کیلئے بلایا گیا ہے ......

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ بک دیکھنے کی ضرورت پڑی، جیب میں ہاتھ ڈالا نوٹ بک ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو، ابھی اور کئی جیبیں دیکھنی ہیں، گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ نوٹ بک نہ ملی۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا، دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے ہوئے محسوس ہوئے، دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا، لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدرِ جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

"مُرید پور کا شہر اِن پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے، ہر صدی اور ملک میں صرف چند ہی ایسے آدمی پیدا ہوتے ہیں، جن کی ذات نوعِ انسانی کے لئے .... "

خدایا! اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے ـــــ نہیں۔ اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں ـــــ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا، جاہل کہنا چاہئے ـــــ یہ بھی ٹھیک نہیں ـــــ غیر مہذب ـــــ اُن کی اعلیٰ سیاست دانی کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں، یہ سب باتیں تو خیر آپ جاتے ہیں لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے ـــــ

ہاں وہ تقریر کہاں سے شروع ہوئی ہے، ہندو مسلم اتحاد پر تقریر، چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں لیکن وہ تو آخیر میں ہیں، وہ درمیان میں مسکرانا کہاں تھا۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے ـــــ"

صدرِ جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی، دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی ـــــ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا، مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے، اور مجھے اپنی نشست سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا، پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا، میں بے ہوشی سے ذرا ہی دور تھا، اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں، تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی بیان کرنی ہے، اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تو تھی، بنگلے اور لومڑی کی کہانی ـــــ نہیں ٹھیک ہے وہ یل ـــــ

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا ـــــ سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ـــــ اور سہارے کے لئے میز کو پکڑ لیا، میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا ـــــ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز ہلنے لگی ہے اور میں اُسے روک رہا ہوں ـــــ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا، بمشکل میں نے یہ کہا کہ "پیارے ہم وطنو!"

آواز خلافِ توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی، ایک دو شخص ہنس دیئے، میں نے گلے کو صاف کیا تو کچھ لوگ اور ہنس پڑے، میں نے جی سخت کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو پورا زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھِل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا۔

"پیارے ہموطنو ــــــ"

اس کے بعد دم لیا اور کہا۔

"پیارے ہموطنو ــــــ"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا چاہیے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں ــــ لیکن زبان تک ایک نہ آئی تھی۔

"پیارے ہموطنو ــــ!"

اب کی بار لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہموطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں ــــ سمجھے آپ؟ (وقفہ) نقص ہیں ــــ لیکن یہ بات یعنی جس امر کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ــــ گویا چنداں صحیح نہیں ــــ (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا؟

یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے، جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے ــــ (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام بے ربط سا ہو رہا ہے، میں نے کہا چلو، وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے۔ لکڑیاں چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں اس لئے ہندوستان میں افلاس بہت ہے، گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں اس لئے گویا لکڑیوں کا گٹھا، یعنی آپ دیکھئے نا کہ اگر ــــ"

(بلند اور طویل قہقہہ)

حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے۔

(قہقہے اور شور و غوغا) "اسے باہر نکالو، ہم نہیں سنتے":

شیخ سعدیؒ نے کہا ہے کہ ؎ چو از قومے یکے بے دانشی کرد۔

آوازآئی "کیا بکتا ہے ــــ" خیر اس بات کو جانے دیجئے، بہرحال اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ ــــــــ

آ عندلیب مِل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے دل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے دورانِ خوان اور تیز کردیا، ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہوگیا چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں اُن کی زندگیاں لوگوں کے لئے شاہراہ ہیں، اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کان پہ خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے، دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے ــــ

لیکن لوگوں کا شور و غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہوگئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کرکے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیہ مجھ پہ پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد اسٹیج پر آگریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو، تم تباہ ہوجاؤ گے!"

"تم ذلیل ہو ــــ"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی، اسٹیج سے پھلانگتا، زقند بھر کے دروازے سے باہر بھاگا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے، اُن کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کردی اور سیدھا اسٹیشن کا رُخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشہ اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اُس دن کے بعد آج تک نہ مُرید پور مجھے مدعو کیا گیا ہے، اور نہ مجھے خود وہاں جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔

انجام بخیر

منظر :- ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔
زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے، جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں، وہاں شیکسپیر، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔
باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں، قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اُسکے بینڈ کی آواز بھی سُنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق، دمہ، کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔
پطرس نامی ایک نادر معلّم میز پر کام کر رہا ہے، نوجوان ہے لیکن چہرے پر گذشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں، چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے، سامنے لٹکی ہوئی جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔
باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت عمدہ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس :- حضرات اندر تشریف لائیے، آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے، علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو اس انبار سے ضخیم کتابیں انتخاب کر لو، اور اُن کو ایک دوسرے کے اوپر چن لو، پھر اُن پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

کمرے میں پُر اسرار نُور سا چھا جاتا ہے، فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دیتی ہے۔

طالب علم :- (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے، اے ہمارے محترم استاد! ہم آپ کا حکم ماننے کو

تیار ہیں، علم ہی لوگوں کا اوڑھنا ہے اور علم ہی بچھونا ہونا چاہئے۔

(کتابوں کو جوڑ کر اُن پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس :- کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی۔

پہلا طالب علم :- اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اُتارنے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم :- اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم :- اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس :- یہ نہ کہو، یہ نہ کہو۔ یہ میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا، اس کا معاوضہ مجھے اُس وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمھاری آنکھوں میں ذکاوت کی چمک دیکھی، آہ! کیا تم جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسانی پیشہ ہے؟ تاہم تمھارے الفاظ میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئے ہیں، مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ، جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم :- (سر و قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم اُستاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے، آپ نے ہماری دست گیری کی، اور ہمارے تاریک دماغوں میں اُجالا ہو گیا۔ معزز استاد! آپ جانتے ہیں آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم آپ کی خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آتے ہیں۔ آپ کے عالمانہ تجربے اور بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہارِ تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم آپ کی خدمت میں پیش کریں اُسے قبول فرمائیں۔ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس :- تمھارے الفاظ سے ایک عجیب بے قراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بینڈ یک لخت بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم :- (آگے بڑھ کر) اے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول فرمایئے (بڑے ادب و احترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم :- (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان! مجھ ناچیز انسان کو سرفراز فرما۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم :- (آگے بڑھ کر) اے محترم استاد! مجھ ناچیز انسان کو سرفراز فرما۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)

پطرس :- (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو! خدا کی رحمت تم پر

نازل ہو۔ تمھاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم کو اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو۔ اور خدا تمھارے علم کے نور سے سینوں کو منور کرے۔ (تینوں اشرفیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم:۔ (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے! ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے، اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لئے بیتاب ہوں گے۔

پطرس:۔ خدا تمھارا حامی و ناصر ہو، اور تمھاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس:۔ (تنہائی میں سربسجود ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمرے کے لئے بہت دنوں انتظار میں رکھا، تیری رحمت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لیکن ہماری کم مائگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ اور یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تیرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق ملتا ہے، اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا توکفیل مجھ کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اور تیری بخشش ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

کمرے میں ایک بار پھر ایک پُراسرار سی روشنی چھاتی ہے، اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے۔

پطرس:۔ اے خدا کے دیانت دار اور محنتی بندے! یہاں تو آؤ۔

ملازم:۔ (باہر سے) "اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔" تعمیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران درختوں کے سائے دُو گنے لمبے ہو گئے ہیں)

پطرس:۔ آہ! انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے مینڈک کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے —— (سربسجود گرتا ہے)

پھر اُٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے، اشرفیوں پر نظر پڑتی ہے، ان کو فوراً کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے۔

پطرس:۔ آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے، خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو۔

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس :۔ اے مزدور پیشہ انسان ــــ! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ دنیائے علم کی ایک کرن بھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے، تیری تنخواہ کی ادائگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے تیری مشقت کا معاوضہ مل جائے گا، یہ تین اٹھنیاں قبول کر اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لئے کسی لطیفہ غیبی کا انتظار کر ــــ دنیا اُمید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔ (ملازم اٹھنیاں زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے) ــــ (بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس :۔ خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ۔ (پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے سے کھانا جلنے کی بُو آ رہی ہے ــــ ایک طویل وقفہ، جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ (بینڈ بدستور بج رہا ہے)

یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آ کر رُک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے۔

پطرس :۔ (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز :۔ (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں، اور باہر دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں اور عرض حال کروں۔

پطرس :۔ (دل میں) میں اس آواز سے نا آشنا ہوں، لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ (بلند آواز سے) اندر آ جائیے۔

دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے، گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے لیکن نظریں زمین دوز ہیں، اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

پطرس :۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے، لیکن جاہ و حشمت کا خیال ہی ہیچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے محترم اجنبی! اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو، اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی لوگوں کا بچھونا اور علم ہی کا اوڑھنا ہونا چاہئے۔

اجنبی :۔ "اے برگزیدہ شخص!" میں تیرے سامنے کھڑے رہنے میں ہی اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔
پطرس :۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی۔؟
اجنبی :۔ اے ذی محترم! آپ میری صورت سے واقف نہیں۔ میں محکمۂ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں۔ اور شرمندہ ہوں کہ کبھی آج تک نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔ (آبدیدہ ہو جاتا ہے)
پطرس :۔ اے خدا۔ یہ سب کیا وہم ہے' یا میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں؟
اجنبی :۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو' کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پہ یقین کرو میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکہ نہیں دے رہی ہیں' اے شریف اور غمزدہ انسان' اگر یقین نہ ہو تو میرے جسم پر چٹکی لے کر میرا امتحان کر لو۔
(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے' اور اجنبی زور سے چیختا ہے)
پطرس :۔ آپ فرمایئے میں سن رہا ہوں' گو مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ عالم بیداری ہے۔
(اجنبی تالی بجاتا ہے' چند خدام چھ بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں' اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)
اجنبی :۔ (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہِ معظم' شاہزادہ ویلز' وائسرائے ہند اور کمانڈر انچیف ان چاروں کی طرف سے یہ حقیر تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدر دانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں" (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس نہ کیجئے ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائیگا
پطرس :۔ (صندوقوں کو دیکھ کر' سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا' آیۃ الکرسی پڑھنے لگتا ہے)
اجنبی :۔ ان کو قبول کیجئے اور مجھے واپس نہ بھیجئے۔ (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)
گانا ـــــ "آج موری انکھیاں پل نہ لاگیں"
پطرس :۔ اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں' اور تو گانا کیوں گا رہا ہے' معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں ہے یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت دے اور ہمت دے۔ میں

خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب ہمارے مطالعے کا وقت ہے کل کالج میں اپنے لیکچر سے تین چار پانچ سو رُوحوں کو خوابِ جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی:۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں؟

پطرس:۔ خدا تمھارا حامی و ناصر ہو، اور تمھارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے، پطرس صندوق کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے، اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے، اور مر جاتا ہے) کمرے میں ایک پراسرار نور چھا جاتا ہے، اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ باجہ بج رہا ہے۔

———(※)———

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجیب ہوس خیز ہے لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی توقعات مجروح ہوں گی۔ کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں۔ یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو کچھ رومان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں، میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمری سے ہی بزرگوں کا موردِ عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کے طفیل سینما گویا میری ایک دُکھتی ہوئی رَگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سن پاتا ہوں بعض دردانگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ فطرت ہی کج بیں بن گئی ہے۔

اوّل تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے، اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں، یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو دوست ہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ ان کی دوستی سے جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے بھی قبضۂ قدرت سے باہر ہوں گے۔

جب سینما جانے کا ارادہ ہوتا ہے تو ہفتہ بھر پہلے انھیں کہہ دیتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا جی، اگلی جمعرات کو سینما چلو گے نا؟ میری مُراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کچھ حرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجیب قدر شناسی فرماتے ہیں۔

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر کبھی ہم نے ایسی بے مروّتی آج تک برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور پھر ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں، کچھ دیر چُپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں۔

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے، خیر میں بہت زور نہیں دیتا، صرف ان کو بات سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی! آج کل سینما چھ بجے شروع ہو جاتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجیب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔

"بھئی یہ ہم کو معلوم نہیں؟"

"میرا یہ خیال ہے چھ بجے ہی شروع ہوتا ہے۔"

"اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں۔"

"نہیں مجھے یقین ہے، چھ بجے شروع ہوتا ہے!"

"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہیئے کہ کیا بولوں؟

خیر جناب! جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان پر روانہ ہو جاتا ہوں اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں، دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ سارے مردانے کمرے گھوم جاتا ہوں، ہر کھڑکی سے جھانکتا ہوں، ہر شگاف سے آواز دیتا ہوں، لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں، وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔

دس پندرہ منٹ بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگاتا ہوں اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہُو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آ جاتا ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کام کے بعد مرزا صاحب کو آواز دے لیتا ہوں، اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں؟ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں؟ یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں؟ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں سے گونج کر واپس آ جاتی ہے، آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدِ نظر رکھ کر پوچھتا ہوں۔

"کیوں حضرت ـــــ آپ اندر ہی تھے؟"

"میری آواز آپ نے نہیں سُنی؟"

"اچھا یہ تم تھے، میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانت پیس کر غصّے کو پی جاتا ہوں اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں۔

"تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟"

"وہ کہاں ـــــ؟"

"ارے بندۂ خدا، آج سینما نہیں جانا ـ؟"

"ہاں ہاں، سینما سینما، یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں، ٹھیک ہے سینما میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ایسی جو مجھے یاد نہیں آتی، اچھا ہوا تم نے یاد دلایا ـــــ ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔

"تو پھر اب چلیں۔"

"ہاں وہ تو چلیں گے ہی، میں سوچ رہا تھا کہ آج ذرا کپڑے بدل لیتے، خدا جانے دھوبی کمبخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں، یار اِن دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔ اگر قتلِ انسانی ایک سنگین جُرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں، اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں، بے بس ہوں، صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔

"بھئی مرزا، لِللہ مجھ پر رحم کرو، میں سینما چلنے کو آیا ہوں، دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا، یار بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو، پونے چھ بج چکے ہیں اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجیب مُربیانہ تبسّم کے ساتھ کرسی سے اُٹھتے ہیں گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمھاری طفلانہ خواہش آخر ہم پوری کر ہی دیں چنانچہ پھر یہ کہہ کر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار چلے تو قانون کی رُو سے انھیں کپڑے اُتارنے ہی نہ دوں۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لائے

ہیں۔ ایک پان منھ میں اور دوسرا ہاتھ میں بھی، اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب، پھر اندر جاتا ہوں، مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کریدکر رہے ہیں:

"ارے بھائی چلو ——"

"چل تو رہا ہوں یار، آخر اتنی بھی کیا آفت ہے۔؟"

"اور یہ تم کیا کر رہے ہو۔؟"

"پان کے لئے تمباکو لے رہا تھا۔"

تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے رہے، میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو اُن سے چار پانچ قدموں آگے پاتا ہوں، کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں...... پھر آگے نکل جاتا ہوں...... پھر ٹھہر جاتا ہوں ..... غرضیکہ چلتا دوگنی رفتار سے ہوں اور پہنچا اُن کے ساتھ ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھُپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکاتا ہوں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اُدھر سے کوئی آواز لگاتا، دروازہ بند کر دو جی۔ یا اللہ اب جاؤں کہاں —— رستہ کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہوں تو سر اُن بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لئے دیوار پر ٹنگی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دُھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں، جہاں ذرا تاریک سا دھبہ دکھائی دے جائے وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی، خمیدہ پشت ہو کر اس کا رُخ کرتا ہوں، اس کے پاؤں کو پھاند، اس کے گھٹنوں کو ٹکرا، خواتین سے دامن بچا، آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں تو وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں، اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں، مرزا صاحب سے کہتا ہوں۔ میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ ہم کو رسوا کر دیا نا! گدھا کہیں کا! اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو بزرگ بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فلم کونسا ہے؟

اس کی کہانی کیا ہے؟ اور کہاں تک پہنچ چکی ہے؟ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے۔ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع اور فراخ انگڑائی لیتے ہیں جس کے دوران میں کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے جب انگڑائی کی لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں، اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھے رہتے ہیں، میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لئے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل مختلف ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں، اور چوروں کی طرح بیٹھ ہوا ہوں، تھوڑی دیر کے بعد انھیں کرسی کی پشت پر کوئی مچھر یا پالتو پسو معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وہ دائیں طرف سے اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں، میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں، ایک دو لمحے بعد ہی وہ مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے، چنانچہ ہم دونوں مچھر سے پینترا بدل لیتے ہیں، غرض یہ دل لگی یوں ہی جاری رہتی ہے، وہ دائیں تو میں بائیں، میں بائیں تو وہ دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے، دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں "لے بیٹا" دیکھوں تو اب تُو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

"پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آئی یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو تم فلم دیکھنے دو۔"

اس کے بعد غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں، اور قتل عمداً، خودکشی، زہر خورانی کے معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں، دل میں کہتا ہوں، ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا، اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر نہیں کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے آ جاؤں گا، اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا، تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا رہوں گا، بہت بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا، اپنے اوورکوٹ کو دو چھڑیوں پر لٹکا دوں گا

بہر حال مرزا کے پاس نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اِس کمبخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے پاس جاتا ہوں۔ اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات کو سینما چلو گے نا۔؟

میبل اور مَیں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی، لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے اس لئے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے کبھی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔

تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا، میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار تھا۔ اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے، کتابوں کے متعلق باہم مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف دریافت کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا، اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی، ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی، عورت مرد کی مساوات کا قائل تو ضرور ہوں تاہم اپنے خیالات اور بعض اوقات اپنے رویّہ میں کبھی نہ کبھی اس تکنے کو ضرور کر دیتا تھا، بعض حالات کے ماتحت میبل اپنی ایسی عادت کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنفِ ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں، اور بعض اوقات میں متکلم اور رہنمائی کا رویّہ اختیار کر لیتا جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا یہی فرض ہے خصوصاً یہ احساس میرے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا، کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا، اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی، یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کی کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیوں نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی، اور ہفتہ بھر کے بعد انھیں میرے کمرے میں پھینک دیتی اور یہ کہہ جاتی کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں، تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔ اوّل تو میرے لئے ہفتے میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا لیکن فرض کیجئے مردوں کی لاج رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ اُن کے سمجھنے کے لئے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتے بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا۔ وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھویں اوپر کو چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کیلئے دروازہ کھولتا۔ یا اس کے سگریٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا، یا سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اُسکے لئے خالی کر دیتا۔ تو وہ میری خدمات کو حقِ نسوانیت نہیں بلکہ حقِ اُستادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی ہے جان ہلال کا ایثار سہل ہے لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اُتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں اُن پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی، لیکن جو کچھ کہتا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے پوچھا تو جواب میں نہایت لاأبالانہ کہا۔

"ہاں اچھی ہے لیکن کچھ ایسی اچھی نہیں مصنف سے دورِ جدید کا نقطۂ نظر نبھ نہ سکا لیکن پھر بھی نقطے نرالے ہیں۔ بُری نہیں، بُری نہیں۔"

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا، لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی، ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا۔

"ہاں پڑھا تو ہے، لیکن ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے

وہ اسٹیج پر جاکر بھی باقی رہے گا، یا نہیں؟ تمھارا کیا خیال ہے؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی بیل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔ تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا۔

اس نقاد پر اٹھارھویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں بالکل ہلکا سا، اور شاعری کے متعلق رویہ دلچسپ ہے، بہت دلچسپ۔

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال ہوگیا جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں بیل سے نہ دبتا تھا۔ اُسے میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتے میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔

میری مردانہ روح میں احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آگئی تھی ——— اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا، یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار اور تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراطِ مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں، لیکن کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں، خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دوہری لعنتیں بھیجیں کہ ایک تو میں نے مکاری سے کام لیا، اور دوسرے ایک عورت کو دھوکہ دیا۔ ان کی تسلی کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانئے کہ کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی، ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہوگیا کہ میں بغیر پڑھے ہی علمیت جتا رہا ہوں۔ بیل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے تو بہر حال اُس کو مجھ پر تفوق ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا، میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی میرے اپنے نزدیک تو مسلّم ہے۔ اس خیال سے اطمینان قلب مفقود ہوجاتا اور اپنے آپ ایک

عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا ہے، پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا۔ اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راست بازی کی دیوی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے، بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے، لیکن اُس وقت کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہیں دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ مہلک نہ تھا، بہت زیادہ تکلیف دہ بھی نہ تھا، تاہم گزشتہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی، اور میں بستر پر بہت دیر تک پیچ و تاب کھاتا رہا، شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی، خیریت پوچھی، دوا پلائی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا، میری آواز بھرائی ہوئی تھی، میبل خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے میں نے مکاری کی ہر تفصیل بیان کر دی، ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا "میبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کر چکا ہوں —— لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا، میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا۔

کہنے لگی۔

"نہیں تو ——"

میں نے کہا۔

"مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکیٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا وہ سب من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی۔

"کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا۔ اس پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے، یہ بھی

ٹھیک تھا۔؟

اس کے بعد گذشتہ فریب کاری پر ہیں اور وہ دونوں ہنستے رہے۔ ببل رخصت ہونے لگی تو بولی۔ وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔" میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب میں انھیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انھیں یہیں رہنے دو، تم انھیں پڑھ چکی ہو۔

کہنے لگی۔

"ہاں ـــــ میں پڑھ تو چکی ہوں۔ اچھا یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی مرتبہ کھولا۔

تینوں میں سے ایک کے بھی اوراق نہ کٹے تھے، ببل نے ابھی تک نہ پڑھے تھے۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کے برابر ہونے میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں، برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی پرانی ہو گئی ہے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں، یہی ہماری حالت تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے، لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر گزر جاتی تھی، میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی کی موٹر کار دیکھتا ہوں مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستاتا ہے، اور میں کوئی ایسی ترکیب ضرور سوچنے لگتا ہوں جس سے تمام دنیا کی تمام دولت سب انسانوں پر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں، اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن گھر میں آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی، اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آجائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی، آخر میں نے خاموشی کو توڑا۔

اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا صاحب! ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ تو ہو گا نا آخر؟"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے "بولو"

"میں نے کہا کوئی فرق نہیں ——— سنتے ہو مرزا کوئی فرق نہیں، ہم میں اور حیوانوں میں، کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں فرق نہیں۔ ——— ہاں ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو، کہہ دو گے حیوان جگالی کرتے ہیں تم نہیں کرتے، اُن کے دم ہوتی ہے تمھارے نہیں ہوتی ——— لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں، وہ بھی پیدل چلتے ہیں میں بھی پیدل چلتا ہوں، اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں، کچھ ہے تو کہو ——— بس چُپ ہو جاؤ، تم کچھ نہیں کہہ سکتے، جب سے میں پیدا ہوں اسی دن سے پیدل چل رہا ہوں۔

"پیدل ——— تم پیدل کے معنی نہیں جانتے، پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں، دوسرا اٹھاتا ہوں، ایک آگے ایک پیچھے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں، تخیّل مر جاتا ہے، آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔

مرزا صاحب، میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے وفائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے ازحد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ اُن کی طرف سے پھیر لیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا گویا میں جو اپنی تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ خیالی ہیں، یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابلِ توجہ ہی نہیں یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا، اچھا مرزا یوں ہی سہی، دیکھو تو، میں کیا کرتا ہوں۔

میں نے اپنے دانت پچی کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا صاحب نے بھی سر میری طرف موڑا، میں مسکرا دیا، لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا، جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا صاحب، میں ایک موٹر خریدنے لگا ہوں"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے۔

"کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا۔ "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ضرورت سے زیادہ ذہین ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے تاکہ تمھیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

مرزا بولے۔

"ہوں ــــــ"

اب کے مرزا نہیں، میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھالیں، پھر سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور لے جاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا بولے۔ "ہوں"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے، مرزا پر رعب پڑ رہا ہے ــــــ میں چاہتا ہوں کہ مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہ کہاں تک مرعوب ہوا ہے، لیکن مرزا نے پھر کہا۔

"ہوں"

میں نے کہا۔ "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر میں دو تین زبانیں سیکھی ہیں، اور ان کے علاوہ تمھیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمھارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو مرزا۔ اس وقت تمھاری جو ذہنی کیفیت ہے اسے عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں، میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا، تم نے کہا کہ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں، تو میاں خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے" وغیرہ" کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا، لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

"یہ نکتہ مجھے نہ سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا۔"

"میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً"

میں نے کہا: "ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔"

مرزا کہنے لگے: "چلو دس آنے تو یہ ہوگئے، باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہوجائیگا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

اس کے بعد ضروری بھی معلوم ہوا ہوگا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہوکر خاموش رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں ـــــ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے۔

"تمھیں ایک ترکیب بتاؤں ـــــ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا: "وہ روپے کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے مفت۔

میں نے حیران ہوکر پوچھا: "مفت ـــــ وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو ـــــ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے، البتہ تم احسان قبول کرنا گوارہ نہ کرو تو اور بات ہے؟"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت کی جوانی کی خوش دلی، اُبلتے فواروں کی موسیقی، اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں گھنٹوں تک اپنی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ چنانچہ جب مجھے یقین ہوگیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہوجانے کا جو خطرہ پیدا ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں، تو میں نے پوچھا۔

"ہے کس کی ـــــ؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے وہ تم لے لو۔"

میں نے کہا: "پھر کہنا ـــــ پھر کہنا۔"

کہنے لگے: "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے، جب میری ہے تو تمھاری ہے تم لے لو۔"
یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا دیکھنے میں کہاں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی مجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا صاحب سب سے تو میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کی معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمھارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی، دوسرے میں آج تمھارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے، اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے میں معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، بدنمک، خود غرض، اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابلِ نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں، مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ اس میں فیاضی کیا ہوتی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے، جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "بس اسی بات سے ڈرتا ہوں۔ تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے ——— حالانکہ خدا گواہ ہے ——— احسان اس میں کوئی نہیں ———"

میں نے کہا ——— خیر کچھ بھی ہی، تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے گویا تم مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی، وہ تو بہت زیادہ تھی، اور اب تو وہ اتنے کی ——— رہی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے۔ میں نے پونے دو سو روپے میں خریدی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں

کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔

میں نے کہا: "کیا بہت پرانی ہے۔؟"

بولے: "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی، میرا لڑکا اس پر کالج آیا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنھیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا، پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس کی آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "تو میں تم سے قیمت تھوڑا ہی مانگتا ہوں ——— اوّل تو قیمت لینا نہیں چاہتا ——— لیکن ———"

میں نے کہا۔ "نا مرزا قیمت تو تمھیں لینی پڑے گی ——— اچھا تم یوں کرو ——— میں تمھاری جیب میں کچھ روپے ڈالے دیتا ہوں ——— تم گھر جا کر گن لینا۔ ——— اگر تمھیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا ——— ورنہ روپے واپس کر دینا ——— اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا کر چکا ہوں ——— یہ تو کچھ دوکانداری کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے: "بھئی جیسے تمھاری مرضی، میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں، تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا ——— میں نے سوچا۔ استعمال شدہ چیزوں کی قیمت لوگ آدھی دیتے ہیں ——— لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا ——— تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا وہ تو بیچارہ بالکل یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن میں کیسے لے لوں، آخر بائیسکل ہے، ایک سواری ہے، فٹنوں، گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں، پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے، پچاس تو ہو نہیں سکتے، اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دے

جائیں۔ جن رقموں کے آگے صفر آتا ہے، وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں، بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔

خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا، چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا، مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا، لیکن ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا، مرزا کل صبح ہی صبح بھجوا دینا، رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک دفعہ پھر کہا۔

"کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے ـــــ دیر نہ کرنا ـــــ خدا حافظ ـــــ اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو زیادہ سمجھنا ـــــ خدا حافظ ـــــ اور تمہارا بہت بہت شکریہ ـــــ میں تمہارا بہت ممنون ہوں ـــــ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا دیکھو نا کبھی کبھی یوں ہی بے تکلفی میں ـــــ کل صبح آٹھ، نو بجے تک ـــــ ضرور ـــــ خدا حافظ ـــــ"

مرزا کہنے لگے "ذرا اسے جھاڑ پونچھ لینا ـــــ اور تیل وغیرہ ڈال دینا، میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا ـــــ ورنہ تم خود ڈال لینا"

میں نے کہا "ہاں ہاں، وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم کل ضرور بھیج دینا، اور دیکھنا آٹھ بجے یا ساڑھے آٹھ بجے تک پہنچ جائے ـــــ اچھا خدا حافظ۔

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر گرد و نواح کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈرات کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا، اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لئے ہر روز نہر تک جایا کروں گا، اور شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے، میں سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی طرح گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی

روشنی جب بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ اڑ رہا ہو ـــــ وہ مسکراہٹ جس کا ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، بار بار دل چاہا کہ بھاگ کر جاؤں ـــــ اور مرزا کو گلے سے لگا لوں۔ رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔
صبح اٹھا تو اٹھتے ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور، وہ بائیسکل آ گئی ہے۔

میں نے کہا "اتنے سویرے؟"

نوکر نے کہا "وہ تو رات ہی آ گئی تھی، آپ سو گئے تھے، میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔

میں حیران ہوا کہ مرزا صاحب نے بائیسکل بھجوانے میں اتنی عجلت کیوں کی ـــــ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں، روپے لے چکے تو سائیکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو، بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑ لو، اور یہ موڑ پر جو بائیسکل والا بیٹھا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ، اور دیکھو "اَبے بھاگا کہاں جاتا ہے، ہم ضروری تم سے کہہ رہے ہیں بائیسکل والے سے تیل کی کپی لے آنا، اور جہاں جہاں تیل دینے کی ضرورت ہو وہاں تیل دے دینا، اور بائیسکل والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے جس سے تمام پرزے خراب ہو جائیں، بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں، اور بائیسکل باہر نکال رکھو ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ذرا جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔ برآمدے میں آیا تو دیکھا کہ ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی، ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے، نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟

کہنے لگا، مرزا صاحب نے آپ کے لئے بھجوائی ہے۔

میں نے کہا "اور جو سائیکل رات کو انھوں نے بھجوائی تھی وہ کہاں گئی؟

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں ———"

میں نے کہا "اچھا ——" پھر اُسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب خیال نہ کیا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

دیا؟

"حضور وہ تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ ———؟"

"حضور دُھروں میں زنگ جما ہے، وہ سوراخ کہیں بیچ میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل، رہٹ اور چرخہ اسی طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پھر پہیئے کو گھما گھما کر سوراخ کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا، لیکن اب سوراخ میں سلسلہ آمد و رفت بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا

"حضور وہ تیل تو سب اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے، بیچ میں جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر ہی ڈال دو، یہ بھی مفید ہوتا ہے۔
آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا، پہلا ہی پاؤں چلایا تو معلوم ہوا کہ جیسے کوئی مُردہ ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو ــــ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اُترائی تھی، اُس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی، لیکن اس رفتار سے کہ جیسے کہ تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصّوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونا شروع ہوئیں۔
ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں، چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پیچھے پہیّوں سے نکلتی تھی...... کھٹ، کھڑ، کھڑ کھڑ کے قبیلے کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر، چرخ قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے، زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ جب کبھی میں پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہو جاتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑچڑا کر بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی، پچھلا پہیّہ گھومنے کے علاوہ جھومتا تھا، یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا، اور اس کے علاوہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو بھی حرکت کرتا تھا، چنانچہ سڑک پر جو بھی نشان بن جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔
مڈگارڈ تھے تو سہی، لیکن پہیّوں کے عین اوپر نہ تھے، ان کا فائدہ صرف یہ ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت دھوپ سے بچے رہیں گے۔
اگلے پہیّے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیّہ ہر چکر میں ایک دفعہ اُوپر کو اُٹھ جاتا تھا۔ اور میرا سر یُوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مُکّے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیّے کو ملا کر چوں چوں پھٹ پھٹ چوں چوں کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر سائیکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی پُرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ چونکے، ماؤں نے اپنے بچّوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑ کھڑ کے بیچ میں پہیّوں کی آواز جُدا سُنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں

چُوں پھٹ پھٹ، چُوں چُوں پھٹ پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی۔ تمام بائیسکل کسی اَدق افریقی کی زبان کی گردانیں دُہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گذری، چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں، ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جاتا تو سامنے تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں نیچے اُوپر کر رہا تھا تو میرے گھٹنے ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیّوں کی اٹھکیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کروں، چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اُترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں خاموشی سی چھا گئی، ایسا معلوم ہوتا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے باہر نکل آیا ہوں۔ جیب کے اندر سے میں نے اوزار نکالا، گدی کو اونچا کیا اور کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا، اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے فٹ بھر اونچی تھی، میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے ہوئے برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دُور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو، مجھے

اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا، یُوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ کر دیکھنے لگتا تھا، لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کیلئے میری حالت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو، ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا، ایک لڑکے نے کہا "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اُتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اُونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا ہے، وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے، اور ان میں بھی یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل، چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا، لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گذر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقررہ باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں، چنانچہ بائیسکل کو ایک دوکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑ کھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا "ذرا اس کی مرمت کر دیجئے۔"

ایک مستری آگے بڑھا، لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو ٹھوک بجا کر دیکھا، معلوم ہوتا تھا، اس نے بڑی تیزی سے حالات کا جائزہ لگایا، لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا "بڑے گستاخ ہو تم، دیکھتے ہو کہ صرف ہینڈل اور گدی کو اونچا کر وا کے کسوانا ہے، بس۔ اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو، اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا "مڈگارڈ بھی ٹھیک کر دوں؟"

میں نے کہا "ہاں وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا "اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لو تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا "اچھا کر دو۔"

بولا "یوں تھوڑا ہی ہو سکتا ہے، دس پندرہ دن کا کام ہے، آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

اور پیسے کتنے ہوں گے؟

کہنے لگا "بس تیس چالیس روپے لیں گے۔"

میں نے کہا "بس ہو چکا، جو کام تم سے کہا ہے وہ کرو، اور باقی ہمارے معاملات میں

دخل مت دو۔

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا: "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں سب ڈھیلے پڑ جائیں گے۔

میں نے کہا، بدتمیز کہیں کا۔ دو آنے مفت میں لے لئے؟

بولا "جناب آپ کو یہ بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہوگی، یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟" للو یہ وہ سائیکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے، پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں گذر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔

میں نے کہا "واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے، ان کو ابھی کالج چھوڑے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے۔

مستری نے کہا "ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا، لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا، اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے، اس لئے ٹانگوں کندھوں، کمر اور بازوؤں میں اس قدر درد ہو رہا تھا جو برداشت کے قابل نہ تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا، لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اس کو دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا، اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغا بازی پر ایک طویل تقریر کرتا، کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے بیچ کر جو

وصول ہو اسی پر صبر و شکر کروں، بَلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ ہی سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دوکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دوکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا، لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں، آخر بڑے سوچ بچار کے بعد اور بڑے تامّل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے۔"

دوکاندار کہنے لگا "پھر؟"

میں نے کہا "لو گے؟"

کہنے لگا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا بیچتے ہیں ہم۔

دوکاندار نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا ــــــ پھر مجھے دیکھا ــــــ پھر بائیسکل کو دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کونسا ہے، اور بائیسکل کونسی ہے۔ آخر کار بولا۔

"کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر ــــــ؟"

ایسے سوالات کا جواب خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے اُن کا مصرف کیا ہو گا۔؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے، مگر کوئی اس کو لے کر کیا کرے گا۔

میں نے کہا اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا۔؟

کہنے لگا ــــــ "اچھا چڑھ گیا پھر ــــــ؟"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا۔؟"

دوکاندار بولا "اچھا، ہوں ــــــ "خدا بخش ذرا یہاں آنا، یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔

جن حضرت کا نام خدا بخش تھا، انھوں نے دُور ہی سے دیکھا جیسے بُو سونگھ رہے ہوں ــــــ "

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے "آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا تو اور کیا۔ محض آپ سے ہمکلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ کر کے لایا تھا۔؟

کہنے لگا۔ تو کیا لیں گے آپ۔۔۔؟

میں نے کہا: "تمھیں بتاؤں؟"

کہنے لگا: "سچ سچ بتاؤں۔؟"

میں نے کہا: "ہاں"

پھر کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی، یا یوں ہی ترساتے رہو گے"

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے"

میرا خون کھول اٹھا، اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے میں نے کہا۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان! مجھے اپنی توہین کی پرواہ نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں زمین پر جیسے زمین سے نیچے میں سے گذر گیا۔ اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جگہ بدل لی ہے۔ جب حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے جس بات کا شوق تھا آج پورا ہو گیا۔ ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دوکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا

ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی رہی۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہوگیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ سائیکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی، ورنہ خدشہ تھا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تمھارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کاہے کو لے جا رہے ہو۔

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ یہ سب لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انھیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر کیا ہوا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو، چلتے جاؤ۔

لوگوں کے شائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت غصہ تھوک ڈالئے۔" ایک دوسرے صاحب بولے "بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کر تجھے مزہ چکھاؤں گا۔" ایک بزرگوار اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھو بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے، اس کے دونوں پہیے علیحدہ ہوتے ہیں۔

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آبادی سے دور نکل گیا، اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں مبتلا تھا، پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں برابر چلتا گیا حتیٰ کہ ایک دریا پر جا پہنچا، پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے۔ اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آجاؤ۔"

میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟"

مرزا صاحب باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو افسوں

نے بائیسکل کے ساتھ ہی مفت مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا۔
مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے، میں اب اس سے بے نیاز بنو چکا ہوں۔
گھر پہونچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف۔ اے کے کورس میں پڑھی تھی۔

———— x(❖)x ————

لاہور کا جغرافیہ

تمہید:- تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے ا— بہت عرصہ گذر چکا ہے۔ اس لئے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ کرّے کو دائیں سے گھمائیے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد، عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجئے۔ جہاں یہ نام کرّہ پر موقوف ہو وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتہ سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع:- ایک دو غلطیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی زمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔

ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے اس لئے کہ شہر دریا کے کنارے پر واقع ہے یا تن کنارے پر واقع ہے۔

لاہور تک پہنچنے کے لئے کئی راستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے، دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے، اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں

اور اس میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبہ کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف لاہور ہی لاہور واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے ——— ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے، لیکن ہر ورم موادِ فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ وسیع عارضہ ہے جو اس جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی، اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دئیے ہیں، جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کئے جاتے ہیں، امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب و ہوا کے لئے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں، اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق میں ابھی چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر شخص کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ

رنگ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں ایک انگوٹھی ہوگی جو دولہا بندگی کے موقع پر ہر ایک دلہن کو پہن کرائے گا۔

نظام سقّے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچنے کے لئے ایک نہ ایک دن گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔

چنانچہ بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ دیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت:۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کو یہاں کے آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں تا کہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا رد و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ڈنڈے لگا کر ایک گھوڑا ان کے آگے جوت دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تا کہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جا سکے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دوکانوں پر انہیں کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کے بجائے نباتی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ نباتی گھوڑے شکل و صورت میں دم دار ستارے سے ملتے ہیں کیونکہ ان گھوڑوں کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے۔

اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا یہ تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنے نقش پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مقام لطف اندوز ہو سکے۔

قابلِ دید مقامات :۔ لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں، پہلے اینٹوں اور چونے سے دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں، پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھ جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکا دیے جاتے ہیں مثلاً "اہلِ لاہور کو مژدہ" یا "اچھا سستا مال" اس کے بعد اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً "گریٹ موڈی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹس کے لئے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ درج ہے بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے، اس کھڑکی کے اوپر "انجمن خدامِ ملت" کے جلسے کا پروگرام ہے۔ اس کھڑکی پر مشہور لیڈر کے خانگی حالات باوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں، عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مِس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے حالات گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سُرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد، یا انقلاب نسیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے، اسی لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے اور ان کو پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ چار پائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت تک وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں "حجرتِ جلی محمد علی دندان ساز" روزنامہ "انقلاب" کا دفتر ہے۔ جہاں "جلی پانی" بھاپ کا بڑا ہسپتال لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں جہاں "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی تاج صاحب کا مکان ہے کرشنا

۔۔ بی آرٹیم" شالامار باغ اور کھانسی کا مجرب نسخہ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت وحرفت :- اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی ہے اور سب سے بڑی انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا نمبر خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے، پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہیں، یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں، چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اس لئے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینمائی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار :- لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبا کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں چند مشہور قسم ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر درزیوں کے یہاں تیار ہوتے ہیں، بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں، اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد ہی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر آتا ہے پروانہ

شمعیں کئی ہوتی ہیں، لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے ہیں۔

دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے اس سے

ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور خود خدا کے رحم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔

کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی۔ اس ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔

تیسری قسم خیالی طلباء کی ہے۔ یہ آلۂ روپ، اخلاق اور آرگون اور جمہوریت پر آواز بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیاتِ غیبی کے متعلق نئے نئے نظریئے پیش کرتے رہتے ہیں صحتِ جسمانی کو ارتقاءِ انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اس لئے مئی اصبحت پانچ چھ ڈنڑ پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں گاتے ہیں لیکن بےسُرے ہوتے ہیں۔

چوتھی قسم خالص طلباء کی ہے۔ یہ طلباء کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اسی قسم کے خدشے کبھی ان کی زندگی میں داخل نہیں ہوتے جس معصومیت کو لے کر وہ کالج پہونچتے ہیں اسے آخر تک موت نہیں ہونے دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلباء کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے، اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر بھی کر سکتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات:۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

(۱) لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔

(۲) لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔؟

(۳) میونسپلٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

— ختم شد —

تخلیقاتِ پطرس

ترتیب

مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر ہنری برگساں کا فلسفۂ خندہ)

ہنسی کے کیا معنی ہیں ؟ کسی مضحک چیز میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے ؟ ہم کبھی کسی کے منہ چڑانے پر کبھی کسی کے ظریفانہ فقرے پر اور کبھی کسی شخص کی ہیئت کذائی پر ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک بات کونسی ہے ؟ ہم کس طریقے سے ظرافت کی اس پری کو شیشے میں اتار سکتے ہیں جو ایک روح کی طرح مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے اور سامانِ تضحیک میں اس قدر تنوع پیدا کر دیتی ہے ؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر حکماء اپنا دماغ صرف کرتے رہے لیکن جو ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر پھر اُن کے سامنے آکھڑا ہوا اور ان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جانِ خندہ یا روحِ ظرافت یا عنصرِ مضحک جو نام بھی آپ اس پری کے لئے تجویز کریں اس نام کو منطق کے اصولوں پر کسی تعریف کے بندھنوں میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ روحِ خندہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہیئے اور ایک آدھ فقرے میں اس کی تمام ہستی کو لکھ ڈالنا اس کی توہین کرنا ہے ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے اور کس طرح نشو و نما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیرپا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جاننے لگیں اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے کہ کوئی ایک فقرے کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے کاغذ پر رکھ دے اور ممکن ہے یہ

"ضاحک" کے نام سے پکارتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان نہ صرف "حیوانِ ضاحک" بلکہ "حیوانِ مضحک" بھی ہے۔ گو کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز کبھی ہنسی کا باعث ہوتی ہے تو یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ عنصرِ مضحک یا کوئی انسانی مشابہت ہوتا ہے یا صنعتِ انسانی کا کوئی نقش اور یا پھر مضحک وہ کام ہوتا ہے جو کوئی انسان اس چیز سے لے رہا ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کر دینا ضروری ہے یہ ہے کہ اکثر دفعہ ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ جب تک روحِ انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ایک ایسے شخص کی ہنسی نہیں اڑا سکتے جس پر ہم ترس کھاتے ہوں یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی ہنسی اڑانے کے موقع پر ہم اتنی دیر کے لیے رحم اور محبت کی زبان بندی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے اشخاص کی جماعت میں جو صرف دماغ ہی دماغ رکھتے ہیں اور جن کا دل (ان معنوں میں کہ دل جذبات کا خزینہ ہوتا ہے) معدوم ہو۔ شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں ایک جماعت حد درجہ کی حساس طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے۔ جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے یعنی وہ اشخاص جن کو اہلِ دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں ہر ایک واقعہ ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو ہمیشہ کمال کو پہنچتی رہتی ہے۔ ایسے اشخاص نہ تو ہنسی سے آشنا ہیں نہ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ جو آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات و افعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ دل بستگی پیدا کر لیں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں اوروں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریکِ کار ہو جائیں اور انہیں کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبۂ ہمدردی کو پوری طرح وسعت دے دیں تو حقیر سے حقیر چیز آپ کی نظر میں اس قدر وقیع و اہم بن جائے گی گویا کسی طلسم نے اشیا کی حقیقت کو

آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو کیونکہ روحِ خندہ کی بھی ایک منطق ہے۔ وہ بھی اپنا ایک مقررہ طریقِ عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی دور از کار رفتہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کئی مضحک باتیں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ بھاتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے جن پر ایک ملک کا ملک دہرا ہو جاتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روحِ خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے اور فن کی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہے تو ممکن ہے یہ زندگی اور فن پہ بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

شروع شروع میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دیئے جائیں ان اصولوں کا خود مضحک اشیاء سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سامانِ تضحیک کی حدود قائم کی جا سکتی ہیں۔

فصل۔ دورانِ بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے یہ ہے کہ کوئی سامانِ تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے دلفریب و دلکش ہو یا ممکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بدنما ہو لیکن مضحک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایک جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ہماری نگاہ کو اس جانور کی ہستی میں کوئی انسانوں کا سا انداز یا انسانوں کی سی بات محسوس ہو جاتی ہے جو سامانِ تضحیک بن جاتی ہے ممکن ہے کہ بعض اوقات آپ ایک بھونڈی نوک دار کاغذی ٹوپی کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔ لیکن اس میں جو چیز مضحک ہے وہ اس ٹوپی کا کاغذ نہیں۔ وجہ خندہ اس ٹوپی کی شکل ہے وہ شکل جس کو یوں معرضِ ظہور میں لانے کا باعث کوئی انسان تھا یعنی مضحک انگیز ٹوپی کی قطع وضع ہے جو اس وجہ سے مضحک ہے کہ وہ کسی انسانی دماغ کے ایک عجیب و مضحک خیال کی ترجمان ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا اہم اور ایسا بین نکتہ [illegible] کی تفتیش سے اس قدر نامحرم رہا ہے اکثر لوگ انسان کو [illegible]

بے لطف بنا دیتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام محسوسات پر ایک تاریکی سی چھا جائے گی جو آپ کو ہنسی سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ اب اگر آپ تماشائی بن کر بات سے الگ ہٹ جائیں اور اپنے آپ کو بالکل لاتعلق بنا کر اس کا مطالعہ کریں تو کئی باتیں آپ کے سامنے مضحک بن جائیں گی۔ اگر کہیں موسیقی کے ساتھ باقاعدہ رقص ہو رہا ہو تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے کانوں کو اس طرح بند کر لیں کہ موسیقی کی آواز آپ بالکل نہ سن سکیں تو رقص بالکل مضحک ہو جائے گا اور شاید ہی کوئی فعل انسانی ایسا ہو جو اس طرح کی آزمائش میں پورا اتر سکے۔ اگر ہم افعال و حرکات کو جذبات کی ہم آہنگی و موسیقی سے علیحدہ کر سکیں اور پھر دیکھیں تو ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو فوراً متانت سے گرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ثابت ہوا کہ کسی مضحک چیز سے پورے طور پر اثر پذیر ہونے کے لیے ایک عارضی انعدام جذبات ضروری ہے۔ تضحیک کا تعلق عقل و فہم یا صرف عقل و فہم سے ہے۔

لیکن ہنسی کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ دوسرے انسانوں کے دماغ سے دور نہ ہو اور یہ تیسرا نکتہ ہے جو توجہ کا طالب ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے رفیق محسوس کریں تو آپ مضحک اشیاء سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہنسی کے لیے ہمیشہ ایک گونج، ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت و رفاقت کا ہونا ضروری ہے۔ آپ خود ہنسی کی آواز کو غور سے سنیے۔ یہ صاف و صریح، بیّن اور متعین آواز نہیں۔ خود اس آواز کی نوعیت میں گونجتے رہنے کی خواہش مضمر معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک دھماکے کی طرح یکایک بیچ زور سے پھٹ کر شروع ہوتی ہے اور ایک مسلسل دنبالے کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ گویا پہاڑوں میں بادل گرج رہے ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں ہو سکتی کہ یہ گونج بلا غایت و انتہا گونجتی رہے۔ اس گونج کا حلقہ جس قدر بھی وسیع ہو سکتا ہے اور اس کے حدود ہے لیکن ہماری ہنسی ہمیشہ ایک جماعت یا ایک حلقے تک محدود ہوتی ہے۔ آپ کو ریل کے سفر میں کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ جب کچھ ہم راہی مسافر آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

جو ان کے لئے یقیناً ظرافت آمیز ہیں کیونکہ وہ دل کھول کر ہنستے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اگر آپ بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتے تو آپ بھی یقیناً ہنستے لیکن چونکہ آپ ان سے علیحدہ ہیں آپ کو ہنسی نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایک شہر کی جامع مسجد میں اس شہر کے بڑے مولوی وعظ فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر اس قدر موثر تھی کہ سب سامعین زار وقطار رو رہے تھے۔ سوائے ایک کے جو بالکل ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ جب اس شخص سے اس کے اس قدر غیر متاثر ہونے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے جواب میں کہا "میں اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں تو اجنبی ہوں" رونے کے متعلق اس شخص نے جس خیال کا اظہار کیا وہ ہنسنے کے متعلق اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ ہنسی ہمیں بے اختیاری کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ایک ہنسنے والے کو ہنسنے کے لئے اور ہنسنے والوں کے ساتھ (خواہ وہ حقیقت میں موجود ہوں یا محض تصور میں) سازش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ محض دوسروں کی مدد ہی سے ہنستا ہے آپ دیکھتے ہیں کہ تھیٹر میں تماشہ دیکھنے والوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر ہجوم کی ہنسی بھی زیادہ بے قابو ہوتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان میں بہت سی ظرافت کی باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے وہ ظرافت سے خالی رہ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت ایک خاص قوم کے رسم و رواج اور خیالات سے تعلق رکھتی ہے۔ جنہوں نے اس نکتے کو نظر انداز کیا ہے وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک ظرافت ایک نہایت ہی حقیر مشغلے سے زیادہ قابلِ غور حقیقت نہیں رکھتی اور جو ہنسی کو حیاتِ انسانی کی باقی تگ و دو سے بالکل ہی بے تعلق سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ظرافت کی یوں توضیح کرتے ہیں کہ "ظرافت ایک تقابلِ ذہنی کا نام ہے"، یا "ظرافت ایک محسوس بے ہودگی کا نام ہے۔" ممکن ہے یہ تعریفیں ٹھیک ہوں لیکن یہ اس سوال کا جواب دینے سے قطعی قاصر ہیں کہ آخر بعض چیزوں پر ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض محسوسات تو ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے یا سنتے ہی ہمارے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں حالانکہ اور ہزاروں اشیاء بھی دنیا

ہیں موجود ہیں جن کا مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہنسی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے، ہمیں ہنسی کو ہنسی کے گھر میں اٹھ کر دیکھنا چاہیئے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنسی کا گھر انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

مفصلہ بالا بحث سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:۔

۱۔ سامانِ تضحیک انسانی دائرے سے باہر نہیں پایا جاتا۔

۲۔ ہنستے وقت جذبات معطل ہوتے ہیں۔

۳۔ ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا ضروری ہے یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب انسانوں کی ایک جماعت اپنی توجہ اپنے ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کر دیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی ہے۔

فصل۔ ایک شخص بازار میں دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ لوگ ہنس دیتے ہیں۔ اب اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ گرا نہیں بلکہ جان بوجھ کر یوں زمین پر بیٹھ گیا ہے تو وہ اس پر نہ ہنستے۔ لوگ ہنستے اس لئے ہیں کہ اس شخص کا زمین پر یوں بیٹھ جانا اس کا ایک غیر ارادی فعل تھا۔ یعنی باعث خندہ اس شخص کے انداز کا یوں یکایک متغیر ہو جانا نہیں بلکہ اس تغیر میں عدم ارادہ کے عنصر کا پایا جانا ہے۔ اس شخص کو چاہیئے تھا کہ جس پتھر سے اسے ٹھوکر لگی ہے۔ اس سے ہٹ کر چلتا یا اپنی رفتار بدل دیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور چونکہ اس کے بدن میں یک لخت کترا جانے کی قابلیت نہ تھی یا شاید وہ کسی اور خیال میں غرق تھا (یعنی اس کا خیال غیر حاضر تھا) اور اس کے جسم میں اتنی لچک اور خمیدگی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے پھر حاضر ہو جانے پر اپنے بگڑے ہوئے توازن کو فوراً سنبھال لیتا۔ اس لئے اس کے اعصاب اپنے پہلے فعل یعنی آگے کو چلنے کی حرکت ہی میں مصروف رہے۔ حالانکہ متغیر حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی بھی آئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجیئے جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ اور بجا تلا ہے۔

اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سر موا انحراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیا ایک مقررہ قرینے اور ترتیب سے رکھی رہتی ہیں اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے اب فرض کیجئے کوئی شریر لڑکا آکر ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے اب وہ شخص میز پر سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آجاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ "مخزن" کا فائل نکل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے تو وہم سے زمین پر جا گرتا ہے۔ غرضیکہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو مجبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے اب اگر خلافِ معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا یا منحرف کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح بہ خطِ مستقیم پر چلتا رہا۔ تو گویا جو شخص اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے جو دوڑنے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامانِ تضحیک دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بل کھانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی اور چونکہ ہم ایک انسان ہیں۔ اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں مڑنے تڑ جانے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحک کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو گرنے کا سامان سوءِ اتفاق نے مہیا کیا تھا اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے ان دو وجوہات سے ان دو شخصیتوں میں فوراً اکڑ جانے کی قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحک نتیجہ رونما ہوا۔ اس کی علت خارجی تھی۔ یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خود اپنے خزانے میں سے اپنے ظہور کے لئے کئی مواقع نکال لے

تو سامانِ تضحیک کی علت خارجی نہ رہے گی۔ بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا دماغ اپنے گزشتہ افعال کے متعلق مصروف رہتا ہے اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا کہ وہ فی الحال کیا کر رہا ہے یعنی اس کے خیالات زمانۂ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو صبح اس نے کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آکر ٹھہر جاتی ہے تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا یعنی پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں ایک لچک اور خمیدگی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے کہ وہ زمانہ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بلند ہوئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا اوجھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پر زور ڈال کر ان کو گردوپیش کے حالات کے ساتھ مطابقت دیتا رہتا جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقت حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی حالت میں سامان تضحیک (اور اس کی علت ظہور) خود اس شخص کی ذات کے اندر موجود ہے۔ ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو شیخ چلی کی کئی ایسی باتیں یاد آ جائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے۔ اس کا مضحک ہونا بعض اوقات بہت وجوہ سے اور بھی زیادہ قوت پکڑتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کو کسی شخص کے خیالات کے یوں غیر حاضر رہنے کی ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی وارفتگی گویا آپ کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہوا ور آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ وہ کیسے بڑھتی رہتی ہے اور کن وجوہ سے ترقی کر رہی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص رات دن مجنوں اور فرہاد کے قصے پڑھتا رہتا ہے اور چوبیس گھنٹے اس کا دل و دماغ، عشق کی وحشت، صحرا نوردی خود فراموشی، بے خودی اور دیگر کیفیات میں مصروف رہتا ہے۔ حتیٰ کہ قیس اور فرہاد کا کیریکٹر

سے اتنا جاذب و دل کش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے اب وہ اپنے آپ کو بالکل قیس سمجھتا ہے اور اس کے خیالات اور ارادے اس کی طرف مائل ہوتے ہوتے بالکل اسی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اگر چندے اس کی یہی حالت رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ اگر اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوگا تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے اور وہ اسی خواب میں اِدھر اُدھر چل پھر رہا ہے اس کی باتیں اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں ایسے شخص میں سامانِ تضحیک کس قدر موثر و عمیق ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پوچھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے اور کبھی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ مدحیہ گانے لگ جاتا ہے ایسے شخص کے خیال کی غیر حاضری میں یہ بات زائد ہے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات سے بے خبر ہے۔ وہاں تخیلات سے باخبر بھی ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گرد و پیش میں بے کار ہے۔ بلکہ وہ ایک اور دنیا میں مصروف بھی ہے۔ ایسی ہستی اس شخص سے زیادہ مضحک ہے۔ جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے ہیں کہ غیر حاضر ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ آخر وہ ہے کہاں؟ مگر جب آپ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ واقعات موجودہ سے بے خبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو عرف عام میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو دیکھ کر جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو ہمارے ساز ہستی میں وہی تار لرزاں ہوتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو دیکھ کر لرزاں ہوتے تھے۔ جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختۂ مشق بنتا ہے یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور اس تگ و دو میں کسی سخت وکرخت حقیقت سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے ہوتے ہیں کہ ان کی بے خبری باقاعدہ منظوم و منضبط ہوتی ہے اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے

سوانح اور ان کے حادثات علت و معلول کے ایک خاص سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو باہوش انسانوں کی منطق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں لچک کی ایک ایسی کمی ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت نہیں دے سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور ضد ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اس لئے خیالات اس کے دماغ میں جگہ نہیں پاسکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے اب ذرا اس سے آگے چلئے اور غور کیجئے کہ جو تعلق ایک خاص خیال کی ہٹ کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی سیرت سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بداخلاقیاں دو قسم کی ہیں بعض برائیاں ایسی ہیں کہ روح انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کو ساتھ لئے ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی طبیعات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتی چلی جاتی ہے اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں دردانگیز اور ملال آمیز ہوتی ہیں۔ بہ خلاف اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھٹا سا ہوتا ہے جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں حلول کر جائے وہ ہم پر سوار ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ نوع میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی یکسانیت کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈرامے اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسماء سے موسوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ کچھ اس طرح سے کیریکٹر کا جز و بدن بن جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان کے خواص کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ان برائیوں کا خیال تک نہیں آتا۔ بجائے اس کے ہمارے پیش نظر صرف وہ کیریکٹر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو بھر دیا جاتا ہے اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسم معرفہ ہوتا ہے مثلاً اتھیلو، ہملٹ وغیرہ لیکن ایک مضحک برائی خواہ وہ ایک شخص سے نہایت ہی

پیچیدگی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی علیحدہ نوعیت اور ہستی کو قائم رکھتی ہے وہ بہ ذات خود ایک کیریکٹر بن جاتی ہے جس کے اردگرد زندہ کیریکٹر گھومتے رہتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مضحک بیماریاں کیریکٹروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوتا ہے اتنا زیادہ مضحک بھی ہوتا ہے ایک ڈرامے کے کیریکٹر کو اگر اس بات کا علم ہو جاتے کہ وہ کیا ہے اس میں کونسی برائیاں ہیں اور ان برائیوں کو ہم کس نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ میں کوئی اصلاح یا تغیر پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحب نقائص مضحکہ کو اپنے مضحک ہونے کا احساس ہوا۔ وہیں وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی یا کچھ نہ کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ لوگوں کی ہنسی مصلح اخلاق ہے۔

سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو دوڑتے ہوتے گر پڑتا ہے اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں اور یہی سامان تضحیک کی رونمائی کا باعث ہوتی ہے۔ کش مکش حیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیداری اور آگاہی کے ساتھ واقعات حاضرہ کو پیش نظر رکھے اور ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جاتے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دیتے رہیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی بے وقوفی اور ہر ایک قسم کا جنون ہماری زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی میں بے جوڑ سی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں اور انواع و اقسام

کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ہنسی گویا سوسائٹی کی ایک انگشت نمائی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض لطافت قلبی سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں جانتا کہ ہم ہنستے صرف اس وقت ہیں جب ہم تحفظ نفس کے تفکرات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو صرف مخلوق فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

"پطرس"

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہار بازوں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں یہ بتادینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا، مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوتے تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چلے جانے والے کا بل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈر ہی کے شائع کرنا پڑا، چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل

نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرکے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لئے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو، ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بپھر کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں، ہم سے بحثنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے۔ آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر فحش حملے کئے اس لئے ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لئے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً سامنے کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لاکر دیتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں لہٰذا کوئی خاتون ملازمت کی کوشش نہ فرمائیں پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنے شاید جوانمرد سمجھیں اور اہلِ قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلوان نیشنل گارڈ والے اور مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا رُخ کریں پھر یہ بھی خیال تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی۔ مردوں کی ایسی بھی کیا قلت ہے لیکن ایک دن ایک خاتون آ ہی گئیں۔ پرزے پر نام لکھ کر بھیجا۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو بلاتے ہی کیوں؟ لیکن آج کل کم بخت نام سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ، زبیدہ، عائشہ کچھ ایسا

نام ہوتا تو میں غسل خانے کے رستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو نازجہاں نجم رومی یا عندلیب گلستانی یا کچھ ایسا ہی فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں۔ غلام رسول، احمد دین، مولا داد جیسے لوگ تو ناپید ہی ہوگئے ہیں جسے دیکھئے نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی بنا پھرتا ہے اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ حرارت عزیزی، نزلہ کھانسی، ثعلب مصری ادویات ہی کے نام نہ ہوں عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا بہر حال، ہم نے اندر بلایا تو دیکھا کہ عورت ہے دیکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسنِ ظن سے کام لے کر اندازہ لگایا کہ اس کے اندر عورت ہے ہم نے بصد ادب و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھتے انہوں نے وجہ پوچھی ہم نے کہا پیچیدگیاں ہونے لگیں آگے بولئے ہم نے کہا پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ٹھنک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں اس لئے ہم تائید یا تردید کچھ نہ کر سکے میری ولادت کو انہوں نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ بہتر سمجھا کہ جو ہونا تھا وہ ہوگیا اور بہر حال میری ولادت کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے پروپرائٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ تفصیلات بیان کریں کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا۔

ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدم ہے وہ شہر کے ایک معزز ٹھیکیدار ہیں۔ اخبار انہوں نے محض خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے لئے جاری کیا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے چنانچہ ان کے پوتے کا ختنہ، ان کے ماموں کا انتقال، ان کے صاحبزادے کی میٹرک کو بعض میں حیرت انگیز کامیابی (حیرت انگیز اس معنوں میں کہ پہلے ہی ریلے میں پاس ہوگئے) ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر کا فرض ہوگا نیز ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خورد و نوش کا انتظام بھی ہو ہمارے پروپرائٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں بھی شامل ہوں گے اور اس پر کسی سب ایڈیٹر کو زیر لب مسکرانے

کرنے کی اجازت نہ ہو گی۔ یہ بچے بہت ہی ہونہار ہیں اور حالاتِ حاضرہ میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوتی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دوانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود سرمالا ابراہیم اسے گود میں لئے لئے پھرے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام "آسمان" ہے پیشانی پر یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان بادل کا پہلے خرقہ دیرینہ ہے اس فقرے کو ہٹانے کی کوئی سب ایڈیٹر کوشش نہ فرمائیں کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے ہم نے کہا بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے کہنے لگے علامہ اقبال کا مصرعہ ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے اس پر ہم چپ ہو گئے پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر ضرور رکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے کے ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے۔ جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم عربوں کے حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریذیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں جمود کے قائل ہیں اسی لئے سب ایڈیٹر کو مسلسل ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ بیلی گیمپ کے ہیڈ ماسٹر کو موسم سرما سے پہلے پہل یا ترقی دلوائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کرا دیا جائے (ان کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے)

انشا کے متعلق ہمارا خاص طرزِ عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ ہوائی جہاز اڑتا نہیں محوِ پرواز ہوتا ہے۔ مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے حالانکہ انہیں کہنا چاہیئے تھا۔ کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔ مہلک طور پر مجروح ہوتے۔

میونسپل کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کی ایک ٹکیہ نشانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں پلا ہونا چاہیئے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے۔

ٹکٹ فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ فی الحال یہ پرنٹر پبلشر اور ان کے [illegible] ہوتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا، علیٰ ہذا جو اشیا ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا ہمارے پرنٹر پبلشر آگے ہی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ سٹاف بہت بڑھ رہا ہے بہت بڑھ رہا ہے

اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصولاً اسٹاف بڑھانے کے خلاف ہیں۔ دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ سٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات؟ کونسی بات؟ اپنے ڈیلو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

وارفتگیٔ جذبات

بھائی. . . . تم سے کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے اس لئے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا۔ یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تکان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دُور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ نوا، رباب کی سادہ موسیقی۔ رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح سرحدی کوہستانوں کے درشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جنگجو، جنوں اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر پھینک دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تضرع سے متراففردوں میں

اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ خیبر کی آغوشِ کوہ کی پر درد و حسینہ کے خوب صورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک مجبوبیت آگئی ہے یکایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رعبِ حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصے میں آکر اس نے اپنی گھاس کی گٹھڑی اور درانتی کو سر پہ رکھ لیا ہے اور ندی کے بیچ میں سے گزر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک شکستگی سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پہ کھڑا اردگرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو، بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور رتیلے کوہستان میں اس کے گیت کی مجبور سُریں وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو عشق اس میدان و کوہ میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے۔ خیبر کے بنجر اور ڈراؤنے پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو اتنی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب دورافتادگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تسکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرا کی وحشت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں اور ستاروں کی حدود از دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے چمک رہا ہے

اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سلسلے ہیں جن میں رات نے اپنے پر اسرار اقتدار کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک بے حد بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں ہوتا فقط ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابلِ بیان بے قراری ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں کیوں بے بس ہوں۔ بس یہ بے بسی کا احساس جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے اور تنہائی ایک محشرستان، بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے اور گیت کی لے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جاتے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر آہ! کس بیداری کے بعد!

(مخزن جولائی ۱۹۲۱ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعہ سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اردگرد تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر کا تاریک منظر دکھائی دے رہا ہے۔ جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر دفعتہً ایک کم بتا سی خنکی پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ کہیں دور ایک کتا بھونک رہا ہے جس کی آواز محیط خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر رل گئی ہے۔ جب یہ آواز ایک لمحہ کے لئے میرے کان تک نہ پہنچے تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی ہے اور میرا دل ایک لمحہ کے لئے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اور ڈراؤنی آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لیمپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹک ٹک اور بھی گھبرا دیتی ہے میز پر رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اور ان کی بے حس و حرکت روحوں کو دیکھ کر کسی قبرستان کا بھیانک منظر تصور میں آ کر ڈراتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت سو رہی ہیں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا ہوں جو دیا سلائی جلاتے وقت اس سنسان محل کے نحیف نغمہ کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے گی۔ مجھے اس بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے ڈر لگتا ہے جو سلگتے ہوئے سگریٹ سے ایک نازک اور پُراسرار ناگن کی طرح نکل کر میرے سامنے کہیں تاریکی میں غائب ہو جائے گی میں دروازے میں سے چمن کی کالی کالی جھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس

ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک مہیب خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور میرے لیمپ کی روشنی مدہم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اُٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے ہلکے سے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی رات سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے حد طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں۔ اس حسین کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی میری آنکھوں میں چھا رہی ہے۔ حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کانپتی ہوئی امید کی طرح ڈر ڈر کر جھجک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے بدن میں خون کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے ماتھے کے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں تو مجھ پر ایک تھرتھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے آنکھیں ان کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ فرش پہ میرا سیاہ کمبل اس سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہلکے سے اپنی خاموشی کا دھیما سا طلسم پھونک دیا ہے میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے سہم جاتا ہوں گویا پُراسرار چپ چپ دنیا کا کوئی بھیانک سا منظر یک لخت مجھے اپنی وحشت دکھائے گا اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے منہ سے نہ نکلے گی۔ میرا گلا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔ میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیرتا ہوں لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو نہ دیکھوں اور رات کی خاموشی اور میرے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو زور سے کھولے ہوئے ہے۔ جو میرے سینے کو دبا رہا ہے اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ گھڑی کی سوئیاں جن میں میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی

اب کسی اور جگہ میں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے چلتی رہی ہیں۔ کیا کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جارہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ کر مجھے بھینچنے کے لئے میری طرف آرہی ہے اور کیا خاموشی اور تاریکی کے جادو نے مجھے اس تنہا بھیانک موت کے لئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک تانگا گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے۔ یہ پہیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا۔ سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیا سلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔ بس اب سگرٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اُٹھوں۔

(نیرنگِ خیال)

دوست کے نام

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنونِ لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہو ئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی — واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہلِ جنون ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوقِ صحیح رکھتے ہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا شغف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہو گی۔ ورنہ تن تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ۔ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں راز داں کو میں،

لیکن اے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی

اخبار کے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصنوعی اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر رومااور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی "سنوں چشم بدور" میں آپ دین کے منہ مسجدیں واعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو ولعب اور تفریح کوشی پر نفرین نہیں کی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتوےٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گھاگس مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

بیانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا ضیافت کے موقعے پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہمعصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعوےٰ دار ہے آپ کی آناد منشی کا مضحکہ نہیں اڑایا؟ اور جب آپ بیٹھے ہوتے نظر آئے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوتے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر بیزاری، وریدملی پک رہی ہوگی اور آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہوگی ورنہ جس حسنِ مذاق پر آپ کو غرہ ہے وہ تو آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرف بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر نیہوڑائے بیٹھا ہے اور باہر بڑا بڑا مینہ برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائدِ اعظم یہاں تشریف لائے ـــــ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ "روز گارڈن" کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا اس روز گارڈن" کا نام "گلستانِ فاطمہ" رکھا گیا اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کریہہ اور طفلانہ تھی۔ کہ مدرسہ کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لکھتے ہوئے شرم آتی۔ "گلستانِ فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت

نہ وہ غریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سلسلے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ نہ پتلون پوش ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے۔ جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں لیکن جب ان جلووں کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے۔ کیونکہ ایسے شاندار موقع کے لئے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار رہی ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتب قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہوگا پنجاب کا خطہ، وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے۔ جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بدمذاقی کا عروج نظر آتا اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفاشعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس انجمن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پہ پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیونکر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباؤاجداد خطاو دائرے اور خم اور زاویے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوئی اور

طغرے، نستعلیق اور نسخ، کس کس نہج سے انہوں نے ابجد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے مطلّا اور مذہب نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں ان کی مسجدوں اور خانقاہوں ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ و ماز یست کا کوئی مقام، سطوت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و قرطاس و سنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے کلچر کے احیا اور تحفظ کے لئے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں، قسمیں کھالو کہ اس ورثہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کر لو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابجد کے خط کھینچیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جواب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہیں ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے۔

اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی لیکن کیا آگے بھی بڑھے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی چھیڑے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اے دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیئے گا کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹکی چٹکی بھر پھینک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک یورپین خاتون میسر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں وہ کہیں اِدھر اُدھر ہو گئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدانخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آ جائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو تہ کر کے رکھ دی گئی ہے کیونکہ کس کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہلوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جانداروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑ دریا، جنگل پر کی جائے۔ اس پہ ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویر میں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہوبہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹوگرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جواب ملا کہ چابکدستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق وراستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر جانے آنے میں تصویر کھینچتا ہے یہ حال تو جاندار اشیاء کا ہے باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کوتوالِ حق بین مصوروں کے "جھوٹ" کو گردن سے

جادو بوچے گا۔ اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیں گے کہ یہ تو دین گوگ ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے جینے کا امکان بہت کم ہے کوئی بات "پرسیح،، بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ درخت تک تو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے، ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تسمہ یا ڈوری بیٹے کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے سازوسامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ دے کے یہی ایک ہمارا مصور ہے۔ اسے دفن کر دیا تو یہ وبا فوراً ختم ہو جائے گی اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہی مغلوں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کونسا الیسا جزیرہ ہے اور کونسے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ اردگرد کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے۔ لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے لٹھ چھین کر اس کی جگہ قلم اور مُوقلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ہیجان پیدا کیجئے۔ آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر اُٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر لیتے ہیں۔ آپ کہئے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجئے تو

تلاشی شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے دُرّے لگائیں؟ کسے سنگسار کریں؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سرِ بازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں اور بچیوں پر اپنا بہیمانہ زور آزماتے ہیں ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپتا ہے؟ آرٹ کے لئے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں یا پھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و سخن، نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے میں بھی پنپتا ہے؟ کہ ہر بڑے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر ہمسائے اور راہگیر سے لینے پر تُلا ہوا ہو، نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا فنکار معتکف ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لئے تصویریں بناتا رہے، نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریبِ شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اسے بک لینے دیں۔ فنونِ لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو۔ کہ چند تصویروں کو مخربِ اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے۔ چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دیئے جائیں جو ان کے ہنر کو کھُردری کسوٹیوں پہ پرکھیں اور ان پہ واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوےٰ تھا اس کا دور اب

گزر گیا ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جانداروں کی تصویر پہ اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو حسن کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب، چھوٹے بڑے، ادنےٰ اعلےٰ سب پر اپنی بخششیں ارزانی فرماتے ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس عہدِ زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے: تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں، کسان کے تہمد میں۔ سیلانی کے ہاتھ کی چھڑی میں، پنہاری کے مٹی کے گھڑوں میں، غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں ٹمٹما رہی ہیں انہیں ہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لئے انہیں اس بیگانۂ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

فرخندہ شبے کہ در پہلوئے آں صد غم نیست
روزِ مولودِ جہاں کم زِ شبِ ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی تو پھر اے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہو گا۔ آپ کے اخلاص اور اصابت رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہو گی۔

بڑے بڑے ارباب حل وعقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہتے کہ

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

(نقوش جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے۔ جن کی ظاہراً تو کئی قسمیں ہیں۔ کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے، بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ میں نے حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں۔ کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا، میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں شعر پڑھے ہیں۔ ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو یا جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے۔

رستا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لئے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پہ عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری فرمائیے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بےکاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجئے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بےکار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجئے لڑھکا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے "ماما یا باپا" کے جوش میں آ کر برخوردار کو ایک عدد ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پہ ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں، بدقسمت ہیں تو وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پہ مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پہ ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا شر ذرا باریک ہے۔ آپ انگلیاں چٹخوا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر کانوں میں روئی دے کر لحاف

میں سو لپیٹ کر سو جیئے، ایک لمحے کے اندر آپ کو جگا کے اٹھا کے بٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔

انہی مرزا صاحب کے گھر پر جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔ اب آپ ہی بتلایئے میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا مرزا صاحب سے کہوں حضرت! آپ کی ان تغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے نہ دن کو کام کر سکتا ہوں۔ نہ رات کو سو سکتا ہوں۔ لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کمرے میں آ جاتا ہے اور مرزا صاحب ایک "الا تبسم سے کہتے ہیں "اختر بیٹا! ان کو سلام کرو۔ سلام کرو بیٹا۔ اس کا نام اختر ہے صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے کبھی ضد نہیں کرتا، کبھی نہیں روتا، کبھی ماں کو دق نہیں کرتا،" میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ وہی نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کے روتا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور شور میں کچھ نہیں سنتے، بدبختی ہماری ہوتی ہے لیکن کہتا یہی ہوں کہ "یہاں آؤ بیٹا"، گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ بھی چومتا ہوں۔

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقر عید کو تھوڑا سا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا۔ تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی! (کیونکہ ایسے موقعہ پر ضد کار آمد ہوا کرتی تھی) لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں۔ ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی کے سرہانے میز پر جو انگور رکھا ہے اس کے چند دانے کھا لئے۔ مہینے دو مہینے کے بعد کو ملے پر غسل کر لیا۔ گا ہے گا ہے ناخن ترشوا لئے۔

مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ شباب کا رنگین زمانہ امتحانوں میں جوابات لکھتے لکھتے گزر گیا اور اب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گزر جائیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا۔ یقین تھا اس کے بعد یا مرض نہ رہے گا یا ہم نہ رہیں گے۔ سو مرض تو بدستور باقی ہے اور ہم —— ہر چند کہیں کہ ہیں —— نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا۔ نرم نرم گدیلوں پہ گزرا گویا بستر عیش پہ دراز تھا۔ اب تو صاحبِ فراش ہوں۔ اب عیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ انگور کھا لیا۔ غسل کر لیا۔ ناخن ترشوا لئے۔

تمام تگ و دو لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کمین گاہ معلوم ہوتا ہے ——

کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں سلام ہندوستانی کھینچ ماریں گے۔

ہال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ حال ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا ہوں کہ یہ "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" والا معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پر طاری ہو جاتا ہے جانتا ہوں کہ کرسی صدارت کی سولی پر چڑھنا ہوگا اور سولی بھی ایسی کہ انا الحق کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پہ بٹھا دیا اور میری حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے ارد گرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کینچن جنگا کی طرح اپنی بلندی پہ جما بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی مجھ پہ اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تہمد پوش، تولیہ بردار، صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک بجے تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ گنے چوس چوس کر جا بجا پھوگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آثار صنادید کا سا حلیہ اختیار کر لیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کرسی اور سٹول میسر آگیا وہیں کھانا منگوا لے گا اور کھانا کھا چکنے پہ گٹھلیوں اور چھلیوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا کہ دنیا میں نام برقرار رہے۔

اب یہ حال ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اگر اس چھٹی کے دن بال نہ کٹوائے تو پھر بات گرمی کی تعطیلات پہ جا پڑے گی۔ مرزا صاحب سے اپنی کتاب واپس نہ لایا تو وہ بلا تکلف ہضم کر جائیں گے۔ مچھلی کے شکار کو نہ گیا تو پھر عمر بھر زندہ مچھلی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

اب تو دلچسپی کے لئے صرف یہ باتیں رہ گئی ہیں کہ خود تقدیر کی حاضری لگانے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دروازے کے پاس جو نوجوان سیاہ ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور اس دروازے کے پاس جو نوجوان سفید پگڑی پہنے بیٹھے ہیں۔ حاضری ختم ہونے تک یہ دونوں جادو کی کرامات سے

غائب ہو جائیں گے اور پھر ان میں سے ایک صاحب تو ہال میں نمودار ہوں گے اور دوسرے بھگت کی دکان میں دودھ پیتے دکھائی دیں گے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی نظر بندی کا کھیل کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یا صاحبِ کمال کے کرتب کا تماشا کرتا ہوں جو عین لیکچر کے دوران میں کھانستا کھانستا یک لخت اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح دروازے تک چل کر وہاں سے پھر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر معشوق سراغ نہیں ملتا۔ یا ان اہلِ فن کی داد دیتا ہوں جو روزانہ دیر سے آتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی حاضری لگوا لیتے ہیں کہ صاحب غریب خانہ بہت دور ہے جانتا ہوں کہ دولت خانہ ہوسٹل کی پہلی منزل پہ ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پہ یقین انہیں بھلا کیسے آئے گا اور کبھی ایک دو منٹ کو فرصت نصیب ہو تو دل بہلانے کے لئے یہ سوال کافی ہے کہ ہال کی گھڑی مینار کی گھڑی سے تین منٹ پیچھے ہے۔ دفتر کی گھڑی ہال کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے۔ چپڑاسی نے صبح دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی ہال کی گھڑی سے نو منٹ پہلے تو مرکب سود کے قاعدے سے حساب لگا کر بتاؤ کہ کس کا سر پھوڑا جائے۔

وہی میں نے کہا ناکہ انگور کھالیا، غسل کر لیا، ناخن ترشوا لئے ؎

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی   اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

"پطرس"

(راوی ۱۹۲۹ء)

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلا دھار برس رہا ہے۔ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ درخت اور پودے ایک دُھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آ رہے ہیں پھول اور پرندے۔ نغمہ اور نکہت۔ رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر دل میں اُمنگیں اُٹھ سکتی ہیں۔ مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے ہل ہل کے لپٹتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ پرندے کھیتوں میں چُھپ چُھپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دنیا سے کوئی پیغام آیا لیکن وہ تڑپ تڑپ کے تڑپاتی ہے اور میں ترس ترس کے تڑپتا ہوں۔ اس کو کہہ کہ اپنا ایک نقرئی تیر میرے سینے تک

پہنچا دے اور اس کو میری حسرتوں میں بچھا کر تجھ تک لے جائے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی امید! کیا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نالے بہہ رہے ہیں۔ میری ضعیف التجا کے درد کو سن سکتی ہے؟

پرندے چہچہاتے ہیں۔ میں چپ بیٹھا ہوا سنتا ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے۔ ان کو کہہ کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گانے دیں کہ میرے نغمے کی نکہت تیرے بالوں کی طرح کائنات کے دل میں بکھر جائے۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قدرت نے ایک آبگینہ کے ٹکڑے پھینک دیئے تھے۔ میرے دل میں خراش ہو رہے ہیں۔ اس بلبل کو بھیج دے کہ آکے سن جائے اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مقصود انتظار! تو بارش کے اس پار آجا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے تیری راہ تک رہی ہیں اس پار آجا پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک دردانگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم بن جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اپریل ۱۹۲۰ء)

تنزّل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا؟ جس تیزروی سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل ودماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمع نظر اور میرا دائرۂ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے مامون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا۔ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرنے نہیں پائے گا۔ جب میرے حیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام وسکون میرے لئے ناممکنات

میں سے ہیں۔۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔

چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک —— صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

آئینہ دل

بچپن کے جذبات گویا ساحل دریا پہ چھوٹی چھوٹی ہلکی ہلکی سی لہریں ہیں جہاں ننھے ننھے ننگے پاؤں سیپیوں کی تلاش میں ریت کی باریک اور نفیس سلوٹوں کو ایک معصوم بے پروائی سے مسل دیتے ہیں جہاں کا طوفان قہقہوں اور پانی کے چھینٹوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا ایک خوش نما نازک بربط جس کو اب تک کسی انسانی ہاتھ نے نہیں چھوا، اور جو ایک درخت کے سایے کے نیچے تنہا پڑا ہے۔ جس کا زیر و بم لاابالیانہ تاروں اور پردوں میں کہیں بکھرا پڑا ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کو کبھی کبھی گدگدا دیتے ہیں اور اس میں سے ایک خندۂ آزاد، ایک بے ترتیب سا نغمہ یوں بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی بادرفتار پری کے پازیب کی جھنکار۔

اٹھتی جوانی کا عالم مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں کے تلاطم پر سطحی سکون بے خبر سا مسکرا رہا ہے جس کے اعماق کی تاریکیوں میں لہریں اٹھتی ہیں اور سطح کو چھیڑ کر واپس ڈوب جاتی ہیں۔ جہاں ایک تلاطم پنہاں ہے اور ایک محشر فرمائی۔

جیسے بربط ایک ہنرمند مغنی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر ایک تار ایک شدید انتظار سے کسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نغمے اپنی ہنسی روکے ہوئے منتظر کھڑے ہیں اور مضراب کو نافہم نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت کی حالت نہ پوچھو جب عشق کا بلاخیز طوفان روسے دریا اور فعہ د۔ پاکو ایک

کر دیتا ہے۔ جب عزقابی کی ہر کشتی اور ہر تیراک کو پستی سے بلندی اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کرلے جاتی ہے جیسے قہر خداوندی، جہاں ہر ایک بھنور طاقت ور سے طاقت ور انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے جیسے قسمت کی مجبوری۔

بربط ہستی کے تار تار میں تھرتھراہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دل خراش نغمے بگولوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں اور اپنی سر چکرا دینے والی تیزی میں زیر دبم کو تنکوں کی طرح لپیٹے لئے جاتے ہیں۔ ہوش وحواس سروں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں اور ایک دل چیرنے والے سرود ایک نشیلے شور کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ اگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوش مستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں تک نکل کر ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے۔ بے رحم زمین قطرہ قطرہ کرکے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان بے بس ہو جاتا ہے پھر اس کی روانی لنگ رہ جاتی ہے اور آخر کار اس کا پانی سوکھ جاتا ہے پھر وہاں موجۂ ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بحر جب بحر نہیں رہتا تو بیاباں ہو جاتا ہے اور ایک ویران، سنسان، ایک بھیانک وحشت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گیت کی دردناک لے جب تاروں میں ایک بے قراری ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سُر اپنی جان سے بیزار ہو کر بے محابانہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جانِ نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں شکستگی نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پھر وہ بربط، بربط نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش نوحہ ماتم ہو جاتا ہے " یہ ہے عشق کی نامرادی "

(مخزن۔ نومبر دسمبر ۱۹۲۱ء)

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچہ بچہ ان کی دیانتداری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے سچے اور بات کے پکے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپیہ تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپیہ دے کر بھیجتے، انہوں نے نوکر کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

"میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو، ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ آکے ہم کو یا ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس لائے گا۔ ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد۔

دکاندار نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کا دستخط دیکھا۔ تو اسے اطمینان ہوا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مکرنے والے آدمی نہیں اور پھر لاکھوں کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے؟ جب چاہوں گا، رقعہ جا کر دے دوں گا اور روپیہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکاندار کے پاس عبداللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا میاں کریم خاں!

میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔"

کریم خاں نے کہا: "ابھی لو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں یہ دیکھو، ان کا رقعہ ذرا ٹھہر جاؤ، تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی کہنے لگا: "تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیئے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا: "یونہی سہی" چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اسی رقعے کو بیس روپے کی بجائے لے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور وہاں سے بیس روپے وصول کر لوں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ منشی کو دیا۔ منشی نے بیس روپے گن گن کر دیئے۔ اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دیئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا اتنا پکا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر یسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کردیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا۔ ان کا کیا پتہ آدمی نیک اور شریف اور دیانتدار سہی، لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگتے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل یہی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پہ اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عندالمطالبہ حامل ہذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کردوں گا۔" اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔"

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تامل قبول کر لیتا ہے اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جاکر اس کے روپے جھنڈ سکتے ہیں۔

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پہ ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہیئے کہ آسانی سے پاس رکھا جاسکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی

ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں ۸۰ اسی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔

نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو۔ اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں، یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ، اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوا دے۔

بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلوا سکتا ہے کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو۔ عبداللہ نے بنک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے۔ وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے۔ چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں:-

بنام فلاں بنک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا۔ اسی کو روپے

ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بنک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ بس جب یہ چک لے جاؤں گا مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چک لے کے عبداللہ کے بنک میں گیا اور کہا کہ مجھے اس چک کا روپیہ ادا کر دو۔ بنک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہے گا۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں۔ بنک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں۔ مگر چلو فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی چک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقعہ پیش آتا ہے، کہ بنک چک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بنک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چک لے کر وہ خود عبداللہ کے بنک میں جائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بنک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چک بھی بھجوا دے۔ اس کے بنک والے خود ہی عبداللہ کے بنک سے اس چک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی آمد میں چڑھا دی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بنک میں محفوظ پڑا رہا۔ نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بنک

جانا پڑا۔ وہ روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہوگیا۔ یہ سب کچھ ایک چک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف "کاغذی روپے" کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چک۔ ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بچوں کے لئے) (خیابانِ اُردو)

رونا رُلانا

ایک امریکن ادبی نقاد ایک مقام پر لکھتا ہے کہ مرد ایک ہنسوڑا جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر رونی شکل بنائے رہتا ہے۔

مصنف کی خوش طبعی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کلی اتفاق بھی نہ ہو۔ لیکن سوال موضوع ایسا ہے۔ جس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں۔ گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ ایک ہی موت کی خبر کے لئے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں۔ ایسی خبر جب بھی نئے سرے سے سنانا شروع کرتی ہیں ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سہیلی کے سسرال کا واقعہ ہو، گلی میں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچے والے کا بچہ بیمار ہو، کوئی اڑتی اڑاتی خبر ہو، کوئی افواہ ہو، غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے۔

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس بارے میں سبھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں ہمیشہ نچلے طبقہ کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے غم نگار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا ہر صفحہ غم والم کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک پھول سے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور بھی رقت دلانی ہو تو اسے سید بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگتا ہوا دکھا دیتے ہیں کہ "میری بوڑھی ماں مر رہی ہے۔ دوا کے لئے پیسے نہیں۔ خدا کے نام کا کچھ دیتے جاؤ۔" کبھی کسی سنگھڑ خوبصورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا یا کسی بدقماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور یوں دل کی بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والی ہیں کہ زارو قطار رو رہی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں لپٹی ہوئی اور آنسوؤں میں نتھری ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں، اکثر میں نزع، بیماری، دق، سل، خودکشی، زہر، ظلم و تشدد ایک نہ ایک چیز کا سلسلہ باندھ دینا گویا فرض جانا۔ ہاں کوئی کروشیا کھانا پکانے کی کتاب ہو تو اور بات ہے۔

آخر یہ مصیبت کیا ہے؟ یہ بات بات پر صف ماتم بچھ جانا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس امریکن نقاد نے کیا غلط کہا؟ جل کے کہا سہی لیکن بڑی بات کیا کہی؟

کسی گھر میں موت واقع ہو جائے تو زنانے اور مردانے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف

دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچا کئے چپ چاپ آنکھیں کچھ سُرخ ہیں کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں یا کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر تھکن اور اداسی سی ہے اور قدم ذرا آہستہ آہستہ اُٹھتے ہیں اور زنانے کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے اور جب کوئی نئی فلاں بی بی ڈولی سے اتکر اندر جاتی ہے تو ماتم کی بھنبھناہٹ میں از سرنو ایک لہر اٹھتی ہے۔ جیسے یک لخت کوئی ہوائی جہاز پر سے گر پڑے۔ مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے ہاں مہینہ بھر کو ایک کلب قائم ہو جاتی ہے۔ گلوریوں پر گلوریاں کھائی جاتی ہیں اور چیخوں پر چیخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پرسی کو جاتی ہیں تو بیمار میں وہ وہ بیماریاں نکال کے آتی ہیں جو ڈاکٹر کے وہم وگمان میں نہ تھیں جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں۔ بیمار کی ہر کروٹ پر ہاتھ ملتی ہیں۔ بے چارہ کہیں گلا صاف کرنے کو بھی کھانسے تو یہ سورۂ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر چاروناچار منحنی آواز میں بولنا پڑتا ہے۔ جوں جوں بیمار پرس عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ موت قریب آتی جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں مزے لے لے کے روتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اشک باری کے لئے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں ایک پُرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ہماری گھر والی بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ کہ کوئی پڑوسن آکے کہہ دے اکہ لے بوا! ماشاءاللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے۔ تو جھنجلا کر بول اٹھتی ہیں کہ تیرے دیدوں میں خاک۔ میں تو مری جاتی ہوں اور میرا برا چاہنے والوں کو ابھی میں ہٹی کٹی نظر آتی ہوں اور کوئی آکے کہہ دے کہ اے ہے بیٹی تجھے کیا ہوگیا تُو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً خالہ کا لقب مل جاتا

تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سنائے جاتے تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں۔ جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے۔ لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر داد لیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غمگین یا مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے۔ جو خدا مجھے نصیب نہ کرے کسی کا غم ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ، ضبط، تحمل، اور خندہ پیشانی سے دور ہو سکتا ہے۔ کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہذب شخص کی یہی پہچان ہے اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی ہنسو اور اوروں کو بھی ہنساؤ دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو، ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔ غم نگار مصنفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص امول ہے جو اپنی تحریر سے ہزار ہا لوگوں کو خوش کو دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا جو اپنے زورِ قلم سے ہزارہا جوان، معصوم، خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رُلاتا ہے اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور ہزار قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی انشا پردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیب نسواں)

نوعِ انسان کی کہانی

دُنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔

ہم کون ہیں ؟

ہم کہاں سے آئے ہیں ؟

ہم کہاں جارہے ہیں ؟

ان سوالات کا جواب افق سے بھی پرے کہیں دور ہمارا انتظار کر رہا ہے اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں، تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اس باب میں، میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ ظہورِ انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کرۂ زمین پر جان دار اشیاء کا وجود کتنے عرصہ سے ممکن ہے اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ یہ ظاہر

کرتی ہے کہ انسان یا انسان کے طرح کی مخلوق یہاں کتنے عرصے سے رہتی ہے۔

انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کرہ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ یا لاوے کا ایک بہت بڑا گولہ تھا جو فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک ہلکی سی تہ نمودار ہوئی ان بنجر چٹانوں پر موسلا دھار مینہ برسا سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان چھپی ہوئی تھیں۔

آخر ایک ایسا زمانہ آیا جب سورج نے بادلوں میں سے اپنا چہرہ نکالا اور دیکھا کہ اس ننھے سے کرے کی سطح پر پانی کے چند تالاب سے بن گئے ہیں۔ یہی تالاب بعد میں مشرقی اور مغربی نصف کروں کے عظیم الشان سمندر بن گئے۔

پھر ایک دن ایک حیرت انگیز معجزہ ظہور میں آیا بے جان دنیا نے جاندار چیزوں کو جنم دیا۔

پہلا جاندار ذرّہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا۔

کئی سال تک یہ ذرّہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ اس عرصے میں رفتہ رفتہ زمین کے ناموافق حالات سے مانوس ہوتا گیا اور بالآخر زندگی کی مشکلات پر قابو پا لیا بعض ذرّے ایسے بھی تھے جو جھیلوں اور جوہڑوں کی تاریک گہرائیوں ہی میں خوش رہتے تھے۔ بہت سی مٹی اور کیچڑ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے بہہ کر نیچے آگئی تھی اس میں جڑیں پکڑ لیں اور پودے بن گئے بعض نے کسی جگہ ٹھہرنا پسند نہ کیا یونہی ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان کے جسم میں بنے بچھوؤں کی سی عجیب و غریب جوڑ دار ٹانگیں نمودار ہوئیں اور وہ سمندر کی تہ میں پودوں اور ان سبزی

۔ل لوتھڑوں کے درمیان جو جیلی مچھلیوں سے مشابہ تھے۔ رینگنے لگے بعض چھلکوں والے ذرّے ایسے بھی تھے جنہیں خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر تیرنا پڑا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ رفتہ کروڑوں مچھلیوں سے آباد ہوگیا۔

اس عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں رہنے کے لئے نئی نئی جگہیں تلاش کرنی پڑیں۔ طوعاً وکرہاً پانی کو الوداع کہا اور پہاڑوں کے دامن میں کیچڑ اور دلدلوں کے اندر سکونت اختیار کر لی۔ دن میں دو دفعہ جوار بھاٹے کی وجہ سے نمکین سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتے لیکن تمام وقت بڑی بے چینی سے کاٹتے اور رقیق ہوا میں جو زمین کی سطح کو لپیٹی ہوتی تھی۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے۔ کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل ہوئے کہ جس طرح پہلے پانی میں رہتے تھے ایسی آسانی کے ساتھ اب ہوا میں رہنے لگے۔ بڑے ہوئے تو جھاڑیاں اور درخت بنے اور آخر کار خوب صورت پھول پیدا کرنا سیکھا جب پھول اُگے تو بھونرے آکر رس چوسنے لگے۔ پرندے دور دور تک بیج اڑا کر لے گئے۔ یہاں تک کہ سب زمین پر سبزے نے اپنی چادر بچھادی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے سائبان پھیلا دیئے۔

بعض مچھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا اور گلپھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں سے سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو خاکابی کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری دونوں جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی مینڈک سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ خاکابی جانور کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہو رہے۔ بعض نے رینگنا سیکھا اور سنسان جنگلوں میں کیڑے مکوڑوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نرم نرم زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہوگئیں۔ ساتھ ہی جسامت بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے جانوروں سے آباد ہوگئی۔ علم حیوانات کی کتابوں میں

اکتھیا ئسورس (ICHTHYOSAURUS) میگلاسورس (MEGALOSAURUS) اور برانتوسورس (BRANTOSAURUS) نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور ہاتھیوں سے اس طرح کھیل سکتے تھے جس طرح بلی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے۔

ان رینگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے لگے (درخت ان دنوں سو فٹ سے زیادہ اونچے نہ تھے) چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تو ٹانگوں کی بھی ضرورت نہ رہی۔ لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھرتی سے حرکت کرنے کے لئے اپنی جلد کی جھلی سی بنائی اور اسے اگلے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان اس ٹانگ سے اس ٹانگ تک پتنگ کی طرح پھیلا لیا۔ پھر اس جھلی پر پَر اگ آئے۔ دم سے مڑنے تڑنے کا کام لیا۔ ڈال ڈال اڑنے لگے اور سچ مچ کے پرندے بن گئے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بڑے عظیم الجثہ رینگنے والے جانور سب کے سب مر گئے اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ شاید آب و ہوا ایک لخت تبدیل ہو گئی۔ یا شاید بھوک کے مارے مر گئے کیونکہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہو گئے ہوں کہ نہ تیرنے کے قابل رہے ہوں نہ چلنے کے نہ رینگنے کے اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے دکھائی دے رہے ہوں لیکن وہ ان تک پہنچ نہ سکتے ہوں۔ لیکن وہ ان تک پہنچ نہ سکتے ہوں بہر حال بڑے بڑے رینگنے والے جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پر مسلط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے۔

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف جانوروں نے لے لی۔ یہ اولاد تو انہی رینگنے والے جانوروں کی تھی لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا کہ اپنے بچوں کو چھاتیوں کا دودھ پلاتے تھے اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں۔ مچھلیوں کے سے پَر ان کے جھڑ چلے تھے۔ پرندوں کے سے پَر اختیار نہ کئے۔ ان کی بجائے بال اُگ آئے۔ ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادات سیکھ لیں جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل

ہوگئی۔ جب تک بچے پیدا نہ ہو جاتے۔ مادہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے اٹھائے پھرتی
باقی سب جانور تو اپنے بچوں کو گرمی اور سردی کے رحم پر چھوڑ دیتے لیکن دودھ پلانے والے
جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے اور جب تک وہ طاقت ور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ
کرنے کے قابل نہ ہو جائیں خود ان کی حفاظت کرتے اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں
کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے اور زیادہ آسانی سے زندہ رہ سکتے۔ کسی بلی کو دیکھو
کس طرح بچوں کو اپنی حفاظت کرنا اور منہ دھونا اور چوہے پکڑنا سکھاتی ہے۔

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ بتانے کی ضرورت
نہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے اردگرد ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بازار میں اور
گھر پر وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور جو اتنے عام نہیں انہیں تم چڑیا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو۔

ان بے شمار بے زبان جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے الگ اپنے لئے
ایک رستہ نکالا۔ عقل و شعور سے کام لیا اور اس کی بدولت زندگی کی کشمکش میں اپنی نسل کی
رہنمائی کی۔ یہ جانور "انسان" کہلایا۔

تھا تو یہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک مہیا کرنے اور جان بچانے میں سب
سے ہوشیار تھا۔ پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی۔ ہوتے ہوتے پنجے کی شکل
ہاتھ کی سی بن گئی۔ پھر لمبی انتھک کوششوں کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا (یہ کرتب
اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے پھر بھی بچے کو یہ
از سر نو سیکھنا پڑتا ہے)

یہ جانور دیکھنے میں کچھ بندر اور کچھ بن مانس سے ملتا جلتا تھا لیکن ذہانت میں دونوں سے
بڑھ کر تھا۔ شکار میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ لیتا تھا۔ ایک
مقام سے دوسرے مقام تک جاتا تو حفاظت کی خاطر ہم جنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا۔
بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ کئی لاکھ سال بعد

انہی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا۔

تمہیں یقین تو مشکل سے آئے گا کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہو گا

میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے۔ کہ جس طرح قدیم مصر کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے آئیس اور نیفینس کا دامن پکڑتے تھے، اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے۔

طنز اور رحم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری مشکل کشا نہیں ہو سکی۔ طنز سے زندگی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بناتا ہے۔

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ وہ محبت اور حسن کا مضحکہ نہیں اڑاتا وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمنوں کو بھی دوست بنالیتا ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پہ ہنسو، ان سے نفرت مت کرو۔ کیوں کہ یہ کمزوری کی نشانی ہے"

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانش مندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

ماخوذ از کتاب "نوع انسان کی کہانی"، مصنف ہنڈرک فان لون

مترجمہ پطرس

بچّے کا پہلا سال

ایک زمانہ ایسا تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے۔ جب تک بچہ کم از کم بولنا شروع نہ کرتا۔ اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ فطرتاً ہی بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ مر جاتے اور جو زندہ رہتے ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی مامتا اور بچے کے لاڈلے پن کا جو دلاویز تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اندھا دھند محبت اور لاڈ پیار اور چیز ہیں۔ اصل محبت اور چیز ہے جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت ہے وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضرر رساں قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو (روسو کی مانند) اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں

نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہوگی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے۔ جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے اور ان پر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کما حقہ، خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پر بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موقعہ پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں۔ تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آسکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے اور بعض بچے تو مر ہی اسی لئے جاتے [illegible] تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش بچہ فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور وہ چوسنے کی خواہش ہے جب تک بچہ اس عمل میں مصروف ہے بہت خوش رہتا ہے۔ باقی تمام وقت وہ ایک تحیر کے عالم میں گزارتا ہے جس سے یوں نجات حاصل ہوتی ہے کہ دن اور رات کا بیشتر حصہ نیند میں گذر جاتا ہے۔ پندرہ دن کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے اور بعض باتیں (مثلاً دودھ پینا وغیرہ) تواتر کے ساتھ ظہور میں آنے لگتی ہیں اس لئے بچہ ان باتوں کا متوقع رہتا ہے۔

یعنی یوں کہئے کہ اب وہ بعض چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہوا نہیں کو پسند کرتا ہے۔ گویا قدامت پسند بن جاتا ہے اور قدامت پسند بھی ایسا کہ اغلباً پھر عمر بھر ایسا نہیں ہوتا ہر نئی چیز اسے ناپسند ہوتی ہے اگر بچہ اس عمر میں بولنے کے قابل ہوتا تو بڑے بوڑھوں کی طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا کہ میاں جانے دو اس عمر میں اب ہم بھلا نئی نئی باتیں کیوں کر سیکھ سکتے ہیں۔ تاہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھ لیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے علاوہ بر آں شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اعمال پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں یہ پختگی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانہ طفلی کی عادات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ ہوں۔ اور جو اپنے گرد و پیش سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہو سکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں۔ جو چیز ایک کے لئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں [illegible] سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے۔ وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تومند تو ہو اس کے اخلاق برے ہوں۔ یا نیک سیرت تو ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار رہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ ماں جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہیئے اس سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا

ہم اسے سمجھتے ہیں اسے ایک دفعہ یقین ہو جاتے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ مزید روتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر اسی عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت رونی صورت بنا کر لوگوں سے گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے پچکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کا یہ سلوک اسے از حد ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبہ سے معرا سمجھ لیتا ہے اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر خدا اسے حسین بنا دے تو بے جا توجہات اور بے جا خاطر مدارات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند لڑکوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی پرورش شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذی اقتدار ہے تو ضدی اور حریص ہوتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی مفروضہ بے توجہی سے کبیدہ خاطر رہتا ہے اس لئے اخلاقی تعلیم روز اول ہی سے شروع کر دینی چاہیئے تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں۔ نہ بعد میں انہیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات کو ٹھکرانے سے اس کے دل میں غصہ اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہیئے کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں سے بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل ہی بے توجہی برتی جائے مثلاً جو بات صحت کے لئے ضروری ہے اس میں کوتاہی نہ کرنی چاہیئے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو اسے اٹھا لینا چاہیئے۔ تاکہ اسے سردی نہ لگے اور وہ بھیگ نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی تکلیف کے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہیئے ورنہ وہ بے جا ضد مت کرانے کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور اہتمام کرنا فضول بلکہ مضر ہے جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہیئے اور ضرورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔ بچوں کی پرورش چاؤ چونچلوں سے نہیں بلکہ متانت اور سنجیدگی سے کرنی چاہیئے۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ان کی عادات کے درست ہونے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ مدعا یہ کہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے۔ ورنہ بعد میں اسے سخت مایوسی کا سامنا ہوگا اور یوں دیکھئے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کو غفلت اور لاڈ کے بیچ بیچ رہنا پڑتا ہے۔ بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ الفت ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے ان کے نزدیک اولاد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرنے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور بڑے ہو کر لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد و آمد نہیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خندہ پیشانی اور بظاہر بے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا۔ ان کے اعضاء کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔ کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے۔ فطری حرکات پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ان کے سامنے گانے گاتے پھرتے تھے اور انہیں چوبیس گھنٹے چوما چاٹی کا تختۂ مشق بنائے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا۔ اس سے بچے بگڑ جاتے تھے اور ہر وقت ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ صحیح

اصول یہ ہے کہ نہ بچے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ بچے کے لئے آپ جو تکلیف اُٹھاتے ہیں اس سے بچے کو بے خبر رہنا چاہئے خدمت کرانے کا چسکا اسے نہ پڑنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو ایسی کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے بچے کو خارجی قواعد و ضوابط کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود بچے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے اور اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے مثلاً جب بچے کو سلانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہیئے، بازوؤں میں تھام کر "سوجا سوجا" نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہیئے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے۔ تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصہ میں بچہ کا سلانا ایک مصیبت بن جائے گا۔ بچے کو اوڑھا لپٹا کر بستر میں سلا دینا چاہیئے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیئے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بخود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر دیکھئے تو مزے کی نیند سو رہا ہوگا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جائے گی۔ دوسرے وہ سوئے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے پیٹ سے کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا اس کی عادات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیاء کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیاء کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اشیاء کو پہچانے اور اشیاء کو پہچاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیا کا بار بار تجربہ ہو۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد بچہ پنگوڑے کے مس اماں کی چھاتی یا دودھ کی بوتل کے مس اور خوشبو اور ماں یا اتا کی آواز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ماں یا پنگوڑے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ وہ اشیاء کی

شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف احساسات کے اختلاف سے بچے کے ذہن میں عادات وضع ہو جاتی ہیں تو مس اور بو اور نظر کی بدولت ذہن میں اشیاء کے تصورات شکل پذیر ہونے لگتے ہیں۔ خاص خاص احساسات اس کے دل میں خاص خاص اشیاء کی توقعات پیدا کرتے ہیں (دودھ کی بو آتی ہے تو چھاتی یا بوتل کے مس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ماں کی آواز آتی ہے تو ماں کی شکل دیکھنے کا منتظر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم کچھ عرصے تک اشخاص اور اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا جس بچے کو کبھی بوتل کا دودھ اور کبھی چھاتی کا دودھ پلایا جائے۔ اس کے نزدیک کچھ عرصے تک ماں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اس تمام عرصے کے دوران میں تعلیم کا ذریعہ محض جسمانی ہونا چاہیئے۔ بچے کی تمام مسرتیں (جو زیادہ تر گرماہٹ اور خوراک تک محدود ہوتی ہیں) اور اس کے تمام دکھ محض جسمانی ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور اس کی عادات یوں شکل پذیر ہوتی ہیں کہ جو چیز اس کے ذہن میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونا ایک حد تک تو ایک اضطراری حرکت ہے جو دکھ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اور ایک حد تک ایک ارادی فعل ہے جو بچہ مسرت حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس دکھ کو دور کیا جاتا ہے (جیسا کہ کیا جاتا ہے) تو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ رونے کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ بچے کو یہ عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ دور کرانے کے لئے روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس حربے کو کام میں لاتا ہے یہ اس کی ذہانت کی پہلی فتح ہوتی ہے۔ لیکن باوجود بے انتہا کوشش کے جب تک اسے دکھ نہ پہنچ رہا ہو وہ ویسا نہیں رو سکتا جیسا دکھ کے وقت روتا ہے۔ ہوشیار ماں اس قسم کے رونے اور اس قسم کے رونے میں بخوبی تمیز کر سکتی ہے۔ عقلمندی یہی ہے کہ جب بچہ کا رونا دکھ کا رونا ہو تو اس پر بالکل توجہ نہ کی جائے۔ بچے کو لئے لئے پھرنا اور اس سے کھیلتے رہنا یا اس کے سامنے گانے گانا آسان بھی ہے اور پُر لطف بھی۔ لیکن بہت

جلد بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شیر خوار بچے کا بیشتر وقت (سوائے دودھ پینے کے اوقات کے) نیند میں گذرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں سخت معلوم ہوں لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو تو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہیئے لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا کرے ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ شروع ہی سے اسے اس بات کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے اور اپنے اعصاب کو کام میں لا سکے۔ پرانے زمانے کے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے۔ ان کی نگہداشت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کی مامتا بھی ان کی سستی پر غالب نہ آ سکتی تھی۔ جب بچے کی نظر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تو وہ متحرک چیزوں کو خصوصاً جو ہوا سے ہل رہی ہوں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیا کو پکڑنا نہ سیکھ لے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے جب پکڑنا سیکھ لے۔ تو یہ دائرہ یک لخت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اس میں مشغول رہتا ہے جھنجھنے کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ جھنجھنے کے زمانے سے ذرا پہلے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پر قابو حاصل کرتا ہے۔ شروع شروع میں پاؤں کی انگلیوں کی حرکات محض اضطراری ہوتی ہیں۔ بعد میں یہ دریافت کرتا ہے کہ میں انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہوں اس احساس سے وہ اتنا خوش ہوتا ہے گویا بہت بڑی مملکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں اب اجنبی نہیں رہتیں۔ بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے کے آس پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑ سکے تو اسے دل بہلا دینے کا بیشتر سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بچے کو تفریح بھی ایسی ہی حرکات سے ہوتی ہے۔ جو تعلیم کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں البتہ گر جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً پن یا سلائی کے

نکلنے سے اسے بچا نا ضروری ہے۔

پہلے تین مہینے کے عرصے میں بچہ دودھ پیتے وقت تو بہت خوش ہوتا ہے۔ لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اکتائی رہتی ہے جب وہ موے میں ہو تو سو جاتا ہے جاگ رہا ہو تو کوئی نہ کوئی بے چینی اسے ضرور رہتی ہے انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے سے کم عمر کے بچے کو نہ تو کسی چیز کا کافی تجربہ ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے نسبتاً بہت جلد زندگی سے لطف اُٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مسرتیں فطری ہوتی ہیں اور تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلّت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا حلقہ تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر اکتایا رہتا ہے اس اکتائے رہنے میں بھی حکمت ہے۔ اس سے نیند پوری طرح آتی ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرانا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے ممیز ہونے لگتے ہیں اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور نہ صرف جانوروں کی مانند بلکہ اور طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے۔ میز پر ایک وزنی گھنٹی پڑی تھی بڑی مشکلوں سے اس نے اسے اٹھایا اور اٹھا کر بجایا اور فخریہ مسکرا کر سب کو باری باری دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ حربہ تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام تر زمانے میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو ازحد احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہیئے۔ بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس فراخدلی سے کرنی

چاہیئے کہ اس کی قدر ہی جاتی رہے اور نہ اس بخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامل نہ کرنا چاہیئے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیئے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے محض مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ خود بول کر اسے سکھاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بالارادہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی معین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے۔ اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کہ طبیعت کو اکسا نہ سکیں ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیئے کہ ایک دفعہ سمجھا بتا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ سمندِ شوق پہ تازیانے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں نیند۔ خوراک اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہیئے گردوپیش کے حالات و واقعات کا مانوس ہونا ذہنی نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے اگر ایک بات باقاعدگی سے پیش آتی رہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔

ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا اور بچہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں۔ بچہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے اگر اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات باقاعدگی کے ساتھ ہوتی ہے اور کوئی نئی بات یک لخت اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈال سکتی تو وہ خوش رہتا ہے۔ ذرا عمر بڑی ہوتی ہے تو نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات میں بچے کو ڈر محسوس ہوتا ہے جس سے اسے جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

اگر بچہ بیمار ہو اور آپ متفکر، تو اپنا فکر حتی الامکان اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے۔ ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا۔ کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے جس سے بچے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو اگر بچے کو ٹھیک نیند نہ آئے یا اس کا پیٹ خراب ہو تو بچے کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہیئے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہیئے کہ اس کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے۔ ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی خوشامد اور ترغیب کا خواہش مند ہوگا۔ اس بات کا خیال نہ صرف عمر کے پہلے سال میں بلکہ بعد میں بھی رکھنا چاہیئے۔ بچہ بڑا ہو تو اس اصول پر بیش از بیش کاربند ہونا چاہیئے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہیئے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا جو خود اس کے لئے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متوقع رہتا ہے۔ حالانکہ اسے ایسی باتیں خود بخود بغیر ترغیب کے کرنی چاہئیں۔

یہ کبھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں جو ان باتوں کو سمجھے بچے کے قوائے کمزور ہیں۔ اور اس کا علم محدود۔ لیکن جہاں یہ کوتاہیاں اس کے رستے میں حارج نہ ہوں۔ وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے۔ پھر عمر بھر ایک سال کے عرصہ میں اتنا نہیں سیکھ سکتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھ کر پالو کہ ایک دن اسے بڑا ہونا ہے اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لینا ہے اس کی موجودہ سہولتوں پر یا اپنی خوشی یا اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے۔ اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ٹھیک تربیت دینے کے لئے محبت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے۔

ماخوذ از کتاب "تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں"
مصنفہ برٹرنڈ رسل ——— مترجمہ بطرس

دیہات میں بوائے سکاوٹ کا کام

مکھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تو تھے ہی۔ جونہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی، ان کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گئے اور سب کی نظریں دروازے پر گڑ گئیں۔ جہاں بڈھے میاں کھڑے بڑے غور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا۔ "نہ کسی کے کانوں میں مرکیاں دیکھیں نہ ناک میں نتھ، نہ کسی کے چہرے پر میل، نہ کسی کی ناک بہہ رہی ہے نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (ایں یہ کیا ؟ اس بچی کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ کیسے افسوس کی بات ہے! لیکن نہیں یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی) اور ہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں۔ نہ کپڑے میلے ہیں۔ سب کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاح اور ترقی کے لئے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا "بڑے میاں یہ ہم پر منتر پڑھ پڑھ کر کیا پھونک رہے ہو ؟"

سقراط یوں چونک اٹھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا "سلام اے لوگو! ہاں میں

ایک خواب دیکھ رہا تھا۔"

"تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو۔ لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔"

"تو پھر ضرور میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا۔ "واہ واہ نواب سقراط میاں، ہمیں ایک کہانی سنائیں گے۔"

سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی اپنے شاگردوں کی طرح خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ انہوں نے پوچھا: "کہئے آپ کا کونسا خواب سچا ثابت ہوا؟"

"میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا اسکول دیکھ رہا ہوں۔ جس میں گندگی نام کو بھی نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سونے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ مہینوں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے۔ تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ہم جلد ہی اسے بھی راہ پہ لے آتے ہیں۔"

عین اس موقع پر ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ چپ چاپ اور شرمائی ہوئی تھی لیکن تھی چست، چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کچھ کاغذ تھے۔ اسے دیکھ کر سب لڑکے اور لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے اور جگہیں بدلنے لگے تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف ہو گئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ تب اس عورت نے لڑکیوں کو سلائی کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے نکل جانا چاہا۔ مگر لڑکے اسے کب چھوڑنے والے تھے۔ سب کے سب چلا اٹھے۔ "ہیں، ہیں بڑے میاں کہاں چل دیئے ٹھہرو تم ابھی نہیں جا سکتے۔ تم پہروں بیٹھے بڑی عمر کے لوگوں سے باتیں کرتے رہتے ہو۔ کیا ہم نے کچھ قصور کیا ہے؟

سقراط نے کہا۔ یہاں میری ضرورت بھی کیا ہے جو کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ تم اور تمہارے استاد اس سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ جاؤں گا۔ جہاں میری ضرورت ہو۔"

استاد نے کہا۔ نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہریے اور کوئی نئی بات بتایئے۔"

سقراط نے کہا۔ "میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں"

اسی شوخ لڑکے نے پھر کہا۔ اچھا تو کوئی کہانی ہی سنا دو۔"

کہانی کا نام سننا تھا کہ سب لڑکے چلا اٹھے۔ "ٹھیک ہے کہانی بھئی کہانی"

سقراط نے کہا۔ "میں کہانیاں وہانیاں نہیں سنایا کرتا۔"

اس پہ کئی لڑکے بول اٹھے۔ "ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں والے ہو، اپنے بچوں کو تو ضرور کہانیاں سناتے ہوگے۔"

سقراط نے کہا۔ یہ کام میرا نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری ماؤں کو اُپلے تھاپنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

اس پہ ننھی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ہرگز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پہ الزام لگاتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے۔"

سقراط نے کہا۔ خوب خوب، مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے۔ مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔"

"معاف تب کریں گے جب تم ہمیں کوئی کہانی سناؤ گے۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا مگر مجھے بہت ہی بڑا ——"

"رہنے دو، ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنانی ہے تو کوئی کام کی کہانی سناؤ۔"

" دیکھو میاں سنراط! عقل کے ناخن لو اور ہمیں ایسی کہانی سناؤ جس میں بادشاہ ہوں، شہزادوں شہزادیوں کا ذکر ہو، اگر تم چاہو تو ایسی کہانی سنا سکتے ہو۔"

" اچھا تو سنو، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ وہ ایک چھوٹی سی ریاست پہ حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔"

لڑکوں نے کہا " اب آئے نا راہ پہ، ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

" اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی جس پہ ایک بہت ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست پر قبضہ جما لوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا تو نہ تھا، ہاں ایک بہت خوبصورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا قبضہ ہو جائے گا۔

لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بڑا بادشاہ بہت ہی جھنجلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر ان سے صلاح مشورہ کیا۔ وزیروں نے کہا۔ اس چھوٹے بادشاہ نے ہماری ہتک کی ہے۔ ہمیں اس پر چڑھائی کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے دل میں بہت ڈرا کیونکہ اس کی فوج بڑے بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلایا اور کہا، اگر ہم لڑے تو یہ بادشاہ ہماری سلطنت پہ قبضہ کرنے لگا اور اگر میں نے اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ دی

تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ ہم کریں تو کیا کریں؟"

اس کی رعایا نے جواب دیا "ہم لڑیں گے اور اپنی جانیں حضور پر فدا کر دیں گے"

بادشاہ نے کہا "لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ غنیم کے مقابلے میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی ہے"

اس پر سب چپ ہو گئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے بے حد محبت رکھتے تھے چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو غنیم کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں۔ یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر شیر بھی آئے اور کہنے لگے "ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے"

بھیڑیئے اور گیدڑ آئے اور کہنے لگے "ہم دشمن کے خیموں کے ارد گرد گھومتے رہیں گے اور جو کوئی اکیلا دکیلا باہر نکلے گا اسے کھا جائیں گے"

کوؤں نے کہا "ہم ان کی ہڈیاں تک نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن بادشاہ نے کہا "یوں کام نہ چلے گا"

عین اس موقع پر ایک مکھی بادشاہ کی ناک پر آ کر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اڑا دی۔ مگر مکھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آ کر بادشاہ کے کان پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جھنجھلا اٹھا اور کہنے لگا "اس مکھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں تنگ کرتی ہے؟ میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں"

بادشاہ کے کان میں جھنجھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں"

بادشاہ چونک اُٹھا اور کہا "یہ کون بولا؟"

وزیر نے عرض کیا "حضور! کوئی بھی تو نہیں بولا۔"

بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی "میں بولا تھا۔"

اب تو بادشاہ اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ مگر اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ناچار پھر آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا اور کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔"

اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

امیر وزیر سب دم بخود کھڑے رہ گئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے، جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں مکھیوں کا بادشاہ ہوں اور آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

بادشاہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا "جاؤ جاؤ، فضول وقت ضائع نہ کرو۔ بھلا تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے ٹھٹھا کرنے آئے ہو۔"

"نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں! اگر آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے دریغ نہ کروں گا۔"

"میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے اور جہاں چاہوں اڑ سکوں۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا "جاؤ۔ تمہیں اجازت ہے میرے دشمن کو برباد کرنے میں اپنا سارا زور لگا دو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو، نہ میرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے بادشاہ کو آپ ہی آپ باتیں کرتے اور

ہنستے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ وہ سمجھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے ہمارے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے لیکن بادشاہ نے سالا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ مکھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ مکھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں اس موقع پر ایک بڈھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور مکھی کی شرطیں مان لینے کے خلاف دھائی دینے لگا۔ اس نے چلا کر کہا " بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے مغرور اور ظالم ہمسائے سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے۔"

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں "چپ رہ بڈھے، کیا بکتا ہے؟" اور بے چارے بڈھے کو زبردستی خاموش کر کے اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مگر اس عرصے میں بڈھا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔"

ایک لڑکے نے کہا " خدا جھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڈھا ضرور سقراط ہی ہوگا۔"

سقراط نے کہا " اگر تم یوں میری بات ٹوکو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔"

ایک ننھی سی لڑکی نے کہا " یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟"

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوتے کہا " یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں اِدھر اُدھر اوپر نیچے بڑے غور سے دیکھتا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے

کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا "اے ناطے میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟"

سقراط نے جواب دیا "نہیں"

ایک لڑکے نے کہا "مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟"

"میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی"

کئی لڑکوں نے زچ ہو کر پوچھا "تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم دیر تک اِسے اِدھر اُدھر تلاش بھی کرتے رہے اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی یہ تو پہیلی ہے پہیلی۔"

"اچھا۔ اگر تم اسے پہیلی کہتے ہو تو پہیلی ہی سہی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کو کس چیز کی تلاش تھی۔ آپ کوڑا کرکٹ تلاش کر رہے تھے لیکن وہ اب آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔"

سقراط نے کہا "بجا فرمایا آپ نے اور اس کے لئے میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں گرد کا ایک ذرّہ بھی تو احاطہ کے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول سے گڑھے میں پھینکا جاتا ہے۔ یقین جانو مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا "مجھے امید ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اسکول چھوڑ دو گے تو اپنی ان تمام اچھی عادتوں کو کبھی نہ بھولو گے۔"

استاد نے کہا "اس کی طرف سے آپ بے فکر رہئے اب صفائی ان کی فطرت کا جزو

بن گئی ہے لا خلافت سے انہیں دلی نفرت ہے اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ کوڑے کرکٹ سے اَٹی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا دوبھر ہو جائے۔"

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار "مرحبا" نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا "ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ، ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!"

سقراط نے کہا "لو بھئی سنائے دیتا ہوں" "اچھا تو کہاں چھوڑی تھی کہانی؟ ہاں ہاں یاد آ گیا۔ خوبصورت شہزادی باغ میں بیٹھی جراب بن رہی تھی۔"

"نہیں یہاں تو نہیں چھوڑی تھی۔"

"تو پھر یہاں چھوڑی ہوگی" "بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔"

"نہیں، یہاں بھی نہیں چھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ خیر، ہم تمہیں بتلائے دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں چھوڑی تھی۔ جہاں مکھیوں کے بادشاہ نے چھوٹی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہیں چھوڑی تھی۔ لو صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر مکھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو وہ بڑا بادشاہ چڑھائی کے لئے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شاندار جشن منانا چاہیئے۔ جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور دنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سورماؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گستاخ ہمسائے کو

تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شاندار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آکر اس میں شامل ہوئے جس جگہ نظر پڑتی تھی لوگوں کے خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا۔ بادشاہ کے خزانے سے کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے انہوں نے بادشاہ کی راجدھانی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور نجس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکایک وبا پھیل گئی اور دھڑا دھڑ موتیں ہونے لگیں بہتیرے جتن کئے گئے مگر مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ناچار بادشاہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ میرے افسر تم سب کے پاس خود آئیں گے اور تم میں سے بہادروں کو چن چن کر فوج میں بھرتی کر لیں گے۔ یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑے بادشاہ کی تمام سلطنت میں وبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بڈھوں، امیروں، وزیروں کو بلایا انہوں نے کہا "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں۔ ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہادر سورماؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو جشن کیا تھا اس نے نہ صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلا دی۔

بادشاہ نے کہا "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے" اور سب بڈھے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال چھوٹے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقتور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر اسے مبارکباد دینے آئے جس وقت وہ بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو مکھیوں کا بادشاہ بھی بھن بھن کرتا ہوا ان کے

پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترئی بجا کر اتنی اونچی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جاتے چلّا کر کہنے لگا "بادشاہ سلامت لائیے میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ "اسے مکھیوں کے ننھے بادشاہ! ذرا ہمیں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سرانجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے ہیں تو وبا سے مرے ہیں اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو جھوٹا اور دغا باز ہے"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا "میں ہرگز دغا باز نہیں۔"

بادشاہ نے کہا "ثابت کرو"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا "میں ثابت کرتا ہوں سنئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی پیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے ٹٹوؤں اور بیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے خیمے گاڑ دیئے اور بڑی بے احتیاطی سے رہنے سہنے لگے۔ وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پاخانہ اور لید کر دیتے اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایک ایسی جگہ سے آیا تھا۔ جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا۔ ہم سب یعنی میں اور میرا لشکر پہلے تو گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھتے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھتے ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد نہ تو اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ جوتے اتارتے۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے سنا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضہ کے جراثیم یہاں لایا ہے تو ہم نے ہیضہ بھی پھیلا دیا۔" یہ کہہ کر مکھیوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترئی بجائی۔ "اسے عادل اور انصاف پسند بادشاہ! اب میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ خوف سے تھرا اُٹھے اور بادشاہ نے کہا "بے شک تم انعام کے قدر ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دوں گا اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور

جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہوگی۔"

اب وہی بڈھا جس نے بادشاہ کے مکھی کی شرطیں مان لینے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا بولا۔"بادشاہ سلامت! میری التجا ہے کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔"بڑے میاں یہ کیوں؟"

اس کے جواب میں وہ بڈھا جو بلاشبہ سقراط ہی تھا اور اس دن تم لڑکوں نے ٹھیک بوجھ لیا تھا کہنے لگا۔" جب آپ نے مکھیوں کے بادشاہ کے ساتھ اتحاد کیا تھا تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہیئے ہمیں آئے دن جو طرح طرح کی بیماریاں گھیرے رہتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ بھی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا۔" تو اب میں کیا کروں؟"

سقراط بولا۔"حضور! آپ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پہ بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔"

بادشاہ نے کہا۔" ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔"

سقراط بولا۔" تو اپنے قول کو نبھائیے۔ لیکن خبردار رہئے کہ مکھیوں کا بادشاہ کہیں آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ نہ کر ڈالے۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور بچے دیتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لئے گندگی بھی مہیا کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے کہا۔" نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی اور کے دسترخوان پہ بھی بیٹھ سکیں۔"

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو ڈرپوک تھا۔ بول اٹھا۔" بادشاہ سلامت! خدا کے

لئے اس طاقت ور دشمن کو ناراض نہ کیجیے۔“ لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا ”ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ ورنہ مکھیوں نے جس طرح ہمارے ہمسایہ بادشاہ کی فوج میں وبا پھیلا کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی۔“

مکھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا ”اے بادشاہ! مجھے انعام کب ملے گا؟“

بادشاہ نے جواب دیا: ”اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے ذرا بھی تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔“

یہ سن کر مکھیوں کا بادشاہ اُڑ گیا اور تھوڑی دیر میں اپنا لاؤ لشکر لے آیا۔ تمام مکھیاں بادشاہ کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھتیں اور جہاں چاہتی اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ کر مر گیا لیکن چونکہ اور کسی نے مکھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا اس لئے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک کپڑوں کے نیچے ڈھک کر یا الماریوں، برتنوں اور بکسوں میں بند کر کے رکھتے اس طرح مکھیوں کا کچھ بس نہ چلتا اور وہ وبا نہ پھیلا سکتیں اور چونکہ مکھیاں گندگی میں انڈے دیا کرتی ہیں۔ انہوں نے غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے لئے الگ گڑھے کھود لئے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک دیتے اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور دیہات کو ایسا صاف ستھرا رکھتے کہ مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ جہاں جی چاہتا پاخانہ کر لیتے تھے لیکن اب انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لئے گڑھے بنوائے تھے اور کسی جگہ رفع حاجت نہ کر پاتے۔ اور وہ اپنے اصطبلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے۔ لید اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھنکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں اور ان میں خمیر اٹھتا رہے اور مکھیاں وہاں بھی انڈے نہ دینے پائیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل مل کر نہایت

عمدہ کھاد بن جاتی۔ تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے اب انہیں کھیوں کا کچھ اندیشہ نہ رہا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور کھیوں ہی سے چھٹکارا مل گیا۔ بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پہلے سے زیادہ ہری بھری ہوگئیں اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہوگئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچالیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی مکھی کے شر سے بھی محفوظ ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کرلی اور دونوں نے آپس میں عہد کرلیا کہ ہم بجائے ایک دوسرے سے لڑنے کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گندگی کمی اور وبا کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی نے بڑی سلطنت کے شہزادے سے شادی کرلی اور وہ اور اُن کی رعایا ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔"

ستقراط نے ننھی لڑکی سے کہا۔ کیوں ننھی اب تو تم خوش ہو؟ اب تو تمہاری شہزادی پھر خوش رہنے سہنے لگی ہے۔"

پھر وہ بڑی عمر کے لڑکوں کو مخاطب کرکے بولا۔ لڑکو! اب جب سالانہ جلسہ ہو تو تم اس کہانی کو جو میں نے تمہیں سُنائی ہے ناٹک تیار کرکے دکھانا۔ اس میں شیر بھی لانا اور بھیڑیئے وغیرہ بھی اور کھیوں کے بادشاہ کے لئے کوئی اچھا سا لباس تیار کرنا اور اس کے شانوں پہ پر بھی لگانا جب تمہارے والدین اور دوست اس ناٹک کو دیکھیں گے تو ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ تم نہانے دھونے اور صفائی کا اس قدر خیال کیوں رکھتے ہو اور تمہیں اپنے اسکول، احاطے اور دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی اتنی فکر کیوں ہوتی ہے؟"

(دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام)

اے ایف۔ ارل۔ برین، ایم۔سی، آئی۔سی۔ایس

مترجمہ: پطرس

ویلٹن صاحب اور میں

نتھیا گلی شمال مغربی سرحدی صوبے کا تابستانی دارالخلافہ ہزارے کی سرسبز پہاڑیوں میں ۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور کئی پہلوؤں سے ایک نہایت معمولی پہاڑی مقام ہے اور سب سے زیادہ یہی وجہ ہے کہ میں نتھیا گلی کا گرویدہ ہوں۔ وہاں کے گھنے جنگل بہت حد تک تہذیب کے جنون تعمیر کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ قدرت کی شان و شوکت کے علمبردار آسمان بوس عظیم الشان درخت لاکھوں کی تعداد میں اپنی مہیب خاموشی میں کھڑے ہیں۔ ندی نالے اپنے قدرتی آبریزوں میں اچھلتے کودتے بہہ رہے ہیں۔ وہاں کی آبادی سوڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کشمکش حیاتِ انسانی کے وہ روح فرسا مناظر جو بڑے بڑے شہروں میں بہت عام ہوتے ہیں، وہاں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ شملہ کی فضا کو متلون فیشن کی رنگ آمیزیوں نے میرے سادگی پسند دماغ کے لئے کثیف اور میرے حساس دل کے لئے زہریلا بنا رکھا ہے۔ مری جسامت کے لحاظ سے تو نہیں لیکن نوعاً بعینہٖ شملہ ہے۔ اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں اسے شملہ پر ترجیح دوں۔ ایبٹ آباد میں میرے آشناؤں کی کثرت میری تنہائی پسند طبیعت کی خواہشات کے مانع ہے۔ لیکن گزشتہ گرمیوں کے موسم میں اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے مجھے نتھیا گلی جانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے مجبور کا لفظ استعمال کیا ہے۔ گو میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جبر مجھے کسی طرح ناگوار نہ تھا۔ ویلٹن صاحب جن کو میں دوست کہتا تھوڑی سی لاف زنی اور دوست کے

علاوہ کسی اور نام سے پکارنا غلط بیانی سمجھتا ہوں۔ گزشتہ موسم گرما میں باندہ گلی مقیم تھے اور انہی کے قرب کی خواہش مجھے کشاں کشاں نتھیا گلی لے گئی۔ باندہ گلی نتھیا گلی سے پانچ ساڑھے پانچ میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا پہاڑی مقام ہے۔ جس میں ایک ہوٹل، تحصیل، خزانہ، کچہری اور ڈاک بنگلے کی موجودگی نے اسے تھوڑی سی اہمیت دے دی ہے۔ ولیمز صاحب اسی ہوٹل میں رہتے تھے اور میں نتھیا گلی میں خواجہ محمد حسین کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نتھیا گلی کا بازار بمشکل پانچ چھ دکانوں پر مشتمل ہے جو ضروریات زندگی مہیا کر سکتی ہیں اور بس۔ یہ دکانیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر کھڈ کی طرف واقع تھیں اور ڈاکخانے سے شاید اس کی عمارت "سرکاریت" سے مرعوب ہو کر ذرا فاصلے پر تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف اسی موڑ پر ڈاکخانے اور دکانوں کے مقابل بازار بھی ہے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر دس بارہ قدم چڑھنے کے بعد خواجہ محمد حسین کی کوٹھی تھی۔ جس کی سرخ چھت اور برآمدے کے خوشنما پتھر کے ستون اپنی بلندی پر سے کم مایہ دکانوں اور بیکار ڈاکخانے کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

ہفتے کے دن دو بجے کے قریب میں برآمدے میں بیٹھا خواجہ صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سات بجے سے بارش بہت زور شور کی ہو رہی تھی اور میں اس کی روح افزا کیفیت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لطیف سحاب پارے اور نیچے دائیں بائیں تگ و تاز میں مصروف تھے۔ بارش کے چلمن میں سے میں سامنے کی دکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن کے مالک اس شدید بارش میں خریداروں سے مایوس بیٹھے تھے۔ بارش کے مسلسل شور سے میرے دماغ میں ایک عجیب نیند سی چھا گئی اور میں خواب بیداری میں ولیمز صاحب اور اپنے باہمی تعلقات پر غور کرتا رہا۔ وہ عیسائی میں مسلمان۔ وہ انگریز میں ہندوستانی، ان کی زندگی آزاد اور خود مختار میں نئی نئی ڈگری حاصل کرنے کے بعد روزگار کا متلاشی۔ ہمیں جاننے والی دنیا حیران تھی اور میں خود بھی حیران تھا کہ باوجود اس قدر تفاوت کے ان کی میری کیونکر نبھتی ہے۔ پانچ سال کی باہمی آشنائی نے ہمیں ایک دوسرے سے

بہت مانوس کر دیا تھا۔ مجھے اپنی نسبت تو یقین ہے کہ انہوں نے مجھے کسی عجیب طریقے سے مسحور کر رکھا ہے۔ اس قدر کہ بعض اوقات ان کے متعلق میرے جذبات میں صاف نسوانیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کی نسبت میں یہ کہوں گا کہ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکتا کہ ان کا مجھے شرف بخشنا میری کسی صفت کی بدولت ہے یا محض ان کی فیاض دلی کا نتیجہ ہے وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں لیکن کبھی تو میں ان کے سامنے اس طرح سہم جاتا ہوں جیسے شاگرد استاد کے سامنے اور کبھی اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہوں جیسے شاگرد استاد کے سامنے۔ اور کبھی اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہوں جیسے وہ اور میں بچپن میں برسوں اکٹھے کھیلتے رہے ہوں۔

میرے خیالات یہاں تک پہنچے ہوں گے کہ ان کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ میرے بائیں ہاتھ میں سگریٹ بجھ گیا۔ مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے زیادہ بیدار کر دیا اور سگریٹ جلاتے جلاتے میں نے کنکھیوں سے باندہ گلی کی سڑک کی طرف دیکھا۔ پتھریلی سڑک پر ایک سوار بارانی ٹوپی اور بارانی کوٹ میں چھپا ہوا تیز دلکی پر نتھیا گلی کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس کے سیاہ ننگے پاؤں مجھے رکابوں میں نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی سائیس ہے۔ بازار میں پہنچ کر وہ گھوڑے پر سے اترا اور باگ کو اس کی گردن پر سے اتار کر بازو میں ڈال لیا اور ہماری کوٹھی کی طرف چڑھنے لگا۔ میں پہلے سے زیادہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

قریب آکر اس نے مجھے ایک خط دیا جس کا بڑا نیلا لفافہ صاف کہہ رہا تھا کہ باندہ گلی ہوٹل سے کوئی پیغام آیا ہے۔ خط بلا شبہ ولیٹن صاحب کا تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ کو پھینک کر اسے جلدی جلدی کھولا۔ سو ولیٹن صاحب انوکھے خط لکھا کرتے تھے۔ مگر یہ سب سے نرالا تھا۔ یہ میرے پاس اب تک محفوظ ہے اور اس وقت میں اس کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ کر رہا ہوں۔

باندہ گلی

پیارے امجد!

سواری کا لباس پہن کر فوراً یہاں آ جاؤ اور اپنے
ساتھ بھرا ہوا پستول، چھ فالتو کارتوس، میرے کمرے کی چابی اور پانچ
چھ نوٹ پیپر لیتے آؤ۔

تمہارا مخلص

"ایچ۔ ڈبلیو۔ ویلنگٹن"

میں فوراً اندر گیا اور جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ٹرنک کھول کر اس میں سے چھ کارتوس نکالے۔ تکیے کے نیچے سے اپنا بھرا ہوا پستول اٹھا کر برجس کی جیب میں ڈال لیا۔ نوٹ پیپروں کے دستے سے چھ کاغذ پھاڑ کر تہ کئے۔ پاس ہی سے ویلنگٹن صاحب کے کمرے کی چابی اُٹھائی (ویلنگٹن صاحب نے اپنے کمرے کی ایک چابی مجھے اس لئے دے رکھی تھی کہ میں بعض اوقات جب پہاڑیوں میں پھرتے پھرتے باندہ گلی کے قریب جا نکلتا اور تھک کر آرام کی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ کھول کر وہاں بیٹھ جایا کرتا) سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پٹہ تالی کی اور بارانی کوٹ پہنتا پہنتا باہر نکلا نوکر کو خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا لکھ کر دیا کہ خدا جانے میں کس وقت واپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔ یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک نمونہ بازار، ہوٹل، ڈاک بنگلہ وغیرہ ایک مسلسل ساتصف دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کا بازار بالکل نتھیا گلی کا سا ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک درزی کی چھوٹی سی دکان، اس کے ساتھ

سیٹھ فیروز جی کا شراب، تمباکو، فلم، کاغذ پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کنجڑے اور پھر شاید ایک بنئے کی دکان تھی۔ اسی قطار میں کچھ فاصلے پر تحصیل، خزانہ، کچہری اور سامنے ڈاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندہ گلی ہوٹل بھوکے پیاسوں کے لئے اپنی آغوش شفقت کھولے بغیر کسی تکبر اور غرور کے کھڑا تھا۔ باندہ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رُخ کیا گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۵۲ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا لیکن دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ویلنگٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا۔ جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ویلنگٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے تھے۔

"میرا پتہ مینجر سے پوچھ لو ـــــ یہ کارڈ جلا دو۔"

میں نے ان دو فقروں کو شاید چھ دفعہ پڑھا۔ جیب سے دیا سلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے مینجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے مینجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا، ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک اور مینجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر تھے اور اس کا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ویلنگٹن صاحب کو اس سے خاص اُنس تھا۔ جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا میں اس سے جب ملا اُسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اُس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسا کر ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر مغموم دیکھ کر مجھے ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھا کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور بارانی کوٹ

کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکارا۔ "ولیم!"

ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا۔ تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ غم سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔۔۔

"ویلنگٹن صاحب ۱۲ نمبر کمرے میں ہیں"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا:۔

"ولیم! تم آج اس قدر غمگین کیوں ہو؟"

کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا:۔

"کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔"

اور سر نیچا کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا:۔

"ولیم! تمہیں غمزدہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو۔"

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا۔ اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غافلانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہا:۔

"آپ کسی سے کہئے نہیں۔"

"مجھ پر یقین رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔"

"ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔"

"قتل؟ کب؟ کس کا قتل؟"

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا

ہے۔ فوق العادت۔ پہلے ولیٹن صاحب کا پراسرار خط پھر اس کارڈ پر وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر۔ میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی، میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ولیم کی آواز نے آخر کار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

"۱۲ نمبر میں براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چار بجے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ سیر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آکر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے لیمپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے۔ صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسبِ معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خوابگاہ انتہائی بدنظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اوڑھنے کے ڈریسنگ گون پہنے بظاہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگانے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک بڑا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد اور اس کی آنکھیں کھلی اور پتھرائی ہوئی ہیں۔ دفعتہً نوکر پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک مرا ہوا آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔ میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہٖ ویسے پایا۔ جیسا کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر امجد! آپ خیال فرمایئے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے طشت ازبام ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھیے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا وہ کیوں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلاوجہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؟ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ ہوں ہی

بدقسمت اور مجھے نہیں معلوم میری بدقسمتی کا زمانہ کب تک رہے گا۔ آپ کو علم ہوگا جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آتے تو پہلے پہل ہم نے بریلی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ چارلس کو علیحدہ کر دوں۔ اس کی عادات مجھے پسند نہ تھیں، اس کی سرکشی اور فضول خرچی ہوٹل کے کاروبار کے لئے از حد مضرت رساں تھی۔ بھائی کو اس طرح علیحدہ کر دینا مجھے سخت ناگوار تھا۔ مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ بریلی کے ہوٹل کا کام بہت زیادہ تھا اور میں اکیلا اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ اسے چھوڑ کر میں نے اس جگہ ہوٹل کھولا اور اب یہاں یہ قتل ہو گیا ہے۔ اب یہ ہوٹل بھی ٹوٹ جائے تو بتایئے میں جہنم میں جاؤں؟"

ولیم کی داستان درد سے میں از حد متاثر ہوا مگر باوجود اس کے یا شاید اسی وجہ سے میں اس کے پاس سے بہت جلد جانا چاہتا تھا۔ ہزاروں طرح کے سوالات میرے دل میں اٹھے مگر میں نے سب کو دبا کر کہا۔

"ولیم! تم ناحق اس قدر فکر کر رہے ہو۔ امید ہے قاتل کا پتہ بہت جلد مل جائے گا تم ذرا حوصلہ کرو۔ تم نے کیا کہا؟ ولیٹن صاحب ۱۲ نمبر میں ہیں؟"

"ہاں۔ مگر آپ ۱۲ نمبر کمرے میں غسل خانے کے رستے جایئے۔"

میں "کیوں؟" کہنے کو تھا۔ مگر "اچھا" کہہ کر باہر نکل آیا۔ بارش تھم چکی تھی اور پھٹتے ہوئے سفید بادلوں میں سے نیلا نیلا آسمان کہیں کہیں سے نظر آرہا تھا۔

غسل خانے کی طرف سے ۱۲ نمبر کمرے میں داخل ہوا تو پہلے سونے کے کمرے میں پہنچا۔ بستر پر براؤن کی لاش ایک سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ یہاں سے میں نشست گاہ میں عین اس وقت داخل ہوا جس وقت ولیٹن صاحب کونے میں میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سگریٹ کیس

میری طرف بڑھایا۔ سگرٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے میں دیا سلائی جلا رہا تھا کہ ویلٹن صاحب بولے :۔

"اچھا۔ تو تم سارا قصّہ ولیم سے سُن آئے ہو ؟"

"ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟"

وہ سگرٹ جلا چکے تو دیا سلائی کو انگیٹھی میں پھینک کر کہا :۔

"جس وقت تم تھیا گلی سے چلے تو بارش ہو رہی تھی نا ؟"

"موسلا دھار"

"تو تمہارا باران کوٹ کہاں ہے ؟"

"وہ تو.... میں مینجر کے کمرے میں بھول آیا ہوں"

"اور تم وہاں ہرگز نہ بھول آتے۔ اگر تم مینجر سے فقط میرا پتہ پوچھ کر چل دیتے۔ اچھا۔ یہ دیکھو۔ سیٹھ فیروز جی اپنے بل فارم کس قدر خوبصورت چھپواتا ہے"

یہ کہہ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں فیروز جی کی دکان کا ایک بل دیا۔ بل اسی قسم کا تھا۔ جس قسم کے نقد چیزیں خریدنے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور جو بطور ایک رسید کے ہوتے ہیں۔ بل پر خریدار کا نام ندارد تھا۔ صرف اس قدر لکھا ہوا تھا :۔

ایک ڈبہ پانامہ سگار	۰	۰	۲۵
ایک چھوٹا دسکی	۰	۶	۰۰
	۰	۶	۲۵

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگدار روشنائیوں میں واقعی نہایت خوبصورت چھپا ہوا تھا۔

میں مسلمان مشرب، شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف۔ میں نے پوچھا۔
"اس چھوٹا وسکی کا کیا مطلب ہے معمولی درجہ کی ہے؟"
"نہیں۔ ایک چھوٹا وسکی کے معنی وسکی کا ایک چھوٹا پیگ۔ اب یہ دیکھو۔ ہمارے ہوٹل کے فارم اگرچہ سائز میں اس سے بڑے ہیں مگر چھپائی میں کس قدر خراب ہیں"
اس کے بعد انہوں نے باندہ گلی ہوٹل کا بل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا۔ کہ ویلنٹن صاحب نے مجھے نتھیا گلی سے اس لئے بلایا ہے کہ انہیں بل فارموں کی چھپائی کے سے اہم مسئلے پر میری رائے کی ضرورت تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا۔ چھپائی واقعی کچھ قابلِ تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی۔

بل بنام مسٹر براؤن صاحب کمرہ نمبر ۱۲ بابت ماہ جولائی

	پائی	آنہ	روپیہ
خوراک وغیرہ	۰	۰	۱۱۰
کرایہ	۰	۰	۳۰
	۰	۰	۱۴۰

سیٹھ فیروز جی کا بل میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور ہوٹل کا بل بائیں ہاتھ میں۔ میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ ویلنٹن صاحب بولے:۔
"یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ کل شام کو پہن کر باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھتے ہی میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا۔ منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب نہیں پیا کرتا تھا نہ کھانے پینے کسی اور وقت۔ اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے چارج کرتے ہیں اس سے نہیں

لئے جاتے تھے۔"

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آخر میں کہا کہ نیکی کا کام تو کرتا تھا) ولیٹن صاحب نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا۔

"اگر وہ شراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدق ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے کل کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا؟"

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

"اب تم دیکھو۔ یہ طاق پر پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب ڈبوں پر سگاروں کا نام "سلطانہ" لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو "سلطانہ" سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے سیٹھ فیروز جی کا بل کہہ رہا ہے کہ کل اس نے "پانامہ" سگاروں کا ایک ڈبہ خرید لیا۔ یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت سنجیدہ و متین اور اس کی عادات نہایت سادہ اور باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن اپنے مقررہ معمول سے اس قدر انحراف کرے کہ شراب نہ پیتا ہو تو اس دن شراب پی لے اور سگار جو وہ غالباً برسوں سے پی رہا ہے۔ چھوڑ کر ایک اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خرید لے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خریدا تھا؟ لیکن نہیں۔ انگیٹھی کے پاس سے مجھے دو جلے ہوئے سگاروں کے باقی ماندہ حصے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو "سلطانہ" سگار کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ اغلباً پانامہ سگار یہی ہیں (چونکہ میں خود سگار نہیں پیتا۔ اس لئے میری واقفیت اس بارے میں محدود ہے) تو گویا اس کمرے میں دو پانامہ سگار پیئے گئے لیکن باقی کا ڈبہ غائب ہے۔ اب چلو خوابگاہ کا معائنہ کریں۔"

یہ کہہ کر ہم دونوں خواب گاہ میں گئے۔ ولیٹن صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر چھتر برس کی عمر کا ایک پتلا دبلا قریباً چھ فٹ دو انچ قد کا آدمی تھا اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ ارد گرد کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

"کنپٹی کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونو ضربیں معلوم ہوتا ہے کسی کُند وزنی چیز سے آئی ہیں۔ اس قسم کی کُند وزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابلِ غور ایک اور بات ہے وہ سامنے کھونٹی پر براؤن کا وہ کوٹ لٹکا ہوا ہے۔ جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک دو جگہ بالکل تازہ پھٹا ہوا تھا۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پھٹا ہے۔ جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھا تو کیا براؤن بلں باوجود ایک مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر ہمت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پر لٹکاتا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گون پہنتا جس کی ڈوری کی گانٹھ تم غور کرو نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام ضرور اس کے سر پر تھی۔ یہاں کہیں نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر ولیٹن صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریکی محیط تھی جس میں میرے متجسس دماغ کو کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی جب میں ولیم سے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میرا دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا اور اب قتل مجھے ایسا اہم واقعہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیٹ صاحب مجھے ساتھ لے کر غسل خانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا:

"یہ ہم چوروں کی طرح غسل خانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟"

وہ بولے۔

"ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ کہو گے؟"

"لیا تھا!"

"ہوٹل میں تین چار آدمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں اور حتی الوسع کوشش کی جا رہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے جو نوکر صبح براؤن کی چائے لے کر آیا تھا اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر چند دن تک اس معاملے پر زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انہوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انہیں کسی خاص شخص کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔"

"اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟"

"اوہو۔ ولیم نے تم سے نہیں کہا۔ صبح سب انسپکٹر صاحب خانی کاغذوں کا ایک دستہ اور قلم دوات لے کر یہاں آئے تھے۔ منیجر کے کمرے میں گھنٹہ بھر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے پھر ایک نوکر کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔ مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔"

"تو انہوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟"

"پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے تو براؤن کے کمرے کا سرسری معائنہ کیا۔ اس قدر سرسری کہ تم اب ان سے جا کر پوچھو تو انہیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہو گی۔ پھر ولیم سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی ملنے آئے تھے۔

وہ صرف ایک فیروز خاں بیرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چیٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندہ گلی ہوٹل میں رہا اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔

"چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاقی سی ہے۔"

"ناچاقی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور عیاش ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا اور ان میں پھر رابطہ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ کل یہاں سیر کے لئے آیا تھا۔"

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندہ گلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کے چمن میں کھڑے ہوتے کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم منیجر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ولیٹن صاحب کو دیکھا تو ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

"ابھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں ...... ہم چائے ڈاک بنگلے میں پئیں گے۔"

میں نے اپنا باران کوٹ منیجر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چار بجنے میں سات منٹ تھے۔

ویلٹن صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کھانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے

ساتھ ہی جو کچھ کھانا ہو کھا لو مجھے دوست یوں بھی دسترخوان کا غاصب سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتظام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی خالی کرسی پر رکھ دیں۔ ولیٹن صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی فکر سے فراغت پاتے دیکھا تو میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور اعضا کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت سواری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے انہوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارتوس مانگے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں چھ فالتو کارتوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انہوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے نوٹ پیپر بھی یاد آئے۔ میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ پیپر بھی میرے پاس ہیں مگر کسی خیال سے چپ رہا اور جیب سے کارتوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے انہوں نے ایک ایک کر کے سب کو پستول میں بھر دیا۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا اور مسکرا کر کہنے لگے:۔

"میرے کارتوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔ میں تمہارا چھ کارتوسوں کا قرضدار رہوں۔"

ان کا یہ بظاہر تکلف فی الحقیقت عین بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب گھبراہٹ سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا۔ لیکن انہوں نے مجھے اس کی فرصت نہ دی اور دفعتاً پوچھا:۔

"تو تمہاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے بل کا معما حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میں سیٹھ کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پانامہ کا ڈبہ اور ایک چھوٹا وسکی کہاں نے

خریدا تھا۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہوتے جاتے ہو اور چونکہ معلوم ہوتا ہے تمہیں تفتیش جرائم میں خاص ملکہ حاصل ہے اس لئے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھتے آنا کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جانے کے لئے گھوڑا کرایہ پہ لیا تھا؟"

مجھے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر میں ڈاک بنگلہ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں دور ہی سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ولیٹن صاحب ٹہلتے ٹہلتے رُک گئے اور ایک منتظر انداز میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "کل مورخہ ۳ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیم صاحب مری ہوٹل کے مالک اور مینجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ براادرس کی دکان سے ایک ڈبہ ہانامہ سگار کا خریدا اور ایک پیگ وسکی کا پیا۔ تحصیل سے کل صبح کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انہوں نے کوئی گھوڑا کرائے پہ نہیں لیا۔ پہلی بات مجھے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکیدار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انہیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پہ رکھ لئے اور نہایت بے پروائی سے دو تین قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پہ ٹہلا۔ پھر مڑ کر میں نے ولیٹن صاحب سے کہا۔

"وہ سگاروں کے جلے ہوئے ٹکڑے جو آپ نے براؤن کے کمرے میں سے اُٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھایئے۔"

انہوں نے فوراً میرے ارشاد کی تعمیل کی۔ میں نے ایک ٹکڑا لے کر اسے کھولا پھر ان چھ ہانامہ سگاروں میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پہ سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مر ہیا نہ لہجے میں ولیٹن صاحب سے کہا۔

"آپ کا قیاس ٹھیک تھا۔ یہ چلے ہوئے سگار بے شک پا نامہ سگار ہیں۔"

انہوں نے جھک کر کہا "آپ کی عین نوازش۔"

"تو اب ہم مری چلیں گے نا؟"

"جس طرح حضور حکم کریں۔"

میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔ وہ پانامہ سگار سلگا کر ہم ڈاک بنگلہ سے تحصیل کی طرف آئے۔ دو گھوڑے لئے اپنے باران کوٹ وہاں باندھے جہاں بکنگھیں نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹٹول کر گھوڑوں پر سوار ہو کر مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

باندہ گلی سے آدھ میل نکل کر ہم نے گھوڑوں کو دلکی پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ جنگلوں کی مہیب عظمت، چیڑ، تنہ، کھنڈ اور بن کھوڑ کے اونچے اونچے درخت ایک طرف پہاڑوں کی پُر شکوہ بلندی، دوسری طرف کھنڈ کی پراسرار گہرائیاں تنگ پیچیدہ سڑک، اس پر گھوڑوں کے ... کی مسلسل آواز، آبشاروں کا شور، کوئلوں کی دردناک کوکو میں تو بے خود ہو گیا۔ درختوں کے بیچ میں سے غروب آفتاب کے ہر لحہ بدلتے ہوئے نظارے کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر مجھے بے قرار کر رہے تھے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر گر کر تحت الثریٰ میں دوتی پھینک رہا تھا۔ میرا دل بار ہا کھڈ میں کود پڑنے کو چاہا۔

میرے کانوں نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ویلٹن نے جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے، اپنا گھوڑا روک لیا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ وہ بولے:۔

"مری بائیسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"شاید پونے آٹھ بجے۔"

"اور اب ساڑھے چھ بجے ہیں اور مری یہاں سے پانچ میل ہے تو گویا ہم بائیسکوپ کا تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اب ذرا ہلکے ہلکے نہ چلیں؟"

"میں خود یہی کہنے والا تھا۔"

ہم نے گھوڑوں کو قدم قدم لے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دم ویلٹن صاحب نے قمار بازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی قباحتوں پر ایک پُرزور لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس شدومد سے کہ میں سمجھا اس فعل مذموم کے اختراع کا جرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پُرمغز تقریر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انہوں نے دفعتہً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:۔

"اور مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح عادت اہلِ فرنگ میں کثرت سے ہے۔ وہ لوگ جو مہذب گھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلاتکلف شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہم صحبت دوست ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہار جیت کے ساتھ روپے کی ہار جیت وابستہ نہ ہو اور اس کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں۔ اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوعِ انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ غلط اور سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں۔ مردہ عیوب کو از سرِ نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ ہردلعزیز کر دیا ہے۔"

"میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس بات کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے براؤن کی موت پر دقیق غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک اس طرح غیر متعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے۔ جیسے وہ اس سے قطعی بے خبر ہوں اور پھر

اس وقت جب کہ کم از کم میرا دماغ خیالات کے عدم اظہار کی وجہ سے بیش از بیش اسی سوچ میں مصروف تھا۔ ویلیٹن صاحب میں مَیں نے بڑی خاصیت دیکھی ہے۔ کہ وہ یک لخت اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ حضور وزیر اعظم انگلستان کے کیرکٹر پر بحث کو ختم کئے ابھی دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کہنے لگ جاتے ہیں۔ ہزار آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متواتر تین گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور اسپیکر کی دھواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں۔ اور لکچر ہال سے باہر نکلتے ہی ہسپانیہ کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اردگرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ویلیٹن صاحب ان سے بالکل غافل، چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

مری بائیسکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ویلیٹن صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگرٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوک دینا شروع کیا۔ ویلیٹن صاحب بولے:۔

"یہ بھی گھڑی کو کنے کا وقت ہے؟"

"میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خدا کرے خواجہ محمد حسین وہاں میرے ٹائم پیس کو کوک دکھیں"۔

"کو تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟"

"اُس میں کیا ہرج ہے؟ بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میرا بھی یہی قاعدہ ہے اور ــــ شاید ... ہر ایک ... عقلمند ......

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ویلٹن صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرف لاابالیانہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فقرے کی صورت میں انہوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا۔

"اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو۔ تو براؤن کل شام کے چار بج کر ۵ ۲ منٹ پر مرا ہے۔"

مجھے ہرگز یقین نہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونک کے میں نے پوچھا:۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۲۵ منٹ پر مرا ہے اور چونکہ چار بجکر ۲۵ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل کے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد اعلیٰ بار رات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خواب گاہ کی چیزوں کو درہم برہم کر دیا گیا۔

میں تحیر، استعجاب، استفہام اور اسی طرح کی بیس تیس چیزوں کا معجون مرکب، ان کے چہرے کی طرف منہ کئے باؤلا کرنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ویلٹن صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگریٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تاریکی میں کہیں اچھال دیا اور بولے:۔

"جب میں نے براؤن کے کوٹ کی تلاشی لی تو اس میں سیٹھ فیروز جی کے بل اور ہوٹل کے علاوہ مجھے براؤن کی جیبی گھڑی بھی ملی تھی۔ جو مجھے یاد ہے کہ چار بجکر ۲۵ منٹ پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کوتاہ بینی سے یہ خیال کیا کہ گھڑی اس لئے ٹھہر گئی کہ اسے کوک دینے والا امر

گیا ہے (مجھے اس وقت یہ نہ سوجھا کہ گھڑی کی چابی پھیر کر دیکھ لیتا) براؤن کی نشست گاہ میں میز پر اس کا ٹائم پیس بھی ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے ٹھہر جانے کی وجہ بھی میں نے یہ خیال کیا لیکن اب مجھے یاد آیا ہے کہ ٹائم پیس کی سوئیاں پونے دس بجے پر ساکن تھیں۔ ٹائم پیس کے ساتھ تو کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ تو اسی وقت ٹھہرا ہے جس وقت اس کی کوک ختم ہوگئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن اپنے ٹائم پیس کو۔۔۔۔اور اگر دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دینا احسن ہے تو دونوں گھڑیوں کو قریباً نو بجے (اغلباً رات کے نو بجے) کو کام کرتا تھا۔ جیبی گھڑی جو چار بجکر ۲۵ منٹ پر ٹھہری ہے تو اس کا ٹھہر جانا اس جسمانی کشمکش کا ایک نتیجہ ہے جو براؤن کو موت کے وقت اپنے قاتل کے ساتھ یقیناً کرنی پڑی۔ اگر تم اور میں جو شاید بہت باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہیں تو براؤن جس کی زندگی کی ہر ایک حرکت بنی تلی اور ہر ایک عادت باقاعدہ اور مقرر کردہ تھی۔ کیا یہ اغلب بلکہ یقینی نہیں کہ وہ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتا تھا؟"

جوں جوں وہ یہ کہتے گئے براؤن کی موت کی ہر ایک تفصیل مجھ پر آشکارا ہوتی گئی ایک دو باتوں کے متعلق پھر بھی میرے دل میں الجھن باقی رہی۔ وہی ویلٹن صاحب کے دماغ میں بھی پھر رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے:۔

" سیٹھ فیروز جی کابل اور دو یا تام سگاروں کے جلے ہوئے باقی ماندہ ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ چارلس ولیم نہ صرف براؤن کے کمرے میں داخل ہوا ہے بلکہ وہاں کم از کم تین چار گھنٹے ٹھہرا ہے (دو سگاروں کے پینے کے لئے کچھ وقت چاہیئے) سو یہ تو تم بغیر خوف و تردد یہ فرض کر لو کہ براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر لانے والا چارلس ولیم ہی تھا اور براؤن کی تبدیلی لباس اور خواب گاہ کی بد نظمی کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ اب صرف دو چار حل طلب باتیں باقی ہیں:۔

اول: یہ کہ کیا چارلس ولیم صرف براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لایا۔ یا کہ قتل بھی اسی نے کیا ہے؟

دوم: یہ کہ اگر اس نے قتل نہیں کیا، تو قاتل کون ہے؟

سوم: یہ کہ اس نے دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ غلط خیال ڈالنے کی کوشش کیوں کی کہ یہ قتل براؤن کے کمرے میں ہوا ہے؟

چہارم: یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا بل براؤن کی جیب میں کیسے چلا آیا؟

براؤن مارا کہاں گیا ہوگا؟ اغلباً اِدھر اُدھر کہیں جنگلوں میں؟"

"شاید۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ مارا گیا ہو وہاں اس کی موت کی ایک یادگار باقی ہے۔ بشرطیکہ جنگلی جانوروں نے اسے وہاں رہنے دیا ہو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کی شام کے وقت پہننے کی ٹوپی۔"

اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے اس قدر متحیر کر دیا کہ میں گرد و نواح کی سب چیزیں بھول گیا۔ ویلٹی صاحب جدھر جدھر مڑتے تھے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا جاتا تھا۔ آخر کار وہ ایک ہوٹل کے سامنے جا ٹھہرے اور کہنے لگے:۔

"یہ چارلس ولیم صاحب کا ہوٹل ہے۔ میرے خیال میں ان کی ملاقات ہمارے لئے فخر اور مسرت کا باعث ہوگی۔"

اس وقت شاید ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنی رات کی محیط تاریکی کے ساتھ ایک ناکامیاب سا خاموش مقابلہ کر رہی تھی۔ ہوٹل کے کمروں کے باہر کہیں کہیں کوئی نوکر پھرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہوٹل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ دفتر کا دروازہ کھلا تھا اور میز کے سامنے دو بابو پیٹھے حساب

کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے منیجر کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا منیجر صاحب ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ منیجر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر گئے۔ چارلس ولیم ایک آرام کرسی پر بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ اور سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ایک خوش نما کنستر اور ایک گلاس اس کی عیش پرست طبیعت کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے پڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی چارلس اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے خط و خال صاف بتا رہے تھے کہ وہ جان ولیم کا بھائی ہے۔ لیکن اس کے تبسم اور جان ولیم کے تبسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جان ولیم جب مسکراتا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف گوئی اور نیک نیتی ٹپکتی تھی۔ برخلاف اس کے چارلس کی مسکراہٹ میں انقباض اور جبر کے عنصر غالب تھے جو اس کے تبسم کو مصنوعی اور ناقابل اعتبار بنا دیتے تھے۔

وہ رسمی لہجے میں کہنے لگا۔

"صاحبان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

ولیٹن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا۔

"ہم یہاں صرف رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں دو سونے کے کمرے دے سکو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

"بہت خوشی سے" یہ کہہ کر چارلس نے ایک نوکر کو بلا کر کہا "ان کو نمبر ۲۲ نمبر ۲۳ میں لے جاؤ۔" پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"آپ کو کھانا تو نہیں چاہیئے؟"

ولیٹن صاحب بولے:

"نہیں صرف کافی کے دو پیالے بھیج دو۔"

ہم دونوں نمبر ۲۲ میں بیٹھے تھے کہ نوکر ایک طشت میں کافی کے دو پیالے لایا۔

ولیٹن صاحب نے اس سے کہا۔

"مینجر کو یہاں بھیج دو۔" یہ کہہ کر ہم دونوں کافی پینے لگے۔ میں نے پوچھا۔
"آپ نے منیجر کو کیوں بلایا ہے؟"

خدا جانے مجھے خاطر خواہ جواب ملتا یا نہ کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ چارلس ولیم اندر داخل ہوا۔ اور ہمارے سامنے آکر ایک خالی کرسی پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ویلٹن صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"مسٹر چارلس ولیم۔ میں تمہارے ہوٹل کی کافی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم از کم باندہ گلی ہوٹل میں اور بھی بہت سی قباحتیں ہیں۔ وہاں کا انتظام کئی پہلوؤں سے ناقص ہے۔ کل ہی وہاں ایک آدمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن میں تو ہوٹل کی بدانتظامی کی نسبت قاتل کی شرافت سے زیادہ متاثر ہوا ہوں کہ ایک تو وہ قتل کرنے کی تکلیف اٹھائے پھر نعش کو اپنے کندھے پر ڈال کر محفوظ جگہ میں لا کر رکھے۔ پھر اس خیال سے کہ نعش کو رات بھر سردی نہ لگے۔ اسے ڈریسنگ گون پہنائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا ایک بل مقتول کی جیب میں چھوڑ جائے۔ تاکہ اس کا پتہ لگانے میں کوئی وقت نہ ہو۔ مسٹر چارلس ولیم! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی کافی کے علاوہ آپ کی شرافت کی داد دوں۔"

میرے کان ویلٹن صاحب کی باتوں پر اور میری نگاہ چارلس کے چہرے پر تھی۔ چارلس کا چہرہ اس طنز آمیز اور پر حقارت تقریر سے تمتما اٹھا اس نے اپنے ماتھے پر ایک پیچ در پیچ تیوری ڈال لی۔ منہ کو زور سے بند کر کے کرسی کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ویلٹن صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی نگاہ چارلس کے چہرے سے نہ اٹھائی غصے کے مارے کہیں تیش میں آکر وہ حملہ نہ کر بیٹھے۔ میں نے ہلکے سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔
ویلٹن صاحب نے نہایت بے پرواہی سے کافی کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

دفعتہً چارلس نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا اور اگر میں ایک لمحہ بھی توقف کرتا تو کرسی پورے زور میں ولیٹن صاحب کے سر پر آپڑتی۔

چارلس نے میرے پستول کی سیاہ نالی کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور بہتر یہی سمجھا کہ اپنے ارادے کو کم از کم ملتوی کر دے۔

ولیٹن صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی:

"امجد چارلس صاحب کو اسی طرح رکھنا۔ میں ذرا کافی پی لوں" ولیٹن صاحب باقی کی کافی پی کر کرسی پر سے اُٹھے اور دروازے کی طرف گئے۔ دروازے کے تالے میں چابی پڑی تھی۔ اسے پھرا کر تالا بند کر دیا اور چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔

دروازہ بند کر کے وہ ہماری طرف واپس آئے اور میرے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے:

"اسے جیب میں ڈال لو۔ میں چارلس صاحب سے لڑنے تو نہیں آیا۔"

چارلس کی طرف مخاطب ہو کر بولے:

"مسٹر چارلس ولیم! ہم نہ تو پولیس کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ نہ پولیس کو اطلاع دے کر یہاں آئے ہیں۔ نہ اب تک ہمارا ارادہ پولیس کو اطلاع دینے کا ہے (تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ) تم قدرتی طور پر پوچھو گے کہ میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟ میرا تعلق صرف اس قدر ہے کہ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک۔ تمہارا بڑا بھائی میرا دوست ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کو اس سے پہلے زندگی میں کتنے صدمے اٹھانے پڑے ہیں کس قدر مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تمہاری طرف اور اپنے کاروبار کی طرف سے کس قدر تکالیف اور رنج برداشت کرنے پڑے ہیں۔ پہلے بریلی میں تم نے اپنی برائیوں کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا۔ کہ وہ تمہیں علیحدہ کر دے۔ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے وہ اپنے نوکروں کی بددیانتی کا تختہ مشق بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر دو سال تک وہ ہوٹل سے نقصان اٹھاتا رہا اور اسی وجہ سے

اس نے بریلی کا ہوٹل چھوڑ کر باندہ گلی میں اپنے سرمائے سے یہ ہوٹل جاری کیا۔ پھر اس کو معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ میں شرمناک طرح پر زندگی گزار رہے ہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس کا دل تمہاری ذلیل زندگی کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ لکھنؤ جا کر تمہیں وہاں سے لے آیا اور اپنے پاس سے روپیہ دے کر مری میں تم سے یہ ہوٹل کھلوایا اور شکر کیا کہ بالآخر تم نے از سر نو شریفانہ رویّہ اختیار کر لیا ہے اور اب اس قتل کی وجہ سے اس کے ہوٹل کی جو بدنامی ہوگی۔ اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا نوکر فیروز خاں قتل کے الزام میں گرفتار ہے۔ گویا تم میں شرافت اور صداقت اس درجہ مر چکی ہے کہ تم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھ لوگے۔"

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بتدریج بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہوتے گئے۔ انتقام، غضب، استفہام، توجہ، نرم دلی، ندامت و افسوس سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک کر چلے گئے۔ لیکن ویلیٹی صاحب نے اپنی تقریر اس وقت ختم کی جب انہیں چارلس کے ماتھے پر اور اس کے کندھوں کے پیچھے ہٹنے میں ہمت اور مردانگی کے آثار نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا۔

"فیروز خاں ہرگز پھانسی نہ پائے گا۔ آپ اطمینان رکھئے جو کچھ میں نے کیا، بہت بُرا کیا اور میں از حد شرم و ندامت کے ساتھ اس وقت اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور شاید میں کبھی قتل نہیں کر سکتا۔"

"اچھا۔ تو میں نے اچھا کیا کہ میں تمہارے پاس آیا۔ اگر تم سارے حالات ہمیں سنا دو، تو میرے یہ دوست ساتھ ساتھ لکھتے جائیں گے۔"

ویلیٹی صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب میں سے نوٹ پیپر اور پنسل نکالی جو میں

تھیا گلی سے ساتھ لایا تھا، نکال کر پھیلائے اور ویلنٹن صاحب سے ان کا قلم لے کر جو جو چارلس کہتا رہا، لکھتا گیا۔

وہ تحریر نہ تو اس وقت مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے اور نہ اس کا یہاں ہو بہو نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ چارلس جب جمعہ کے دن باندہ گلی گیا تو شام کو چائے پینے کے بعد براؤن کی طرح وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ سامنے سے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے سات آٹھ گز نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے زمین پر سے اٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کنپٹی کو ایک مہلک ضرب آئی تھی۔ اور وہ مر چکا تھا چارلس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کا نام و نشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے باندہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام ٹی براؤن ہے اور یہ باندہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے پہلے تو اسے خیال ہوا کہ باندہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک بڑا ذلیل خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ باندہ گلی آکر اس نے پانامہ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا اور وسکی کا ایک پیگ پیا۔ اور پھر ہوٹل میں آکر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود ادھر ادھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا قریباً گیارہ بجے براؤن کی نعش کو اٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا اور موقع پا کر نعش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا اور خواب گاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو قتل اسی کمرے میں ہوا ہے اور یہ سب باتیں اس نے بھائی کے حسد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا باندہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ رات بھر براؤن کے کمرے میں رہا۔ جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی بیشتر

اس سے کہ باندہ گلی کا کوئی آدمی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔

میں اس کا سارا بیان لکھ چکا تو ویلنٹن صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے رکھ دیئے اور کہا "ان پہ دستخط کر دو۔" کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے اس کے بعد ہوٹل کے دفتر کے ایک بابو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتلائے بغیر اس کے دستخط بھی بطور گواہ کے کرائے گئے۔ پھر ویلنٹن صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے لفافے کے اوپر مجھ سے پتہ لکھوایا:-

سب انسپکٹر پولیس۔ باندہ گلی

معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ ضلع ہزارہ۔ ایبٹ آباد

لفافے کو ہاتھ میں لے کر چارلس سے کہا:

اس لفافے کو میں ابھی ڈاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے باندہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں کے کہیں پہنچ سکتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری یہ تحریر فیروز خاں کی رہائی کے لئے کافی ہوگی۔

دوسرے دن صبح ہم باندہ گلی پہنچے۔ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے ۲۵ نمبر کمرے میں، میں اور ویلنٹن صاحب آرام کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ویلنٹن صاحب اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سامنے بیٹھا خاموشی سے سگرٹ پی رہا تھا اور دل میں کل کے واقعات کو ایک ایک کر کے دہرا رہا تھا۔

ویلنٹن صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا۔ تو میں نے پوچھا:

"وہ سیٹھ فیروز جی کا بل براؤن کی جیب میں کس طرح آگیا؟"

"سیٹھ فیروز جی کا بل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا

بل نکالا تو اسے پڑھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فیروز جی کا بل رکھا۔ مری جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر پھر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فیروز جی کا بل بھی چلا گیا۔"

"اور ہاں۔ آپ نے خاص مجھے نوٹ پیپر لانے کو کیوں کہا تھا؟"

"میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیپر ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے تھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے میرا پتہ لگا سکتا تھا اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیر سی خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکر گزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیپر خریدنا قرین مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیپروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکر گزار ہوں تو میں کیا کروں؟"

جو جی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یہ یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا۔

ڈیر مسٹر احمد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر ٹی براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو ناانصافی اور گمراہی سے بچانے میں آپ نے بہت سا حصہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام محکمہ کی طرف سے آپ کی بے غرضانہ مساعی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقۂ تفتیش کی تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہی بخشیں تو سب حالات کو پولیس جنرل میں شائع کر دیا جائے۔ اُمید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے فخر بخشیں گے۔

آپ کا مخلص

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔

جناب عالی۔

مسٹر براؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے چارلس ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب انکشافات مجھ سے ایک بدرجہا اعلیٰ دماغ کے غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔"

شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے کسرِ نفسی ہی سمجھیں مگر میں اور کیا لکھتا۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

قدیم یونانی حکما اور اُن کے خیالات

(۱)

مصنفین فلسفے کی تاریخ کو عام طور پر حکما کے اُس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر ملاطیس میں آباد تھا۔ یہ حکما مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے وہ دیکھتے تھے کہ یہ دنیا عالم کون و فساد ہے اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے مگر باوجود اس کے کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل از سر نو شروع نہیں ہوتی اور نہ کبھی دائمی اختتام ہی پر پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر آخر یہ تغیر کس چیز کا ہے وہ ایک چیز کیا ہے جو مختلف ہیئتوں میں آ آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کونسا ایک مادۂ بنیادی ہے جو متغیر ہو ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک معمہ تھا۔ جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکما نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

سب سے پہلے تھیلس نے پانی کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد این ایکسی منڈر آیا اور اس نے کہا کہ یہ مادہ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ این ایکسی مینیز نے اس کو بخارات سمجھا جو رقیق حالت میں حرارت پاکر آگ بن جاتے یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہو کر ملاطیس کو تاراج کر دیا اور حکماء

کے اس گروہ کا اپنے مرز دبوم میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ مگر انہی ایام میں میلا طیس سے کچھ فاصلے پر شہر افیس میں ایک فلاسفر ہرقلاطیس نامی موجود تھا جو میلاطیس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلاطیس کو دنیا کی سب باتیں قابلِ تاسف وافسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اس لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور ہو گیا جس طرح سے کہ دیمقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک" کے نام سے پکارتے تھے۔ کیونکہ اس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔

ہرقلاطیس کے نزدیک کائنات کا مادہ بنیادی آگ ہے وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوت فکریہ بھی اس ابدی آگ کا ایک حصہ ہے جس سے سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا آخر الامر دھواں بن جانا خیال کی اس بے ترتیبی اور بے نظمی کو ظاہر کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اس نے بھی اور حکما کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اس نے بہت زور دیا ہے وہ خود مسئلہ تغیر ہے تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آبِ رواں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا۔ دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ جب اشیاء کی حالت ہر لحہ بدلتی رہتی ہے۔ تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں۔ وہ ہمارے منہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے کیونکہ وہ چیز بذاتِ خود اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لئے کلام کرنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اس جملے کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں

دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی دریا سکون کی حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بظاہر ایک دریا ہر آن ایک نیا دریا بن کر ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہرقلاطیس کے مسئلہ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قرطالیس نامی ایک فلاسفر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قرطالیس ہرقلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی قرطالیس کا شاگرد تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اُس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سُنا اُس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جو ازل میں جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم بھی ہمیشہ کے لئے درست اور کارآمد ہو۔ یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہرقلاطیس اور اُس کے پیرو مسئلہ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ان معنوں میں قائلین مادیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خطِ تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے۔ جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا اور آخر میں اُس نے منزل پر پہنچنے کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے اُس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنہوں نے اخلاف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ اُن کا حال اُن کے ہمعصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اُس کے حالات زیادہ تر یا

نوارسطو فانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا تو یہی دفعہ وہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا گیا اور اس کے کچھ حالات نامور جرنیل زینوفون کی اس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں۔ جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطو فانیس۔ زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اسکے اپنے استاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیئے جن پر وہ سقراط کے بتلائے ہوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا۔

ارسطو فانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہل ایتھنز کا نمائندہ بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی ہنسی اڑائی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات اور یہ منطقی بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے ازحد مضرت رساں ہیں۔ برخلاف اس کے زینوفون سقراط کو ایک کامل رہنما۔ روحانی مددگار۔ پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک سچا نمونہ اور اُن تمام لغو اور بے ہودہ خیالات کا جو قوم کی اور گھرانوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہو سکتے دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کن کن مختلف زاویہ ہائے خیال سے ایک ہی شخصیت کو اُن دو طریقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دماغی ترقی کے زمانے میں اس زبردست ہستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اُس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں برقی رو کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی۔ لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی۔ جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی۔ جن کو اُس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہیں۔ سقراط منطقی یاوہ گو نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اُس کو الہام ہوتا ہے اور خدا نے اُس کو ہدایت بنی نوع انسان

کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک انوکھی بلاغت بخشتا تھا۔ اُس کی آزاد زندگی اُن تمام بندشوں سے رہا تھی جن کی وجہ سے ایک دنیادار پابہ زنجیر ہوتا ہے اُس کی روش میں منصب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلےٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطوفانیس جو سقراط اور اس کے عقائد کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلوئے حیات ہرگز نہیں بتاسکتا تھا جس پہلوئے حیات نے افلاطون اور افلاطون کی طرح اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہلِ حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹادے۔ سقراط اگرچہ چاہتا تو جیسا کہ قانون اُس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کر سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا۔ مگر اُس کے پیروؤں میں سے اکثر ایسے متمول تھے۔ جو اُس کے لئے بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وہ چاہتا تو اس کی ایک جنبشِ ابرو کی تعمیل میں اُس کے بے شمار دوست اُس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقی ماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرنے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اُس پر لگائے گئے۔ ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا جنھوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس نے بذاتِ خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اُس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں

کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبط نفس کا مادہ پیدا ہوگیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بدعنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلنے لگے اور پاکیزگی اور نیکوکاری کو اپنی زندگی کا مقصد اعظم سمجھ کر اُسے ہمیشہ اپنے مدِّ نظر رکھنے لگے۔ تخریب اخلاق کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایام جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اُس کے مشہور جانبداروں میں سے افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا اور زینوفون ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں داخل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ہر قلاطیس کے عقیدۂ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اشیائے تغیر کی وجہ سے اُن کا علم بھی ہر لحہ متغیر ہونا چاہیئے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اُس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوتی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم ہمیشہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتلائے ہوئے راستوں پر چل کر اس علم صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقہ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ اُن دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سوفسطائی" سمجھتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے۔ وہی فعل بعض اور واقعات کے ماتحت "بدی" بن جاتا ہے جس پر خطر زمانے میں ایسے بے ہودہ خیالات سے راست رو زندگیوں کے عقیدے متزلزل

ہونے کو تھے اور اخلاق انسانی ایسی کج بحثوں سے معرض خطر میں تھا۔ اُس وقت سقراط آگے بڑھا اور اُس نے اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اُس نے کہا "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے۔ کسی اور حالت میں برا ہو اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری بیان کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے پوری طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں" مگر ہم یہ بھی نہ کہیں گے "کہ ہم جانتے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے" کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف تھے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے۔ پوری طرح واقف ہوں۔ مثلاً سچا منصف بہادر وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر کے اس کے معنوں کی توضیح کریں۔"

سقراط کے ان خیالات نے کہ انصاف بہادری وغیرہ وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور اُن کے معنوں کی تحلیل اُن کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے۔ افلاطون کو اندھیرے میں شمع ہدایت دکھائی۔ ہرقلاطیس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رُوح تاباں کے آگے شک و گمان کی ایک دُھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی۔ جس کو سقراط نے اپنے انوار ادراک سے تار تار کر دیا۔ یہ حقائق محسوسات کے زُمرے سے باہر ہیں۔ جن اشیاء کا احساس ہمیں اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اُن موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی محمول ہوتی ہے۔ مگر اس موضوع کو بذاتِ خود ادراک سے تعلق ہے۔ نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ عام محسوسات کے علاوہ جس میں اشیاء ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا ایک اور دنیا حقائق ابدی

کی بھی ہے اور ان حقائق کا علم بھی اُن ہی کی طرح ابدی ہے۔ عالم متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقتِ ابدی ملحق ہے اور جو رشتے ہم عالم متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں اُس میں اس حقیقتِ ابدی کا علم صحیح مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے۔" تو اس فقرے میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے زمرے تک ہی محدود رکھے مگر افلاطون بہ آسانی اس سے بہت آگے چلا گیا اور اُس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط اب خط ج د کے مساوی ہے۔ مساوات کے علم کو تسلیم کرتا ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقتِ ابدی ہے۔ جس کا احساس حواسِ خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے "مساوات" بذاتِ خود جو کل تھی وہ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ گو کل ہمیں معلوم ہو جائے کہ خط اب اور خط ج د درحقیقت آپس میں برابر نہیں۔

یہ مسئلہ حقائقِ ابدی افلاطون کی تعمیرِ فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہی ہے۔ افلاطون ان حقائق کو اپنی زبان میں IDEAS کہا کرتا تھا۔ یہ لفظ اب تک انگریزی زبان میں موجود ہے مگر اس کے معنی اب ان معنوں سے بہت مختلف ہیں۔ جن معنوں میں افلاطون نے اس کو استعمال کیا۔

(۲)

بیکن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مشعلِ حکمت ہر ایک شخص کی شمع سے روشن کر لیا کرتا تھا۔ افلاطون کی نسبت بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہرقلاطیس اور سقراط کے علاوہ اور بھی بہت سے قدما کی تعلیم نے اس کے دل و دماغ کی خوابیدہ قوتوں کو بیداری اور گمراہ خیالات کو ہدایت بخشی۔ اس نے بہت سا اقتباس فیثاغورثیوں سے کیا۔ جن کے ساتھ اُس کے آقا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ فیثاغورس مسیح سے قریباً ساڑھے پانچ سو سال پہلے جزیرہ ساموس

میں پیدا ہوا۔ یہ جزیرہ ایشیائے کوچک کے ساحل کے ساتھ ہی واقع ہے۔ جہاں سب سے پہلے وہ یونانی حکما تدریس کیا کرتے تھے۔ جو بعد میں اُن یونانی نو آبادیوں میں جا بسے اور جن کی وجہ سے جنوبی اٹلی "یونان اعظم" کے نام سے مشہور ہے۔

فیثاغورس نے ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ جس نے کچھ عرصے کے لئے قرطانکی حکومت پر غلبہ پا لیا۔ ملطیسی حکما نے اپنے فلسفے کو مذہب کے ساتھ تعلق دینے کا خیال نہیں کیا۔ دیوتا سے اُن کی مراد کوئی ذی شعور لائق عبادت ہستی نہ تھی بلکہ اس نقطے سے اُن کا مطلب محض نظام مادی کا ایک بڑا عنصر تھا۔ فیثاغورسی مذہب نے اگرچہ ایک طرف اُن وحشیانہ توہمات اور رسوم کو جن سے لوگوں کے اعمال اور خیالات کنارہ کش ہو چکے تھے۔ از سر نو رواج دے دیا۔ مگر دوسری طرف اپنے تناسخ اور عقیدۂ دوام روح سے عظمت فرد یہ اور انسانی زندگی کی ذمہ داریوں کے احساس کو لوگوں کے دلوں میں بڑھا دیا۔ اُس نے یہ بات دنیا کے دل نشین کرا دی کہ انسانی ہستی قابلِ وقعت اور لائق حرمت ہے۔ اس کو سطح آب پر محض ایک حباب نہ سمجھنا چاہیئے۔ انسان ایک ایسی حقیقت رکھتا ہے۔ جس کے لئے حسن آتش سوار یا چشمکِ برق کی تمثیل کسی طرح سے شایاں نہیں ہو سکتی۔ ملطیسیوں کی طرح فیثاغورس علاوہ حکیم ہونے کے عالم بھی تھا۔ اب تک اس کو ہندسے کا بانی سمجھا جاتا ہے اور علم موسیقی میں سپتک کا موجد بھی اسی کو بتایا جاتا ہے۔ افلاطون کے زمانے میں فیثاغورسیوں کی شہرت نہ صرف بحیثیت عالی دماغ حکما کے تھی۔ جو انسانی روح کے انتقالات پر غور و خوض کیا کرتے تھے بلکہ ساتھ ہی وہ جید ریاضی دان اور موسیقی کے ماہر بھی شمار کئے جاتے تھے۔

ریاضی اور مذہب دونوں میں فیثاغورسی عقائد نے افلاطون پر بہت سا اثر ڈالا۔ افلاطون خود بھی بڑا ریاضی دان تھا۔ کہتے ہیں۔ اس کی درسگاہ کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ہندسہ نہ جانتا ہو اس کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ فانی مادی حقائق کے ابدی حقائق کے

موجود ہونے کا مسئلہ فیثاغورسی بھی اپنے عقیدے میں ظاہر کر چکے تھے کہ کائنات کی اصلی بنیاد اعداد میں پائی جاتی ہے۔ پہلے پہل فیثاغورس کو اس بات کا خیال اس وقت آیا جب اس نے یہ دریافت کیا کہ موسیقی میں نغمے کا انحصار سُروں کے تناسب پر ہے ساتھ ہی ساتھ جب طبیعات کے دائرے کے وسیع ہو جانے سے بہتیرے مظاہر قدرت کو ریاضی کی پیمائشوں اور عرض و طول کے مسائل سے تطابق دیا گیا تو اس خیال کو اور بھی تقویت مل گئی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاطون کے دریافت کردہ حقائق ابدی میں علاوہ اعداد کے اور کئی باتیں شامل ہیں۔ مگر افلاطون اور افلاطون سے بڑھ کر اس کے پیروؤں کی یہ عادت تھی کہ وہ ان حقائق کا ذکر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا۔ فیثاغورسیوں کی طرح ریاضی کی اصطلاحات میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدۂ حقائق ابدی اور فیثاغورس کے عقیدہ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائد روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائق ابدی کی غیر فانی دنیا (جس میں کہ روح اپنی عقل اور ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جانچتی ہے) اور فانی تغیر پذیر۔ مادی دنیا کے درمیان قائم ہے۔ عالم ادنیٰ یعنی موخر الذکر دنیا کے مختصات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے۔ یہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو بذاتِ خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں۔ جب یا تو ان کو کوئی دوسری چیز حرکت دے یا (جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے) خود ان کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی کارپردازی یعنی کی وہ کیفیت نفسی ہے۔ جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقت ابدی کو سمجھتا ہے۔ تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ کہ روح بھی اُن حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ افراد کون و فساد کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے اور اُن کے لیے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا

سکتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ تسلسل اور روح جو اس انتقال لامتناہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روح کائنات تھی۔ نہ زید۔ عمر۔ بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوئی ہے اور نہ صرف حقائق ابدی کی فہیم ہے۔ بلکہ ان اوہام اور خواہشات کا مصدر بھی ہے جو ہمارے فانی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفتر خیالات میں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف اُن نتائج کا نام ہے جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و فکر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں اور اگر فلسفہ سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق اُن غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو اُن کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے۔ مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علم حقائق ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں یا غلط۔ اس لئے جہاں پر ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے فہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہیئے۔ جس کی کوئی بات علم حقائق ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کرنی چاہیئے۔ افلاطون کے مکالمات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا۔ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ یہ بات درجہ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس ذاتی رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی ریاضی کے سوال کا صحیح حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو

فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ اغلباً یہ بات اُس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اُسے بھولا ہوا تھا۔ جب اُس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اُس کی یاد تازہ ہو گئی اور اُس نے فوراً صحت حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اغلب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا کہ ہر ایک روح جون بدلتی رہتی ہے اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اُس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ، بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیروؤں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آواگون سے رہائی اور اس زندگی کے رنج و کرب سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی ایسی مکتی کا خیال نہیں کیا۔

فیثاغورسیوں کے علاوہ افلاطون اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی ممنون تھا۔ اس فرقے کو فرقۂ ایلیائی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرمانیدیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر ایلیا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلیطس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرمانیدیس کے خیالات ہرقلیطس سے بالکل ہی متضاد جانب کو ہیں۔ ہرقلیطس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے اور فرمانیدیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سرے سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب کبھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقام ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ مگر جب شروع سے کوئی خلاء یا موجود ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرمانیدس کا یہ خیال تھا کہ کسی ایسے

خلاف تھے لاموجود فیہ یعنی نیست کے عمل وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیست بھی ہست میں شامل ہے جو نتیجے کے سراسر خلاف ہے۔ نیست کا عمل وقوع تصور میں آنے سے انکار کرتا ہے اور جس چیز کو تصور سے گریز ہو۔ اس کی حقیقت فرمانیدیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات نے اس کو یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ کسی قسم کی حرکت انتقال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا فریب ہے در اصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر غیر متحرک ناقابل انتقال حقیقت ہے۔ جس کی نوعیت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی سالم ناشکستہ وحدت میں کہیں تقسیم حصص یا تفریق و تمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متلون نقشہ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اس یکرنگ مرقع سے بہت مختلف ہے۔ مگر ہمارے حواس جیسا کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم و ادراک سے پرکھ لینا چاہیئے اور فرمانیدیس کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور ہم فریب خوردہ ہیں۔

افلاطون جس کی بلند پرواز طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر و گردش سے رہائی اور مکمل سکون و استقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بیدردی سے پامال کر دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمانیدیس کے ساتھ ہم خیالی پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ عقائد کی رو سے ہر ایک حقیقتِ ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمانیدیس کی واحد الوجود اور سالم الوجود حقیقت کو اس متلون اور سراپا فریبِ نظر دنیا سے ہے جس کی حواس ہمیں تلقین کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمانیدیس وحدتِ حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرتِ حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالمِ حقائقِ ابدی اور عالمِ محسوسات ان دونوں میں سے ہر ایک میں کثرت و تفریق ضرور ہے علاوہ برآں افلاطون عام صوری کو بالکل ہی موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالمِ صوری ہست و نیست کے درمیان ایک برزخ ہے

کیونکہ اس کا وجود تو یقینی ہے مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمانیدیس اس کو بالکل خالی از حقیقت عاری از وجود اور نیست محض خیال کرتا تھا۔ فرمانیدیس کا حرکت جیسے امر الواقع سے انکار اس کے ہم عصروں کو اس کی سمجھ کا پھیر معلوم ہوتا تھا اور وہ عدم حرکت کو خلافِ قیاس سمجھتے تھے۔

فرمانیدیس کے ایک مشہور شاگرد زینوؔ نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلافِ قیاس نظریہ کی حمایت یہ کہنی چاہی کہ جب ہم اس (بقول معترضین) "اظہر من الشمس حقیقت الامر" یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی (اگر زیادہ نہیں تو کم از کم فرمانیدیس کے عقیدے جتنی) خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر محاصرہ ٹرائے کا نامور جانباز اقلیس جو اپنی سرعتِ رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہہ دینا بڑا ہی آسان معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا۔ اب فرض کرو کہ اقلیس کی رفتار کچھوے سے دس گنا ہے اور کچھوے کو شروع سے سو گز کی رعایت دی گئی ہے۔ یعنی وہ پہلے ہی سے سو گز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اقلیس وہ سو گز کا فاصلہ جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہے طے کر چکے گا۔ تو کچھوا اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اقلیس اور کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اقلیس وہ دس گز طے کرے گا تو کچھوا اقلیس سے ایک گز آگے ہوگا جب اقلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوا ۱/۱۰ گز آگے ہوگا علیٰ ہٰذ ... الی لا نہایت کچھوا اقلیس کے آگے ہی رہے گا۔ زینوؔ کا ایک اور بھی اسی طرح کا معمہ ہے جس کو معمائے پروازِ تیر کہتے ہیں۔ جدید متحرک تصاویر کے اصول سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالتِ پرواز میں ہو کسی خاص معین وقت پر فوٹو لیا جا سکتا ہے جس کا مطلب یہ کہ وہ اس نقطۂ وقت پر جب کیمرے کے روزن کو کھولا گیا ساکن تھا اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ اس سے گویا وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔

اور اگر وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معمول نے ہمیں یہ ثابت کر دکھانے میں بڑی مدد دی ہے کہ ساخت اور مدت دونوں کو مسلسل اور ناقابلِ تجزیہ تصور کرنا چاہیئے یعنی جس طرح ایک عدد اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ نقطوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریق مخالف کی بات کو مان لینے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بعید از عقل ہیں۔ یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (DIALECTIC) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں پورا ماہر تھا اور افلاطون تو اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقۂ تدلیل سمجھتا تھا کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے لفظ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدما میں سے انقصاغورث کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم میلا طیسی حکما کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا۔ مگر کچھ عرصے تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر فرقلیس کے ساتھ بطور صلاح کار اور رفیق کے رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل مبرا اسی مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جیسی کی کہ ہماری پامال روندی ہوئی حقیر زمین تو (نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارد) اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا قہر و غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس زمانے میں (اور سقراط کے وقت میں بھی) جمہوریت حکومت بے مذہبی معاملات میں آزادیِ خیال کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ انقصاغورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر اعلیٰ طبقوں پر پڑتا تھا۔ جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ اوّلین میلا طیسی حکما میں سے کئی ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ مگر

ان کا یہ نظریہ اس عقدے کے حل کرنے میں ناکام رہا۔ کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی خاصیتوں میں اس قدر تباین کیوں ہے۔

انقصاغورث کا خیال تھا کہ پہلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر متفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں۔ جہاں سے بعد میں ہر ایک کو ہمارا نفس علیحدہ کر کے سب کو نظم و ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی مختص جگہ پر متعین کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انقصاغورث کے اس طرح نفسِ انسانی کو بطور ایک مرتب اور ناظم کے اہمیت دینے سے سقراط کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ترتیب نظامِ قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکما کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا۔ اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انقصاغورث نے اتنا کچھ کر کے یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تفرسیحات بحیثیت ہر ایک کے استعمالات کے کیونکر مقرر ہوتی ہیں۔ اس مسئلہ پر اس نے خود اپنا دماغ لڑایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں سے تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب اور ان کے اعضائے اور قوائے کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے۔ کہ یہ دنیا کسی بڑے عقلمند اور رحیم صانع کا کام ہے اور یہ عالم عالمِ شہود ہے۔

(۴)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر اتفاق تھا کہ یہ دنیا عالمِ شہود ہے اور مختلف حقائقِ ابدی ایک ہی نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام اُن فواید پر مبنی ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے متجسس ادراک کی تشفی صرف اسی خیال سے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیاء ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب عمل

جب ہی معلوم ہو سکتا ہے جب کہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظام عالم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لئے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام ہمیشہ فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف "جمہوریت" میں اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے ان "سرپرستوں" کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنا کر دہ ایک کالج چھوڑ گیا۔ جو بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا سب سے بڑا مرکز رہا۔ ۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینن نے اس کا ذریعہ آمدنی ضبط کر لیا۔ تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ اُن نوجوانوں میں سے جنہوں نے س کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطا طالیس بھی تھا جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطۂ خیال کا ہوتا ہے یا اسطا طالیسی۔ ان دو یونانی حکماء کو بلحاظ اُن کے ادراک کے رجحان اور طریقۂ فکر کی نوعیت کے قوت فکر کی دو متضاد اقسام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے حقائق حیات کو چشم و گوش کے معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کا توسن عقل و فہم اس میدان میں جولانی کیا کرتا تھا۔ جو تجربے مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے اُس کی طبیعت افلاطون کی طرح آتنا در‌ون نہ تھی۔ وہ صحہ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس ر تجربے کی مدد سے ایسے نتائج پر پہنچتا تھا۔ جن کا اثبات مشاہدے کی بنا پر ممکن تھا۔ اکثر اگر غور دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات سفے کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ افلاطون پکا منطقی تھا اور ارسطو اس قدر مقید اور محتاط تھا جس قدر اس کو سمجھا جاتا تھا۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک

میسر تھا۔ مگر وہاں کا طرز تعلیم اُس کو پسند نہ آیا اور اُس نے اُس کالج کو چھوڑ کر خود ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہوگیا تھا مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقائد پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ جن سے اُسے اتفاق نہ تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارسطو افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو ان باتوں پر جن میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا۔ بہت کم زور دیتا ہے۔

ارسطو افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائق ابدی کا علم ہے۔ جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائق ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جواہر) سے جن میں وہ منقسم، یا "منقول" ہوتے ہیں۔ علیحدہ نہیں سمجھتا۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا طریقہ بیان نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرسکے جو اگرچہ اس نوع کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بذات خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس تعلق کو "شرکت" کا تعلق کہا جاسکتا ہے مگر اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا ہے۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا۔ جس طرح مختلف جسامت کے چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے آکھڑے ہوں۔ تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق سائبان کا تھوڑا یا بہت حصہ اُس کے اوپر ہوگا یا دوسرے پیرائے میں ہم اس تعلق کو نقل کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نقلیں ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ نمونے سے ہم نوع کی تعبیر کے لئے ایک اور

ہوتہ فرض کرنا پڑے گا اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہوگا۔ ہم اس تعلق سے اتنا ہی آگاہ ہیں جتنا کہ جزو کل یا اصل و نقل کے تعلق سے ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی قابلیت یا نا قابلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ یا کم سمجھتے ہیں۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائق مشترکہ محض زائیدہ خیال اور ہمارے وہم وگمان کی پیدائش ہیں۔ مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا۔ وہ ان کی ہستی کا بلا تعلق دماغ انسانی قائل تھا۔ ورنہ علم طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے موہوم باتوں کے سوا کچھ نہیں رہتے۔ ارسطو نے مختصات کی دو قسمیں کی ہے۔ مختصات ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور مختصات صفاتی (مثلاً عظمت۔ سفیدی۔ عقلمندی وغیرہ) مختصات صفاتی۔ مختصات ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور مختصات ذاتی صرف کلام میں افراد موضوع سے علیحدہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص "شکل" (FORM) ہوتی ہے۔ انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں "روح" کہا جاتا ہے۔ اُس کا جسم جو تمام حرکات وافعال کے لئے روح کا محتاج ہے۔ روح سے بالکل متضاد ہے۔ اس کو "مادہ" کہتے ہیں۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جا سکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے۔ ایسے قضایا کو "کلیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیاء ایک قسم کی ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیاء کی ترکیب عناصر اربعہ خاک آب آتش باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے امفدا قلیس نے جو چوتھی صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا۔ عناصر قرار دیا۔ روایات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ

اٹناکے دہانے میں پھینک دیا تھا تاکہ اس کے اس طرح ایک دم غائب ہوجانے سے وہ لوگوں میں دیوتا شمار کیا جائے) یہ عناصر اربعہ جو چار خواص بنیادی۔ حرارت۔ برودت رطوبت۔ یبوست سے پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف تناسب میں ترکیب پاکر مختلف اجسام بن جاتے ہیں اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کرسکتی ہے۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ عنصر خامس کا بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی نوع کے اور افراد کا تسلسل ضروری نہیں۔

اس مختصر بحث سے یہ تو ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ارسطو نے اس بارے میں اپنی توجہ کو زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک ہی محدود رکھا اسی سے اس نے افلاک کی ابدی گردش کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ غیر ذی روح اشیاء کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح اشیائی حرکت کو خود زا نہ سمجھتا تھا۔ ذی روح اشیا کی حرکت کی علت ہمیشہ علاوہ ازیں حرکت ہوتی ہے۔ یہ علت تصادم سے تو نہیں مگر ان اجسام کی خواہشات کو اکسانے سے اُن کی حرکت کا باعث ہوتی ہے اور اس لئے ضروری نہیں کہ وہ خود متحرک ہو۔ کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہوسکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام اشیا کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متحرک محرک خدا ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود اُن کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ افضل خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیا اس کی طرف کھینچ کردہ جاتی ہیں وہ کسی

کی طرف کھنچ کر نہیں آتا۔ ایسی اکمل۔ اعلیٰ اور بے نیاز ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو اُس کی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کا بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی اور ابدی ہے نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے وہ اکمل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

ان اشیا کی حالت میں جو غیر ابدی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت ہے۔ ایک دوسری مکمل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو ان کے ارتقا کے اول ترین مدارج کا پتہ اس انتہائی صورت سے لگاتا ہے جس کی طرف اس ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ترین ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ علت مادی۔ علت صوری۔ علت فاعلی اور علت غائی۔ غیاث اللغات مصنفہ محمد غیاث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آں را سبب نیز گویند بر چہار قسم است۔ سبب در مسبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود بالقوۃ۔ آں را علت مادی گویند بہ تشدید دال چوں نسبت چوب با سریر۔ واگر داخل بود بالفعل آں را علت صوری گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشد یا مسدس۔ واگر خارج بود اگر آں سبب موجد او ست۔ آں را علت فاعلی گویند چوں نجار۔ اگر ایجاد برائے آنست آں را علت غائی گویند چوں جلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور موخر از ہمہ علت ہا ست و در ذہن و تعقل از ہمہ مقدم علت غائی غایت و منتہائے جمیع علتہائے اربعہ است و بدانکہ اطلاق علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ روا ندارد۔ چرا کہ حق تعالیٰ در خلقت اشیاء محتاج بغرضے نیست۔ اگر بنظر دقیق دیکھا جائے۔ تو سوائے علت مادی کے باقی علل ثلاثہ مائل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ نجار اسی حد تک علت سریر شمار کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ وہ تختہ کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال

(علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز کا ہو سکتا تھا۔ گویا علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو متشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل اربعہ پھر وہی بات ظاہر کرتا ہے کہ تمام عیر ابدی اشیا کے دو تقابلی پہلو ہیں۔ اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پاکر ایک مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل وصورت رکھتی ہیں (مثلاً سنگِ مرمر) کسی دوسری حالت میں کسی اور چیز کا "مادہ" بن جائیں (مثلاً سنگ مرمر کا بت) مادہ بغیر شکل وصورت کے نہیں مل سکتا۔ ایسی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے خدا (ارسطو کے خیال کے مطابق) شکل بغیر مادہ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ارسطو اگر کسی شغل کو خدا کی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک شغل علم ہے۔ اسی لئے وہ انسان کے لئے اس کو اعلیٰ ترین اشغال جانتا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "اخلاقیات" میں کہتا ہے کہ تحصیل علم سے ہی انسان اپنی سب سے اشرف قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے اسی بات میں اس کو دوسرے باشندگانِ زمین پر ترجیح دی جا سکتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی مسرتِ قلبی کا باعث ہو سکتی ہے۔ چونکہ انسان ادراک محض نہیں بلکہ ادراک اور حیوانیت کا ایک معجون مرکب ہے۔ اس لئے یہ مسرتِ قلبی تمدنی اور معاشرتی فرائض کی پابندی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً ایک حیوان متمدن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سوسائٹی میاں بیوی اور بچوں کی ہی ہو۔ مگر ارسطو جس کو سب سے ارفع زندگی سمجھتا تھا وہ صرف آزاد اشخاص کے مہذب فرقوں میں ہی پائی جاتی ہے اور اس کا اپنے علم اور یقین کی بنا پر یہ خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی نسل ہی آج تک ایسی مدنیت کے قابل ہوئی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اس قسم کی مدنیت کے آئین کا خاکہ کھینچا ہے اگرچہ اس کے اپنے ہی ایک شاگرد (سکندر اعظم) کی بادشاہت میں پرانی مدنی حکومتوں کے

الحاق اور ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ مگر ارسطو کو کبھی اس انقلاب کا خیال نہ آیا۔ اس کے دماغ میں ایک مہذب حکومت وہی ایک چھوٹی سی خود مختار دولت مشترکہ ہی ہو سکتی تھی۔ جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اور جو اتنی بڑی نہ ہو کہ اس کے تمام باشندے معاملات جمہور میں ذاتی حصہ نہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کے لئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لئے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا روزمرہ کا کام غلاموں کو سپرد کر کے حکومت کے لئے وقت نکالنا چاہیئے۔ طریقہ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا۔ کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قوموں کی قومیں اپنی اس ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے ایک خود مختار حکمراں انتخاب کر لیتی ہیں۔ جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزاد دول مشترکہ میں سیاسی مساوات حقیقی مساوات کی بنا پر ہونی چاہیئے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذاتی برتری کی وجہ سے باقی سب پر ممتاز ہو تو سب کو چاہیئے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مان لیں۔ علاوہ بریں تمول اور افلاس کی تمیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون تو کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے اور سلطنت کے "سرپرست" (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند، اپنی بیوی، اپنا بچہ، اپنی ماں، اپنا باپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا وہ "ہرچہ از یار ماست از ماست"، سے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ دو قریبی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی

دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولت مند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ روپیہ مالداروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ بھوکے ننگوں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

" پطرس "

کہکشاں۔ مارچ ۱۹۱۹ء

سر محمد اقبال

وہ انسان جس نے اُردُو شاعری کو مردانہ پن بخشا

اقبال کی وفات سے ہندوستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہوگیا۔ وہ بطور ایک عالم متبحر اور نازک فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم کے بھی ان لوگوں کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی اعلےٰ شاعری تک رسائی سے قاصر تھے۔ منبع فیض وجود تھا۔ بطور شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا۔ لیکن ادبی اور عمرانی دنیا میں اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلندتر تھا۔ اس کی وفات سے جہاں مسلمانوں سے ایک فصیح اللسان پیغامبر اور ان کی تہذیب کا ایک بہت بڑا شارح چھن گیا ہے۔ وہاں اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی دراز مدت کے لئے اہمیت اور منزلِ مقصود چھن گئی۔

کم و بیش چالیس سال گزرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری اگرچہ لوگوں میں مقبول تھی اور ہر کس و ناکس اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں۔ بلکہ محض زندگی کے حاشیہ کی تزئین سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقبول عام فن تھا۔ مگر یہ فن محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت شاعری کیا تھی؟ محض جذبات انگیز عیاشی، نرم و نازک، دل خوش کن، مزاحیہ یا ہجویہ، لیکن سراسر بے ربط۔ اسی لئے اس کے اختیار کرنے میں سنجیدگی اور متانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا اور لوگوں کی زبان پر تعمیراتِ ملت اور ترقی کے الفاظ آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے آرٹ کو پھر ڈھونڈ نکالا کہ یہ بھی انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلیٰ سنجیدگی اور مقصد و مدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ حالی ایسا غزل گو عہدِ شباب کی ہوس کاریوں سے تائب ہو کر مشہور زمانہ مسدس کا مصنف بن گیا۔ جس نے خوابِ غفلت کے متوالے ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑ کر جگایا کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کر سکی۔ انہی حالات میں اقبال جس نے اسی فرسودہ ڈگر پر اپنی شاعری شروع کی تھی۔ محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے احیا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بے قرار ہے۔

ہندوستان ہمارا

اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس ولولۂ عمل سے بے تاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذباتِ محبت کا پتہ لگتا ہے۔ اس کی نظم،

"سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے"

بے شک فرقہ وارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ پُر اثر اپیل ہے۔ جو کسی محبِ وطن کے قلم سے نکلی ہو اور اس کا شہرہ آفاق گیت "ہندوستاں ہمارا" میرے خیال میں بہترین قومی گیت ہے۔ جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا اور جس سے بہتر گیت کی شاید مدت مدید تک بننے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے غائر مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا۔ اس کے افقِ خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور اس کی نسبت سے قوموں کا تعصب اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور اپنی گفتگو میں، وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں

تقسیم کرنے کی بے ہودگی ثابت کیا کرتا وہ ایک ایسے تمدنی نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے اور جو زندگی کو ایک مقصد و مدعا بخشے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا بامقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت العلل کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور بامقصدیت انہیں نظر آئی تو اسلام میں یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

مجازی خیالی دُنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص غم ناک کیفیت موجود ہے۔ ہم میں شاید ہی کوئی فنکار ایسا ہو جس کے فن میں گھر کے لئے اداسی بطور مرض کے موجود ہو۔ ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزومند ہیں اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بے پناہ دل کشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پرشوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بہ منزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے۔ ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب اور اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدردان اس سے چھوٹ گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور

ہوتے ہیں، جو صرف اس لئے ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیئر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کولرج کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت "انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں" اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اُردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرارِ خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے انگریزی زبان میں ملتا ہے تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھیں، خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا (اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا) اسی لئے اس کے یو۔پی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہے اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغ کا معنوی فرزند تھا جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار پہلو ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے اگر افراد کے وسیع اثرات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو نئی اور مختار صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زوردار اور چٹکیلی زبان سے مالا مال کیا

جس سے وہ پہلے قطعاً ناواقف تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور تیزی بخشی۔ جس کا راز انہوں نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے وقت پا لیا تھا لیکن چھپے مضامین یا پُر اثر وعظوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ جدید اردو کے بنانے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیش رو غالب) ابھی تک سب سے نمایاں اور زبردست اشخاص رہا ہے ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادانِ فن نے گھڑے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ از صوفی ریاض حسین)

غنچۂ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر

نیاز مندانِ لاہور

حال ہی میں تمکین کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسومہ بہ غنچۂ تبسم حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں ایک دیباچہ کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر روزگار کے قلم سے ہیں۔

کچھ عرصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ مُلّا کتاب شائع کرتا ہے تو حاجی اس پر دیباچہ لکھتا ہے۔ حاجی قلم اٹھاتا ہے تو مُلّا اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ من ترا مُلّا بگویم تو مرا حاجی بگو۔ یہاں تک تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہلا کی کثرت ہے اور ہمارے اہلِ قلم اتنی دقیق باتیں لکھتے ہیں کہ جب تک ایک مصنف کے نکات اسی پایہ کا دوسرا مصنف بمجردِ اشاعت لوگوں کے سامنے حل کر کے نہ رکھ دے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے لیکن "غنچۂ تبسم" کے ایک نسخے کے ہمراہ چار چار حکمائے زبان کا پرچۂ ترکیب ارسال کرنا زیرے کے منہ میں اونٹ کے برابر ہے۔ تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے کیا ان کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ جب تک چار آدمی انہیں کندھا نہ دیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیباچے بھی ایسے کہ ان سے نہ تو تمکین صاحب کی شانِ سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ دیباچہ نویسوں کی شانِ سخن فہمی ہی دوبالا ہوتی ہے البتہ فطرتِ انسانی کے

اس اہم اصول پر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔ یہ شروع شروع میں شیخ سعدی کی آڑ ہم نے اس لئے لی کہ ہم بہرحال ناظرین وقارئین کے کثیر التعداد گروہ کے چند غیر معروف افراد ہیں اور دیباچہ نویس حضرات بہرحال اہل قلم، لہذا خدا کے بعض برگزیدہ بندوں میں سے ہیں ورنہ جو بات اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں۔ ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں۔

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا "سرآغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے دوسرے دیباچے کا نام "املام"، تیسرے کا نام تاثر"، چوتھے کا نام تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا مقوی نام نہ مل سکا ہوگا) یہ ثقالت الفاظ کتاب میں جابجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو "مندرجات" لکھا گیا ہے کتاب کا تفسیری عنوان" مجموعہ نگارشات نگاہی" ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرۂ قرطاس" اور "ملنے کے پتے" کی بجائے "سبیل ہائے اصول" اور قیمت کی بجائے "نذر" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے۔ تو مجبوری ہے۔

ہاں تو ہم تمکین صاحب کے "سرآغاز" کا ذکر کر رہے تھے چار دیباچوں میں اپنی تعریف کروانے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نخوت نہ ہوئی تو انھوں نے خود قلم اٹھایا شروع میں تو لکھ دیا کہ "بنام خداوند بخشائش گر مہرباں"، لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا لیا اور تین صفحوں تک انا الحق ہی کہتے چلے گئے۔ جابجا تاریخوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانۂ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آتے۔ ۱۹۲۷ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور اوائل ۱۹۳۱ء میں معروف زیادہ رہتا تھا اور اولی اللہ مدیران رسائل نے مضامین کے لئے

مارے تقاضوں کے نام میں دم کر دیا۔" آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ جا بجا کوشش کے لفظ پر ہم نے خط اس لئے کھینچ دیئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوبصورتی سے کوشش کی ہے۔ مساعی جمیلہ غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب اسی طرح کی پھسپھسی اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ "ترا ملک دکھن تو دکھنیچ بول" لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں:

"میری مادری زبان اردو ہے، اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں:

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا۔"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟

تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں کئی دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں:

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے۔ مگر میں اس بدذوقی کا مخالف ہوں جنہیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے۔"

الحمدللہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال آیا کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بدمذاقی نہیں؟ ہر دیباچہ میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ڈائرکٹری تک چھپوا دینا بدمذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بدمذاقی نہیں۔ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بدمذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا جہاں اتنے گوناگوں و بوقلموں عنوان قائم کئے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ آپ "کاتب" کے متعلق فرماتے ہیں کہ زود نویس ہیں مگر:

"حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں۔ جنہوں نے اِملے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیئے"

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعوےٰ نہ فاضل ہونے کا اور خدسے کے واسطے یہ تو بتایئے کہ یہ "املے کی غلطیوں" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی انشے کے اصولوں کے مطابق لکھا اور کاتب صاحب کی کم سوادی کو آخر آپ کہاں کہاں پیش کرتے پھریں گے کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایلجنبن" کو ہر جگہ "ایلگزنان" لکھنا بھی انھی کے سر تھوپیے گا؟ کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتح پوری کے "اعلام" کے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی، پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچے کا آغاز یوں ہوتا ہے،

"غنچۂ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکاہات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو نکاہات

میں شامل کرتا ہوں۔ اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ وہ نورنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں۔"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکاہات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں"، "کتنا بھونڈا فقرہ ہے "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے۔ ہم اصلاح کے ذمہ دار نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلے فقرے کو یوں لکھنا چاہیئے تھا:

"غنچۂ تبسم"، جناب تمکین کاظمی کے فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے"

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو فکاہات میں شامل کر کے اتنے بڑے بڑے جمادات سے ہم حیوانات کے سر پھوڑنے کی کوشش فرمائی ہے اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی۔ علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماما پر ناراض ہوئے۔ دل غصے سے بھرا ہوا تھا چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہارِ ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے لیکن ماما کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ جھنا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی اضلاع ہو۔" ماما بیچاری دیکھ کر رہ گئی۔ یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زناٹے سے کہہ دیا کہ میں الف، بے کو جیم میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی اور یہاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑ لیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کر دیا ہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔"

(کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی اسی رعب ڈالنے کے سلسلے میں کر گئے؟) اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ

طبیعات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کونسی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابلِ قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعوےٰ پوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دورِ حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیشِ نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، ورجینا وولف، کیتھرین منسفیلڈ، مڈلٹن مرے۔ پروفیسر گیرڈ، ولسن نائٹ، وغیرہم کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاح نگار ہے؟ یہ فہرست ادبی نقادوں کی تھی لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ معدودے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا گہرا کیا ہلکا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ اے ل برٹرنڈ رسل جو دنیا کے مشہور فلاسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی پر کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے بھولے سے بھی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یورپ اور یورپ کا ہر شعبہ علم اور تنقید اور تنقید کی تکمیل ہر بلٹ میں اپنی ٹانگ اڑا دی تو وہ کس جہاں کو اپنا مخاطب بنا رہے تھے؟ ایسی باتیں تو دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہئیں۔ ان کو سپردِ قلم کر کے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشاپردازی کا کمال ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:۔

"جناب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

پہ پر "آپ نے خوب لگایا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں یعنی فقرے سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پہ لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں) فقرہ بہرحال بھونڈا ہے یعنی اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہیئے تھا

"وہ اس صنفِ ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

نہ یہ کہ وہ" اس صنفِ ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس صنفِ ادب "پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"فکاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔

سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں"

دوسرے فقرے میں "دونو" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ" جو محاورے یا اصطلاحات گوارے سے کانوں میں پڑے ہیں ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آجاتی ہے۔ تو تھوڑی دیر کے لئے سماعت مشوش ہو جاتی ہے" ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیر خواری کے زمانے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہیئے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجئے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے اس میں اُن اہلِ زبان ہی کو آپس میں نپٹنے دیجئے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجئے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں کس بھول پن سے فرماتے ہیں کہ فکاہی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے" (یہ "کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے

خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اب ہم تم اَن پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ نگار ہی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نہ انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل اور بات اس دھڑلے سے کی ہے گویا چلتے چلتے فنِ تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگِ میل ہی تو نصب کر گئے ہیں۔ ایسی بے سر و پا بات کی تردید کوئی کس طرح کرے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرطِ فرصت اس کا جواب ضرور لکھا جائے گا۔ اتنا ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر برگسوں کی کتاب موسوم بہ "خندہ" یا میریڈیتھ کا مضمون ضرور کسی سے پڑھ لیں۔ کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ نیاز صاحب "یورپ کے ہر شعبۂ علم" کو جانتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لئے فرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مصنفوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی نو مشق ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے کہ نیاز صاحب کا آفتابِ شہرت نصف النہار پر تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کہنہ مشقی کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے۔ جن موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کا دائرہ ماشاء اللہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ان کے شوقِ انشاپردازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا یا کم از کم اگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرہ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"تاثر" مولانا احسن مارہروی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے شروع میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو (کہ لہجہ بدلے تو معنی بھی بدل جاتے ہیں) بڑے طمطراق کے ساتھ گلے کی رگیں پھلا پھلا

کرا ور ایک حد تین چار نمبر دے کر بیان کیا ہے اور سیدھی سادھی بات کو وہ اُلجھایا ہے کہ آشفتہ بیانی کو ہمیشہ کے لئے احسن مارہروی کا مرادف بنا دیا ہے ما بعد اس مقدمے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (قارئین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو از حد غور سے پڑھیں)

"غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب ترتیب میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اس کی تدریجی حالت عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر، ہندی مواعظ، اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب تنوعات کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کے لئے ضروری اور جزو لاینفک ہیں۔"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے ان میں سے کوئی صاحب اس کا فانی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں۔ کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گنوانے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں۔ بہر حال احسن صاحب کی پروفیسریت کے سامنے آکر ہر فقرہ اس زور سے زانوئے ادب تہ کرتا ہے کہ مطلب تو پچک کر باہر نکل جاتا ہے اور لفظوں میں گٹھنے پڑ جاتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک دو صفحے لکھ کر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچۂ تبسم تمکین کاظمی
ایسا مذاق جس میں متانت ہے لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے۔ اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرتِ داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر، کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ احسن صاحب سے ہم اور تو کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی تو لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۳ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ضرور لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی علمی سند نہیں محض چندہ دیتے رہنے کی علامت ہے یعنی اگر ہندوستان میں افلاس نہ ہو تو بھیل گونڈ تک سب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہو سکتے ہیں۔ اہلِ دانش کے نزدیک اس کی وقعت تو آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور پھر یہ لوگ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس کے بعد خطوط وحدانی کے اندر لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا خاص جارج پنجم کے دست مبارک سے سند پائی ہے ان سے ہماری درخواست ہے کہ ابلہ فریبی کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے سے تو "مبارک (شکار پوری)" لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکار عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔ اور ظریف وہ جو حد سے سوا ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف تحریر لکھ رہا ہوں۔"

ماشاء اللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے! گویا ظریف تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔

(یہ نکتہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کتم عدم میں انتظار کر رہا تھا کہ بیسویں صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے جو اسے معرض ظہور میں لائیں گے) ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں اگر یہ صحیح ہے تو ہر بڑے سے بڑا بے وقوف، ہر نادان بچہ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں بعینہٖ لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (بسیار نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھئے:

"اگر کنوئیں کے برابر گہری اور آفتاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو۔۔۔۔"

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے۔

ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی لئے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مداح ہیں فرماتے ہیں:۔

"ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں۔ اور چھپوا رہے ہیں اس سے حضرت ضیاء الملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے۔ جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین مضمون لکھ ڈالے تو وقت پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ملا رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بدذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ

انھوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے درگزر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بدذوقی ایسی ہے کہ علانیہ ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا انھوں نے ملا صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے۔ حد درجہ قابلِ نفرین ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا اور وہ بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے اور اپنی ظرافت نگاری پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لئے اور بے شمار باتیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہیئے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم بھلا کیوں پیچھے رہ جائیں، جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ "اس ہنسی مذاق میں کہیں ہمیں نہ بھول جائیے۔ ملا صاحب ظرافت نگار سہی لیکن کتاب تو بہر حال ہماری ہے۔ ملا رموزی نے کہا ہے۔" ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ مزید آپ کو حیدرآباد بلاتا۔" (سخن سنج لوٹ لوٹ گئے۔ ہاہاہا) ملا صاحب نے کہا۔ "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً اخفی قلم سے جواب دیا کہ "کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں" (ہاہاہا) ملا صاحب نے کہا: "ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جائیے۔" آپ نے نوٹ اپنا دیا کہ "مسلمانوں عبرت حاصل کرو۔" (ہاہاہا) ملا صاحب نے کہا۔ "اللہ انہیں منصب دار بنا دے" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہمیں اب بھی ہے۔" (معزز مرفہ الحال لوگ فوراً مرعوب ہو گئے) سبحان اللہ کیا اچھی پھلجھڑیاں ہیں۔

تقریب کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا رموزی کا

کی طرح بیانگ مرل ایم۔آر۔اے۔ایس (لندن) ہیں ۔ان میں صراحۃً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنایتۃً ادعائے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زور قلم خودنمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ اسپنسر، میتھیو آرنلڈ، گاردان رسکن، لنکن اور ایمرسن کے اقوال نقل کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو نہایت نیک دلی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنا دیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور لنکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط ـــــــ

احسن مارہروی صاحب کی طرح سیدی صاحب کا مذاقِ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" تو "حسن پرستی" کو "عشق پرستی" بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینت کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے:۔

تو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں
نہ تم شستے تو پتھر تھے جو تھے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ تو خیر پھر بھی گزارے کے قابل ہے۔ لیکن پہلے مصرعے میں جیسے بیلچوں سے بھرتی کی گئی ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

سیدی صاحب کو اسی پائے کے اشعار اور کہنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر کو نوٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا:

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عموماً خضاب کہتے ہیں

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے اور اس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سیدی صاحب کچھ ایسے تذبذب میں

پڑ گئے کہ انہوں نے اس کے نیچے حیثیت قوسین میں اقبال کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سعیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصہ میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو صدرجہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا بے درجے کی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباواجداد کیوں بھگتیں اور پھر اچھی بات بھی بے محل کی جائے تو بری معلوم ہوتی ہے تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریرات ایسی بھی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے بیقرار ہو جائیں۔

دوسرے حصہ میں سعیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر فرداً فرداً تنقید کی ہے۔ یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ سعیدی صاحب کے پاس خیالات کی قلت ہے اسی لئے بیچارے کسی کی تعریف کرتے وقت بےدست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

۲۔ پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

۳۔ فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

۴۔ امتیاز علی تاج صاحب نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے۔

اس کے بعد ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائگی کے (یا شاید اسی کم مائگی کی وجہ سے) معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً

"اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل

طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا۔"

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا بچہ واقف ہے "اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا" "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مصداق ہے۔ یہ شغل سعیدی صاحب ہی کو مبارک ہو۔ ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے:-

"بہر حال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے۔"

ذکر تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں۔ سعیدی صاحب شاید "کامل" کے معنی نہیں جانتے انہوں نے اسے بھی "خوب" اور "عمدہ" کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے ــــ آخر میں سعیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد یہ قول ان کے "بہت کافی ہو گئی ہے" بہت کچھ زہر اگلا ہے چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے تو کیوں۔ اس لئے ہمیں سعیدی صاحب کے زوردار فقروں میں بجز چھچھورے پن اور سوئے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر ہمیں سعیدی صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے جو لوگ تمکین صاحب سے رشک کرتے ہیں ان کی دماغی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

خاتمے پر ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذ اللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں سوار ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں۔ اور باوجود اپنی زنگ خوردہ تلواروں اور اپنے فرسودہ ساز و سامان کے سمع خراش نعروں کے ساتھ روحِ ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوت مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ برا بھی لکھتے ہیں اچھا بھی لکھتے ہیں جب ہندوستان میں ادب و انشا کی یہ حالت ہے

کہ ہر چلے بڑے کی کہت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی نخوت کے بلبلے پر چھید کرنا ان پر احسان اور اُردو خوانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو خاموشی، متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آرا سے مستفید ہوتے غلط آرا کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کم از کم اخلاقاً ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے۔ انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے۔ ایک صاحب ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری مؤدبانہ عرض ہے کہ شمہ بمقدار علم رکھیں۔ چلو بھر پانی میں گز بھر نہ اچھل پڑیں۔ عالم وہی ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علمانہ رہے۔ بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دفعہ قلم سے جو نکل جائے اسے نظر ثانی تک کا محتاج نہ سمجھنا جہالت کی نشانیاں ہیں۔ لنکن کا قول ہے۔

"تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے لئے دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے فصحائے زیر بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آ گئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدرآباد، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "لائیو تو قلم دان" کی آوازیں بلند ہوں گی گو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آئیں بائیں شائیں کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے آگے آپ خود سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجئے خواہ الگ الگ نبرد آزمائی کیجئے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو بلکہ آپ سے "مجھا نپلزم" تک کے متوقع ہیں۔

باقی رہا "غنچہ تبسم" یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے جو بلاری فواحشات سے پر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاحیہ نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے تعفن کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔

انارکلی، مخلص صاحب اور ہم نیاز مند

نیاز مندان لاہور

دسمبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک نظر" کے عنوان سے "ایک مخلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو بوجوہ بے حد دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار سائبیریا کی آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہر سطر میں گز گز بھر اچھلے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعتِ ظرف چلو بھر سے بھی زیادہ نہیں اور ملتو بھی ایسا جس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی کو لیجئے کیونکہ مخلص صاحب نے اپنا زورِ قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح سے طرح طرح کی کریہہ آوازیں نکلتی ہیں کہتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے وہ بجائے مبارکباد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ دل سے چاہتے ہیں کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہوگا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ وہ آئندہ ذمہ دار لٹریچر سے کوئی واسطہ نہ رکھیں انارکلی کا ڈرامہ تو اتنا بھی بھاری بھر کم نہیں جو پڑھے لکھے تو درکنار معمولی واقفیت کے آدمی کو ہی بہلائے یا اس پر رعب ڈال سکے اور تاج صاحب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ فوراً اسے دریابرد کر دیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا دہلی کسی دوست کو تار بھیجیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے مخلص صاحب کو ایک ہلکا سا جلاب دے دیں تاکہ یہ قراقر رفع ہو جائے اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب خدا بڑے ہو جائیں گے اور کچھ تھوڑا بہت پڑھ لیں گے تو پھر بڑے بھاڑی اور تڑے بھڑی کی تنقید سے بھی شوق فرمالیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ایسے ہی نحیف دماغ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہو گی اب تو ماشاءاللہ اہل زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ خدا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہو۔ یوں تو "اہل زباں" کی یہ چھیڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کو ہانکتے ہانکتے ادب کی دم میں بندہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چکنا پات لگا ہو اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بد اخلاقی کا ثبوت دیا ہے وہاں بیس تیس جگہ اپنی علمیت بھی ضرور جتائی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ساختہ علم ان کی بے ساختہ جہالت سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ لیکن مخلص صاحب کی ان خصوصیات کا پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں (زور دار بکھرے، یہ ہے موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ "اہلِ زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لئے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ژولیدہ بیانی ایسے نقادوں کی خاص صفت ہے مثلاً فرماتے ہیں:

"انار کلی... تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سبجیکٹو) ڈرامہ ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی بد ملاوٹ سنائیں گے۔"

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دہلی جا کر مخلص صاحب کے دارالمطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ جھروکے سے جھانکیں تو ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سبجیکٹو ڈرامہ دہلی کا محاورہ ہے یا لکھنؤ کا؟ کیونکہ الفاظ گو انگریزی ہیں۔ لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض ناواقف ہے اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ دریافت کیا ہے کب ہوئی اور اس کا کولمبس کون ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے شکارپور کے سفر کے دوران میں وہیلر کے بکسٹال سے ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی۔ جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوشگوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب مصنفہ لال بجھکڑ سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ:۔

"(انار کلی) ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، فکشن اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہئے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونہ عبرت ہونا چاہیئے۔"

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا۔ کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور اس اظہارِ علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ عطار گوید کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے

خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جیسے انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بھگار کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل"، کس خانے میں ڈالئے گا۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ"، کو کیا قرار دیجئے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے بھی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سرفہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جب کہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں ہیمو بقال کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مروا سکتا ہے۔ اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟

بر سبیل تذکرہ۔ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہیئے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ "کیوں بے تو نے جوانی میں ہیموں بقال کو مارا تھا؟" اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کر کے ساتھ رکھنا پڑا۔ کئی فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی۔ کئی پیراگرافوں کو از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ کئی فقروں کے معنے جوتشیوں سے پوچھنے پڑے اور اس دوڑ دھوپ کے بعد مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کو بہ قول ان کے "خلش" تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں:

" اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں (مضمون کا رقبہ اسی قسم کی تکرار کا ممنونِ احسان ہے) کہ انار کلی لکھ کر آپ نے اس کی باعظمت سیرت تباہ کی ہے۔"

اس سلسلے میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دیئے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ:

" اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے وہ آپ کے اکبر والے کردار سے بالکل نہیں ملتی۔ "

جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے (اس کا جواب مختصراً تو ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشاپرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہیئے۔ اس کی انشاپردازی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشاپردازوں نے تباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد سمجھ میں آتا ہے)

پھر آپ فرماتے ہیں:۔

" ڈرامہ نگار کی تعریف یہی ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلاف فطرت نہ ہو۔"

مخلص صاحب یہ دوسری بات کہنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ یہ فقرہ جو کہیں سے سن پایا تھا جوں کا توں اپنے مضمون میں رکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر اکبر کے کیریکٹر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کہی یا کی وہ انسانی فطرت

کے منافی ہے۔ اور بجز جنات کی امداد کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دیئے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کئے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے ہیموں بقال پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔

یہ خلافِ فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب گانٹھنے کو کہی تھی اصل مطلب ان کا وہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک روزانہ انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد موٹے موٹے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی تو ایک عالی وقار علم دوست روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور جوان خوابوں کی تعبیر کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شاندار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پاکر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک دل انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لئے وقف کر دے خواہ مرتے وقت صرف یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو محض ادبیات ڈرامے کے متعلق کسی سڑی بُسی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبانی مغلِ اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں۔

فلاں کنیز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف ریختی لکھنے کے لئے مسالہ مہیا کر سکتے ہیں تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات نہ صرف انتہا درجے کی ادب ناشناسی بلکہ انتہا درجے کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلا تشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں تو اس میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے اس سے یہ بدسلوکی کی۔ حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اُڑاتے رہے پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتلایئے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے رُخِ انور پر ایک تھپڑ رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ لیکن اس نقادی میں بھی آپ کو کیا مزہ آئے گا کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوعِ تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں :-

"میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلیہ شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہوگا جس میں شاہانِ سلف کے سفر و حضر کے جبین مناظر اس طرح دکھلائے گئے ہوں گے کہ بسنت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ دو آتشیانہ منزل (جھروکہ) سے لگا لگا دیوان خانہ عام ہے جس کے صحن کے بیچوں و بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے۔ اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا جبین بازو ہی نورتن سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشنِ نوروز

کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ رنگ تو دکھا دیا ہوتا کہ ملک تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی۔ یعنی یہی کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود دار امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ کر کے دونوں گھرانے کو ایک کیا۔"

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے سے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انارکلی کا لکھ رہے ہیں نہ اس سین کا حسرت ناک انجام کیوں کر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی۔ چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں:

"اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو......"

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آگیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نورتن ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے۔ کہ تاج صاحب انارکلی کا قصہ تو تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے۔ کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انارکلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہرحال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہیئے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین غرناطہ

کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علمبردار ہے اگر غرناطہ بہت دور ہے تو کم از کم توزک بابری کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ بابر بہر حال اکبر کا رشتہ دار تھا اور بقول غلص صاحب وہ "بہنگ رفتگاں" میں سے تھا۔ آخر میں ایک ہیں آل انڈیا مغل کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے غلص صاحب کو تاریخی کلچر" کا درد تو بہت ہے۔ لیکن ان کا مذاق ایگریکلچر سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض غلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک دوپہر ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب وقت ہو چکا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے۔ فقرہ یوں ہونا چاہیئے تھا:

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی معصومیات کی طرف ضمناً اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا سو چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھیئے۔ ڈکشنری میں دیکھیے۔ اور شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو غلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس فقرے کو وہ بقول خود ابحار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"ستونوں اور محرابوں کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں:

"یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جاتے تو سائے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سائے کا طویل ہونا کہتے ہیں دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے۔ وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اوّل تو ایسے فقرے پر ہے کہ "تم غیبل ہو بیٹھو؟ ..." "تو مضائقہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ۔ جو شخص "اہلِ زبان" ہو کر بھی نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے۔ اس کو کوئی غیر اہلِ زبان۔ بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہلِ زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہلِ زبان ہونا اور بات ہے۔ زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرزِ تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں تکلیف دہ طور پر انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ شیکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی۔ تو لوگ اس پر یونہی معترض ہوتے تھے۔ ادھر ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھچھوری اور کمیل

جیسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ لوگوں کو "بدخنجر اور اسطام" اور اسی مصنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا ہے۔ مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آرد کہ جامہ ندارد۔

"پختہ حسن" اور "پھیکا آسمان"، وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرما دیا کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کر لی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ بجا ہے حضور یہ نئی ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً پختہ حسن صرف مبتدیوں کے لئے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ "اہل زبان کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس ہدی کی گرہ یعنی "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یوپی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے "دنیا کی تو انارکلی انارکلی کہتے زبان خشک ہوتی جا رہی ہے۔ اور تجھے اتنی توفیق نہیں کہ جھوٹے منہ سے دو بول شکریے ہی کے کہہ دے۔"

مخلص صاحب کہتے ہیں: "جھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں یہاں "پھوٹے منہ" چاہیئے۔

اگر جناب مخلص صاحب نوراللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ جھوٹے منہ کے معنی ہیں۔ ظاہرداری سے اور نمائش سے۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور تجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہرداری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریے کے کہہ دے۔

"پھوٹے منہ" کے معنی نوراللغات میں یوں لکھے ہیں "(تحقیر سے) خراب منہ سے' بڑے منہ بددلی کے ساتھ" توسین میں جو "تحقیر سے" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ

جس کو مخاطب کرکے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے گویا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ انارکلی کی ماں اس موقعہ پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے انارکلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے۔ اب یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

" دوسرا اعتراض "سیخچوں دار روزن" پر ہے "سیخچہ" کے معنی نوراللغات میں یہ لکھے ہیں۔ "چھوٹی سیخ" لوہے کی چھوٹی سلاخ "سیخچوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے۔ کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہو تو ممکن ہے وہاں سیخچہ کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے "بزم آخر" پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے ضرور مل جائے گی۔ کبھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پاکر ادھر سے گزریئے تو ایک نسخہ خریدتے جایئے اس میں آپ کو کنٹھا مل کپڑا اور گوش پیچ کی گوٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوتے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابوالفضل کے آئینِ اکبری کا مطالعہ فرمایئے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈرامہ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابیں ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اتنی تکلیف ادا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نوراللغات کو مستند مانتے، نہ بزم آخر کو اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہیئے پہلے اہلِ زبان آپس میں نپٹ لیں۔

جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو درون در چہ کردی کہ برون خانہ آئی

یہ تمام بست و بود ہے اس تنقید کی قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں انارکلی کے اصل موضوع کو مخلص صاحب نے چھوا تک نہیں محض ضمنی اور فروعی باتوں ہی میں اُلجھے رہے خود انارکلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے اردگرد تمام واقعات و کوائف کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش رہے۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انارکلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈرامے کا ممنون ہے اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں؟ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے۔ اور اس میں انارکلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہوگا کہا تو یہ کہا کہ اکبر مست اچھا آدمی تھا۔ سائے دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ہاں سینچ نہیں فلانچ ہوتا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ رہے ہوں گے کہ ارسطو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو محض کنایتہً بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انارکلی کو مس حجاب اسمٰعیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا چغتائی صاحب نے اپنی قلم کاری سے اس ڈرامے کی طباعت کو رونق بخشی۔ تاج صاحب اور مس حجاب یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو معرضِ بحث میں نہ لانے چاہیئے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے نقادوں کو ذہنی اعتبار سے ابھی ہجو نویسی کے درجے

سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا واسوختانہ چڑچڑاپن خود نقاد کے سفلہ پن کی دلیل ہوتا ہے۔ خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہیئے جس سے شہدے پن کی بو آئے۔ یہ مس حجاب اسمٰعیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشاپردازی کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً غلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن غلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیئے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کے لئے ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہیئے۔

غلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چار دانگِ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے" اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ جس بداخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے۔ اس کی اشاعت ایک دودمان عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہیئے تھی۔ غلص صاحب کی نقاشانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن غلص صاحب کا "ذاتی کلچر" شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے۔

ہم اس مضمون کے کسی کھیلنے سے جواب کے لئے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب غلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار، استاد، شاگرد یا ہمنوا۔

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکن) اکابر و مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے۔ ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجموعے کا خیال ایڈورڈ۔ آر۔ مرو (EDWARD R-MURROW) کی ایک تالیف دس آئی بلیو (THIS I BELIEVE) سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکن ریڈیو اور ٹیلیویژن کے مشاہیر میں سے ہیں کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالاتِ حاضرہ خصوصاً خارجی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے اور تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کو غور سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگِ عظیم میں اہلِ انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کہیں خم نہیں کھایا۔ چنانچہ حب وطن عدل و انصاف، جمہوریت، ملت کا خیال، جب بھی ان

کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے بلا سوچے سمجھے اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی اور شدید خطرے کے زمانے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی بات میں بہت مین میخ نہ نکالی جائے اپنی روایات کو پسِ پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرّو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے اور وہی کسی بحران کے زمانے میں ابھرتے کام آتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکیوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا —— دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں۔ چند مضامین ان میں سے اس کتاب میں بھی شامل ہیں اور امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرینکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ پاکستانی اور امریکی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک —— ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا —— ایک بیشتر مسیحوں کا ملک، دوسرا مسلموں کا —— ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ، دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز —— ایک یورپین ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر بھی ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں قنوطیت سے دستبردار، دونوں ایمان کے قائل، جد وجہد کے قائل، عزم و خدمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشری خدمت اہم ترین ضروریات میں سے ہے۔ البتہ امریکہ میں ان خیالات کو بہت کچھ سہولتیں اور گنجائشیں عمل کی نصیب ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ بطن مستقبل میں ہے۔ لیکن فخر و مسرت کا مقام ہے

کہ ہمارے ہاں جو لوگ برسرِ کار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصّہ لینا لابدہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت عرصہ تک سربرآوردہ رہنمایانِ قوم پیدا کرتا رہے گا۔ ان کے خیالات اولوالعزمانہ ہیں وہ بلندی کے خواہاں ہیں ملّت کا احساس رکھتے ہیں۔ معاشری خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ ایمان کو پاکیزہ زندگی کا جزوِ عظیم سمجھتے ہیں اور منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اپنی پسماندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے جیسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو ـــــ

جب میں اس مجموعہ کو اس نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم فی الواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو فرداً فرداً مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم گھبرا جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھئے۔ تو دلجمعی کا باعث ہو گی۔

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

چھُپے چوری

ماجرہ مسرور کی کتاب "چھُپے چوری" کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض یورپین نقادوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ اس سوال نے گدگدایا کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدُا ہوتا ہے ؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تو اُلجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہوسکا۔ آدمی دنیا آدمی دنیا سے اجنبی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مخبر اور غماز کوئی نہیں۔ یہ تو بچھ جلنے سے بھی زیادہ پردہ در ہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی۔ گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی مسلک پر ادروں کے ساتھ ہولیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا بھیس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور سچی سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں، میری زندگی کیلئے ایک لمبی مضبوط سی رسی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں" عورتوں کے ادب کو غور سے دیکھئے تو یہ کلیہ کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو توڑ کر منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھاند جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو رتبہ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے۔ کسی اور صنف ادب میں نہیں کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے فطرت نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دلجمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بُنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہے گا۔ فطرتِ نسوانی نے پنہائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانتداری سے لکھتی ہے، سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا کارنامہ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے۔ ہمارے ہاں ادیب عورتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روئداد جس جرات اور بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے مردانہ ادب کو بھی ریاکاری کے گھونگٹ اُلٹنے پڑے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایک اور جھونکا ہے۔ پہلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نبھایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نبھا رہی ہیں ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہیں۔ انوکھے اور پُراسرار جال۔

ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہاور کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خارپشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی، ٹھٹھرنے لگتے ہیں تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو یہی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ . . . ." میں نظر نہیں آتا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قرب —— ایک بیَر اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جلاپوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس رینگتے ہوئے سانپ سے ڈر آنے لگتا ہے جس فریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں۔ وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے (کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو) تو ہاجرہ کو اس پہ برہم نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسے بھی قدردان ہی سمجھنا چاہیئے۔

"کاروبار" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم ملے جلے پائے جاتے ہیں اور اگر فریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے۔ لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا بھی تو نہیں اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں

یں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی بیوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمر یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائے گی۔

"ایک بچی" کو آپ محروم ماتا کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہوگا نہ افسانہ نگار کو، لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں۔ جن کا حال نادیدہ (ہاجرہ سے پوچھے بغیر) ہمیں سنائی چلی جاتی ہے:

"مجھے جانے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ گلی کے اس مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا۔ میرے اندر ہی اندر کوئی الجھ کر ٹھکنے لگا۔ میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ کر گڈ مڈ کر دوں۔ گلی میں جیسے کوئی نشے میں بہکتا ہوا گزر رہا، مست اور بے پروا، اور مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے نہیں، سینے پر بے کار پڑے پڑے، پہلوؤں سے بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پہ ہالہ بناتے بناتے۔"

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بُن لیتی ہیں تار تار کر کے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے، کتنی گتھیاں تھیں اس جال میں، نہ معلوم ہاجرہ نے بننے سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سلجھایا ہوگا۔ اور دھاگوں کے سب پیچ کیوں کر یاد رہے ہوں گے۔ اس سلیقے کی اصلی قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے وہی آپ کو بتلائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت اسے اپنے لئے کتنا سہل بنا لیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ——— "سرگوشیاں" اور "لاعلاج ——— ایسی ہیں کہ ہمارے جدید ادب کو ان پر فخر کرنا چاہیئے۔ دونوں کا اسلوب ایک دوسرے سے جدا ہے۔

"سرگوشیاں" ایک کردار کی مسلسل تقریر ہے جو اپنی تیز رو میں ماضی کی بانیں بہا بہا کر ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخالکی سی تیز گفتاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر پیراگراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع شروع میں کھلتا ہے۔ جیسے کوئی "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" پکار کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب گہتا کی گزشتہ زندگی کے اوراق ایک ایک کر کے الٹنے لگتے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رقت بسا اوقات دہشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت کا انداز خطرات سے پُر ہے لیکن آفریں کہ ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لاعلاج" .. میں ایک دادی ہے ایک پوتی ـــ دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ نے یہ کہانی پوتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے لیکن مجھے تو پوتی بھی دادی ہی کی طویل اُلجھی ہوئی زندگی میں ایک اُلجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے بکھرے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسنِ انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اگر اُردو میں کوئی کہانی اپنی تکمیل، اصلیت اور حساسی کے اعتبار سے اس سے تک پہنچتی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا کرمین کی بھائیں بھائیں کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کرمین ہی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے۔

"اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی، کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیئے اور ایسے معلوم ہوا جیسے سن و سال کی ایک منہ زور ندی ہے کہ بہے چلے جاتی ہے اور یہ اس کی سطح پر جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت

کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ جڑ اکھڑ چکی اور زندگی کو نہ جانے کس وقت
کوئی پھونک مار کر بجھا دے سکنے کو زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر
بے اختیار بہے چلی جاتی ہے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں
پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی لہریں اسے نگل جائیں......"

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بین ہیں ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا بھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں۔ جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تو ان کا ذہن ٹٹولنا شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک انوٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوتے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں ذاتی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچدار ہوتا ہے۔ جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے۔ جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے، میٹھے، کٹھے پھل لگتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کھائے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا۔ نئی سے نئی جڑ نظر آئی۔ ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جسمانی مظاہر سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اور ہاجرہ کے احساس میں کئی نزاکتیں اور پیچیدگیاں ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگینی بھی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی خلوت شعاری کی وجہ سے روایتی اور مصنوعی "ادبی" زبان سے بہت حد تک مامون رہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تو جیتے جاگتے الفاظ

کے سوال کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف لپکتی ہے ساتھ ساتھ اترا کر اپنی طرف دیکھتی نہیں رہتی اور اس الھڑپن کی وجہ سے بے تکان وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان کے منشا نہ گلے میں اٹک کر رہ جاتیں یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

لیکن الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہرحال ان گنت ہوتی ہیں۔ اور لفظ اکثر ہار ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اسی لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالخصوص ان کی ژرف نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے کہئے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈال لیں ؛

"کوئی ساتھ رونے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں لڑھکتے۔"

" لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے ؟ جامن چاہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے۔ کم بخت منہ کی اودراہٹ چغلی کھا دیتی ہے۔"

"آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

"سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے۔ قلم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو اور سختی سے نب پر زور دے کر کھینچو تو یونہی کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں۔"

"محبت مکڑی کا ایک ایسا جالا ہے جو اگر کونوں کھدروں میں گھستے پر جسم سے لپٹ جائے تو چھٹانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے۔"

"تم کہنا چاہتی تھی کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔"

"تم تو ایسی ٹھنڈی نظر آ رہی ہو جیسے کسی بنگالی قحط زدہ کا چولہا۔"

"اس کے احسانات پر جیسے سڑا ہوا آم نچڑ رہا تھا۔ گھناؤنا اور کڑوا رس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے ذہن کے بیتال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلتے ہوئے فقروں کو بھنور میں پڑی ہوئی سیپ کی طرح نچا ڈالتا ....."

"یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں۔ وہی چند روز بعد ایسی فضول ہو جاتی ہیں جیسے نالا ضگی کا چھلکا....."

"کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا...."

"مگر وہ دونوں اس سے محفوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو....."

"وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسا بے بس اور دردناک محسوس کرنے لگی۔ جیسے جیٹھ بیساکھ میں ریت کے پہلوؤں میں دبی ہوئی گنگا...."

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی ننھی چڑیا چہکتے چہکتے ایک درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔"

"جتنی لمبی عمر ہو اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر سینے بیٹھو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں...."

ماننا پڑے گا کہ ہاجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور جذبے یا خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آئی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے کیوں کر چل سکتا ہے اور جو گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں اپنے دل کی بات کیونکر کہہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے چیز کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی ان کی طبیعت کا اصلی جوہر جو ان کے تین مجموعوں میں چمکا ہے انہیں خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چین نہ آئے گا۔

"پطرس"

چمپا اور دوسرے افسانے

دیباچہ

(مولانا عبدالمجید خاں) سالک (بٹالوی) کے ہاتھ آج ہتھکڑی میں بند ہیں اور صفحۂ قرطاس اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرہ فطرت کے جو خال اس کی قلمطرازی کے ممنون احسان ہیں وہ ہمیشہ چشمِ امتیاز کی پتلی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے کہ جب تک زندان کی چار دیواری سالک کو اہلِ نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے روشن دل کی ضیا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ اگر وہ "گمنام" گمنامی کا شیدا۔ وہ عزلت نشینِ محشر۔ وہ انجمنِ خلوت، اس وقت حراست و بند سے آزاد ہوتا۔ تو یقین نہیں کہ وہ اپنی "گمنامی" کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب کج بین اور نکتہ چیں ثابت ہوتی — ایک وقت اور صرف ایک وقت — جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادبِ لطیف کے خیاباں سے منہ موڑ کر صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبۂ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار و گل گشت میں بھی رنگ و بو تھا۔ بادیۂ وحشت میں آج بھی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہلِ مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے اور اس سے اہلِ درد آج اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ "عشق کی دلہن" سمجھتا رہا اور عورت کے دل کو خواہ وہ "فلورا پارکنسن" ہی کیوں نہ ہو اس کا مجلۂ عروسی۔ اس کی "چمپا" نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی "جندا" کی وفا حسد اور رشک کو پامال کر گئی "بھولا" کی آہ وزاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دیئے اور "سوہنی" کے عشق کا شعلہ اب تک صدیوں کی ہیبت اور تاریکی میں ہمالہ کی برفانی چوٹیوں پر روشن نظر آتا ہے۔

ہمارے شعر و سخن کے آئینے میں عشق کو اپنا چہرہ اکثر دیوانوں کا سا نظر آتا ہے یہاں تک کہ عشق جنون کو اپنا ایک دوسرا نام سمجھتا ہے "سدا بہار ٹالیو کا ہندی" میں عکس اور معکوس۔ اسم اور مسمیٰ دونوں سامنے کھڑے ہیں اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے حواس کو گمشدگی میں ڈال دیں اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالک کی تحریر ساز دل میں ضرور کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے اور بارہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں "بھولا" ایک چھوٹا سا افسانہ ہے لیکن "بھولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار ہندو دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ماتھے پر تلک کا ٹیکہ نظر آتا رہتا ہے۔ "ارشاد" کی کشتی "دیکھتے ہی دیکھتے نیلے افق میں غائب ہو گئی" ہے لیکن اس کے چہرے پر عشق کی دل دوز وحشت اب تک ہنس رہی ہے۔

سالک کو انتہائے جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر ہند اور یورپ کے خوشنما بنگلوں میں اس نے جذبات کو پابجولاں دیکھا تو انہیں رسوا۔ ہندوستان کے دلدلوں اور سرکنڈوں سے جھنڈوں کے [illegible]

چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مرد اور عورت صرف عورت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار۔

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار ہلکے ہلکے درد اور ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا جوانمرد اس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے "ہلالِ عید" جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوئی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بارہا ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشا پرداز وں کے لمبے لمبے فقرے ناکام رہے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو صورت کو معنی سے زیادہ دلاویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے لئے سالک کی "چھرا،، کا ذکر کرنا پڑے گا اور وہ اس ادیب سحر طراز اس شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دار رنگوں کے ذوقِ سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ بے زبان تحریر سالک کی کافرماجرائی کے ہمرکاب ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ حیاتِ ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے مجھے اس کی کبھی جرات نہ ہوتی اگر مجھے یہ فخر حاصل نہ ہوتا کہ میرے نیاز مخلصانہ نے تبسم حوصلہ افزا کو اکثر سالک کے لبوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے نیاز مند آنکھیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

"بھارس" ۱۹۲۲ء

جھُوٹے

صُوفی غلام مُصطفےٰ تبسّم کی کتاب کا دیباچہ

ایسی ہلکی پھلکی کتاب پر جو چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے دیباچہ کا بوجھ نہ پڑنا چاہیئے تھا۔ لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور انسان نے استاد کی بیخ بھی لگا رکھی ہے۔ صوفی تبسّم کو جو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ "والدین" بھی ہیں اور "استاد" بھی، یہ گوارا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلا جائے اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے اس لئے قرار پایا کہ وہ بچوں کو نظمیں سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھوں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چیچوں چیچوں چاچا گھڑی پہ چوہا ناچا"، اور خوش ہو لئے۔ بڑے کہیں گے "چیچوں ہم نے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں۔ اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا۔ وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی ملانا بے فائدہ بات ہے بوجھوں مانا چاہیئے۔

خدا کا شکر ہے، صوفی تبسّم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جن میں پڑوں

پر ناگ ناچتے ہیں اور طیاں پیر کھاتی ہیں اور بڑے موٹے چھم چھم ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں یہ وہ دنیا ہے۔ جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کش مکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔

اس لئے قابلِ رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلا تکلف اس رنگین دنیا میں چہچہا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش ذوق سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں۔ اور جذبے اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دن ہے اور یوں اتوار منانے میں انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد اس میں جا بجا آپ کو نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ سہل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے سہل ممتنع سہل نہیں ہوتا۔ اسی طرح سہل ممتنع بھی سہل نہیں ہوتا۔ دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدر دان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

"پطرس"

دہلی ۵ رجون ۱۹۴۶ء

ایرآن میں اجنبی

ن - م - راشد کی نظموں کے دُوسرے مجمُوعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا اور اسے بلا وجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا کہ میرا ایک شاگرد اردو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا اور میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پہ اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف المدرسین سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دیئے آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق کے ساتھ یو۔ این کی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ ؏

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اور ان کو بیچ میں لا کر دز دیدہ اوقات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بحثیں یو۔ این کے کیفے ٹیریا میں ہوئی ہیں اور ہم آپ نے آپ کی شاعری کو سمجھانے سمجھنے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے مجھے جو محبت ہے اس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بے سود نقادی پر ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو اسے لوگ سننے کے قابل ضرور سمجھیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم "اتفاقات" شائع ہوئی تھی۔ اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعراء پر لعن طعن برابر ہو رہی تھی اور ان کی قافیہ آزادی اور عروض کی بے راہ روی پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا رہے ہیں۔ حتّٰی کہ غزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کئی قوتوں کا ہاتھ ہے جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے۔ ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا جس سے متقدمین بے بہرہ تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے جو اس سے قبل نظروں سے اوجھل تھے۔ ناممکن تھا کہ آپ کی شاعری ایک نیا انداز فکر اور نئی زبان بلکہ نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ نہ لاتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی طفیل کتنے نوخیز شاعروں کی ہمت بڑھی بلکہ راشد کے اسلوب بیان میں تو کچھ ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض معتقدین کچھ زیادہ ہی بہک گئے۔ یہ جاذبیت بلکہ جادو فیض میں بھی ہے لیکن فیض کی کئی ادائیں فضائے نظم میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ سر پتے اور سر پھول میں نظر نہیں آتیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چھپا نوجوان شاعر کو بہت جلد پڑھا جاتا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بزم میں شمع پہلے کس کے سامنے

رکھی جاتے۔ اس قسم کا سابقہ ہی مقصود تھا۔ اس سے تو محض یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے جدید شعراء جو اثر پذیر ہوئے تو ان کے اور آپ کے تعرف نظر کے مابین کیا علاقہ تھا۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دلچسپ فریب ہے جس کے آپ خود بھی شکار ہوئے۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ قطعے آپ نے یکجا کر دیئے ہیں۔ ان میں اس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا جسے عزیز لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کا حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(داخلِ ایران ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق و بُعد ظاہر ہے تاہم جس ذہنی اور جذباتی دنیا میں آپ کی شاعری باغ لگاتی ہے اور ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہو گی۔ سعدیؔ اور حافظؔ اور خیامؔ اور رومیؔ اور نظیریؔ کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کر ہو تے؟ ایران تو ہمارے شعراء کا رضاعی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ اسے ایران (اور عربستان) کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ ایک نئی یگانگت کا احساس ہوا۔ "من و سلویٰ" میں تو آپ ایران سے در پردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں اجنبی ہوں نہیں ؎

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے رضاعی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں ـــــ

خدائے برتر
یہ دارپوشِ بزرگ کی سرزمیں

یہ نوشیروانِ عادل کی دادگاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگارخانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک عجمی ہوں اور "جانِ عجم" سے ملنے آیا ہوں۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریزی کی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے کچھ اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریز دونوں کو بھول گئے اور آپ کے "سیاہ فام" جسم میں ایشیائی روح بیدار ہوئی۔ وہ احساسِ مظلومیت جس سے کم ہی کوئی ہندی ناآشنا تھا اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور وہ غیر کے بے پناہ بھرے ہوئے ستم نے ایک نئے انداز سے آپ کو ابھرا دیا۔ ایشیائیوں کو آپ نے دیکھا کہ ——

قدیم خواجہ سراؤں کی اک نژادِ کاہل ہیں
اور اپنی اجل کی راہوں پہ تیز گامی سے جا رہے ہیں

تو آپ بے قرار ہو کر للکارے ——

ان اونچے درخشندہ شہر دل کی
کہنہ فصیلوں کو مضبوط کر لو!
ہر اک برج و بارہ پر اپنے نگہبان چڑھا دو!
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

ایسے چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعہ میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں وطنی

شاعر بھی ہوئے ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی، اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشدؔ نے سیاسیات کا رخ کیا؟ کیا آپ کی اس نوع کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہلِ مکتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار "سیاسی شاعروں" میں کرنا کور ذوقی معلوم ہوتی ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشفی ہرگز نہ ہو گی۔ کیونکہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے نردبان پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن آپ کی نظر اور بلندیوں پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں۔ جو بعض سیاسیات کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجئے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا منظر واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ پارہ نظم کی حرارت بڑھتی جاتی ہے۔ بات آمریت اور آمر سے شروع ہوتی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے سانحلانی ہے اور جس کی گرفت جنوں کی سی گرفت ہے ۔۔۔

مگر وہ تیری مدد سے گذری ہوئی رازداری\
کہ جس نے تجھے\
اپنے افکار کے قید خانے میں\
محصور سا کر دیا تھا\
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں\
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو\
جہاں ہر عقیدے کو تو\
اپنے الہام کے شیشۂ کور میں دیکھتا ہے۔

جہاں ایک چھوٹا سا روزن بھی ایسا نہ تھا
جس میں ملت کے افکار کی اکلوتی کرن کا گزر ہو
اسی کا نتیجہ کہ اک روز
کہنے کو باتیں بہت تھیں
مگر سننے والے کہیں بھی نہ تھے
اور تھے بھی تو کر ہو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی کہہ کے ٹال دینا محض کسل مذاق ہے یہ تو ایک مرثیہ ہے جو آپ نے خود پسند انسانوں پر لکھا ہے جو خود ہی اپنے زندانی ہو جاتے ہیں۔ اس ہوں کا نقشہ جو انتہائی نخوت کی انتہائی سزا ہے۔

آپ کے نیاز مند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے اور اب تو اس مجموعے نے دوبارہ اس کی تصدیق کر دی۔ کہ آپ کا مزاج شاعری بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے ایک کو الفاظ پر محمول سمجھئے دوسری کو جذبات پر۔ گو الفاظ و جذبات کی یہ تمیز محض بغرض سہولت ہے اس پر بہت توجہ نہ ڈالنا چاہیے پہلے شوکت کو لیجئے۔ ان اساتذہ کو چھوڑ کر جو ٹھیٹھ زبان کے ماہر بھی تھے اور شعر میں اس سے گریز بھی نہ کرتے تھے (بلکہ افسوس کہ بعض اوقات اسی کو شاعری کے لئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعراء خصوصاً پنجاب کے اردو شعراء کے ہاں مسکین اور گھریلو الفاظ ملتے ہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں سجاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اکثر اپنے لغت کو ایران اور عربستان کا جبۂ دوستانہ پہنا دیتے ہیں۔ سرنگوں بات بھی ہو تو اسے "سرنگوں" کہہ کر اس میں کر و فر پیدا کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں یہ شعر جھوم جھوم کے پڑھتا رہا ہے

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر ڈھونڈتا رہا کہ اس میں عجز و ندامت کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ عجز جتنا بھی تھا اس سے لغت کا طنطنہ کہیں بڑھ کر ہے۔ الفاظ ایسے دل کش ہیں کہ معنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اس بارے میں اکثر قدامت پسند ہیں۔ لغت میں کوئی جدت دکھاتے بھی ہیں تو بس اتنی کہ روایتِ ایران سے چند اور الفاظ بطور سوغات کے لے آتے ہیں یا اگلے سال کے فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ ابھی تک ذات پات کے قائل ہیں کہ جو شودر ہو وہ کبھی برہمن کی برابری نہیں کر سکتا اور جس لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اس کی رسائی آستانِ شعر تک کبھی نہ ہو گی اس سے ہماری شاعری پر کئی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ جنہیں کھولنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کتب کب تک ہماری شاعری کو اپنے کندھے پہ اٹھائے پھریں گی اور وہ دن کب آئے گا۔ جب ہمارے شعراء اپنی زبان کو نوازیں گے اور قیامِ پاکستان کے بعد کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں اور اگر ہندوستان میں ہیں تو ان سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم "ہماری اپنی زبان" آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کو ہدف کیوں بناؤں اس حمام میں ہم سبھی ننگے ہیں۔ غنیمت بلکہ شکر ہے کہ آپ پڑھنے والوں کو محض لوتھوں تو نہیں مارتے بلکہ جہاں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں۔ وہاں بھی خون کو گرما ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے آپ کے "دار پوش" اور "دلاک" اور "لباس کبودی" اور "لستان" اور "کور وادی" واللہ سب گوارا ہیں بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے کوہ کافی الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں آپ جب بھی انہیں بلائیں حاضر ہو جاتے ہیں اور ہر خدمت بجا لاتے ہیں ــــــ

شکر اور قہوے کے معلوفِ ارزاں
جو بازار میں انتہائی گراں تھے۔

اس لیے گوارا ہے کہ انھی بلند آہنگوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا فرما سکتے ہیں ——

منو کے آئین کا ظلم سہتے ہوئے ہریجن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے دزدِ شب زمستاں
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بیچ ڈالے گا
ہم کو بردہ فروش افرنگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے سیسے سے
آج بھی کور دکر ہیں ہم سب
جواب بھی چاہیے
تو رو ک لے ہم سے نورِ عرفاں

ایسے شعروں سے محروم رہ جانا کسے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ سیاق وسباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوش کہہ لیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوش اور جذبے کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جائے جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو۔ جب شدت اس حد تک پہنچے تو مزا کچھ تلخ ہو جاتا ہے۔ شاعری اپنی ہی کیاریوں کو روند ڈالتا ہے جیسے بچہ ضد میں آکر چیزیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعراء جوان ہیں یا جوانی کے دنوں میں

انہوں نے نام پیدا کیا اور علاوہ بر آں آزادی (سیاسی یا معاشی یا فنی) کی پیاس سے ہمیشہ ان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لیے اس معاملے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شاعری غالب آئی اور اسے اپنے پیمانے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ نہمت ہیں آپ اس شدت پر وہ قابو نہ پا سکے جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچی ہے۔ جہاں درشتی سے آپ کا قلم نا آشنا ہوا جاتا ہے "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبے کی شدت کے ہاتھوں کند ہونے نہیں پایا۔

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
کہ دیکھی ہیں میں نے ہمالہ و الوند کی چوٹیوں پر شعاعیں

میں معنی کی دو تین تہیں ہیں جنہیں شاعر نے جیسے بے ساختگی کے ساتھ دو تین مصرعوں میں لپیٹ کے رکھ دیا ہے اور "درویش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہوگا ـــــ

یہ درویش
جن کے اب وجد
وہ صحرا کے ویرانی کی ریت پر
تھک کے مرجانے والے
اسی کی طرح سے تھے
تہی دست اور خاکِ تیرہ میں غلطاں
جو تسلیم کو بے نیازی بنا کر

جیعفر کی فرد میوں ہی کو اپنے لئے
ہال ویز جانتے تھے
جنہیں بھی فروغِ گدائی کی خاطر
جلال شہی کی بقا بھی گوارا
جو لاشوں میں چلتے تھے
کہتے تھے لاشوں سے
"سوتے رہو
صبح فردا کہیں بھی نہیں ہے"
وہ جن کے لئے حریت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہارِ شاہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے
بھلا حد کی کس کو خبر ہے؟

"لاشوں" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر بھپرنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی ملائمت سے وہ اثر پیدا کیا جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجموعے میں "درویش" کیا بہ اعتبار لغت اور کیا بہ اعتبار واردات قلب اور مزاج شاعری کے حاصل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ

"بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا اشکارے کی سی ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں"

یہ ہمہ گیری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جن

کے آپ بانیوں میں سے ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعہ میں جا بجا پائی جاتی ہیں آپ نے مکالمے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی نئی چیز نہیں اور جہاں داستان یا افسانہ ہو وہاں مکالمے سے مفر نہیں۔ لیکن قدماء کے مکالمے الف بے الف بے .... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لڑھکتے چلے جاتے تھے۔

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال

دال کرتی تھی عرض یوں احوال

وقس علے ہذا۔ لیکن جدید شاعری میں مکالمہ ایک پیچدار معاملہ ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ ساتھ لہجے کا نشیب و فراز، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ بننا پڑتا ہے۔ یہ مہم آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی اور آپ نے اسے جا بجا ایک دوستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعتِ مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر کرنا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے۔

زمستاں کے دن تھے

لگاتار ہوتی رہی تھی سرِ شام سے برف باری

دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے۔

مگر برف کا رقص یونہی تھا جاری

......

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں خامشی چھا گئی

خیاباں کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ

یخ کے گلولے پرندے سے بن کر لٹکنے لگے تھے

زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے

کف آلود ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری ـــــ

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی

بن گیا روئے آب پر کائی!

ـــ کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں تو لا محالہ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اسکیچ، خود کلامی، مکالمے کہانیاں غرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے اسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی اس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس کی قوتِ تخلیق بھی ایسی تھی کہ ابلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر چھوٹے پتھر کو دو آنہ دھکیلتی چلی جاتی تھی۔

نیو یارک

۵ ۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

"پطرس"

نغمہ زار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصہ سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رُت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مستِ کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھر آتا ہے۔ تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اونچے سروں میں الاپتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔ "نغمہ زار" اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں "فن" کے نقائص اور بے عنانیاں نظر آئیں گی۔ اہلِ ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے اِدھر اُدھر جا پڑتے

ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار جھومتا ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جوگا تا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر ناچتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پر مست ہیں۔ ایک ایسی شراب طہور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

۱۹۲۵ء

"پطرس"

افسانے، ڈرامے، ناولٹ

ترتیب

مارخائیم

آر۔ ایل۔ اسٹیونسن

(ترجمہ)

پطرس

دوکاندار بولا۔ حضرت ہماری کمائی کا کیا پوچھتے ہو۔ طرح طرح کے ڈھنگ ہیں۔ کوئی جاہل گاہک آجائے تو میں اپنے علم و فراست سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ کوئی اُچکا آجائے (اور یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے شمع کو اتنا اوپر اٹھایا کہ روشنی اچھی طرح اجنبی کے چہرے پر پڑنے لگی) تو اپنی نیکی اور دیانت سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

مارخائیم ابھی ابھی دکان میں داخل ہوا تھا۔ باہر کھلے بازاروں میں سورج کی روشنی اچھی خاصی تھی اور دکان کے اندر کی تاریکی سے جس میں چمکتی ہوئی چیزوں کی روشنی ملی ہوئی تھی آنکھیں ابھی مانوس نہ ہوئی تھیں۔ کچھ ان پُرمعنی الفاظ کو سن کر اور کچھ شمع کی لَو کو اس قدر اپنے قریب پاکر اس انداز میں آنکھیں جھپکنے لگا۔ جیسے درد ہو رہا ہو اور نگاہیں ایک طرف کو پھیر لیں۔

دکاندار ہنس دیا اور کہنے لگا۔ تم آج کرسمس کے دن میرے پاس آئے ہو۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اکیلا ہوں۔ شٹر چڑھا رکھے ہیں اور کاروبار قطعی بند کر رکھا ہے۔ تو حضرت اس کی آپ کو قیمت ادا کرنا ہوگی۔ میں اس وقت اپنا حساب کتاب درست کر رہا تھا۔ میرے وقت کا جو حرج ہوا۔ اس کی قیمت

ادا کرنی پڑے گی اور پھر اس خاص رویے کی بھی قیمت ادا کرنی پڑے گی ۔ جو میں آج نمایاں طور پر آپ میں پاتا ہوں۔ رازداروں کا راز دار ہوں اور کبھی کسی سے آڑے ٹیڑھے سوال نہیں کرتا ۔ لیکن جب کسی گاہک کا انداز اس قدر مجرمانہ ہو کہ بوڑھے سے نظریں چار نہ کر سکے تو پھر اسے اس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے ۔ دکاندار دوبارہ ہنس دیا اور پھر حسب معمول اپنے کاروباری لہجے سے (جس میں پھر بھی کچھ کچھ طنز پایا جاتا تھا) کہنے لگا۔ تو تم اب کے پھر اس بات کا اطمینان کرا دو گے کہ یہ چیز تمہارے قبضے میں کہاں سے آئی ! پھر وہی اپنے چچا کی الماری میں سے ! حضرت یہ آپ کے چچا جان نے بھی دنیا جہان کے عجائبات جمع کر رکھے ہوں گے !

دکاندار کوتاہ قد، زرد رو، خمیدہ پشت پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ عینک کے سنہری فریم کے اوپر سے نظریں ڈالنے لگا۔ اور سر کو یوں ہلانے لگا کہ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ مارخائیم کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ مارخائیم نے دکاندار کی آنکھوں سے آنکھ ملائی تو نظر سے انتہا درجے کا الم اور تھوڑی سی ہیبت ٹپک رہی تھی۔

بولا۔ اب کے تم غلطی پر ہو۔ میں بیچنے نہیں کچھ خریدنے آیا ہوں۔ میرے پاس اب کوئی عجائبات نہیں۔ جن کے دام وصول کروں۔ چچا کی الماری دیوار تک خالی ہو چکی ہے اور نہ ہوتی جب بھی میں سٹہ بازی میں اس قدر روپیہ کما چکا ہوں کہ اس الماری میں تخفیف کی بجائے کچھ اضافہ ہی کر سکتا ہوں۔ آج جس کام کو آیا ہوں وہ تو بہت معمولی سا کام ہے۔ مجھے ایک خاتون کے لیے کرسمس کا تحفہ مطلوب ہے (اس تقریر کے دوران میں جو وہ پہلے ہی تیار کر کے لایا تھا۔ اس کے فقروں کی روانی بڑھتی چلی گئی) اور میں جانتا ہوں کہ ایسی معمولی بات کے لیے تم سے تمہارا جو حرج کیا۔ اس کے لیے مجھے ہر طرح کی معذرت کرنی چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی غفلت کی وجہ سے کل یہ کام کرنا بھول گیا۔ آج ہی کھانے کے وقت مجھے یہ اپنا حقیر سا تحفہ پیش کرنا ہے ۔ اور تم خود جانتے ہو جب شادی سے بہت سا روپیہ ملنے کی امید ہو ایسے پتا

کرنے میں غفلت نہیں کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکاندار اس دقعہ میں اجنبی کی بات کو تول رہا ہے لیکن اُسے کچھ یقین نہیں آتا۔ اس خاموشی کے دوران میں دکان کے عجیب وغریب سامان میں جو بہت سی گھڑیاں پڑی تھیں، اُن کے ٹک ٹک کرنے کی آواز اور ساتھ ہی بازار میں جو گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اُن کے پہیوں کے مدھم شور کے علاوہ اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

دکاندار بولا۔ اچھا حضرت یونہی سہی۔ آخر تم پرانے گاہک ہو اگر تمہیں ایک اچھی جگہ شادی کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو بھلا میں اس میں کیوں روڑا اٹکاؤں یہ بوتلیں عورتوں کی پسند کی چیز دیئے دیتے ہیں۔ یہ دستی آئینہ پندرہویں صدی کا چھوٹا ہے تو میرا ذمہ اور یہ مال بھی ایک ایسے گھر سے جہاں بڑے بڑے کمال کے عجائبات جمع تھے۔ نام تمہیں اس شخص کا نہ بتاؤں گا۔ اپنے گاہک کی خاطری واجب ہے اور حضرت وہ بھی تمہاری ہی طرح ایک ایسے شخص کا بھتیجا اور واحد وارث تھا۔ جسے عجائبات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔"

دکاندار کرخت اور تیز آواز میں باتیں کرتے کرتے جب آئینے کو اپنی جگہ سے اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو مارخائیم کے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی گزر گئی۔ ہاتھ پاؤں یک لخت تھرّا اٹھے اور ہزارہا طوفانی جذبات دفعتہً لپک کر چہرے پر چھا گئے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں مارخائیم سنبھل بھی گیا۔ اور ان جذبات کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ بجز اس کے کہ جب آئینہ ہاتھ میں لیا تو ہاتھ ذرا کانپ رہا تھا۔

بیٹھی ہوئی آواز میں بولا آئینہ؟ کچھ دیر خاموش رہا۔ اور پھر صاف آواز میں دوبارہ بولا۔

"آئینہ؟ کرسمس کے لیے! یہ بھلا کیونکر ہوسکتا ہے؟" دوکاندار بولا۔

"ہو کیوں نہیں سکتا؟ آئینے میں کیا حرج ہے؟"

مارخائیم اس کی طرف ایک ایسے انداز سے دیکھ رہا تھا جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ بولا: "تم مجھ سے پوچھتے ہو اس میں حرج کیا ہے؟ یہ دیکھو! اپنا چہرہ دیکھو! تمہیں دیکھنا گوارا ہے؟ ہرگز نہیں! نہیں۔ مجھے کسی آدمی کو گوارا نہیں!"

مارخائیم نے جب یوں دفعۃً آئینہ اس کے سامنے کر دیا۔ تو دکاندار یک لخت پیچھے کو ہٹ گیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہنس دیا اور کہنے لگا: "تو جناب آپ کی ہونے والی اہلیہ محترمہ بہت ہی کم رو ہوں گی۔"

مارخائیم بولا: "میں نے تم سے کرسمس کے لیے تحفہ مانگا۔ اور تم مجھے یہ لا کر دے رہے ہو۔۔۔ یہ مکروہ و ملعون چیز ہے۔ جو ہر وقت بڑھاپے کی آمد اور گناہوں اور حماقتوں کی یاد دلاتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ یہ دستی ضمیر! کیا تمہارا واقعی یہ مطلب تھا کہ میں یہ خرید لوں! تم نے کچھ سوچا بھی تھا! مجھے بتاؤ۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ کہ تم مجھے بتا دو۔ تو آؤ مجھے اپنا حال سناؤ۔ میرا اندازہ ہے کہ تم پوشیدہ طور پر بہت ہی خیرات کرتے ہو!"

دکاندار نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ عجیب بات ہے کہ مارخائیم ہنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ چہرے میں خواہش اور امید کی جھلک تو ضرور نظر آتی ہے لیکن ہنسی کا نام و نشان تک نہیں۔

مارخائیم مغموم لہجے میں بولا: "نیک نہیں ہو یا بیدار نہیں۔ نہ کسی سے محبت رکھتے ہو۔ نہ کسی کے محبوب ہو۔ ایک ہاتھ ہے جس سے روپیہ وصول کرتے ہو۔ ایک تجوری ہے جس میں سنبھال کر رکھتے ہو۔ بس تمہاری بساط یہی ہے۔ خدایا! اور بس یہی کچھ ہے۔"

دکاندار کچھ ڈانٹ کے بولا: "میں تمہیں بتاتا ہوں۔" اور پھر ہنس دیا اور کہنے لگا۔ "میں سمجھا۔ تمہاری یہ شادی معاشقے کی شادی ہے اور تم اسی خاتون کی صحت کے جام پیتے رہے ہو۔"

مارخائیم کو ایک عجیب قسم کی دلچسپی سی ہوگئی۔ بولا۔ اخاہ! تم بھی عشق کر چکے ہو! مجھے اس کا حال سناؤ"

دکاندار بولا" میں اور عشق! مجھے کبھی اتنی فرصت نہیں ملی۔ اور نہ آج ہی مجھے اتنی فرصت ہے کہ میں اس بے معنی گفتگو میں یوں اپنا وقت گنواؤں۔ آئینہ خریدتے ہو یا نہیں؟"

مارخائیم نے کہا۔ اتنی جلدی کیا ہے! یہاں کھڑے باتیں کرنے میں بھی مزا ہے۔ اور زندگی اتنی مختصر اور ناپائدار ہے کہ میں تو کبھی کسی لطف سے منہ موڑنے میں جلدی نہ کروں۔ خواہ وہ اس لطف کی طرح معمولی سا ہی کیوں نہ ہو۔ جو تھوڑا بہت نصیب ہو۔ اس کے ساتھ چمٹ جانا چاہیئے۔ جیسے کوئی گرتا ہوا آدمی پہاڑ کی چٹان سے چمٹ جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو زندگی ہر ایک لمحہ ایک چٹان ہے۔ میل بھر اونچی چٹان اتنی اونچی کہ وہاں سے چھوٹ کر گریں تو زمین سے ٹکرا کر انسانیت کا تمام حلیہ مسخ ہو جائے اسی لیے مزے مزے کی باتیں کرتے رہنا ہی بہتر ہے۔ چلو تم مجھے حال سناؤ اور میں تمہیں اپنا حال سناتا ہوں۔ حجاب ہم میں کیوں حائل رہے۔ آؤ راز کی باتیں کریں۔ کیا معلوم ہم ایک دوسرے کے دوست ہی بن جائیں؟"

دکان دار بولا" مجھے تم سے صرف ایک بات کہنی ہے۔ سودا خریدنا ہے تو خریدو ورنہ دکان سے باہر نکل جاؤ!"

مارخائیم نے کہا" سچ ہے سچ ہے۔ کافی دل لگی ہو چکی۔ اب کام کی بات کرنی چاہیئے۔ اچھا کوئی اور چیز دکھاؤ؟"

آئینے کو نچلے طاق پر رکھنے کے لیے دکاندار پھر نیچے جھکا تو اس کے تھوڑے سے سنہری رنگ کے بال اس کی آنکھوں پر آگرے۔ مارخائیم ذرا اور بھی قریب کو سرک آیا۔ ایک ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں تھا۔ تن کے کھڑا ہو گیا اور ایک لمبا سانس کھینچ کر چھاتی پھیلائی۔ چہرے پر کئی مختلف جذبات ایک ساتھ جھلک رہے تھے۔ ڈر بھی تھا۔ ہیبت بھی تھی۔ کچھ تہیہ بھی کر چکا ہے

مسکرا بھی رہے ہیں اور کچھ متفکر بھی۔ بالائی ہونٹ جیسے توانائی کے انداز میں اُوپر کو اٹھا ہوا اور دانت جیسے باہر جھانک رہے تھے۔

دکاندار بولا "یہ شاید پسند آ جائے" یہ کہہ کر سر اُوپر اٹھانے لگا کہ مارخائیم پیچھے سے اس پر جا پڑا۔ سیخ کی شکل کا ایک لمبا سا خنجر چمکا اور پھر نیچے کو اترا۔ دکاندار مرغِ بسمل کی طرح تڑپا۔ کنپٹی طاق پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو کر فرش پر جا گرا۔

دکان میں رقت کی کئی چھوٹی چھوٹی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بعض اپنی عمر کے شایانِ شان آہستہ آہستہ اور وقار کے ساتھ بول رہی تھیں۔ بعض جلدی جلدی گڑبڑا رہی تھیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ دیچ در دیچ ملی ہوئی آوازیں ٹک ٹک کر کے تانے گن رہی تھیں۔ باہر سڑک کے فرش پر کوئی لڑکا کھٹ کھٹ دوڑتا ہوا گزرا۔ جس کے پاؤں کی آہٹ نے ان چھوٹی چھوٹی آوازوں کے تسلسل کو برہم کر دیا۔ مارخائیم چونکا اور اسے یک لخت اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ ہیبت خوردہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شمع دکان کے تختے پر جل رہی تھی۔ اور شعلہ ہوا سے ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا۔ شعلے کی اس خفیف حرکت سے ایک بے آواز سا ہنگامہ بپا تھا۔ اور کمرہ سمندر کی مانند لہریں مار رہا تھا۔ لمبے لمبے سائے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ تاریکی کے مہیب دھبے پھیلتے تھے۔ اور سکڑ جاتے تھے۔ جیسے سانپ رہے ہوں۔ تصویروں کے چہرے اور چینی کے بت پانی کے عکس کی مانند لرزاں اور متغیر تھے۔ اندر کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی کی ایک لکیر سایوں کی اس دنیا میں یوں جھانک رہی تھی۔ جیسے کوئی انگلی اشارہ کر رہی ہو ـــ

اس کی سہمی ہوئی نظریں ان چیزوں سے گزرنے کے بعد پھر لاش پر جا کر رک گئیں۔ جو فرش پر کچھ کبڑی کچھ چت پڑی تھیں۔ بہت ہی چھوٹی اور زندگی میں جس قدر حقیر مفلسوں اور مسکینوں کا لباس اور پھر نہایت بدنما انداز معلوم ہوتا تھا۔ لکڑی کے بُرادے کا ڈھیر پڑا ہے۔ مارخائیم کا خیال تھا۔ میں اس کے دیکھنے

سے بہت کما جاؤں گا۔ مگر وہ تو کچھ بھی نہ نکلی۔ لیکن پھر بھی اس کے دیکھتے دیکھتے اس پرانے کپڑوں کے ڈھیر اور اس خون کے تالاب میں عجیب معنی پیدا ہونے شروع ہوئے تو یہ یہیں پڑا رہے گا اور جب کسی کو معلوم ہو جائے گا! ہاں تو پھر! تو پھر یہ مردہ جسم ایک چیخ مارے گا۔ جو انگلستان بھر میں تھرائے گی۔ اور تمام دنیا کو تعاقب کی گونجوں سے بھر دے گی۔ مر کر پیچھے پڑا رہے گا۔ اس نے سوچا ایک وقت ایسا بھی تھا۔ جب انسان کا جیسا پاش پاش ہو جاتا تھا تو، پہلے ہی الفاظ نے اُسے چوکنا کر دیا۔ وقت! اب کے تمام کام ہو چکا۔ وقت جو مردہ شخص کے لیے ہمیشہ کو ختم ہو گیا وہ قاتل کے لیے دفعتہً اہم بن گیا ہے جو کچھ کرنا ہوا بھی اور اسی وقت......

یہ خیال ابھی اس کے دل میں تھا کہ گھڑیوں نے یکے بعد دیگرے ہر رفتار اور ہر قسم کی آواز کے ساتھ۔ کوئی مینار کلیسا کے گھنٹے کی طرح گمبھیر، کوئی باریک آواز میں والز کے ابتدائی سُر بجاتے ہوئے سہ پہر کے تین بجانے شروع کر دیئے۔ اس خاموش دنیا میں یک لخت اتنی زبانوں کے بول اٹھنے سے مارخائیم ڈگمگا گیا۔ اور اپنی جگہ سے حرکت کر کے شمع ہاتھ میں لئے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ متحرک سائے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اتفاقیہ کہیں روشنی کا عکس دکھائی دے جاتا تو روح تک کانپ اٹھتی۔ اُسے اپنا چہرہ طرح طرح کے بیش بہا ۔۔۔ بعض ولایتی بعض وینس یا ایمسٹرڈم کے بنے ہوئے آئینوں میں عکس در عکس دکھائی دیا۔ جیسے جاسوسوں کی فوج اُسے دیکھ رہی ہو۔ اس کی نظریں اپنی ہی نظروں سے چار ہوتیں۔ اور اس کے جرم کو پا لیتیں۔ اس کے قدموں کی آہٹ گو اس کے منصوبے کو ہزارہا خامیاں اُسے بار بار سمجھائیں یہاں تک کہ وہ اس تکرار سے تنگ آگیا۔ تمہیں یہ کام کسی اور وقت کرنا تھا۔ جبکہ کسی کے سُن پانے یا آجانے کی بالکل توقع نہ ہوتی۔ اس بات کا انتظام کر رکھنا تھا کہ ضرورت پڑے تو ثابت کیا جا سکے میں اس وقت یہاں نہیں کسی اور مقام پہ تھا۔ تمہیں بہت محتاط ہونا چاہیئے تھا۔

دکاندار کی طرف شکیں کس لیتے اور منہ بند کر دیتے جان سے نہ مارتے تھیں اور بھی جرأت کرکے خدمتگار کا کام بھی تمام کر دینا چاہیئے تھا۔ یہ سب کچھ کسی اور طرح کرنا تھا۔ طرح طرح کے افسوس اس کے دل کو مجروح کئے دیتے تھے۔ ذہن مسلسل اس تھکا دینے والی کشمکش میں مصروف تھا کہ ان باتوں کو کس طرح بدل ڈالے۔ جن کا بدلنا اب ناممکن تھا وہ تجویزیں سوچ رہا تھا۔ جن کا سوچنا اب بالکل بیکار تھا۔ گویا نہ مٹنے والے ماضی کو نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتا تھا

اس دوران میں اور اس تمام ذہنی مصروفیت کی تہہ میں قسم قسم کے جوانی خوف اس کے دماغ کے نہاں خانوں میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ جیسے کسی ویران اور تنگ و تاریک کوٹھڑی میں چوہے دوڑ رہے ہوں۔ سپاہی کا ہاتھ زور سے کندھے پر پڑے گا تو تمام اعصاب یوں جھٹکا کھائیں گے۔ جیسے مچھلی کانٹے میں لگ کر جھٹکا کھاتی ہے۔ عدالت کا کٹہرہ اور قید خانہ اور پھانسی کا تختہ اور سیاہ رنگ کا تابوت۔ سب ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔

راہگیروں کا خوف اس کے دل کے سامنے محاصرۂ فوج کی طرح جم کے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا کہ اس کشمکش کی کوئی نہ کوئی آواز مزدوران کے کانوں تک پہنچی ہو گی۔ اور وہ ضرور معلوم کرنا چاہتے ہوں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ اب وہ پڑوس کے گھروں میں کان لگائے بے حس و حرکت بیٹھے ہوں گے۔ تنہا زندگی بسر کرنے والے لوگ جن کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ کرسمس کے دن اکیلے بیٹھے زمانۂ ماضی کی خوشگوار یاد کو دہراتے رہیں۔ اُن کے شفقت آمیز خیالات یک لخت برہم ہو گئے ہوں گے جو لوگ گھروں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ وہ میز کے گرد باتیں کرتے کرتے یک لخت رک گئے ہوں گے۔ اور ماں اپنی انگلی اٹھا کر دم بخود ہو گئی ہو گی۔ ہر عمر اور ہر طبیعت کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے۔ گوش بآواز ہوں گے۔ گویا پھانسی کا رسہ تیار کر رہے ہوں گے۔ بعض اوقات اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ میرے حرکت کرنے سے جو بھی آواز پیدا ہوتی ہے وہ

ضرورت سے زیادہ طلب ہے۔ یوں سمجھیے کہ جیسے جام ایلی میں یوں لگا ئے
جیسے گھڑیال بجتا ہے اور ٹک ٹک کے شور سے وہ اس قدر گھبرایا کہ دل
چاہتا تھا کہ سب گھڑیال بند کر دوں۔ طرح طرح کے خوف پیا پے اس سرعت
کے ساتھ رنگ بدل رہے تھے کہ بعض اوقات سکوت بھی خطرے کا موجب
معلوم ہوتا تھا۔ گویا خاموشی بھی زنجیر کو زور سے جا کر لگے گی اور وہ یک لخت ختم
جائے گا۔ یہ سوچتا تو قدم ہلکے اٹھانے کا خیال کر دیتا اسباب کے بیچ میں ملڈر
جیتا پھرتا اور ارادۃً چھوٹ موٹ کی جسارت کے ساتھ اس طرح اٹھتا بیٹھتا جیسے گھر
کا مالک ہو اور اپنے کسی کام میں لگا ہو۔

لیکن ان مختلف خطرات نے اس کا اتنا بُرا حال کر دیا کہ اس کے دماغ کا
ایک حصّہ اب بھی چوکنّا اور ہوشیار تھا۔ لیکن دوسرا حصّہ دیوانگی کے کنارے
پر کانپ رہا تھا۔ خصوصاً ایک وہم نے تو اس کے دل پر بُری طرح تسلط جما لیا۔
کوئی سہما ہوا پڑوسی جو اپنی کھڑکی کے پاس کان لگائے سن رہا ہو۔ کوئی راہرو
جو چلتے چلتے کچھ شبہ کر کے یک لخت رُک جائے۔ اس طرح کے لوگ زیادہ
سے زیادہ شک ہی کر سکتے ہیں۔ انہیں کسی بات کا علم اور یقین تو ہو نہیں سکتا۔ اینٹوں
کی دیوار اور بند کھڑکیوں میں سے تو صرف آوازیں ہی باہر جا سکتی ہیں۔ لیکن خود
گھر کے اندر ـــــ کیا میں اکیلا ہوں؛ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا
تھا کہ گھر کی خادمہ اپنے بہترین کپڑے (بُرے بھلے جیسے بھی تھے) پہن کر
کسی چاہنے والے سے باہر ملنے گئی ہے۔ اور اس کے پاس کے بر لیتے
اور اس کے چہرے کی بر مسکراہٹ سے مترشح تھا کہ دن بھر کے لیے
باہر گئی ہے ـــــ تو پھر میں اکیلا ہی ہوں۔ لیکن پھر بھی اُسے یقین تھا کہ
بالائی منزل سے جو بالکل ہی خالی پڑی تھی۔ قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی
دے رہی ہے نہ معلوم کیوں؛ لیکن کسی ہستی کے موجود ہونے کا احساس بہت
زبردست تھا جس کے تعاقب میں اس کا تخیّل مکان کے کمرے کمرے اور
کونے کونے میں پھر گیا۔ کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس موہوم ہستی کا چہرہ ہی نہیں لیکن

پھر بھی دیکھنے کو آنکھیں موجود ہیں۔ کبھی اسے خود اپنی ہی پرچھائیں معدوم ہوتیں کبھی مرے ہوئے دکاندار کی شکل دکھائی دیتی۔ جسے مکاری اور نفرت کی روح نے پھر زندہ کر دیا ہو۔

بعض اوقات دل کو کڑا کرکے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتا تو نظریں اس سے متنفر واپس آتیں۔ مکان کی چھت اونچی تھی۔ روشندان چھوٹا سا اور میلا تھا۔ موسم کا یہ حال تھا کہ کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جو روشنی چھن چھن کر نچلی منزل تک پہنچتی وہ بہت ہی کم تھی۔ اور دکان کی دہلیز پر مدھم سی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی اُسے یہ شبہ ہوتا تھا کہ اس خفیف سی روشنی کے گوشے میں کوئی سایہ معلق و لرزاں ہے۔

دفعتہً باہر بازار سے کسی خوش طبع آدمی نے اپنی چھڑی کے ساتھ دکان کے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ساتھ ہی کُکّے بھی مارتا جاتا تھا۔ اور بلند آواز سے ہنس ہنس کر کئی ایسی مذاق کی باتیں کہتا جاتا تھا جس میں کئی دفعہ اس نے دکاندار کا نام لے کر بھی پکارا۔ مارخائیم کا خون جم گیا اور اس نے مردے کی طرف دیکھا لیکن نہیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ اب وہاں پہنچ چکا ہے۔ جہاں آوازوں کی رسائی نہیں۔ وہ سکوت کے سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ اور اس کا نام جسے کبھی وہ طوفان کے شور میں بھی سُن لیتا۔ اب ایک بے معنی سی آواز ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس خوش طبع آدمی نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا اور وہاں سے چل دیا۔

یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ جو کچھ کرنا باقی ہے بہت جلد کرنا چاہیئے اس عمدکشش علاقہ سے باہر نکل کر لندن کے اژدہام کے تالاب میں کُود پڑنا چاہیئے اور دن ڈھل چکنے پر عکسی اور بظاہر معصومیت کی جائے پناہ یعنی اپنے بستر پر پہنچ جانا چاہیئے۔ ابھی ایک ملنے والا آیا تھا۔ ابھی کوئی دوسرا آ جائے اور وہ شاید اس آسانی سے نہ ٹلے۔ ارتکاب جُرم کے بعد جو کچھ وصول ہونا تھا۔ اُس سے محروم رہ جانا ایسی ناکامی ہے کہ طبیعت اسے قبول نہیں کرتی۔ اب اسے فکر تھی تو روپے

کی اور تلاش تھی تو چابیوں کی جن کے ذریعے روپیہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔

سر پھیر کر کھلے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھا جہاں وہ سایہ رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ مقتول کے قریب آیا۔ کسی ذہنی کراہیت کا احساس نہ تھا۔ پھر بھی معدے کی نسوں میں جھٹکا سا لگا۔ لاش کی انسانی وضع مفقود ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں بکھرے پڑے تھے اور دھڑ دُہرا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کپڑوں کے اندر انسانی جسم نہیں۔ تھوڑا سا بھوسہ بھرا ہے۔ لیکن پھر بھی طبیعت اس سے متنفر تھی۔ دیکھنے کو تو حقیر اور بے حیثیت تھی لیکن ڈرتا تھا کہ ہاتھ سے چھوؤں تو شاید اتنی حقیر معلوم نہ ہو۔ لاش کے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور چت لٹا دیا۔ کچھ عجیب ہلکی ہلکی اور ڈھیلی ڈھیلی سی تھی۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی عجیب عجیب ہیئتیں بن جاتیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے ہوں۔ چہرے پر جذبات کی کوئی کیفیت باقی نہ رہی تھی اور وہ موم کی طرح بے رنگ تھا۔ ایک کنپٹی خون آلود تھی۔ جس کے دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مارخائیم کو بھی یہی ایک بات ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے فوراً ہی ایک خاص میلے کا دن یاد آجاتا۔ جو اس نے مچھیروں کے ایک گاؤں میں گزارا تھا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ پیتل کے باجوں کی بلند آواز اور ڈھول کی دُنادُن سنائی دے رہی تھی۔ ایک داستان گو گویا ناک میں گا رہا تھا۔ ایک لڑکا جسے کچھ ڈر بھی تھا۔ کچھ شوق بھی تھا۔ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ آخرکار سب سے زیادہ رونق کے مقام پر پہنچ گیا جہاں ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ اور ایک لمبے چوڑے پردے پر تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر براؤن رگ اور اس کے شاگرد کی تھی۔ سلیک سٹر اور مسز مینگ اور ان کے مقتول مہان کی تھی ــــــ ایک تصویر میں وُمیرا اپنے قاتل تھرٹل کے خونی پنجے میں گرفتار نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ اور بیسیوں جرائم کی تصاویر پیش نظر تھیں۔ یہ تمام نظارہ اسے اس وضاحت کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔ جیسے کسی شعبدہ باز نے ماضی کو پھر زندہ کر دیا ہو۔ اپنے آپ کو پھر از سر نو وہی لڑکا سمجھنے لگا۔ اُسے معلوم ہوا کہ میں پھر وہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ ان مکروہ تصاویر کو دیکھ کر پھر میرا دل کراہیت سے بھر گیا ہے۔

اور اس ڈھول کی آواز سے میں پھر جیسے سُن سا ہو گیا ہوں۔ اس موسیقی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُسے یاد آ گیا۔ اور اس کی وجہ سے پہلی دفعہ اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اسے متلی سی ہوئی۔ جوڑوں میں یک لخت ایک ضعف سا محسوس ہونے لگا جس پر قابو پانا مزید دشوار تھا۔

عقلمندی اسی میں سمجھی کہ ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کی بجائے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ لاش کے چہرے کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔ اور اپنی طبیعت پر زور ڈال کر اپنے جرم کی ماہیت اور سفاکی کو پوری طرح محسوس کرنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ یہی چہرہ مختلف جذبات کے زیر اثر تیور بدلتا رہا تھا۔ یہ ہونٹ بول رہے تھے۔ اس جسم میں فرمان پذیر قوتوں کی آگ بھری تھی۔ اور اب میرے ایک ہی فعل سے کارخانۂ حیات کا پُرزہ یک لخت تھم گیا۔ جیسے ساز اپنی خمیدہ انگلی سے کسی گھڑی کو روک دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کو ہزار سمجھاتا رہا لیکن بے سود۔ کسی تاسف کا احساس نہ ہوتا تھا۔ نہ ہی دل جو جرم کی نقلی تصویروں کے سامنے کانپ اٹھتا ہے۔ اب تو حقیقت کو دیکھ کر بھی نہ پسیجتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُسے دکاندار پر تھوڑا سا رحم آتا کہ اُسے بھی خدا نے وہ تمام قوتیں عطا کی تھیں۔ جن سے دُنیا کو ایک عجیب و غریب طلسماتی بہشت بنایا جا سکتا ہے لیکن اُن سے اس نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اب وہ مر چکا ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ کبھی زندہ ہی نہ تھا۔ بس اس بات پر اُسے کچھ ترس آتا تھا۔ لیکن تاسف یا ندامت کا شائبہ تک اس کے دل میں موجود نہ تھا۔

چنانچہ اس نے ان خیالات کو دماغ سے نکال دیا اور چابیاں تلاش کر کے دکان کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر زور کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اور مینہ کی پڑاپڑ سے خاموشی مفقود ہو چکی تھی۔ کسی رستے ہوئے غار کی مانند مکان کے کمروں میں طرح طرح کی گونجوں سے جو لمحہ بھر کو بھی نہ تھمتی تھیں۔ اور جو گھڑیوں کی ٹک ٹک کے ساتھ مل کر کانوں میں ایک شور سا پیدا کر رہی تھیں ایک ہیبت سی چھا گئی تھی اور جب وہ خانم دروازہ کے قریب پہنچا تو اسے ایسا

معلوم ہوا جیسے اُس کے ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ پاکر کوئی شخص دبے پاؤں سیڑھیوں پر واپس چلا گیا ہے۔ وہ سایہ ابھی تک دہلیز پر کانپ رہا تھا۔ اُس نے طبیعت کو کڑا کرکے دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر کھول دیا۔

کہر چھایا ہوا تھا اوطاق کی مدھم سی روشنی اس زرہ بکتر پر جو سیڑھیوں کے موڑ پہ ہاتھ میں نیزہ لئے ایستادہ تھی۔ اور ترشی ہوئی سیاہ چوبی دیوار پہ ٹنگی ہوئی تصویروں اور چوکھٹوں پر بھی پڑ رہی تھی۔ مینہ کا شور تمام گھر میں اس زور سے سنائی دیتا تھا کہ مارغائیم کو اس میں کئی مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پانوؤں کی آہٹ اور آہیں اور کہیں دور سارنج کرتی ہوئی پلٹنوں کے قدموں کی کھٹا کھٹ اور روپیہ گننے کی جھنکار اور دروازوں کے ہلکے ہلکے احتیاط کے ساتھ کھلنے کی چیں چیں۔ یہ سب آوازیں گنبد پر مینہ کی پڑاپڑ اور پرنالوں میں آب باراں کے شور کے ساتھ ملی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ احساس کہ میں اکیلا نہیں اس قدر تیز ہوتا گیا کہ دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ اُسے کچھ جنون سا ہو گیا کہ پُراسرار ہستیاں مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں بلکہ اُوپر کے کمروں میں چلتی پھرتی معلوم ہو رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا تو یہ معلوم ہوا جیسے اوپر کوئی دبے پاؤں پیچھے کو بھاگ گیا ہے اور کوئی ہلکے ہلکے اس کے پیچھے چڑھ رہا ہے۔ سوچا اگر میں بہرا ہوتا تو اس وقت روح کو کتنا اطمینان ہوتا۔ لیکن پھر یہ سوچا کہ یہ بیدار خواص ہی تو ہیں۔ جو اس وقت میری زندگی کی حفاظت کے لیے پہرہ دے رہے ہیں۔ اس خیال سے اُسے کچھ اطمینان ہوا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ کان لگائے رہا۔ سر کو بار بار پیچھے موڑتا۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑتی تھیں اور ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لیکن ہر طرف کامیاب ہوتے ہوتے رہ جاتیں۔ کیونکہ جدھر دیکھتیں اُدھر ہی کسی نامعلوم بھاگتی ہوئی چیز کا پچھلا حصہ غائب ہوتا نظر آتا۔ پہلی چھت تک چوبیس سیڑھیاں تھیں اور ہر ایک سیڑھی ایک قیامت معلوم ہوتی تھی۔

اوپر کی چھت پہ تینوں دروازے کھلے پڑے تھے۔ اور تینوں کہیں کہیں معلوم ہوتے تھے ان کو دیکھ کر مارغائیم بید کی طرح کانپا۔ جیسے توپوں کے دہانے نظر آ رہے ہوں

اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اب گویا لوگوں کی تیز نظروں سے پوری طرح کبھی نہ بچ سکوں گا یہی دل چاہا کہ کسی طرح اپنے گھر کے اندر پہنچ جاؤں۔ جہاں چاروں طرف دیواریں کھڑی ہوں گی۔ اپنے بستر میں جا کر چھپ جاؤں گا۔ اور سوائے خدا کے اور کسی کی آنکھیں مجھے نہ دیکھ سکیں گی۔ اس خیال پر اُسے کچھ تعجب سا ہوا۔ اسے اور قاتلوں کے قصے یاد آئے جو کہا جاتا ہے۔ انتقام خداوندی سے خوف کھاتے تھے۔ کم از کم مدخائیم کے دل میں اس بات کا خوف نہ تھا۔ خدا سے تو نہیں۔ البتہ قوانین قدرت سے ضرور ڈرتا تھا کہ ممکن ہے میری موجودگی کے بعض ایسے آثار باقی رہ جائیں جو اثبات جرم میں مدد دیں۔ ان آثار کو تو قوانین قدرت کی بے رحم اور اٹل کارفرمائی کبھی محو نہ کرے گی۔ اس سے بھی دس گنا زیادہ وہ اس بات سے خوف کھاتا تھا۔ وہم پرست ضعیف الاعتقاد لوگوں کا سا خوف کہ کیا معلوم کوئی ایسی بات ظہور میں آ جائے جو آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ کیا معلوم قدرت خود اپنے قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ میں ایک ایسا کھیل کھیل رہا ہوں۔ جس میں ذہانت اور فراست کی ضرورت ہے۔ جس میں کامیابی خاص قواعد و ضوابط پر مبنی ہے جس میں اقلیدس کی طرح خاص اسباب و علل سے خاص نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر اس جابر و مطلق العنان بادشاہ کی طرح جو کھیلتے کھیلتے شطرنج کی بساط اُلٹ دیتا ہے یک لخت علت و معلول کا یہ سلسلہ برہم کر دے تو کیا ہوگا؟ مورخ کہتے ہیں۔ جب موسم سرما نے اپنی آمد کا وقت بدل ڈالا تھا تو نپولین کا یہی حال ہوا تھا کیا معلوم مدخائیم کا بھی یہی حال ہو؟ کیا معلوم ان ٹھوس دیواروں میں شیشے کی سی خاصیت پیدا ہو جائے اور میری تمام حرکات باہر سے صاف صاف نظر آنے لگیں۔ جیسے کسی شیشے کے بکس میں شہد کی مکھیوں کی حرکات نظر آتی ہیں فرش کے یہ مضبوط تختے سمندر کی ریت کی طرح نیچے بیٹھ جائیں اور دلدل کی طرح مجھے اپنی گرفت میں پھنسا لیں؟ یہ تو دور کی باتیں ہیں۔ کیا معلوم یہ مکان ہی گر پڑے اور میں اس لاش کے ساتھ یہیں محبوس ہو جاؤں۔ یا ساتھ کے گھر میں آگ لگ جائے اور آگ بجھانے والے لوگ سب طرف سے اندر آ گھسیں؟ ان چیزوں سے وہ

مزدور خوف کھاتا تھا۔ ان کو چاہو تو گناہ کا خداوندی انتقام سمجھ لو۔ لیکن خود خدا کی ذات سے وہ بالکل نہ گھبراتا تھا۔ دل سے کہتا میرا یہ فعل تجاوز سہی۔ لیکن اس کی وجوہ بھی تو خاص ہیں اور خدا کو ان کا پورا پورا علم ہے۔ یہی نہیں بلکہ انصاف کا یقین بھی خدا ہی پر تھا۔ انسانوں پر نہ تھا۔

جب صحیح سلامت ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا اور وہ دروازہ بند کر لیا تو اُسے محسوس ہوا اب کوئی خطرہ نہیں۔ کمرہ بالکل بے آرائش تھا۔ فرش پر قالین تک نہ تھا۔ جا بجا خالی بکس اور ٹوٹا پھوٹا سا فرنیچر پڑا تھا۔ کئی لمبے لمبے آئینے تھے جن میں مختلف زاویوں سے اُسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ جیسے کوئی ایکٹر اسٹیج پر ہو۔ کئی تصاویر بعض چوکھٹوں میں لگی ہوئی بعض بغیر چوکھٹوں کے۔ دیوار کے ساتھ اُلٹی کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے کے کمرے کی۔ فرنیچر الماری، میک اور الماری جس میں لکڑی کی پچی کاری کی ہوئی تھی۔ اور ایک بہت بڑا پرانی وضع کا پلنگ تھا۔ جس پر دبیز قیمتی کپڑے کے پردے لگے تھے۔ کھڑکیوں کی چوکھٹ تک پہنچی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کا پچھواڑا تھا۔ اس لیے پڑوس کے لوگوں کی نظر نہ پڑ سکتی تھی۔ رمضان نے ایک بکس کو الماری کے سامنے کھینچ لیا اور کنجیوں کے گچھے میں سے ایسی کنجی تلاش کرنے لگا۔ جس سے الماری کا قفل کھل سکے۔ کنجیاں بے شمار تھیں۔ اس لیے یہ کام لمبا تھا۔ اور طبیعت گھبرانے لگی تھی۔ اس خیال سے اور بھی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ کہ کچھ ہے الماری میں کچھ بھی نہ نکلے اور وقت کا اڑا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس پوشیدہ مصروفیت سے اس کے حواس پھر درست ہو گئے۔

دروازہ کو کنکھیوں سے بلکہ بعض اوقات نظر بھر کر بھی دیکھ لیتا جیسے کوئی محصور سپہ سالار اپنی حفاظت کے انتظامات کو مستحکم پاکر خوش ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بالکل مطمئن تھا۔ باہر بازار میں مینہ برس رہا تھا۔ اور بارش کا شور طبعی اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد دوسری طرف سے حمد و مناجات کے گیت کے ساتھ پیانو بجنے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ بہت سے

بچے مل کر گیت گا رہے تھے۔ گیت کی موسیقی خوش آیند تھی اور اس کے سروں سے ایک خاص وقار ٹپکتا تھا۔ بچوں کی آوازیں پیاری اور بھلی معلوم ہوتی تھیں اور مارغائیم مسکراتا ہوا سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کنجیاں گھما گھما کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ دل میں اسی قسم کے تصورات اور خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ کبھی گرجا جاتے ہوئے بچوں اور آرگن کے بجنے کا خیال آتا۔ کبھی کھیلتے کودتے بچوں کا تصور بندھ جاتا کہ ندی کے کنارے نہلنے کو جمع ہیں۔ یا کھلے میدان میں گھوم رہے ہیں۔ یا جب آسمان پر بھاپادلوں سے اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ تو پتنگ اڑا رہے ہیں۔ سرکے کسی اور تار چڑھاؤ کے ساتھ پھر گرجے کا خیال آجاتا گرمیوں کا موسم ہے۔ اتوار کا خواب اور دن۔ پادری بلند آواز اور شائستہ لہجے میں وعظ کر رہا ہے (اس پر ذرا مسکرا دیتا) روغنی چوبین مقبرے اور کلیسا کے مشرقی حصے میں مدھم سے حروف میں لکھے ہوئے دس احکام آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔

ایسی باتیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یک لخت چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہ برف کی سی خنکی خون کا ابلتا ہوا فوارہ۔ آگ کا ایک شعلہ اس کے جسم میں دوڑ گیا پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے اور جسم تھر تھر کانپنے لگا کسی شخص کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کسی ہاتھ نے دروازے کے دستے کو گھمایا۔ قفل سرکتا ہوا سنائی دیا اور دروازہ کھلا۔

خوف نے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اب کیا ظہور میں آئے گا خود مقتول ہی اپنے پاؤں چل کر آگیا ہے یا عدالت کا کوئی کارندہ ہے یا اتفاقیہ ہی کوئی شخص چلا آگھسا ہے جس کی شہادت اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دے گی۔ لیکن جب دروازہ کھلا تو ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا جس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ مارغائیم کو دیکھا، سر ہلا کر مسکرایا (جیسے کسی دوست کو دیکھ کر پہچان لیا ہو) اور پھر پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ مارغائیم کو خوف کے مارے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ منہ سے بے اختیار ایک ہلکی سی چیخ نکلی جسے سن کر اجنبی پھر

واپس آگیا۔ خندہ پیشانی سے پوچھنے لگا۔

"تم نے مجھے بلایا تھا؟" یہ کہنے کے ساتھ ہی اندر آگیا اور دروازہ بھیڑ دیا۔

مارخائیم کھڑا تھا اور ہمہ چشم بن کر اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید آنکھوں پر پردہ پڑا تھا کیونکہ اجنبی کا قد و قامت اور شکل و صورت متغیر و لرزاں نظر آتی تھی جیسے شمع کی کانپتی ہوئی روشنی میں چینی کے بت متغیر و لرزاں نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کوئی شناسا ہے۔ پھر خیال آتا مجھ سے شکل ملتی ہے۔ دل پر انتہا درجے کی ہیبت چھائی ہوئی تھی اور کم از کم اس بات کا یقین تھا کہ یہ شخص اس دنیا کا مکین نہیں یہ خدا کی مخلوق میں سے ہے۔

لیکن عجیب بات تھی کہ پھر بھی یہ اجنبی جو کھڑا مارخائیم کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا معمولی سا انسان معلوم ہوتا تھا اور جب اس نے یہ پوچھا کہ روپے کی تلاش میں ہو؟ تو لہجے میں وہی سلیقہ تھا جو روزمرہ کی عام گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ مارخائیم نے کچھ جواب نہ دیا۔

اجنبی بولا: "میں تمہیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ ملازمہ آج اپنے چاہنے والے سے جلدی رخصت ہو گئی ہے اور اب یہاں پہنچا ہی چاہتی ہے۔ اگر مسٹر مارخائیم اس گھر میں پکڑے جائیں تو نتیجہ جو ہوگا وہ تم جانتے ہی ہو۔"

قاتل نے پوچھا: "تم مجھے جانتے ہو؟"

اجنبی مسکرا دیا اور بولا: "تم مدت سے میرے منظور نظر ہو۔ عرصے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور بارہا میں نے چاہا ہے کہ تمہاری مدد کروں۔"

مارخائیم بولا: "تم کون ہو؟ کیا تم شیطان ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا: "میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ میں کون ہوں۔"

مارخائیم بولا: "ضرور پڑ سکتا ہے! میں تم سے مدد چاہوں! تم سے؟ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔ خدا کا شکر ہے تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔"

اجنبی نے ایک شستگانہ درشتی بلکہ تحکم کے ساتھ جواب دیا: "میں تمہیں جانتا ہوں میں تمہاری روح تک سے واقف ہوں!"

مرخائیم بولا: "مجھے جانتے ہو! مجھے کون جان سکتا ہے! میری زندگی خود میرا ہی بگڑا ہوا نقشہ اور خود بھی یہ ایک تہمت ہے۔ میں نے عمر بھر اپنی فطرت کو جھٹلایا ہے۔ ہر انسان کا یہی حال ہے۔ ہر انسان اس طرح سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے جو وہ اپنے اُوپر چڑھاتا رہتا ہے اور جس کے اندر اس کا دم گھٹا جاتا ہے۔ ہر انسان کشاں کشاں مدھر زندگی سے جائے اُدھر ہی کھینچا چلا جاتا ہے، جیسے ذبرن کسی کو پکڑ کر اس پر کمبل ڈال دیتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو اپنے اوپر اختیار ہو، اگر کبھی وہ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دے جائیں تو تم انہیں اس سے کہیں مختلف پاؤ گے اور ان کے چہروں پر نامور بہادروں اور خدارسیدہ بزرگوں کا سا نور چمکتا نظر آئے گا۔ میں بہت سوں سے بڑا ہوں۔ مجھ پر جھوٹ کی بہت موٹی تہ جمی ہے اور میرا عذر مجھے اور میرے خدا کو معلوم ہے لیکن اگر مجھے مہلت ہو تو میں اپنی اصلی حقیقت آشکار کر سکتا ہوں۔"

اجنبی نے پوچھا: "مجھ پر؟"

قاتل نے جواب دیا: "سب سے پہلے تم پر۔ میں تمہیں عقلمند سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب تم آ ہی گئے ہو تو کم از کم میرے دل کا حال بخوبی جان لوگے لیکن افسوس پھر بھی تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو! ذرا سوچو تو! میرے افعال سے! دیوؤں کے ملک میں پیدا ہوا اور میں نے دیوؤں کے ملک میں زندگی بسر کی۔ جب سے میں نے جنم لیا ہے، حالات و واقعات کے دیو مجھے کلائیوں سے پکڑ کر گھسیٹتے پھرتے ہیں اور تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو! تمہیں میرا باطن نظر نہیں آتا؟ تم یہ نہیں سمجھتے کہ مجھے بدی سے نفرت ہے؟ تمہیں میرے سینے کے اندر ضمیر کے احکام صاف صاف لکھے ہوئے نظر نہیں آتے؟ میں نے اکثر ان کی تعمیل سے گریز کیا ہے لیکن دیدہ و دانستہ کبھی ان کی غلط تاویل نہیں کی۔ اپنی مرضی کے خلاف گناہ کرنے والوں کی مثالیں تو لاکھوں کی

تعداد میں موجود ہوں گی۔ کیا میں تمہیں ویسا ہی انسان معلوم نہیں ہوتا؟"

جواب ملا: "تم نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے لیکن اس سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ بدی سے نفرت کرنے کے باوجود بھی انسان اس کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ تمہیں کون سے واقعات کس طرف قدم اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں غرض تو اس سے ہے کہ جس رستے پر چلو وہ رستہ ٹھیک ہو لیکن وقت نکلا جا رہا ہے۔ بھیڑ کا تماشا کرتے کرتے اور اشتہاروں کی تصویریں دیکھتے ماما کو دیر ہو گئی ہے تاہم وہ آ رہی ہے جیسے پھانسی کا تختہ۔ بازاروں میں سرکس کا جوکر دوڑتا ہوا تمہاری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کہو تو میں تمہاری مدد کروں۔ میں جو سب کچھ جانتا ہوں تمہیں بتاؤں۔ روپیہ کہاں رکھا ہے؟"

مارغاٹم نے پوچھا: "مجھے قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی؟"

اجنبی نے جواب دیا: "میں یہ خدمت کرسمس کے تحفے کے طور پر کرنے کو تیار ہوں۔"

مارغاٹم سہم سی گئی۔ ایک تلخ سے احساس تحقیر کے ساتھ مسکرا دیا اور بولا: "نہیں میں تمہارا احسان کبھی نہ لوں گا۔ اگر پیاس کے مارے میری جان نکل رہی ہو اور پانی کا پیالہ تمہارے ہاتھ میں ہو جب بھی مجھ میں اتنی ہمت ضرور ہو گی کہ میں انکار کر دوں یہ میری سادہ لوحی ہی لیکن میں اپنے آپ کو بدی کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہتا۔

اجنبی نے کہا: "مرتے وقت توبہ کر لینا۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔"

مارغاٹم نے زور سے جواب دیا: "تمہیں اسی لیے عذر نہیں کہ تم جانتے ہو مرتے وقت توبہ کرنا بے سود ہے۔"

اجنبی نے جواب دیا: "میرا یہ خیال نہیں لیکن بات یہ ہے کہ میں ان باتوں کو اور ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ جب زندگی ختم ہو جائے تو پھر مجھے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ایک انسان عمر بھر میرے حکم کی تعمیل کرتا رہتا ہے۔ دینداری کے بھیس میں سیہ کاری پھیلاتا رہتا ہے یا اپنی کمزوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر گندم

کے کھیت میں منتقل ہوتا ہے۔ جب اس کی مخلصی کا وقت قریب آتا ہے تو میں اس سے صرف ایک اور خدمت چاہتا ہوں۔ وہ یہ گناہوں سے توبہ کرے اور اس جہان سے مسکراتا ہوا رخصت ہو۔ یعنی میرے باقیماندہ پیروؤں میں سے جو لوگ خدا کم حوصلہ ہیں انہیں ہمت دلائے۔ انہیں آس لگی رہے کہ عفو خداوندی مرتے وقت بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ میں کچھ ایسا جابر آقا تو نہیں۔ مجھے آزماؤ۔ میری مدد قبول کرو ابتک تم نے جو دل چاہا کیا، اب بھی جو دل چاہے کرو بلکہ پہلے سے بھی زیادہ عیش اور اطمینان کی زندگی بسر کرو اور جب ملت پڑنے لگے اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے جائیں اس وقت میں تبدیلی قلب کے لیے تم سے کہے دیتا ہوں۔ اس وقت ضمیر سے صلح کر لینا اور خدا کی آغوشِ شفقت میں جگہ پانا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ میں اب جہاں سے آیا ہوں وہاں اسی طرح کا ایک تائب انسان بسترِ مرگ پہ پڑا تھا۔ کمرہ ماتم داروں سے بھرا ہوا تھا جو اس کے آخری الفاظ کو بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ زندگی میں سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ استغفار کی جھلک تک اس کے چہرے پر کبھی نہ آئی تھی لیکن مرتے وقت اسی چہرہ پر امید کا تبسم درخشاں نظر آتا تھا۔"

مدخائم نے پوچھا: "تو تم مجھے بھی اسی قسم کا مردود انسان سمجھتے ہو! تم سمجھتے ہو میری تمنا کی یہ چار طبیں ہی ہے کہ عمر بھر سیہ کاری میں گزار دوں اور آخری وقت خدا کو دھوکا دے کر چوری چھپے جنت میں داخل ہو جاؤں۔ میرا دل سوچتے ہوئے گھبراتا ہے۔ کیا تم نے بنی نوع انسان کو ایسا ہی پایا ہے؟ یا تمہیں میرے ہاتھ خون آلودہ دیکھ کر مجھ پر اسی دنائت کا گمان ہوا ہے؟ کیا قتل کا گناہ اتنا ناپاک ہے کہ نیکی کا احساس بالکل ہی مر جاتا ہے۔

اجنبی نے جواب دیا: "قتل کو میں کسی خاص قسم کا گناہ نہیں سمجھتا۔ جس طرح تمام زندگی ایک جنگ ہے اسی طرح ہر گناہ ایک قتل ہے۔ میرے نزدیک تو تمام بنی نوع انسان کی مثال ان ملاحوں کی سی ہے جو اپنے ڈوبے ہوئے جہاز کے تختوں پر تیر رہے ہوں۔ کھانے کو ان کے پاس کچھ نہ ہو، فاقے کے مارے سے نوالے چھین چھین کر کھا رہے ہوں۔ یہاں تک کہ مردم خوری پہ اتر آئے

ہوں۔ میری نگاہ عین اس لمحے سے کہیں پرے نکل جاتی ہے جس میں جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر ایک کا انجام موت ہے۔ میری آنکھوں کو وہ حسین لڑکی جو ناخ پر جانے کے لیے ہزاروں داؤں سے اپنی ماں کو بے لبس کر دیتی ہے اور تم جیسا قاتل دونوں یکساں خون میں لتھڑے ہوئے نظر آتے ہیں میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں بدی کے نتائج کو سوچتا ہوں: یہی نہیں بلکہ میں نیکی کے مسئلے پر بھی غور کرتا رہا۔ مجھے دونوں میں سرِمُو فرق نظر نہیں آتا۔ گویا دونوں کی دونوں ہدانیاں ہیں جن سے موت کا فرشتہ فصل کاٹ کر لے جاتا ہے۔ جس بدی کے لیے میری زندگی وقف ہے وہ اعمال کی بدی نہیں سیرت کی بدی ہے۔ مجھے گنہگار انسان محبوب ہے۔ گناہ کے فعل سے محبت نہیں۔ بڑے کاموں کا ثمرہ شاید بڑی بڑی نیکیوں کے پھل سے بھی زیادہ شیریں نکلے۔ لیکن ہمت کس میں ہے کہ قرنوں اور صدیوں کے دمدماتے ہوئے آبشار کی تہ تک پہنچ کر بدی کے نتائج کا مطالعہ کر سکے۔ میں جواب تمہاری دستگیری پر آمادہ ہوں تو وہ اس لیے نہیں کہ تم نے ایک مکاندار کو قتل کر ڈالا ہے بلکہ اس لیے کہ تم مارخائیم ہو۔"

مارخائیم نے جواب دیا "میں تم سے اپنے دل کا حال صاف صاف بیان کرتا ہوں۔ یہ جرم میرا آخری جرم ہے اور پیشتر اس کے کہ یہ مجھ سے سرزد ہوا مجھے کئی سبق مل گئے یہ خود ایک سبق تھا، بہت بڑا سبق، اب تک جو کچھ میں نے کیا وہ میری مرضی کے خلاف تھا لیکن سرکشی نے مجھ سے سب کچھ کرا دیا

میں افلاس کا مظلوم اور مجبور غلام تھا۔ بعض اوقات انسان کسی نیک کام کے لیے روپے کا لالچ کرتا ہے۔ مجھے صرف عیش پسندی کی ہوس تھی لیکن آج مجھے اس جرم سے دولت اور عبرت دونوں چیزیں حاصل ہوئیں گویا پھر اپنے اصلی روپ میں عود کر آنے کے لیے ارادہ اور سامان دونوں مہیا ہو گئے ہیں۔ اب میں اپنے افعال کا پورا پورا مختار ہوں اب میں بالکل بدل جاؤں گا ان ہاتھوں سے نیکی کروں گا اور اس دل کو اطمینان نصیب ہوگا۔ میری گذشتہ زندگی کے بعض جذبات پھر میری طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں۔ اتوار کی شام کو جب گرجا کا آرگن بج رہا ہوتا یا جب کسی

مقدس کتاب کی تلاوت سے میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے یا جب میں معصومیت کے زمانے میں اپنی ماں سے باتیں کیا کرتا تھا تو اس وقت اپنی آئندہ زندگی کا جو تصور میرے سامنے تھا وہ اب سچا ہو کے رہے گا۔ میں چند سال بھٹکتا پھرا ہوں لیکن اب مجھے منزلِ مقصود پھر نظر آرہی ہے۔"

اجنبی نے پوچھا: "یہ روپیہ تم سٹہ بازی میں لگاؤ گے؟ جہاں میں سمجھتا ہوں تم پہلے بھی کئی ہزار ہار چکے ہو۔"

مارخائیم نے کہا: "ہاں لیکن اب کے میرا جیتنا یقینی ہے۔"

اجنبی بولا: "اب کے تم پھر ہارو گے۔"

مارخائیم نے کہا: "ہاں! مگر آدھا روپیہ میں اپنے پاس رکھوں گا۔"

اجنبی بولا: "وہ بھی ہار دو گے۔"

مارخائیم کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ نکلا: "اچھا! کیا مضائقہ ہے! فرض کرو میں سب روپیہ ہار دوں اور فرض کرو میں پھر مفلس اور قلاش ہو جاؤں تو کیا میرا نفس ایک حد اور بھی اسفل، یوں ہی آخر تک اسفل رہے گا اور رفتہ رفتہ نیکی کی قوت کو سلب کر دے گا؟ نیکی اور بدی دونوں زبردست ہیں اور اپنی اپنی طرف بلا رہی ہیں مجھے دونوں سے محبت ہے۔ میں بڑے بڑے کارنامے سوچ سکتا ہوں، اپنے نفس کو مار سکتا ہوں، نیکی کے رستے میں جان تک قربان کر سکتا ہوں اور گو میں اتنا ذلیل ہوں کہ قتل تک سے دریغ نہ کیا لیکن رحم سے بالکل ناآشنا نہیں۔ میں غریبوں پر رحم کھاتا ہوں (مجھ سے زیادہ ان لوگوں کی مصیبتوں کو کون جانتا ہے؟) میں محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں وہ ہنسی اور خوش دلی چاہتا ہوں جو اطمینان قلب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی سچی یا کوئی اچھی بات ایسی نہیں جس سے مجھے دلی محبت نہ ہو، تو کیا صرف بدیاں ہی میری رہنمائی کریں گی؟ اور کیا میری خوبیاں کوڑے کرکٹ کی طرح بے کار پڑی رہیں گی؟ ہرگز نہیں۔ نیکی بھی افعال کی رہبر ہو سکتی ہے۔"

لیکن اجنبی نے اپنی انگلی اوپر کو اٹھائی اور بولا: "تمہیں اس دنیا میں آئے چھتیس سال ہو گئے۔ اس دوران میں تمہاری قسمت نے کئی دفعہ پلٹا کھایا اور تمہاری

طبیعت نے کئی رنگ بدلے لیکن میں چھتیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ تم برابر قعرِ مذلت کی طرف جا رہے ہو۔ آج سے پندرہ سال پیشتر تم چوری کے خیال سے بھی کانپ اٹھتے۔ آج سے تین سال پیشتر قاتل کا نام سن کر تمہارا رنگ فق ہو جاتا۔ لیکن اب کیا کوئی بھی جرم، کوئی بھی سفاکی، کوئی بھی ذلت ایسی ہے جس سے تمہاری طبیعت متنفر ہو اور پانچ سال میں تم ان سب کے مرتکب ہو چکے ہو گے۔ تم دن بدن پستی کی طرف جا رہے ہو اور سوائے موت کے اور کوئی چیز تمہیں نہیں روک سکتی۔"

مارخائیم نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا: "یہ سچ ہے میں نے ایک حد تک بدی کے احکام کی تعمیل کی ہے لیکن سب کا یہی حال ہے۔ محض اس جہان میں بسر کرنے کی وجہ سے پاکیزہ ترین انسان بھی دنیا کی آلائشوں سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔"

جواب ملا: "میں تم سے ایک سیدھا سادا سوال پوچھتا ہوں۔ جواب پانے پر میں تمہاری آئندہ اخلاقی زندگی کا حال تمہیں بتاؤں گا۔ بہت سی باتوں میں تم نیک و بد کی چنداں پروا نہیں کرتے اور ممکن ہے تم ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔ بہر حال ہر انسان کا یہی حال ہے لیکن کوئی ذرا سی بات بھی ایسی ہے جس میں تم اپنے افعال کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہو؟ یا ہر بات میں بے معانی سے کام لیتے ہو؟"

مارخائیم کو جیسے جواب سوچنے میں بے حد تکلیف ہو رہی ہو۔ بولا: "کوئی ذرا سی بات ایسی ہے۔ نہیں کوئی نہیں رہی میں ہر طرح ذلیل ہوں۔"

اجنبی بولا: "تو پھر اسی پہ مطمئن رہو۔ کیونکہ تمہارا بدلنا ناممکن ہے۔ دنیا کے اسٹیج پر جو پارٹ تمہیں ادا کرنا ہے اس کے الفاظ مقرر ہیں اور ان میں رد و بدل کا کوئی امکان نہیں۔"

مارخائیم بہت دیر تک چپ کھڑا رہا بلکہ دوبارہ بھی پھر اجنبی ہی نے بولنا شروع کیا: "تو پھر تمہیں بتاؤں کہ روپیہ کہاں رکھا ہے۔۔۔۔؟"

مارخائیم نے پوچھا: "اور عفوِ خداوندی؟"

جواب ملا: وہ تم آزما چکے ہو۔ دو تین سال ہوئے تم ہی تو تھے جسے میں نے مذہبی جلسوں کے پلیٹ فارم پر سب سے بلند آواز میں حمد و مناجات کے گیت گاتے سُنا تھا:

مارخائیم بولا: یہ سچ ہے۔ مجھے اپنا فرض صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ میں اس سبق کے لیے دل و جان سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میری حقیقت اب مجھ پر آشکارا ہو چکی ہے۔"

مین اس وقت دروازے کی گھنٹی کے بجنے کی تیز آواز تمام گھر میں سنائی دی۔ اجنبی کا رویہ یوں بدلا جیسے گھنٹی کا بجنا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا تھا اور وہ بس اسی کے انتظار میں تھا۔

بولا: وہ ماما آگئی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ واپس آجائے گی۔ اب تمہارے لیے فقط ایک مشکل کام انجام دینا باقی رہ گیا ہے اس سے کہنا تمہارا آقا بیمار ہے۔ خود جا کے دروازہ کھولنا۔ تمہارے چہرے سے گھبراہٹ نہیں بلکہ سنجیدگی مترشح ہونی چاہیئے۔ مسکرانا مت۔ بہت زیادہ اطمینان کا اظہار بھی نہ کرنا۔ میرے کہے پر عمل کروگے تو یقین مانو تمہارا راز کبھی فاش نہ ہوگا۔ بس لڑکی اندر آجائے اور دروازہ بند ہو جائے تو جس ہوشیاری سے تم نے آقا کو ٹھکانے لگایا ہے اسی طرح اس آخری کانٹے کو بھی اپنے رستے سے ہٹا سکتے ہو۔ پھر تو ساری شام اور اگر ضرورت ہو تو ساری رات پڑی ہے۔ گھر کے سب مال واسباب کی اچھی طرح تلاشی لے لینا اور پھر مزے سے نکل جانا۔ ماما کے آجانے میں بھی ایک عجیب حکمت ہے۔ اٹھو! میرے دوست اٹھو! تمہاری زندگی اس وقت ایک کچے دھاگے سے بندھی ہے۔ اٹھو! کچھ کرو!"

مارخائیم اپنے صلاح کار کو غور سے دیکھتا رہا اور بولا: اگر میری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ میری ہر حرکت بدی اور گناہ ہی کے لیے وقف ہے تو نجات کا ایک دروازہ تو اب بھی کھلا ہے۔ میں ہاتھ پاؤں ہلانا ہی کیوں نہ بند کردوں؟ اگر میری زندگی ناپاک ہے تو میں اس زندگی سے دستکش ہی نہ ہو جاؤں؟ تم

سچ کہتے ہو میں ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا غلام ہوں لیکن اب بھی میں ایک ہی فیصلہ کن جنبش کے ساتھ ان سب خواہشات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ نیکی کی تمنا کبھی پوری نہ ہو تو اچھا یونہی سہی لیکن بدی سے نفرت تو اب بھی باقی ہے اور تمہیں یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہوگی کہ میں اسی نفرت سے طاقت اور جرأت دونوں چیزیں حاصل کر سکتا ہوں۔"

اجنبی کا چہرہ بدلنا شروع ہوا۔ اس کے خدوخال حسین و جمیل ہوتے گئے اور ایک شفقت آمیز احساس تسخیر کے ساتھ چمکنے لگے اور پھر فوراً ہی مدھم ہو کر غائب ہوئے لیکن مارخائم اس تغیر کو دیکھنے یا سمجھنے کے لیے ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ اس نے دروازہ کھولا اور کچھ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کی گذشتہ زندگی کا صاف اور صحیح نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ خواب کی طرح بدنما اور تکلیف دہ بے ترتیب اور بے جوڑ۔ گویا شکست کا ایک منظر پھیلا ہوا ہے۔ جب اپنی زندگی یوں نظر آئی تو جینے کی ہوس باقی نہ رہی لیکن زندگی اس کے پار اسے اپنی کشتی کا ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان کے دروازے کے پاس پہنچا تو رک گیا۔ دروازے میں سے جھانکا۔ شمع ابھی تک لاش کے پاس جل رہی تھی اور ایک عجیب خاموشی طاری تھی نظریں مبہوت تھیں اور دل میں دکاندار کے متعلق خیالات کا ایک ہجوم برپا تھا۔ گھنٹی جیسے بے صبری کے ساتھ دوبارہ بجی۔

دہلیز کے پاس ماما کے رُوبرو کھڑا ہوا تو چہرے پہ مسکراہٹ سی تھی۔

بولا "پولیس کو بلا لو تو بہتر ہو۔ میں نے تمہارے آقا کو قتل کر دیا"

(علی گڑھ میگزین)

★

گونگی جورو

یہ ترجمہ بھی ہے اور خلاصہ بھی۔ اس دوگانہ دستبرد سے اصل کامیڈی
کی سب لطافتیں فنا ہو گئی ہیں صرف کہانی باقی رہ گئی ہے لیکن صرف
کہانی ہی کا منتقل کرنا مقصود بھی تھا۔ اناطول فرانس نے اس قصے کو
مشہور فرانسیسی مصنف رابیلے سے اخذ کیا ہے۔ رابیلے نے مدلن تھیٹر
سے مستعار لیا تھا۔ گویا کہانی در اصل بہت پرانی ہے۔ اناطول فرانس نے
اسے نیا رنگ دے کر کامیڈی کی شکل میں پیش کیا۔

جو خاکہ اب آپ کے سامنے ہے اس میں خوبیاں اساتذہ کی ہیں خامیاں
میری ہیں۔ (پطرس)

پہلا ایکٹ

ہنگل نامی پیرس کے ایک جج کا کمرہ

(ماسٹر آدم ایک بیرسٹر اس سے ملنے کے لیے آیا ہے۔)

آدم۔ (جھک کر آداب بجا لاتا ہے) زہے قسمت کہ آپ سے پھر ملاقات ہوئی۔

بوتال۔ واہ خوش قسمتی تو اسے میری کہیئے۔ فرمایئے پیرس میں کس طرح آنا ہوا!

آدم۔ (کرسی پر بیٹھ کر) شارترے سے آیا ہوں۔ ایک سفارش کرنے کے لیے۔
ایک نوجوان خاتون کی۔ جس کے سر پر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے اس

پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ اس کا سرپرست اس کی سب جائداد ہضم کر گیا ہے بس اس مقدمے پر ہی اس کی قسمت کا دارومدار ہے۔ اگر جیت گئی تو کچھ ہو سکا آپ کی نذر کر دے گی ورنہ ......

بوتال: اچھا اچھا ہم غور کریں گے۔

آدم: اب کچھ اپنی کہیئے۔ تنہائی میں دن مشکل سے گزرتے ہوں گے۔ شادی کا ارادہ نہیں کیا؟

بوتال: تم نے نہیں سنا؟ پچھلے ہی مہینے تو میں نے شادی کی ہے۔ ایک مجسٹریٹ کی بیٹی سے۔ کیتھرین نام ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ گونگی ہے۔

آدم: تو شادی سے پہلے تمہیں اس کا علم نہ تھا؟

بوتال: معلوم تو تھا۔ بھلا یہ بات بھی کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ لیکن اس وقت مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ ایک تو خوب صورت دوسرے بہت سا جہیز۔ میں نے سوچا۔ چلو ہوا کیا۔ طبیعت بھی بہلے گی روپیہ بھی ہاتھ آئے گا۔ پر اب پچھتاتا ہوں۔ کچھ بات چیت کر سکتی تو مقدمے والوں کی خاطر مدارت کر تی وہ بھی ہماری تواضع کرتے، کوئی مرغیاں لاتا۔ کوئی شراب کا پیپہ دے جاتا۔ لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ گزارہ مشکل سے ہوتا ہے اور میں خود بھی پژمردہ اور اداس رہتا ہوں۔ بیوی کیا ہے۔ ایک مشین ہے۔

آدم: بہری تو نہیں۔

بوتال: نہ۔ خیر سنتی تو تم ہم سے بھی زیادہ ہے۔

آدم: تو پھر کچھ مشکل نہیں۔ اگر کوئی گونگا شخص ساتھ ہی بہرہ نہ ہو تو اس کا علاج سہل ہے۔ آپ کے گھر کے پاس ہی ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ اس کا آپریشن اس بارے میں ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

بوتال: میں ابھی اس کو بلاتا ہوں۔

آدم: تمہاری مرضی۔ لیکن اس کو بلانے سے پہلے ایک دفعہ سوچ لو گونگی بیوی کے جہاں کئی نقصان ہیں۔ وہاں کئی فائدے بھی ہیں۔ (آدم چلا جاتا ہے۔ بوتال اپنے ملازم

کو ڈاکٹر کے گھر بھیجتا ہے اس کے بعد جج کی بیوی کیتھرین داخل ہوتی ہے۔)

بوتال: (کام کرتا کرتا رک جاتا ہے) آہا! میری جان۔ تم آگئیں۔ مجھے تمہاری آہٹ تک سنائی نہیں دی۔ تم پریوں کی طرح خاموشی کے ساتھ گزر جاتی ہو۔ تم ایک خوشگوار خواب کی مانند ہو۔ تم قدرت کا ایک معجزہ ہو۔ تم میں سوائے ایک گویائی کے باقی تمام صفات موجود ہیں۔ اگر تمہیں گویائی کی قوت بھی عطا ہو جائے تو کیا تم خوش نہ ہوگی! جو جذبات اب مجھے تمہاری آنکھوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں وہ تمہارے ہونٹوں سے ادا ہوں گے۔ تمہاری روح بے نقاب ہو جائے گی تم اپنے منہ سے محبت کا اظہار کرو گی۔ اپنے شوہر کو اپنی زبان سے پکارو گی۔ میری جان میں تمہیں ایک خوش خبری سناتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر ابھی آکر تمہاری زبان کھول دے گا۔ تھوڑی دیر میں تم چہچہانے لگ جاؤ گی۔

(کیتھرائن اشاروں سے بے انتہا مسرت کا اظہار کرتی ہے اس کے بعد ڈاکٹر آتا ہے اور سب کے سب آپریشن کی تیاری کے لیے ساتھ کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔)

دوسرا ایکٹ

(جج کا کمرہ ——— شام کا وقت)

آدم: آپ نے فادر سے لوکل کے مقدمے پر غور کیا؟

بوتال: ابھی نہیں۔ تم جو کاغذات چھوڑ گئے تھے۔ انہیں پڑھنے تک کی فرصت نہ ملی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ تمہارے مشورے پر عمل کیا۔ اب جان عذاب ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور میری بیوی بولنے لگی۔

آدم: خدا کا شکر ہے۔ کہا کیا اس نے؟

بوتال: بکنے لگی۔ ذرا آئینہ دکھانا مجھے اور میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ میری جان! میری سالگرہ کے دن مجھے ساٹن کا ایک گون لا دو گے نا؟ ساٹن کا گون اور ایک ٹوپی جس کے اندر قل کا استر لگا ہو۔

آدم: اس کے بعد اس کی زبان بند تو نہیں ہوئی؟

بوتال: نہیں بلکہ وہ متاثر لگتا تھا۔ بغیر رکے کے، بغیر کسی وقفے کے بولتی رہی۔

آدم: شروع شروع میں تو یہی ہوگا۔ برسوں کی رکی ہوئی باتیں سب یک وقت نکلیں گی۔ بعد میں بولنا نارمل ہو جائے گا۔ میرے مقدمے کا خیال رکھیئے۔ اس خاتون کا نام لیڈی آرسیلین ہے۔ خدا حافظ!

(آدم چلا جاتا ہے۔)

بوتال: (کاغذات پڑھنے لگ جاتا ہے، دوسرے جانب لیڈی آرسیلین....

(کیتھرین داخل ہوتی ہے۔)

کیتھرین: کیا کر رہے ہو میری جان؟ تم مصروف معلوم ہوتے ہو! تم ہمیشہ مصروف رہتے ہو۔ تم بہت کام کرتے ہو۔ دشمنوں کو کچھ ہو نہ جائے۔ میں کہتی ہوں کبھی آرام بھی تو کیا کرو، اور بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم کر کیا رہے ہو؟

بوتال: میری جان.....

کیتھرین: کیا کوئی راز کی بات ہے جس کے پوچھنے کا مجھے حق نہیں؟

بوتال: میری جان....

کیتھرین: کوئی راز کی بات ہے تو میں نہیں پوچھتی۔

بوتال: مجھے بات تو کرنے دو۔ میں ایک مقدمے کا فیصلہ لکھنے لگا ہوں۔

کیتھرین: تو بڑا ضروری کام ہوا نا؟

بوتال: بہت ضروری!

کیتھرین: تو میری جان تم اپنا فیصلہ کرو میں کچھ نہ بولوں گی۔

بوتال: مقدمے کے واقعات یہ ہیں.... لیڈی آرسیلن....

کیتھرین: میری جان تمہاری رائے میں مجھے ولیم کا گون اچھا لگے گا یا تنگ فل کا؟

بوتال: مجھے کیا معلوم۔ مجھے تو.....

کیتھرین: میرا خیال ہے میری عمر کی عورت کو سادہ اچھا لگے گی۔ بشرطیکہ بالکل کی ہو اور اس پر چھوٹے چھوٹے پھول ہوں۔

بوتال: ممکن ہے۔ مگر......

کیتھرین: اور دیکھو میری جان! تمہارے خیال میں گون کا گھیر بہت ہی زیادہ رکھنا بُری بات نہیں۔ گھیر ہونا تو زیادہ چاہیئے ورنہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا پہن رکھا ہے لیکن اتنا زیادہ بھی فضول ہے۔ تم دیکھنا یہ فیشن بھی اڑ جائے گا ٹھیک ہے نا؟

بوتال: بے شک مگر.....

کیتھرین: اور جوتے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ عورت کا اندازہ ہی اس کا پاؤں دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ وضعدار عورتیں جوتوں کا خیال سب سے زیادہ رکھتی ہیں۔ ٹھیک ہے نا!

بوتال: ٹھیک ہے مگر....

کیتھرین: اچھا تم اپنا فیصلہ لکھو۔ میں نہ بولوں گی۔

بوتال: بہت اچھا (کاغذات اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے) "مذکورہ بالا خاتون کے سرپرست نے خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہو کر...."

کیتھرین: کل ہی مجھ سے ایک سہیلی کہہ رہی تھی کہ دنیا کا حال دن بہ دن بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر طرف بے ایمانی بڑھتی جاتی ہے۔ لوگوں میں دیانتداری، اور شرافت نام کو نہیں۔ کیا یہ سچ ہے یا میری سہیلی یوں ہی مبالغہ کرتی تھی! بولو میری جان!

بوتال: مہربانی کر کے یا تو تھوڑی دیر چپ ہو جاؤ یا کہیں اور جا کر بولتی رہو۔ میرے کام میں ہرج ہوتا ہے۔

کیتھرین: میری جان! تم اطمینان رکھو میں بالکل کچھ نہ کہوں گی۔

بوتال: (پھر بات لکھنے لگتا ہے) "مذکورہ بالا سرپرست نے اس خاتون سے بہت سا روپیہ....."

کیتھرین: میں کبھی کبھی سوچتی ہوں چیزیں مہنگی کتنی ہو گئی ہیں۔ پھر بھی تو ہم لوگ کفایت شعاری نہیں کرتے۔ دسترخوان پر جب تک دس دس کھانے نہ ہوں

چین نہیں آتا۔ میں تو سمجھتی ہوں تھوڑی سی یخنی، تھوڑا سا گوشت، اور ایک میٹھی چیز بس یہ کافی ہونا چاہیئے۔ لیکن لوگ چٹو بھی تو بہت ہوتے جاتے ہیں۔ میری جان! تم کو ایسے لوگوں سے نفرت نہیں ہوتی؟ اور یوں کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کھانے کے بغیر گزارہ کس طرح ہو؟ لیکن ذرا سوچو تو۔ لوگ کیسی کیسی بدمزہ اور غلیظ چیزیں کھاتے ہیں۔

بوتال: میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

کیتھرین، میری جان! میں اب اور کچھ نہ کہوں گی۔ ممکن ہے تمہارا ہرج ہوتا ہو۔ میں زبان تک نہ ہلاؤں گی۔

بوتال: تمہاری مہربانی۔

(وقفہ)

کیتھرین: دیکھا میری جان! میں اب کچھ کہتی ہوں؟ بالکل چپ بیٹھی ہوں۔

بوتال: ٹھیک۔

(وقفہ)

کیتھرین: اب تو تمہارا حرج نہیں ہوتا؟

بوتال: بالکل نہیں۔

(وقفہ)

کیتھرین: اب اطمینان سے اپنا فیصلہ لکھو۔ کیا ختم نہیں ہوا ابھی؟

بوتال: اگر تم نے بولنا بند نہ کیا تو کبھی ختم نہ ہوگا (لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے)

کیتھرین: (یک لخت کھڑی ہو جاتی ہے) سنو! معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگی ہے لوگوں کا شور سنائی دے رہا ہے (بوتال کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں نہیں۔ میں غلطی پر ہوں۔ خدا کا شکر ہے آگ نہیں لگی۔ توبہ توبہ جب کہیں آگ لگتی ہے تو کیسی مصیبت ہوتی ہے۔ گھروں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ لوگ اپنا اسباب دریا میں پھینک دیتے ہیں اور کھڑکیوں میں سے کود کود کر باہر نکل آتے ہیں۔ خوف اور شور کے مارے لوگ دیوانے ہی ہو جاتے ہیں۔

بٹال: بس اب اس سے زیادہ برداشت کرنا ناممکن ہے اگر یہی حالت رہی تو مجھ سے کوئی شدید جرم سرزد ہو جائے گا۔ (نوکر کو آواز دیتا ہے) دیکھو جا کر ڈاکٹر صاحب کو ابھی بلا لاؤ۔ کہو کہ بہت ضروری کام ہے۔ فوراً آ جائے۔

کیتھرین: کیا ہے میری جان! تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ موسم کی خرابی ہے یا کھانے میں کچھ نقص تھا!

بٹال: (دے کاکش) میں نے تمہاری زبان نہ کھلوائی ہوتی۔ لیکن گھبراؤ نہیں ابھی ڈاکٹر آ کر اپنی سیاہی ت تمہاری زبان پھر بند کر دے گا۔ (کاغذ اٹھا کر کیتھرین کے منہ پر مارتا ہے۔ کیتھرین چیخیں مارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے — ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

بٹال: ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے آپ کو اپنی بیوی کے علاج کے لیے بلایا ہے۔

ڈاکٹر: کیا انہیں کوئی تکلیف ہے؟

بٹال: اسے؟ اسے کیا تکلیف ہوتی۔ بدقسمت ستم رسیدہ مظلوم تو میں ہوں۔

ڈاکٹر: تکلیف آپ کو ہے علاج آپ اپنی بیوی کا کرانا چاہتے ہیں!

بٹال: ڈاکٹر صاحب اسے گویائی کی طاقت آپ نے بخشی تھی تو اس قدر فیاضی سے کیوں کام لیا تھا۔ کیا اس کی زبان کسی طرح بند ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر: بالکل ناممکن! بولتے ہوئے آدمی کو گونگا بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔

بٹال: آپ نے میرا دل توڑ دیا ہے میں اجڑ گیا اب تو میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اپنے گلے میں ایک بھاری سا پتھر باندھ کر دریا میں کود پڑوں۔

ڈاکٹر: تمہاری بیوی کا تو کوئی علاج نہیں البتہ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔

بٹال: وہ کیسے؟

ڈاکٹر: بہت بولنے والی بیوی کا دفعیہ تو صرف یہی ہے کہ شوہر کو بہرا بنا دیا جائے میرے پاس ایک سفید سفوف ہے جسے کان میں ڈالتے ہی انسان ہمیشہ کے لیے بہرہ ہو جاتا ہے۔

- بوتال: ہمیشہ کے لیے!

ڈاکٹر: ہمیشہ کے لیے!

بوتال: نہیں مجھے یہ ہرگز منظور نہیں۔ میں بہرا بننا نہیں چاہتا۔

(کیتھرین داخل ہوتی ہے)

کیتھرین: ہیلو! یہاں تو ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر: بیگم آپ کو اب بولنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی؟

کیتھرین: ڈاکٹر صاحب! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ شروع میں تو صرف چند فقرے ہی بول سکتی تھی۔ لیکن اب روانی کے ساتھ گفتگو کر سکتی ہوں۔ تاہم میں ضرورت سے زیادہ نہیں بولتی۔ ابھی ابھی میرا شوہر کام کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ پاس بیٹھی تھی لیکن پھر بھی میرے شوہر کو شکایت ہے کہ تمہارے بولنے سے میرے کام میں ہرج ہوتا ہے (شوہر سے مخاطب ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ناراض کس بات پر ہو؟ آخر وجہ کیا ہے؟ کوئی بات تو ایسی ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتاتے! للہ مجھے کچھ تو بتاؤ۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری آسائش کا خیال رکھوں۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں آئندہ کے لیے احتیاط کروں گی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اماں جان کو خدا بہشت نصیب کرے کہا کرتی تھیں کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی بات نہ چھپانی چاہیئے۔ بے چاری سچ کہتی تھیں۔ دل میں کبھی کوئی بات نہ رکھنی چاہیئے۔ جو ہو صاف صاف کہہ دینا چاہیئے۔ میرا خدا جانتا ہے میں نے کوئی قصور نہیں کیا اگر پھر بھی تمہارا یہ خیال ہے کہ میں گنہگار ہوں تو بے شک ڈاکٹر کے سامنے سب حال بیان کر دو۔

بوتال: (بے بس ہو کر) ڈاکٹر صاحب! خدا کے واسطے وہ سفید سفوف میرے کانوں میں ڈال دیجئے۔ (ڈاکٹر بوتال کے کان میں سفوف ڈال دیتا ہے)

کیتھرین: میری جان۔ میرے سرتاج! آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا میں ایسی ہی بے رحم ہوں کہ میں تمہیں ستاؤں! میں نے تم سے کبھی کوئی دغا کی

ہے ؛ کبھی نہیں دھکا دیا ہے!

بوتال: (مونچھوں پہ تاؤ دے کر) آہا! زندگی کس قدر شیریں ہو گئی ہے! مجھے اب ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا۔

کیتھرین: بوتال! میری بات سنو: میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے دل کا حال سناتی ہوں۔ میرا دل بچپن ہی سے نرم تھا۔ جب میں سات سال کی تھی۔ تو میرے پاس ایک چھوٹا سا کتا تھا..... سُن رہے ہو! میری جان! میری روح! میرے شوہر! (بوتال کو جھنجھوڑتی ہے)

بوتال: زندگی اب ایک جنت ہے۔

(تازیانہ)

★

صید و صیاد

۲۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے قدیمی پل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے اپنا تعلق منقطع کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے اور جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتا جاتا، اس کے دل میں اطمینان اور سکون بڑھتا جاتا تھا۔

یہ نوجوان (جس کا نام ایڈمنڈ سیوین تھا) جب پل کے عین وسط میں پہنچ گیا تو جنگلے پر ہاتھ رکھے دریا کے سیاہ پانی کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم ذرا کانپا، اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور غافلانہ انداز میں اپنا اوورکوٹ اتارنے لگا۔

اوورکوٹ کو تہ کر کے اس نے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے جنگلے کو مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دریا میں کودنے ہی کو تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا اور اس کے کانوں میں آواز آئی "ذرا ٹھہر جائیے حضرت!"

اس موت کے تمنائی نے اجنبی کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے کر ہٹا دیا اور پھر چھلانگ مارنے لگا لیکن اب کے بار اس کے کندھے کو دو ہاتھوں نے زور سے کھینچ لیا اور پھر وہی آواز آئی "حضرت! ذرا ٹھہر جائیے، صرف ایک گھنٹے کے لیے ٹھہر جائیے! کیا اتنا ہی آپ کو بہت معلوم ہوتا ہے؟"

سیوین نے مڑ کر دیکھا اجنبی میانہ قد کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ چہرے کے نقش ایسے تھے جن پر نیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی صرف ایک تفکر سا تھا۔ آواز

اس نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔

لیکن موسیو سیوین کو غصہ سا آگیا اس نے اپنے دل کو جس محنت سے خودکشی پر آمادہ کیا تھا، اس کا یوں رائیگاں جانا اسے ناگوار معلوم ہوا۔

وہ جھلا کر بولا "آپ ہوتے کون ہیں؟"

اجنبی نے کہا "حضرت یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کر سکتا ورنہ میں کا ہے کو مخل ہوتا بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت مناسب ہے لیکن میں کیوں دخل دیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت ضرورت ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ یقین جانیئے میں کبھی یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا"

سیوین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا "تو تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ ایک عورت ہی کی خاطر تو میں یہ (اس نے دریا کیطرف ہاتھ پھیلا دیا) عورت کی جنس کو میں یہاں جان کا خراج ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اجنبی بولا "قصور ایک عورت کا اور آپ سب عورتوں کو الزام دے رہے ہیں۔ آپ انکار نہ کیجئے میں آپ کے منہ سے "نہ" نہیں سن سکتا۔ دوبارہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک خاتون کی چل کے مدد کیجئے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو ایک گھنٹہ تک ملتوی کر دیجئے۔ محض ایک گھنٹہ تک، کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ اس وقت سے کر ابد تک جتنا بھی زمانہ ہے آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹہ بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟"

سیوین باوجود ناراض ہونے کے اجنبی کی باتوں کو غور سے سننے لگا تھا پوچھا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اجنبی نے کہا "یہ دیکھئے میں ابھی آپ سے کہتا ہوں۔ یہاں سردی ہے آپ

اتنی مہربانی کیجئے کہ اپنا اوور کوٹ پہن لیجئے۔ اور میرے ساتھ اس خراب خانے تک چلا چلئے۔ وہ جہاں سُرخ رنگ کی روشنی نظر آرہی ہے۔ جو کچھ مجھے کہنا ہے آپ وہاں پہنچ کر سن لیجئے۔ اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ سیدھے تک واپس آجائیے اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

سیوتین نے صیاکو ایک نظر دیکھا اور اجنبی کی بات مان لینے کو تیار ہو گیا۔ اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ ہو لیا۔

اجنبی نے کہا "شکر ہے کہ آخر کار آپ مجھے مل گئے ورنہ خدا جانے میں کہاں مارا مارا پھرتا۔ آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی آپ ہی کی طرح کے ملے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بدتمیز کہیں کے میری سنی ہی نہیں میں کہتا کیا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں۔ اور شاید تمنا کر رہے ہیں کہ کسی طرح واپس پیرس پہنچ جائیں۔ لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں — یہ لیجئے ہم پہنچ گئے یہ خراب خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا مضائقہ ہے... پہلے آپ صاحب!"

دونوں کمرے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور زیادہ متفکر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یوں دیکھنے میں بُرا نہ تھا۔ موسیو سیوتین پچیس برس کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے، لباس پیرس کے دیہاتیوں کا، رنگ ذرا زرد۔ بولا "تو تمہارا مقصد کیا ہے؟"

اجنبی نے کہا "مجھے اپنا مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ چل کے "شیر شکاری" کھیلئے "شیر شکاری" کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟"

"نہیں۔"

"افسوس! انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو یقیناً سنا ہوگا؟ مجھے پیل کہتے ہیں۔"

سیوتین نے کہا "بکتے جاؤ۔ میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سُنا۔"

پول مایوسی کے لہجے میں بولا: "تب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب سنئے۔ جو حضرات اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں ان کے لیے میں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔ جس پر انہیں کسی طرح ملامت نہ ہو سکے۔ اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا تو آپ دریائے سین کے پاس جانے کی بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہو گا۔"

سیمین نے کہا "جو کچھ تمہیں کہنا ہے جلدی کہو۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر چکا ہے اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔"

پول نے کہا: "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دیکھئے نا۔ آخر ایک موجد بھی سینے میں دل رکھتا ہے اس کے بھی حسیات کو صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ تو صاحب بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ تمدن حقوق و فرائض کے باہمی تعلقات کا نام ہے چند فرائض ایسے بھی ہیں جن کو زندگی کے آخری لمحوں میں بھی پورا کرنا ضروری ہے۔ سوسائٹی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کو دنیا سے یوں اکیلے جانا مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ کئی لوگ ایسے موجود ہیں جو آپ کو تشریف لے جانے میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں۔ تیار کیا؟ خواہش مند ہیں۔ جن کی مدد سے آپ کے وداع آخری کو نہ صرف زیادہ پُر لطف بلکہ زیادہ خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس حسن آفرینی کے لیے میں نے ایک معمولی سا کھیل ایجاد کیا ہے جس میں دو کھلاڑی اعلیٰ درجہ کا لطف حاصل کر سکتے ہیں اور ان میں سے ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے زندگی سے تنگ آئے ہوئے دو آدمی آپس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کون شیر ہے اور کون شکاری۔ اس کے بعد شیر اپنے گلے میں ایک نقرئی گھنٹی باندھ لیتا ہے اور شکاری ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لے لیتا ہے۔ کمرے کے تمام چراغ گل کر دیئے جاتے ہیں اور صید و صیاد کو تنہائی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر شیر کی مرضی کے مطابق موسیقی سے اس کی سامعہ نوازی

کی جاتی ہے پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے شیر کی حرکت سے اس کے گلے میں لگی ہوئی گھنٹی بجتی ہے۔ شکاری اندھیرے میں فائر کرتا ہے ایک دفعہ اور پھر ایک دفعہ اور۔ پھر چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں اگر شیر زخمی ہو گیا تو وہ یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ سب گولیاں زہر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ بچ جائے تو گھنٹی اس کے گلے سے اتار کر شکاری کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا۔ لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ تو ایک خاتون نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بدعت کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے۔ ایک مرد کو ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے۔

میں نے اس میں ایک دو جدتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھی بھر دیتا ہوں۔ سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کارتوس خالی ہے۔ اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے معزز حضرات اور معزز خواتین کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ دریائے سین میں پڑے پائے جائیں۔ وہ اب اس پرلطف موت کو ترجیح دیتے ہیں"

سیوتن نے پوچھا "لیکن تمہاری اس ہرزہ سرائی کو مجھ سے کیا تعلق ؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو ؟ میں سمجھتا ہوں تمہیں اس قبیح فعل کے لیے کسی کیس کی توقع ہے تو وہ پھر تم کو مجھ سے نہ ملی۔ میں واپس پل پر جا رہا ہوں اور نہیں سمجھتا کہ کسی طرح بھی تمہارا ممنون ہوں"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

پول نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا "خدا کے لیے پانچ منٹ یہاں اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی فیس نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوک اور ایک خاتون

کو آپس میں یہ کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو بچ گئی ہیں لیکن ڈیوک صاحب اب تک تشریف نہیں لائے ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جاسکتا ہے اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری سخت بدنامی ہے۔ دربار میں یہ خبر پہنچی تو میری ناموری میں خلل آجانے گا۔ آپ چل کر ڈیوک کی جگہ لے لیجئے اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنایئے اگر خدانخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے تو آپ اس پر احسان کرکے واپس تشریف لے آیئے۔"

میوتین نے گھبرا کے پوچھا "تم چاہتے ہو میں اس کی جان لوں؟"

دل نے کہا "یہ کیا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے۔ چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مرجانا یا ایک مدریا میں پڑے سڑتے رہنا۔ جہاں اس بات کا خطرہ بھی ساتھ لگا ہے کہ کوئی خدائی فوجدار آکے آپ کو نہ بچا لے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں آپ کی قسل کو کم از کم یہ خیال تو ہوگا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔

میوتین نے کہا "ممکن ہے میں جانبر ہونے کو ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمہیں تمہاری ایجاد مبارک ہو، جس کی بدولت تم نے خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت مار دیا ہے۔"

موجد بولا "حضرت آپ بہت تنگ نگاہی سے کام لے رہے ہیں آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا ہے خدا آپ خود تو فرمایئے۔ میں نے کس کو جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مرجاؤ۔ میرے پاس تو وہی لوگ تشریف لاتے ہیں۔ جنہوں نے مرجانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا؟ یہ سنتے ہی جیب سے ایک پاکٹ بک نکال کر، یہ میرے بہی کھاتے کا حساب سنئے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہو چکی ہیں جن میں سے ۲۸ مردوں کی تھیں۔ اور تیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیلی جاچکی ہیں! بیالیس اموات۔ اب حضرت! اگر میرے مرتی اپنا طریقۂ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً دگنی ہوتی ہے یا نہیں؟ جناب عالی! میں تو مصلح بنی

نوع انسان ہوں تو جانیں بچاتا ہوں۔"

سیوئن نے کہا: "اور تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمہاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہیں۔"

"حضور مجھے معاف کیجئے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے ممکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھیلتے حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے ماسوا باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گولی کے چلنے کا ڈر ایک مختصر، مگر شدید انتظار مرگ۔ مجروح نعش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی ہیبت ناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں وہ پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مرنا ہے تو گھر میں جا کر طبعی موت ہی مریں گے۔

حضور! اگر آپ چل کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کر دیں اور خوش قسمتی یا ذہانت سے آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالےٰ کا شکریہ ادا کریں گے کہ آپ زندہ بچ گئے۔"

سیوئن نے کہا: "خیر یہ بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں مختصر یہ کہ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے اور کیا؟"

یُول بے انتہا مسرور ہوا اور بڑے لچھے دار فقروں میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

سیوئن نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا: "بل ادا کرو اور چلو چلیں۔ بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔"

شراب خانے سے نکلے تو یُول آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں ایک آویزاں لیمپ کی ناکافی روشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ یُول نہایت روانی سے باتیں کرتا جاتا تھا شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپس چلے جانے کا ارادہ نہ

کرے ۔ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا۔ کبھی دربارِ شاہی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں ایکٹرس نے بہت بُری طرح ایکٹ کیا۔ اور گاتے وقت بے سری ہوگئی ۔ اور جب اس طرح کی باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی ۔ سیوآن بالکل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا ۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور ایک کسی قدر بڑے گھر کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئے ۔ یُول نے ایک گھنٹی کی رسّی کو پکڑ کر کھینچا ۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی ایک کھڑکی میں سے کسی نے باہر جھانکا اور آواز آئی " کون ہے ؟"

یوآل نے کہا " میں ہوں دروازہ کھولو "

دروازہ کھلا اور یہ دونوں اندر داخل ہوئے ۔ یُول نے پوچھا " وہ خاتون ابھی یہیں ہیں ؟" جواب ملا " ہاں صاحب "۔ " ڈیوک آئی ہیں "؟ جواب ملا ۔ " نہیں صاحب "۔

یوآل نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا " آیئے "۔

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بربط دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا میز پر ایک رُباب رکھا تھا ۔ اور کرسی پر ایک عورت سوئی پڑی تھی ۔ شکل حسین نہ تھی ۔

سیوآن نے مایوس ہو کر پوچھا " کیا یہی وہ خاتون ہیں ؟"

یوآل نے کہا " نہیں صاحب ! یہ تو بربط بجانے والی عورت ہے ۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سوگئی ہے ۔ وہ خاتون تو ساتھ کے کمرے میں ہیں ۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اتار کر یہاں لٹکا دیجئے اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے اسے بھی پورا کر دیجئے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجئے ۔ گمنامی میرے یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے ۔ ٹھیک ۔ اِدھر کو تشریف لائیے "۔

ساتھ کا کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا ۔ فرنیچر تھوڑا ۔ مگر جس قدر بھی تھا اچھا

تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی: "اب آبھی چکو۔ اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔"

وِل نے کہا۔ "بیگم صاحبہ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے کچھ مشکلات پیش آگئی تھیں جن کی وجہ سے میں رُک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں۔ یہاں بے وفا حضرت کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کرکے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے۔ آپ اس میں ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر لیجئے یا دُنیا کے لیے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ ڈالیئے۔"

عورت نے اٹھ کر کہا: "نہیں میں ضرورت سے زیادہ انتظار کر چکی ہوں۔ یہ ابھی اور انتظار کیا معنی؟ اجنبی صاحب اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟"

سیون نے کہا: "سچ بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر میں فوراً اس دُنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کچھ وِل کی باتوں کا اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھے تعجیل کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹہ ٹھہر جائیے مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے۔ کیونکہ آپ ہی نے میرے اصلی ارادے کو درہم برہم کر دیا ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریا کی تہ میں پڑا ہوتا یا بہہ کر سمندر تک پہنچ گیا ہوتا۔"

خاتون نے کہا: "جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب! لیکن افسوس کہ میں اس وقت اپنی رفاقت میں کوئی دل پذیری پیدا نہیں کر سکتی۔"

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ جس میں سیون اس حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کے بالائی حصے کو مستور کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ٹھوڑی کی گولائی، ہونٹوں کی کمان، چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوبصورتی جو گھنگھریالے بال میں سے جھانک رہی تھی۔ اس بات کے لیے

کاڈی تھیں کہ سیون نقاب پوش حصے کے متعلق غور کرنے لگ جائے شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بہرحال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو ہی جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی: "جناب! اگر ہمیں اپنی زندگی کے آخر لمحے اکٹھے ہی گزارنے ہیں تو ہنسی کھیل سے ہی گزار دیں۔ دو گھنٹے خاموش بیٹھی رہی ہوں۔ خدا میرے دل کو بہلنے دیجئے۔ خدا کے لیے بات ہی کیجئے۔

سیوتین نے کہا: "بیگم! بسر و چشم۔ کیا بات کروں۔ اچھا استعارے میں بات کرتا ہوں۔ جب میں ادھر کو آ رہا تھا تو راستے میں پولس سنتریوں کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ ایک طرف کو زہرہ دکھائی دے رہی تھی۔ پولس نے مجھ سے پوچھا تھا: "یہ زہرہ یہاں کیسے آ گئی؟" اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ زہرہ یہاں کیسے آ گئی۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جس کو فریب کیا جا سکے۔ دلوں کے توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر یہ کھیل جو ہم کھیلنے والے ہیں۔ اس کی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ میں پھر پوچھوں گا کہ زہرہ یہاں کیسے آ گئی؟

خاتون نے جواب دیا: "جناب معلوم ہوتا ہے آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت پوچھتے تو میں اس کو آپ کی دیدہ دلیری سمجھتی اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی۔ لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹہ اور زندہ رہنا ہے میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تو جناب زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ مطاردہ ہے۔ جس کی ظاہرا شکل و صورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی۔ لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا۔"

سیوین نے کہا: "اس کے اور حالات سے مجھے آگاہ کیجئے۔"

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا: "میں اس سے زیادہ کیوں بتلاؤں۔ میں راز کے بدلے راز کا اظہار کر سکتی ہوں۔ گمنام صاحب! آپ بتائیے۔ آپ یہاں کیوں

تشریف لائے ہیں؟" (معاف کیجئے میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکارتی)

"بیگم صاحبہ! میرے یہاں آنے کا باعث حسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارا ہوا ہے جو میرے ساتھ قران میں آیا ہے اور کچھ عرصہ تک میری ہمراہی میں گردش کرتا رہا۔ لیکن یہ ستارہ آخر میں آپ کے عطارد کی طرح کج رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سیاہی کی آغوش میں چمک رہا ہے۔ یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے اس لیے میں کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تو آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا؟"

"کبھی نہیں۔ اسی لیے میں نے قسم کھالی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش نہ آئے گا۔"

"آپ کے خیال میں وہ اس قابل ہے کہ اس کے لیے جان یوں قربان کر دی جائے؟"

"کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے؟"

خاتون نے جوش میں آکر کہا "ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں محبت کو دل شکستہ کا مرہم جان کر اس کی طلب گار ہوں آپ کا شاید یہ خیال ہو لیکن میں تو صرف اس لیے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا اور بادشاہی کے لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ زندگی میں پہلے بھی ایک دفعہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ پھر یوں ہو۔ مرد جھوٹے اور بے وفا ہیں۔"

"بیگم صاحبہ! ایک آپ کو چھوڑ کر عورتیں بھی کچھ کم نہیں۔"

بات کو یہاں پہنچا کر دونوں غم زدہ نظروں سے آگ کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ستیون نے کہا۔

"بیگم صاحبہ! زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں۔ آپ میری اتنی بات مان لیجئے کہ اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجئے۔"

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا "کیوں؟"

دُنیا میں بھیج دے گی یا مجھ سے چند منٹ پہلے وہاں جا پہنچے گی :

جواب ملا "فضول تھا ۔ آپ کہتا ہے کہ اس وقت آپ اپنے دل کو اعلیٰ و ارفع خیالات میں معروف رکھیں "

میویتین نے کہا "بیگم صاحبہ ! یہ نہ کہیئے - ابھی ابھی مجھ سے یول نے کہا تھا کہ انسان ایک حیوان متمدن ہے ۔ ہم ایک طول طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں - اور اگر میں اپنے ہمسفر کی شکل چاہوں ۔ تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے ۔ معاف کیجئے ۔ آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیئے ۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہو گیا ہوتا اور پھر آپ کی گولی کا نشانہ بننا یا آپ کو اپنا نشانہ بنانا کوئی معمولی سی بات ہے ! ۔۔۔ مجھے اپنی شکل دکھا دیجئے "

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی ۔ پھر کہنے لگی " جناب فی الحقیقت بقول آپ کے میں آپ کی احسان مند ہوں ۔ آپ کا حکم ماننے کے بغیر چارہ نہیں ۔ آپ بھی اپنا نقاب اتار دیجئے ۔

دونوں نے اپنے نقاب اتار دیئے ۔ اور دونوں غور سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ۔ میویتین خوش شکل تھا لیکن بے نقابی نے خاتون کے چہرے کے جس حسن کو آشکارا کر دیا تھا میویتین کی توقع سے بالا تھا ۔ باریک نفیس ابرو جیسے کسی خوش مذاق مصور کی قلم طرازی ، نیلی نیلی خوب صورت آنکھیں ، لمبی لمبی خمیدہ پلکیں آنکھوں کی نیلگوں گہرائیاں میویتین کا دل دھڑکنے لگا ۔

خاتون نے کہا " کیا میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرد مجھ سے یوں منہ پھیر لیں "

میویتین نے کہا " جو کچھ میری آنکھوں کو نظر آ رہا ہے اس سے تو ایک تیسرا شخص بھی مسحور ہو سکتا ہے ۔ اگر ان دونوں نے آپ سے بے وفائی کی تو اس کی وجہ اس موجودہ صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتی ۔ کیا انہوں نے کوئی اور وجہ نہیں بتائی ؟"

" ایک نے وہ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ دوسرا افلاس کی ناگوار تھا ۔ جب میرے والد کے ساتھ ہی میرا

تموّل بھی رخصت ہو گیا اور ناداری نے مجھے آن گھیرا۔ تو میرا چھبیلا ایک دن مجھے ملنے آیا۔ عشق و محبت کی داستان رُک رُک کے اور تھم تھم کے مجھ سے کہتا رہا۔ آواز میں عجز تھا۔ انداز میں انکسار تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر گھر بار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے —— حضرت میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھے تھے۔ دوراندیش واقع ہوئے تھے۔"

سیون نے جیسے ایک دزدیدہ ہوس کر کے کہا "او خدا ایسی شکل کو دیکھنا اور پھر دوراندیش رہنا۔ اور آپ کے عشق کا دوسرا شعلہ۔ آپ کا معطارد۔ وہ بھی دوراندیش تھا؟"

"نہیں اب میں دولت مند ہوں۔ چچا کے مرجانے کے بعد مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا۔ میرے سورما کا دل اور تیسرے چہ مہینے تک میری قدم بوسی کرتے رہے۔ لیکن آہ میں کیا کہوں۔ جو امر دسپاری ایسے نہیں ہوا کرتے۔ یکایک انہوں نے حسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا آپ کا عذر ملاحظہ فرمایئے۔ میری دردمندی کا بھی خیال کیجئے مجھ کو آپ لکھتے ہیں " رنگ کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں" اب تک وہ اندھا تھا یک نئی نوبی نے اسے بصارت بخشی۔ اب اسے نیلی آنکھوں کی بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔"

سیون نے کہا "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن نہیں بیگم صاحبہ یوں ہو سکتا ہے اس سے پیشتر مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں سے پیارا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اب میں نیلے رنگ کی قسم کھایا کروں گا۔"

"حضرت آپ اسی بھورے رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹہ پہلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں۔ جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا اس کی صحبت میں مجھے تمام محاسن، سب کی سب خوبیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کی تعریف میں قصیدے کو لکھ کے گائے تھے۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ میری جہالت کا نتیجہ تھا۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں اور مجھے شہرت سے نفرت تھی اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے میں اسے تمام عورتوں سے

بڑھ کر حسین جانتا تھا۔ اس لیے کہ میں نے ابھی آپ کو دیکھا نہ تھا۔"

نفرت آمیز جواب ملا کہ "شاعر صاحب کیا کہنے! آپ بھی اور مردوں کی طرح ہر لمحہ بدلنے والے ہیں۔ آپ بھدے رنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے لیے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں اور بمشکل ایک گھنٹہ گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا رنگ موہ لیتا ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لیے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں۔"

سیوتن نے کہا "میں نیلے رنگ کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں یہ نیلی آنکھیں مجھے التفات کی نظر دیکھیں تو یہی زندگی جنت ہو سکتی ہے۔"

خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی۔

"جناب آپ یقین مانیئے کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق و فنا کر سکتی ہیں۔ آسمان نیلگوں ہے لیکن اس کی بجلیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

سیوتن نے آہستہ سے کہا "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہوگا۔"

خاتون نے جوش میں آکر کہا "میں بہت ہی خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو مار دینے سے مجھے بہت ہی مسرت حاصل ہوگی۔"

شاعر نے کہا "اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ دوراندیش صاحب نے اور عطارد نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ بیگم صاحبہ! یہ برہم مزاجی نیلی آنکھوں کو نہیں سجتی آپ بہت بہت بے رحم ہیں۔ لیکن آپ کے عطارد کا دل معلوم ہوتا ہے غیرت سے بالکل مبرا تھا آپ کا عتاب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے وہ ماسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے ایک تلاطم میں کہیں سورج نظر آ رہا ہے۔ پھر اس پہ بادل گھر آتے ہیں پھر کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں۔ اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے جس

نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کریں وہ حسن کی کس قدر قدر کر سکتا ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ بچ جاؤں تو ذکر اس بے ہی وتی کا اور پھر بیاں اپنا جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں۔ کیف افسوس ملیں۔ آپ کو فردوس کی پُر فضا گلگشتوں میں مسرت ہو کہ اسے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی ؟

اس تقریر کے دوران میں خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی۔

"سبحان اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر احمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب! کوئی شخص آپ کی نظموں کو چھاپنا بھی گوارا کرتا ہے ؟"

شاعر نے فخر و غرور سے کہا" بیگم صاحبہ میرا نام ایڈمنڈ سیوین ہے"

"کون سیوین ؟ مان کا ماٹو کا رہنے والا ؟"

"شاعر نے کہا" میں وہی ہوں۔ آپ کو میری نظموں میں سے کون سی پسند ہے وحسن شیریں، عشق لیلے! ؟"

"نظمیں ؟ میں نے نظمیں کبھی نہیں پڑھیں! شاعر سیوین کا نام میں نے آج سے پیشتر کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی محبوبہ اس مجوری آنکھوں والی کا نام ڈوبائے ہے ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ مگر آپ اسے کیونکر جانتی ہیں ؟"

"میرا کپتان، میرا سورما، میرا عطارد مان کا ٹو میں اسے اپنا دل دے چکا ہے۔ مجھے اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پہلے سیوین نامی ایک مجنوں شاعر کی دلدادہ تھی۔ اب وہ ایک جنگ جو، بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا عطارد مشہور خطوط بارے خط بہت مفصل لکھا کرتا تھا "

غصے سے سیوین کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بیتاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا آخر کار بولا۔

"سو بیگم صاحبہ آپ ہی ہیں۔ جنہوں نے بے دردی کے ساتھ میری خوشی اور

میری راحت مجھ سے چھنوا دی ہے اگر آپ اس سورما کو اپنے پاس سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزارتا۔ میں شہر ایک ضروری کام کے لیے آیا تھا مجھے کیا معلوم کہ میری عدم موجودگی میں میری دولت کو یوں ایک لٹیرا آ کر لوٹ لے جائے گا۔"

اس نے اتنا کہا اور ٹہل ٹہل کر کمرہ کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑ کر اس نے اپنی نظریں اس خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گرم تقریر سے خاتون کے چہرے پر ایک سُرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نور چمک رہا تھا اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش رُبا تھا۔

دعب حسن اور اس پر شاعر کی نگاہ۔ سیوتن کی پلکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا ــــ وہ ایک پیکرِ التجا ہو کر بولا۔

"بیگم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے سُورما کو بھلا دیں اور میں اپنی بے وفا محبوبہ کو بھول جاؤں اور ــــ"

"اور کیا ؟"

"اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں ؟"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی۔ اتنی دیر تک کہ سیوتن اپنی توہین محسوس کرنے لگا۔ کہنے لگی۔

"شاعر صاحب! مجھ سے آپ کی عشق کی پائیداری کو تو نہیں سراہا جا سکتا۔ البتہ میں آپ کی جدتِ طبع کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس دانش مندانہ تجویز کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے سچے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہے اسے کچھ کر کے بتانا پڑے گا۔ میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی۔ جو آج تو نیلی آنکھوں پر مرتا ہے اور پھر قوسِ قزح کے سات رنگ باری باری سے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا ناممکن ہے ــــ اس لیے"

اتنے میں دروازہ کھلا اور نوکر اندر داخل ہوا۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر

چونکا اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا "یہ سخت بے قاعدگی ہے۔ آپ ازراہِ نوازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے"

خاتون نے کہا "اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے پول! تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں۔ آپ شاعر ہیں۔ مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ میں شاعروں کو گولی سے بھی مار سکتی ہوں"

پول نے ایک تھیلی آگے بڑھا کے کہا "اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں۔ آپ ایک ایک کترن نکال لیجئے۔ جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی اسے شیر بننا پڑے گا"

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ سیون نے بھی اپنی قسمت آزمائی۔ کترنوں کو ایک ساتھ رکھ کر ماپا گیا۔

خاتون پکار اٹھی "میں شکاری ہوں"

سیون نے کہا "اور میں شیر ہوں۔ بیگم صاحبہ، گولی بالکل سیدھی چلائیے۔ یہ جھگڑا جلد پاک ہو جائے گا"

پول نے کہا "یہ دیکھئے۔ یہ گھنٹی ہے اسے اپنے گلے میں ڈال لیجئے اور ہلا کر دیکھئے۔ ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ بیگم صاحبہ یہ پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب اس دیوار کے سامنے ہی رہیئے اور جب وقت موسیقی بند ہو جائے تو آپ دو قدم چلئے اور گھنٹی کو بجنے دیجئے اور بیگم صاحبہ آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں۔ لیجئے آداب عرض ہے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے آپ کا سفر جلدی سے طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوشگوار و دل پذیر ہو۔ صاحب آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیئے"

سیون نے کہا "کوئی دردناک سا سُر بجاؤ۔ جس میں امیدوں کا خاک میں مل جانا ہو۔ جس میں نیلی آنکھوں کی سفاکی ہو جس میں ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔ بیگم صاحبہ! لیجئے جو انتقام آپ کو مردوں کی جنس سے

لینا ہے، وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لیجئے۔"

پول نے طاق پر رکھی ہوئی شمعیں بجھا دیں۔ انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا۔ پھر میز کا لیمپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو کمرے میں بالکل اندھیرا تھا ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے فضا میں ایک بے تابی پیدا کر دی تین منٹ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔

محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ پول لیمپ ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دھواں ابھی نکل رہا تھا۔ سیوین ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔

پول نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا "گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں وہ دو سوراخ۔ بیگم صاحبہ۔ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب آپ گھنٹی بیگم صاحبہ کو دے دیجئے اور میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں۔"

پول کونے میں میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا "بیگم صاحبہ! آپ نے پستول بہت اونچا چلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میرے دل میں اتنا رحم نہیں۔ میری ایک نہ ایک گولی ضرور مہلک ہوگی۔"

خاتون نے کہا "شاعر صاحب یہی تو میری تمنا ہے۔"

پول نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا۔ خاتون سے پوچھا "آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیئے؟"

جواب ملا "کوئی بے پروا سی چیز بجا دو۔ دردناک سُر مجھے نہیں بھاتے۔"

دروازہ بند ہو گیا۔ اور ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک ہنستا کھیلتا سُر سنائی دیا۔ آخر وہ بھی بند ہو گیا۔

ایک گھنٹی کی آواز آئی۔

ایک گولی چلی۔

صید نے آواز دی" شاعر صاحب پستول ذرا نیچے کر کے چلائیے۔"

صیاد نے کہا " نیلے نیناں والی۔ خدا حافظ"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا " بے وفا شاعر۔ خدا حافظ" اور پھر گھنٹی بجی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی کوئی زمین پر بیٹھ گرا۔

پول روشنی سے کمرا بھر آگیا۔ خاتون اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ سیوین کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جو فرش پر پڑا تھا۔

خاتون نے ایک چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیوین کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ چلا چلا کر کہتی رہی۔

"میرے شاعر، میرے پیارے شاعر، تونے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا اور میں نے یونہی تیرا مسخرا اڑا دیا۔ میرے خوب صورت شاعر تو کیوں مرگیا؟"

پول نے شبہ کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا " لیکن وہ کیسے مر سکتا ہے! کارتوس تو خالی کارتوس ہے۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا خیال ہے میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا اس کا نشان تو دیوار پر موجود ہے اس لیے دوسرا کارتوس بھی خالی ہوگا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارتوس خالی ہے یہ مرکیسے سکتے ہیں؟ صرف بے ہوش ہو گئے ہیں! وہ بھی نہیں۔ دیکھئے۔ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔"

سیوین نے آنکھیں کھول دیں کہ حسن عشق کے انداز میں نیاز مند ہے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا " تو کیا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔ او خدا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

خاتون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی "نہیں میرے صاحب! ہم ابھی پیرس میں ہیں"۔

"پیرس میں! کیا کہا تم نے! پیرس میں! کیا خواب ہے؟" سیون اٹھ کر بیٹھ گیا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نشان اس بات کا شاہد ہے"۔

پولی بولا "وہ خالی کارتوس تھا آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ! اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے"۔

خاتون نے کہا "اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ برائے مہربانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجئے۔ مجھے آج ہی ورسیلز پہنچنا ہے"۔

پولی نے کہا "بیگم صاحبہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے۔ دیکھیے ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو جائے گا۔ پی لیجئے"۔

"صاحب! آپ مجھے فوراً گاڑی منگوا دیجئے۔ آپ سنتے ہیں؟"

پولی مایوس ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سیون آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔

خاتون نے پوچھا "میرے اچھے صاحب! مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی؟"

"تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمہارے لئے اپنی جان دے دوں! افسوس وہ بھی نہ ہوا"۔

خاتون نے بڑی ملائمت سے کہا "یہ آپ کیا جانیں؟" اور پھر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی "میرا نام ولن سینیر ہے۔ میں ملکہ کی درباریوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد ورسیلز میں آکر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر"

"اور پھر کیا؟"

"اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں ہی ستاروں کی باتیں کریں گے"۔

شاعر نے پوچھا: "ان دو نیلے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"
خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا: "یونہی سہی۔"

*

عشق کی خودکشی

مفصلہ ذیل تحریر کے پُرزے جیل خانے کی اُس کوٹھری میں پائے گئے جہاں میرا دوست قاسم پھانسی پانے سے پہلے محبوس تھا اور مجھے سعادت علی خاں داروغہ جیل کی مہربانی سے دستیاب ہوئے تھے قاسم جس کی زندگی شوق اور کیف کے سرچکرا دینے والے جذبات سے معمور تھی آج دوسری دُنیا میں ہے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ اپنی محبوب بیوی رضا کو بھیج چکا تھا خدا ان دونوں کی روحوں کو عافیت عطا فرمائے۔

۱۔ شاید مجھے داروغہ جیل کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس کی اجازت سے میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس وقت جذبات سے بالکل خالی ہے۔ میرے دل کی اس وقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے جب سحر کی پھیکی روشنی اور تکان کا خواب آلود سکون مشاغل شبانہ کی بوالہوسیوں اور عشرتوں کو بے رنگ اور بھیانک کر دیتا ہے میرا دل ایک کھنڈر ہے۔ جس میں زندگی نہیں آثار ہیں۔ جہاں حال بیدار نہیں، ماضی خفتہ ہے۔ جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ، فقط ایک ویران سی گونج ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں جو نوائے زندگی اور غلغلۂ حیات نہیں۔ ایک خندۂ بے مسرت، ایک فریاد بے درد ہے۔

کل مجھے قانون کی انتہائی سزا دی جائے گی۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ہر شخص اس کے لیے تیار ہوتا ہے۔ موت کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ موت

اسی لیے موت بے کہ ناگہانی ہوتی ہے۔ ہر ایک موت ناگہانی موت ہے۔ موت کا وقت معین ہے اور اس طرح معین کیا گیا ہے کہ بے موقع آئے۔ اگر ہمیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو تو ہماری تمام زندگی اسی موت ہی کی تیاری میں صرف ہو جائے۔ زندگی اس قیام کی مانند ہو جو ریل کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کیا جاتا ہے۔

۲۔ انسان کی ہستی فوری ضروریات اور فوری انتظامات کا ایک اجتماع ہو جس میں عشق کی ناپائیداری حسن کی بے وفائی کی طرح ہو جہاں تعمیر ایک غلطی ہو جہاں اعتماد ایک حماقت ہو۔

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے اس لیے میں نے جو کچھ تعمیر کیا تھا اسے منہدم کر چکا ہوں۔ مجھے اس تخریب میں بہت کم تکلیف ہوئی ہے۔ میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی۔ میری آرزوں کے محل، میری توقعات کے قصر، میرے ارادے کے قلعے سب بلند اور شاندار تھے۔ لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا کہ سب کی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔

شروع میں جب میں نے مجرم ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ تو اکثر لوگ مجھے سچا جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ ارشد بھی مجھے بے گناہ سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھے کتنی مدت سے جانتا تھا۔ ایسے لوگ مجھ پر رحم کھاتے تھے اور مجھ سے ہمدردی کرتے تھے۔

چند ایسے بھی تھے جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے ان کا گمان تھا کہ رضیہ کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے وہ بھی مجھ پر رحم کھاتے تھے لیکن مجھے حقیر جانتے تھے۔

یہ دونوں غلطی پر تھے۔ مجھے اعترافِ جرم کی دیوانگی سمجھنے والے سن لیں کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے اسی ہاتھ میں ہاتھ جو اس وقت خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ رضیہ کے نازک گلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اس کے سانس کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے میرے انکارِ جرم کو میری بزدلی اور دروغ گوئی سمجھنے والے سن لیں کہ جب میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر بلا تامل کہہ دیا تھا کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں تو

میرے دل اور زبان میں وہی سچائی تھی جس نے بعد میں اعتراف کروایا۔ میں ایک نہیں، دو ہوں۔ شاید میں دس بیس ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں احساس ہو رہا ہے کہ میری ایک تنہا ہستی میں کس قدر کثرت تھی۔ رضیہ کو چاہنے والا بھی انسان تھا جو اب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے۔ میں کیسے مانوں؟ اگر میں ایک ہوں تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں ——— کہ میں نے رضیہ کو اس لئے قتل کیا کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ کتنی عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن نہیں یہ بات ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی میں سب کچھ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں۔ شاید میں نے غلطی کی ہے۔ میں ایک کمزور ہوں سب انسان کمزور ہوتے ہیں۔

۳۔ دو سال ہوئے ہیں اور رضیہ بیاہ ہے گئے۔ اس کے سنگدل والدین نے اسے معاف نہیں کیا۔ میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو "اوباشی" سمجھتے ہیں کیونکہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ اگر ہمارے محلے میں حسن اس قدر کمیاب نہ ہوتا تو شاید چند اور والدین بھی اس وقت اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتے۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ماحول رہنے کی وجہ سے ان کی اولاد کی عصمت شعاری ہے کیا شاعرانہ خیال ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کی نیک خصالی پر فخر کرتے ہیں۔ اس صفت پر فخر کرتے ہیں۔ جو مردوں کے وہم و تخیل نے عورت کو بخش دی ہے۔ ان سے کہہ دو جو مجھ سے بچ گئے ہیں کہ اصل وجہ ان کی لڑکیوں کی پاکبازی نہیں میری عالی نگاہی تھی جو ان میں سے کسی کو بحیثیت بیوی کے گوارا نہ کر سکتی تھی۔ یہ نقادان اخلاق سمجھتے ہیں کہ میں نے رضیہ کو اس کی بدچلنی کی وجہ سے مار ڈالا۔ او خدا جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو محض ایک قتل کے بدلے کیوں؟ میں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں؟

رضیہ کو کس نے مارا؟ شاید میں نے! یہ نہ کہو۔ تم رضیہ سے جا کر پوچھ لو۔ وہ کبھی میرا نام نہ لے گی۔ وہ کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ میں نے اسے قتل کیا ہے اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا۔ تم یقین مانو

کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی۔ محض میری خاطر اس نے تمام جہان کے الزامات اپنے سر لیے۔ دنیا بھر کے مصائب اس نے میرے ساتھ مل کر برداشت کیے۔ ٹھیک وقت پر میرے لیے کھانا تیار کرنا اور بڑے اہتمام سے میرے بستر کو بچھانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی۔ رات کو بڑی دیر تک میرے انتظار میں جاگتی رہتی۔ ہائے یہ نہ کہو کہ میں نے اسے مارا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاؤ تمہیں اختیار ہے پوچھ لو۔

عورت اگر چاہے تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔ فطرت نے دلوں کو توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل محض اس لیے بنائے ہیں کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لیے ہیں کہ یا ہم ان کو دیکھیں یا ہم ان کے لیے روئیں۔ عورت کو خراجِ نگاہ چاہیے یا خراجِ اشک۔ اسی دولت سے وہ کشورِ دل پر حکمرانی کرتی ہے۔ ان کا عہد ایک دورِ ظلم ہوتا ہے اور ایک عہدِ ستم۔ جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے رضیہ سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ وہ برف تھی۔ میں نے چاہا اسے آگ بنا دوں وہ برودت تھی۔ میں یا بنتا تھا حرارت ہو۔ وہ چپ چاپ پانی کی طرح بہتی تھی اور میں اسے شعلوں کی طرح بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں رات کی تاریکی میں بار ہا گھنٹوں تک متواتر اسکے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے لمبے لمبے درد بھرے فقروں میں اس سے اپنے عشق کی داستان کہتا۔ اسے دیوی سمجھ کر پجاریوں کی طرح اس کی پوجا کرتا۔ وہ بُت کی طرح بیٹھی رہا کرتی۔ میں اس سے کہتا "اے میرے دل پر حکومت کرنے والی ملکہ! میں تیرا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ تیری خدمت کرنا میرے لیے جنت میں زندگی گذارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟" وہ کچھ نہ بولتی۔ میں اس کی باہیں مروڑتا۔ جب بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوتے۔ مجھے خوشی حاصل ہوتی کیونکہ

اس پر بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ تم کہو گے شرم کی وجہ سے! تم کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے تمہیں "نسوانیت" کا کچھ علم نہیں۔ تم صرف مرد ہو، تم میں مردانگی نہیں۔ تمہاری تمناؤں میں بلندی کی قابلیت نہیں۔ تم کو چھوٹی چھوٹی باتیں خوش کر سکتی ہیں او کم ظرف انسانو! تم مجھے کچھ نہ کہو۔"

۴۔ کئی دفعہ میں رات کو دیر میں گھر آیا۔ اس نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے۔ وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے۔ میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا "رضیہ! میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟" وہ کہتی "آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی" تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے تو تمہارے لیے اطمینان کا باعث ہو۔ شاید تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ جسے تمہاری کوئی بات ناپسند نہیں اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کبھی نہ سمجھو، تمہیں عورتوں کا تجربہ نہیں۔ تم میں غیرت نہیں۔

ایک دن میں نے اس سے کہا رضیہ جب تم میری ہو، تو پھر کیا ہے کہ تم میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پرونے میں صرف کر دیتی ہو؟ تم مجھ سے باتیں کیا کرو۔" وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اس کی سب کتابیں پھاڑ ڈالیں میں نے اس کے کپڑے جلا دیئے وہ روتی رہی اور کھانا پکاتی رہی ان کتابوں اور کپڑوں کے لیے روتی رہی۔ جن کو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا لیکن جلد غائب ہو گیا اور میں مٹھیوں کو بند کر کے رہ گیا۔ دو دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے مجھے نہ منایا۔ تم کہو گے، ڈرتی تھی، پھر تغافل کسے کہتے ہیں؟ کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ جس پروانے کو شمع کے جلتے ہوئے مر جانا چاہیئے تھا وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی خامی ہے۔ رضیہ! تم مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں دنیا میں، میں نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی تو اس کا الزام مجھ پر نہیں عائد ہوتا۔ وہ اسی قابل تھیں کہ ایک

رات کے پیے بد رضیہ ہوتیں اور بس ان چند لموں کے مشغلے سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا مذاقِ سلیم کا خون کرنا ہے اس پر اگر اہلِ دُنیا مجھے قصور وار سمجھتے ہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ مجھے کل مار ڈالیں گے اس سے زیادہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں اس سے زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں۔

افسوس! اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائے گا تو اب ناکردہ گناہوں کی حسرت دل میں نہ ہوتی۔ کسی سے کوئی ایسا پیمان نہ باندھتا جس کو توڑتے ہوئے میرے دل کو ذرا بھی رنج ہوتا۔ میں رضیہ سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس کی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا جس نے چُپ کے سوا کبھی دوسرا جواب نہیں دیا جس نے دل کا حال ہمیشہ مجھ سے چُھپایا۔ جسے میرے مشتعل جذبات کے روح سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جسے میرے عشق کے فنا انجام زلزلے کبھی نہ ہلا سکے۔ اس سے شادی کرتا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودھویں کی چاندنی میں وہ سفید لباس پہنے تھک کر لیٹی ہوئی تھی۔ اور میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اپنے دل کی بے قراری کو کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لرزتے ہوئے فقروں میں بیان کر رہا ہے: "رضیہ تم نے مجھ پر کیا جادُو پھونک دیا ہے کہ میرے جسم میں کوئی رُوح ہے تو وہ تم ہو۔ میری آنکھوں میں کوئی نور ہے میرے دل میں کوئی سرور ہے تو وہ تم ہو۔ میری زندگی، میری راحت۔ اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوشی پاؤں۔ رضیہ صرف تمہارے ہوتے ہوئے میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اُٹھتی ہیں۔ آرزوؤں کا ایک تلاطم بپا ہوتا ہے۔ تمناؤں کا ایک کہرام مچ جاتا ہے۔

تمہیں ایک دفعہ دیکھ لینا سازِ ہستی کے تمام تاروں کو یوں چھیڑ دیتا ہے جیسے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گزر گیا میرے دل میں نغمے گونجتے ہیں کہ آسمان کو سُنے۔ کیا تو سُنتی ہے؟" وہ کچھ نہ بولی۔

میں نے کہا: "رضیہ سنتی ہے؟" کہنے لگی: "سنتی ہوں۔" میں نے کہا: "کیا تمہارے دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتیں؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اس

کندھوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت انکسارت سے کہا: "رضیہ کچھ تو کہو" اس نے کچھ نہ کہا یا شاید یہ کہا کہ میں کیا کہوں۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اس کے گلے کے قریب آتے گئے میری انگلیوں کو ایک زبردست خواہش نے فولاد بنا دیا۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں سے کٹ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کا پنجہ سکڑتا گیا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کی نظروں میں دہشت نظر آئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اور وحشی ہو گیا۔ میرے پنجے کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ اس نے کچھ کہا۔ لیکن اس کے کہنے میں الفاظ نہ تھے۔ میں اس کا گلا بھینچتا گیا حتیٰ کہ میرا ہاتھ تھک گیا یہاں تک کہ اس کا اور دنیا کا تعلق منقطع ہو گیا مجھے چاند تاریک دکھائی دینے لگا۔ میری نگاہ میں ایک سیاہ سرخی چھا گئی۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے لپٹ گیا۔ چلا چلا کر پوچھتا رہا "رضیہ! میری جان!! تم کیوں چپ ہو؟ تم کو کس نے مار ڈالا ہے! رضیہ میری پیاری رضیہ! تمہارا قاتل کون ہے؟" وہ کچھ نہ بولی۔

۶۔ وہ بے چاری مر گئی۔ میرے ہاتھوں سے مر گئی۔ میں نے اسے مارا میں کل مر جاؤں گا۔ اس نے میرا دل دکھایا۔ میں اس کے لیے مرتا تھا۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی۔ خدائی قوانین کی گرفت مضبوط ہے اور ان سے رہائی مشکل۔ مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں اس خیال سے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل بطریق احسن ہو، وہ اس کی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیوانگی کا مگر کرنا جانتی ہے راحت کی نیند سلانا نہیں جانتی اندھا کر دیتی ہے اپنے قریب آنے کا رستہ نہیں بتاتی۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا کہ مجھے خوش کرے۔ میں نے اسے مار ڈالا کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی۔ کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے۔ عورت کی محبت ایک افسانہ ہے روح جسم کا دوسرا نام ہے۔ جذبات کی کوئی حقیقت نہیں ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ آج تم کچھ ہو۔ کل خدا جانے کیا ہو گے؟

قاسم "سپلٹر سس" (مخزن جولائی ۱۹۳۱ء)

تائیس

رومان اناتول فرانس

اوپیرا: موسیو گیلے

اناطول فرانس کی "تائیس" بہت مشہور کتاب ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ناول کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ جس میں ہیتیس اور سکندریا کے رومانی مناظر اور راہب پفنوتوس کے کرب و اضطراب کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر "تائیس" موسیو گیلے کے اوپرا کا ترجمہ ہے جو اناطول فرانس کے ناول سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے لیکن اس میں ڈرامہ کی مخصوص قیود کی وجہ سے واقعات اور مناظر محدود کر دیئے گئے ہیں اور چند کرداروں کے نام بھی بدل دیئے گئے ہیں۔

اوپرا ڈرامہ کی ایک ایسی قسم ہے جس میں ڈرامائی واقعات تو موسیقی کے ذریعے سے اور مناظر و جذبات الفاظ کے علاوہ اسٹیج کی آرائش۔ اور اداکاری سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کو خیالی اسٹیج اور خیالی اداکار وضع کرنے پڑتے ہیں اس کے بغیر اوپرا سے محظوظ ہونا ممکن نہیں۔

پطرس صاحب کے ترجمے کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پڑھنے والے کا کام ہلکا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسے تخیلی حرکت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ الفاظ کی پُروقار موسیقی، فقروں کے اتار چڑھاؤ، مکالموں کی ڈرامائی مترنم حرکت سے مز

صرف کرداروں میں جان آگئی ہے بلکہ تھیبس اور سکندریا کی دھندلی اور دُور دراز فضا وات کسی دلفریب خواب کا جزُ معلوم ہونے لگتی ہے اسلوب یکساں، ہموار اور ہم آہنگ ہے اور ترجمہ کے بعض حصّوں میں نثر کے ڈانڈے نظم بلکہ نغمہ سے جا ملتے ہیں ۔

افراد

تائیس ———— سکندریہ کی حسین رقاصہ

اتانیل ———— ایک راہب

پالیموں ———— ایک بڈھا راہب

نسیس ———— سکندریہ کا رئیس

مرتال ｝
کروبلی ｝ ———— نسیس کی خواصیں

البین ———— راہبہ عورتوں کی سردار

چند اور راہب

باب اوّل

پہلا منظر

(صحرائے تھیبس۔ دریائے نیل کے کنارے سینو مبیت راہبوں کی جھونپڑیاں۔

ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا۔

بارہ راہب ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ ان کے بیچ میں بوڑھا پالیموں اس غریبانہ طعام کی صدارت کے فرائض انجام دے رہا ہے جو میز پر چنا ہے۔

ایک جگہ خالی ہے جہاں اتانیل کو بیٹھنا ہے)

ایک راہب۔ یہ روٹی رکھی ہے۔
دوسرا۔ اور یہ نمک ہے۔
تیسرا۔ اور یہ پودینہ ہے۔
چوتھا۔ اور یہ شہد ہے۔
پانچواں۔ اور یہ پانی ہے۔

پالیوس۔ (کھڑا ہو کر بڑے جوش کے ساتھ) آسمان سے ہر صبح شبنم کی طرح میرے باپ پر برکات کا نزول ہوتا ہے۔ آؤ اس خدا کی ستائش کریں جو ہمیں نعمتیں بخشتا ہے۔ آؤ اس کے حضور دُعا مانگیں کہ وہ ہمیں اپنی رحمت کے سایے میں رکھے۔

راہب۔ (بہت نرم آواز سے) اے خدا! جہنم کے شیاطین ہمارے راستے سے دُور ہو جائیں۔

(راہب چپ چاپ کھانا کھاتے ہیں)

ایک راہب۔ (مہر سکوت توڑ کر) اے خداوند! ہمارے بھائی اتانیل پر اپنے بازوؤں سے قوت پہنچائے رکھ۔

بہت سے راہب۔ (افسوسناک لہجے میں) اتانیل!

چند اور راہب۔ (اسی لہجے میں) کتنا عرصہ گذر چکا اور وہ ابھی واپس نہیں لوٹا!

دوسرے راہب۔ مگر وہ کب واپس آئے گا؟

پالیوس۔ (جیسے کسی راز کو چھپا رہا ہو) اس کی واپسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں نے کل رات اسے خواب میں دیکھا۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے اور وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔

راہب۔ (جوش کے ساتھ) اتانیل خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔

(قدیکس کے لہجے میں) وہ خواب میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

(اتانیل داخل ہوتا ہے اور بہت آہستہ آہستہ قریب آتا ہے جیسے غم اور تھکن سے چور چور ہے)

راہب۔ (راہب کے ساتھ) وہ آگیا، وہ آگیا!

اتانیل۔ (درمیان میں کھڑا ہوکر، مغموم آواز میں) تم پر سلام ہو!

پامیوں اور راہب۔ بھائی تم پر سلام ہو! (سب اُس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں) تم بہت ماندہ ہو، تمہارا چہرہ غبار آلود ہے، آرام کرو۔ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ کچھ کھاؤ۔ کچھ پی لو۔

(اتانیل غم زدہ انداز میں بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ سے کھانے کو اپنے سامنے سے ہٹا دیتا ہے)

اتانیل۔ نہیں میرا دل ناکامی سے لبریز ہے۔ میں الم زدہ اور دل شکستہ ہوں۔ تمام شہر معصیت کے چنگل میں ہے۔ ایک عورت تائیس نے سیاہ کاری اور حیا سوزی کا جال پھیلا رکھا ہے اور اس کے ہاتھ سے جہنم بنی نوع انسان پر حکومت کر رہا ہے۔

راہب۔ (معصومیت اور سادگی کے انداز میں) یہ تائیس کون ہے؟

اتانیل۔ (تھوڑی دیر کے لیے جیسے خواب سے بیدار ہوتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے) معبد وثنیں کی ایک آبرو باختہ پجارن!

(عجز کے لہجے میں اور نرم آواز سے جیسے کسی گئے گزرے زمانے کے واقعات دہرا رہا ہو) افسوس اس وقت جب میں کم عمر تھا۔ اس سے پیشتر کہ میری روح پر رحمت خداوندی کا نزول ہوا۔ میں اسے جانتا تھا (گھبراہٹ کے عالم میں) ایک دن ....اور میں اعتراف کرتا ہوں اور نادم ہوں..... میں اس کے لعنتی دروازے کے آگے ٹھہر گیا لیکن خدا نے مجھے اس قہر سے بچا لیا۔ اور صحرا میں مجھے اطمینان قلب عطا فرمایا۔ جہاں میں نے اس گناہ سے کنارہ کشی اختیار ک

ملا ناول میں اُس کیرکٹر کا نام نفنوتوس ہے اور پرلوئیں نے نفنوتوس کے نام کو جدا سمجھ کر اسے بدل دیا۔

جو شاید مجھ سے سرزد ہو جاتا۔ آہ! میری روح میں ایک تلاطم ہے۔ تائیس کی حیا سوزی اور تباہ کاری سے میرا دل خون ہے تمنا ہے کہ میں اس عورت کی روح کو خدا کے نام پر مفتوح کر دوں۔

پالیمون۔ (نرمی کے ساتھ دانشمندانہ انداز میں) میرے بیٹے! ہم راہبوں کو اس دُنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار ہو۔ عقل ابدی نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے ——— رات ہو رہی ہے۔ آؤ دعائیں مانگیں اور سو جائیں۔

(راہب پُراسرار ہیبت اور تقدس کے انداز میں دست بستہ سر جھکائے ہوئے ایک کر کے دُعا مانگتے ہوئے اپنی اپنی جھونپڑیوں کو چلے جاتے ہیں)

پالیمون۔ اے خدا! جہنم کے سیاہ شیاطین ہمارے رستے سے دُور ہٹ جائیں! اے خدا! ہمارے رزق اور پانی کو برکت دے۔ اے خدا! ہمارے راہبوں کے جسموں پر اپنی رحمت نازل کر جس وہ نیند نصیب کر جسے بدخوابی برہم نہ کر سکے اور وہ آرام عطا فرما جس میں کوئی گناہ نہ ہوا۔

(اندھیری رات میں سکون اور خاموشی کے ایک لمحے کے بعد تاریکی کے درمیان ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ روشنی کی اس دھند میں سکندریہ کے تھیٹر کا اندرونی حصّہ دکھائی دیتا ہے۔ بنچوں پر ہزار ہا لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک اسٹیج ہے جس پر تائیس نیم برہنہ لیکن نقاب پوش افروڈائٹی کے عشقیہ جذبات کو حرکات رقص سے ادا کر رہی ہے۔ تماشائی بلند آہنگی کے ساتھ دیر تک داد دیتے رہتے ہیں لیکن یہ تمام آوازیں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے بہت دُور سے آ رہی ہوں۔ تائیس کا نام اس ہجوم میں ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن کانوں تک بہت مدھم ہو کر پہنچتا ہے۔ غور و ہنگامہ بڑھتا

جاتا ہے اور تائیس کی حرکات اور بھی پُرمعنی ہوتی جاتی ہیں پھر یہ
تمام منظر دفعتہً غائب ہو جاتا ہے ——— دن نکل آتا ہے)

اتانیئل۔ (آہستہ آہستہ خواب سے بیدار ہو کر یک لخت اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی آواز غصے اور رنج سے بھری ہے) شرم! شرم! قہر! ابدی تاریکی! خداوند میری مدد کر! (سجدے میں گر جاتا ہے) اے خداوند! اے خدائے ذوالجلال! جس نے ہماری روح اور ہمارے دل میں رحم ڈالا، تعریف تجھی کو ہے۔ میں اس خواب کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ (جوش سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) میں اس عورت کو گناہ سے نجات دلواؤں گا۔ میں اسے نفس کے بندھنوں سے آزاد کراؤں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان کے ماتم زدہ فرشتے اس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اے خدا کیا وہ تیرے ہی مبارک دم کا ایک سانس نہیں؟ اس کا گناہ جس قدر تاریک ہو، اتنا ہی رحم کا سزاوار ہے لیکن میں اسے بچاؤں گا۔ اسے میرے حوالے کر دے اور اے خداوند پھر میں اسے تیری نذر کر دوں گا۔ تاکہ اسے حیاتِ ابدی نصیب ہو (راہبوں کو بلاتا ہے جو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں) اے بھائیو! سب کے سب اٹھ کھڑے ہو۔ آؤ۔ مجھے غیب کی طرف سے اشارہ ہوا ہے کہ پھر اس ملعون شہر کی طرف لوٹتا ہے خدا نہ کرے کہ گناہ کے سمندر میں اور بھی ڈوب جائے۔ خدا نے مجھے منتخب کیا ہے کہ میں تائیس کے پاس لے آؤں۔

(اتانیئل پالیمون کے سامنے سر جھکاتا ہے)

پالیمون۔ (نہایت پُرسکون لہجے میں نرمی کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے) میرے بیٹے! ہم راہبوں کو اس دنیا سے احتراز واجب ہے ——— عقلِ ابدی نے ہمیں یہی سبق دیا ہے)

(راہب اتانیئل کے ساتھ ساتھ سڑک تک جاتے ہیں
اور پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اتانیئل کی دعاؤں کو

دہراتے ہیں جس کی آواز صحرائے تھیبس کی تنہائیوں میں
آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے)

اتانیل کی آواز۔ (دُور سے) اور اے رحمت کی مقدس روح۔ میرے دل کو تقویت دے۔

راہب۔ اس کے دل کو تقویت دے۔

اتانیل کی آواز۔ (بہت دور سے) اور مجھے عالم الملکوت کی سی طاقت دے تاکہ
میں بدی کی چالوں کا مقابلہ کروں۔

(مکمل خاموشی۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

اسکندریہ۔

نیس کے گھر کے باہر کا چبوترہ۔ آس پاس بڑے بڑے سایہ دار
درخت ہیں۔

چبوترے پر سے شہر اور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ دائیں طرف بھاری
بھاری پردے لٹک رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک عالیشان ایوان ہے
جو ضیافت کے لیے آراستہ ہے۔

(اتانیل آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے اور پیچھے کو ٹھہر جاتا ہے۔)
(ایک غلام اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی طرف بڑھتا ہے۔)

غلام۔ اے فقیر! یہاں سے دُور ہو جا اور کہیں اور جا کر بھیک مانگ۔ میرا
آقا تم جیسے کتوں کو پاس نہیں آنے دیتا۔

اتانیل۔ (نرمی کے ساتھ) میرے بیٹے اگر تیری ناراضگی کا موجب نہ ہو تو میرا
کہا مان۔ میں تیرے آقا کا دوست ہوں۔ اور اس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔

غلام۔ بھکاری یہاں سے دُور ہو جا (اتانیل پر اپنا عصا اٹھاتا ہے)

اتانیل۔ (نرم لہجے میں مگر رعب کے ساتھ) مارنا ہو تو مارو لیکن اپنے آقا کو میرے

کنے کی اطلاع کر دو۔ جاؤ۔

(غلام تائیس کی پُر وقار نگاہ کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جھک کر سلام کرتا ہے اور پھر گھر میں غائب ہو جاتا ہے) اتانیل تنہائی میں تھوڑی دیر کے لیے چبوترے پر سے سامنے پھیلے ہوئے منظر کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔)

اتانیل۔ بدکار شہر! خدا کی پناہ! اسکندریہ! جہاں میں گناہ پیدا ہوا۔ وہ رنگیلی فضا جہاں میں نے عشرت کی بے پناہ خوشبو میں سانس لیا۔ ہوس انگیز سمندر جہاں میں نے زریں چشم بحری نازنین کا ترنم سنا۔ ہاں یہی میرے سفلی نفس کا گہوارہ تھا! سکندریہ میرا گہوارہ! میرا وطن! سکندریہ۔ میں نے تیرے عشق سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ مجھے تیرے زر و دولت سے، تیرے علم و فن سے، تیرے حسن سے نفرت ہے۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔ اور تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تجھے میں اس عبادت گاہ کی طرح ملعون سمجھتا ہوں جہاں ناپاک ارواح نے اپنا بسیرا بنا لیا ہو۔ آسمانی ہوا کے جھونکو۔ جنت کے فرشتو آؤ اور اپنے پیروں کی جنبش سے اس زہر آلود فضا کو جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے گی معطر بنا دو!

(آوازیں اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نیسیں کروبیل اور مرتال دو حسین لونڈیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے داخل ہوتا ہے۔ اتانیل کو دیکھ کر رک جاتا ہے، اور لونڈیوں کو چھوڑ کر اپنے دونوں بازو پھیلائے تپاک کے ساتھ اتانیل کی طرف بڑھتا ہے۔)

نیسیں۔ (گرمجوشی کے ساتھ) اتانیل! تم ہو؟ میرے مکتب کے رفیق۔ میرے دوست، میرے بھائی۔ ہاں میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ گو تمہاری صورت اب انسانوں کی بہ نسبت حیوانوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ آؤ۔ آؤ۔ مجھ سے بغلگیر

ہو جاؤ۔ تم صحرا کو خیر باد کہہ آئے ہو؟ تم پھر ہم میں شامل ہونے آرہے ہو؟

اتانئیل۔ نسیس تم اس رقاصہ تائیس کو جانتے ہو؟

نسیس۔ (ہنس کر) یقیناً میں اسے جانتا ہوں۔ صرف جانتا نہیں۔ بلکہ وہ میری ہے صرف ایک اور ایک دن کے لیے۔ میں نے اپنے تاکستان اس کی خاطر بیچ ڈالے۔ اپنے تاکستان اور اپنی زمینیں اور اپنی چکیاں اور اس کی خاطر میں نے قصیدوں کے تین دیوان مرتب کئے لیکن یہ سب کچھ بے سود تھا۔ اس کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے میری انتہائی کوششیں بھی لاحاصل ہیں۔ اس کا عشق خواب کی مانند نازک اور جلد غائب ہو جانے والا ہے۔ اتانئیل! تم کو اس سے کیا کام ہے؟

اتانئیل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔

نسیس۔ (کھل کھلا کر ہنس پڑتا ہے میرے سادہ لوح دوست! وہ وینس کی پجارن ہے۔ وینس کے قہر کو مت جگاؤ۔

اتانئیل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔ جانسیس! میں تائیس کو اس ناپاک محبت سے چھڑا کر لے جاؤں گا۔ میں اسے یسوع مسیح کی دلہن بناؤں گا اور اپنی زندگی راہبہ خانے میں بسر کرے گی۔ تائیس آج میرے ساتھ جائے گی۔

نسیس۔ (اتانئیل کے کان میں ہنس کر، وینس کے قہر مت جگاؤ، وہ انتقام لے گی۔

اتانئیل۔ خدا میرا نگہبان ہوگا (ایک لمحے کے بعد) اس عورت سے میں کہاں مل سکتا ہوں؟

نسیس۔ یہیں پر۔ آج وہ میرے دسترخوان کی زینت ہوگی۔ آج آخری دفعہ وہ اس نشاط پرست محفل کی رونق ہوگی۔ آج رات وہ تھیٹر میں رقص کر رہی ہے اور وہاں سے سیدھی یہاں آئے گی۔

اتانئیل۔ اے دوست مجھے ایشیائی لباس پہننے کو دو تاکہ میں اس ضیافت کے شایان نظر آؤں۔

نسیس۔ اے نازمینو! کروبیل اور مرتال، جلدی کرو اتانئیل کو لباس پہنا دو۔

(نسیس اور اتانئیل رنیقانہ گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں
مرتال تالی بجاتی ہے ایک خدمتگار حاضر ہوتا ہے
اور مرتال کا حکم پاکر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد
غلام ایک صندوق اٹھائے داخل ہوتے ہیں جس میں
سے کروبیل اور مرتال اتانئیل کے لیے سنگھار کا سامان
نکالتی ہیں ایک چمکدار نقرئی آئینہ اتانئیل کو دکھاتی ہیں اور
ہنس دیتی ہیں۔ اتانئیل اسی طرح بیٹھا نسیس سے باتیں کرتا
رہتا ہے۔ لونڈیاں اس کے بالوں کو خوشبودار تیل لگاتی
ہیں اور اس کے سر اور داڑھی کو کنگھی کرتی ہیں۔ نسیس
مسکراتا ہوا ان کو دیکھتا رہتا ہے۔)

نسیس۔ اب میں ایک بار پھر تمہیں ویسا ہی دیکھوں گا جیسے کبھی پہلے دیکھا کرتا تھا۔

اتانئیل۔ ہاں میں جہنم کا مقابلہ کرنے کے لیے جہنم ہی کے ہتھیاروں سے سجوں گا۔

نسیس۔ معرور فلسفی۔ انسان کا دل کمزور ہے۔

اتانئیل۔ جب خداوند میرا رہبر ہے تو میں مزدور سے خوف نہیں کھاتا۔

کروبیل۔ (مرتال سے) جوان ہے!

مرتال۔ (کروبیل سے) خوب صورت ہے!

کروبیل۔ اس کی داڑھی کے بال الجھے ہوئے ہیں!

مرتال۔ اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

کروبیل۔ اس کے سر کے گرد یہ پٹی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

مرتال۔ یہ انگشتری پہن لو۔

کروبیل۔ اپنے بازو کو آگے پھیلاؤ۔

مرنال۔ اور اپنی انگلیاں۔

مرنال اور کردبیل۔ جوان ہے اور خوب صورت ہے اور اس کی آنکھوں میں
آگ بھری ہے۔

مرنال۔ (سنگھار کو جاری رکھتے ہوئے) اب لباس پہن لو۔

کردبیل۔ (خوشامد سے) یہ سیاہ پشم کا کرتہ اتار ڈالو۔

اتانیل۔ (ان سے جاگنے کی کوشش کرتا ہے) ہٹ جاؤ۔ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔

(کردبیل اور مرنال پہلے تو اتانیل کے ورشت انکار سے
ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب
آتی ہیں)

کردبیل اور مرنال۔ (سیاہ پشم کے کرتے پر لباس فاخرہ پہنا کر) یہ لو اپنے زہد و تقویٰ
کو اس نرم و نفیس ملبوس سے ڈھانپ لو۔

نسیس۔ (اتانیل سے) ان کی ہنسی مذاق سے رنجیدہ نہ ہو اور ان کے سامنے اپنی نظروں
کو نیچا نہ کرو بلکہ آنکھیں اٹھا کر ان کے حسن کی داد دو۔

اتانیل۔ (اپنے آپ سے) اے نور کی روح! آ اور میرے دل کو اس جنگ کے لیے
مضبوط بنا دے کہ مجھے بدی کی قوتوں سے لڑنا ہے۔

کردبیل۔ (اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے اگر فیبی اسے دیکھ پائے تو اس جنگ
زاہد کے سینے میں پھر انسانوں کا سا دل دھڑکنے لگ جائے۔

مرنال۔ (اتانیل سے) آؤ ہم تمہیں کفش زریں پہنا دیں۔

کردبیل۔ (اتانیل سے) آؤ ہم تمہارے رخساروں پر عطر چھڑک دیں۔

کردبیل اور مرنال۔ (ایک دوسری سے) اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے۔

(بہت دور سے تھیس کے نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے
نسیس چبوترے پر جا کر شہر کی طرف دیکھتا ہے پھر واپس
آکر مسکراتا ہوا اتانیل سے مخاطب ہوتا ہے۔)

نسیس۔ اپنے آپ کو سنبھال لو غنیم بڑھا چلا آ رہا ہے۔

(رقاصوں اور ایکٹروں کے گروہ جن کے ساتھ نسیس کے فلسفی
دوست بھی شامل ہیں۔ تائیس کے آگے آگے چبوترے پر
داخل ہوتے ہیں۔)

ایکٹر اور فلسفی۔ (تائیس کے گرد جمع ہو کر اور اس کے سامنے جھک کر) تائیس! خواہر کریتیز! اسکندریہ کا پھول! تائیس! محبوب ترین دولت! تائیس! تائیس! تائیس!

(نسیس اپنے مہمانوں سے مراسم ملاقات ادا کرنے کے بعد
ایوانِ ضیافت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غلام پردے
اٹھا دیتے ہیں۔)

نسیس۔ تامین! پیاری تائیس! ہرماودرے! رستو بیولے! ڈورین! کیلی کریٹی! میرے مہمانو! میرے دوستو! مقدس دیوتا تمہارے ساتھ رہیں۔

(سب ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔ تائیس بھی اور
مہمانوں کے پیچھے پیچھے ایوان میں داخل ہونے کو ہے
لیکن نسیس اسے ٹھہرا لیتا ہے اور اس کے پاس ہی ایک
نشست پر بیٹھ جاتا ہے وہ کھڑی رہتی ہے ہونٹوں
پہ ایک طنز آمیز تبسم ہے نسیس اس کو محبت بھری حسرت
آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے۔)

تائیس۔ ہاں یہ تائیس ہے وہ نازک صنم جو آج آخری مرتبہ تیرے میووں سے آراستہ دسترخوان کی زینت بننے کو آئی ہے۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

نسیس۔ ہم نے سات دن تک ایک دوسرے سے عشق کیا۔ اکٹھے سات دن تک بے وفائی نہ کرنا بہت بڑی وفا ہے۔ میں شکوہ نہیں کرتا۔ اب تم میرے بازوؤں کو خالی چھوڑ کر بالکل آزاد ہو جاؤ گی۔

تائیس۔ نسیس! آج کی رات خوش ہو لو۔ مسرت کے لمحوں کو نشاط کی دولت بکھیرنے

وہ وار اس آخری رات سے بجز ایک مختصر ہنگامۂ عشرت اور خود فراموشی کے اور کچھ نہ مانگو۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

(کئی فلسفی جن میں اتانئیل بھی شامل ہے مباحث علمی میں مشغول ایوان کی طرف سے داخل ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ چبوترے تک پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ اتانئیل باقی لوگوں سے علیحدہ ہو کر بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے اور تائیس کو غصہ کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔)

تائیس۔ (نسیس سے) یہ اجنبی کون ہے جو مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے میں نے اسے کبھی ضیافت میں نہیں دیکھا۔ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کون ہے؟

نسیس۔ (جیسے نہایت معمولی سی بات ہو) ایک سیدھا سادہ فلسفی، صوفی، رہنے والا راہب ذی ظرف کے ساتھ، تم سے ملنے آیا ہے۔ خبردار ہو جاؤ!

تائیس۔ ساتھ کیا لایا ہے؟ عشق؟

نسیس۔ کوئی انسانی کمزوری اس کے دل کو نہیں جا سکتی۔ وہ نہیں اپنے مقدس عقیدے پر لانا چاہتا ہے۔

تائیس۔ اس کا عقیدہ کیا ہے؟

اتانئیل (آگے بڑھ کر) اپنے جسم سے نفرت، دکھ اور رنج سے محبت کرو۔ نفس کو کچل ڈالو اور گناہوں کی تلافی کرو۔

تائیس۔ (تھوڑی دیر تک اس کو چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے) جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، میں صرف عشق پر ایمان لائی ہوں، کوئی اور طاقت مجھ پر قابو نہیں پا سکتی۔

اتانئیل۔ (غصے کی حالت میں اس کے کلام کو سنتا رہتا ہے اور آگے بڑھ کر درشتی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے) کفر مت بک!

(ان الفاظ کو سن کر طلسی اپنی باتیں چھوڑ نائیس کے قریب آتے ہیں۔ خدام سب مہمانوں کو اس واقعے کی اطلاع پہنچا دیتے ہیں۔ مہمان ایوانِ ضیافت سے باہر نکل آتے ہیں اور آہستہ آہستہ استعجاب اور حیرت کے عالم میں تائیس اور نسیس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔)

تائیس۔ (اتانیل سے ایسے لہجے سے جس میں طنز اور خوشامد دونوں کی آمیزش ہے) تم کس لیے اس قدر غصّے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں سے جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟ ——— وہ کون سی منحوس حماقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے؟ ——— انسان عشق کے لیے بنا ہے اور تم دھوکا کھا رہے ہو ——— انسان علم و فن کے لیے بنا ہے تمہاری آنکھیں کیوں اندھی ہو رہی ہیں؟ ——— تمہارے ہونٹ زندگی سے نا آشنا ہیں ——— تم عشق کی پختہ کاری کو نہیں جانتے آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور پھولوں کا تاج پہن لو ——— عشق کے سوا باقی سب جھوٹ ہے ——— اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو۔

اتانیل۔ (بہت جوش کے ساتھ) کبھی نہیں! میں تمہاری بے حقیقت کاریوں سے نفرت کرتا ہوں ——— کبھی نہیں! میں اب ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگاؤں گا۔ لیکن اے سیاہ کار عورت! میں تیرے محل میں آکر تجھے نجات دلاؤں گا ——— اور تجھ پر فتح پاکر جہنم پر فتح پا جاؤں گا۔

تائیس، نسیس اور باقی لوگ۔ پھولوں کا تاج پہن لو ——— عشق کے سوا سب جھوٹ ہے اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو۔

اتانیل۔ (پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور رخصت ہوتے ہوئے رُعب و وقار سے مخاطب ہوتا ہے) میں تیرے محل میں آکر تجھ کو نجات دلاؤں گا۔

نسیس اور باقی لوگ۔ (اتانیل کو خفا کر) دین سے سرکشی کرنے والے! بہت ہو تو آ جانا۔

تائیس۔ (افروڈائٹی کے مشتعلہ جذبات رقص سے ادا کرنے کے لیے اپنا آپ سنبھالتے ہوئے اور آتانئیل کو غصّہ دلاکر وہیں سے سرکشی کرنے والے ہمت ہو تو آجاتا۔

(غلام تائیس کا لباس اتارنا شروع کر دیتے ہیں ——
آتانئیل انتہائی غصّہ سے پیچ و تاب کھا کر وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔)

باب دوم
پہلا منظر

(تائیس کا محل

سورج کی روشنی صحن اور تالاب کے اس پار سے ایوان تک پہنچ رہی ہے۔ اس لیے قوس قزح کے ایوان مختلف سے رنگین ہے اور آنکھوں کو تسکین بخشتی ہے!

سامنے وینس کا بت استادہ ہے اور اس کے پائے کے بالمقابل ایک اونچے مجمر میں سے خوشبودار دھواں اٹھ رہا ہے۔ فرش پر بیش بہا قالین اور ان پر کامدار گدیلے اور صحرائے لیبیا کے شیروں کی کھالیں بچھی ہیں۔ جا بجا پھولدان میں موسم بہار کے پھول سجے ہیں۔

تائیس مغنیوں اور رقاصہ لڑکیوں کو ساتھ لیے داخل ہوتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد ان سب کو ایک اشارے سے چلے کا حکم ہوتا ہے)

تائیس۔ (تنہا۔ مایوسی اور رنج کے لہجے میں) آہ! تھکن اور اداسی سے میری زندگی بھاری ہو رہی ہے —— مرد سب کے سب بے پروا اور ہوس کار ہیں۔ عورتیں حاسد اور بدخواہ ہیں —— اور زندگی کی گھڑیاں تو طول ہو رہی

ہیں ـــــ مجھے آرام کہاں نصیب ہوگا اور مسرت کہاں حاصل ہوگی ! ـــ
(سوچ میں ڈوبی ہوئی آئینہ اٹھا لیتی ہے) اے میرے وفا کار آئینے ۔ مجھے
ڈمارکس دے ـــ مجھ سے کہہ کہ میں اب بھی حسین ہوں ۔ مجھ سے کہہ کہ
میرا حسن لازوال ہے ۔ میرے گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے ۔ اور
میرے بالوں کی سنہری چمک کبھی مدھم نہ ہوگی ـــ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں
اور میرا حسن لازوال ہے ـــ (سنبھل کر اور غور سے کان لگا کر سنتی ہے گویا کسی
غیر معلوم مقام سے کوئی آواز کچھ کہہ رہی ہے) آہ ! اے بے رحم آواز خاموش
ہو جا ۔ وہ آواز جو مجھ سے کہہ رہی ہے " تائیس تمہارا حسن ڈھل جائے گا " ـــ
تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا ۔ جب تائیس تائیس نہ رہے گی ؟ نہیں ! نہیں !
مجھے یقین نہیں آتا ـــ اگر کوئی مخفی ترکیب ، کوئی سحر کا فن ایسا نہیں جو حسن کو
برقرار رکھ سکے ۔ تو اے وینس ، تو ہی مجھے اس کے ابدی ہونے کا یقین دلا ۔
(وینس کے بت سے مخاطب ہو کر زیر لب دعا مانگتے ہوئے) وینس ! ـــ
جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود ہے ۔ وینس ! مجھے جواب
دے ، مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ۔ میرے گلاب
سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے ۔ اور میرے بالوں کی سنہری چمک مدھم نہ
ہوگی ـــ مجھے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ہمیشہ کے لیے !
ہمیشہ کے لیے ! ہمیشہ کے لیے !

(اس کی نظر اتانئیل پر پڑتی ہے جو چپ چاپ اندر آ کر
دہلیز کے پاس ٹھہر گیا ہے ۔)

تائیس (اخلاق کے ساتھ) اجنبی تم اپنے کہنے کے مطابق آ ہی گئے ۔

اتانئیل ۔ (زیر لب دعا مانگتے ہوئے) اے خداوند ! اس عورت کا درخشاں
چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے ۔ اس کی دلآویزی کا جادو میرے
استقلال کے سامنے بے کار رہ جائے ۔

تائیس ۔ (مسکرا کر) کہو کیا کہتا ہے ؟

اتانئیل۔ لوگ کہتے ہیں تم بے مثال ہو۔اس لیے میں تم سے ملنے کا آرزومند تھا اور اب جبکہ میں نے تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم پر قابو پانا میرے لیے کس قدر فخر کا باعث ہوگا۔

تائیس (مسکرا کر) تمہارا عجز بلند مرتبہ ہے تمہارا عزور اس سے بھی زیادہ سرکش ہے خود سرا جنبی! ہشیار رہو، کہیں مجھ سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ۔

اتانئیل (جذبے کے ساتھ) تائیس میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا ہوں۔ لیکن ویسی محبت نہیں جیسی تم سمجھتی ہو۔ میں مقدس سوع کے نام پر، حق اور راستی کے نام پر تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں جس عیش کا وعدہ دلاتا ہوں وہ تمہاری جھوٹی سے آراستہ عشرت کاریوں اور ایک مختصر شبِ وصال کے خواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو رحمت میں آج تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کا کوئی انجام نہیں۔

تائیس۔ (طنز آمیز لہجے میں) اچھا تو مجھے اس عجیب و غریب محبت کے کرشمے دکھاؤ۔ سچا عشق تو صرف بوسوں کی زبان سے بولتا ہے۔

اتانئیل۔ تائیس! میری ہنسی مت اڑاؤ۔ جو عشق میں تمہیں سکھانے آیا ہوں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

تائیس۔ (بے پروائی سے) دوست! تم بہت دیر میں آئے۔ میں ہر لذت سے واقف ہوں۔

اتانئیل۔ جس عشق سے تم واقف ہو۔ وہ شرم اور حیا سوزی سے ہم کنار ہے۔ جو میں تمہیں سکھانے آیا ہوں صرف وہی ایک عشق بلند پایہ ہے۔

تائیس۔ احمق ہو کر جس کے ہاں مہمان ہو، اُسی کی توہین کرتے ہو!

اتانئیل۔ توہین! ــــ میں تو صرف تمہیں راہِ حق پر لانا چاہتا ہوں (اس کا جوش بڑھتا جاتا ہے) آہ کون ہے کہ جو   میرے الفاظ کو شعلوں کی طرح بھڑکا دے تاکہ میرے ایک سانس سے اے رقاصہ! تیرا دل موم کی طرح پگھل جائے۔ کون ہے جو تجھے میرے حوالے کر دے۔ کون ہے جو میری

گفتار میں سمندر کا سا طوفان پیدا کر دے کہ اس کی چڑھتی ہوئی لہریں تیری مدح کو حیات ابدی کے لیے پاکیزہ بنا دیں۔

تائیس۔ (کچھ بے قرار سی ہو کر اتانئیل کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے) حیات ابدی کے لیے!

اتانئیل۔ ہاں حیات ابدی کے لیے!

تائیس (اپنے دل سے فیصلہ کر چکی ہے لیکن ابھی اظہار میں تامل باقی ہے) مجھے سب حال بتاؤ۔ اس پُراسرار عشق کا حال! ـــــ میں سب کچھ مانوں گی۔ ہاں سن رہی ہوں۔

(تائیس ایک سونے کے چمچے سے خوشبودار مسالحہ آگ میں ڈالتی ہے۔)

اتانئیل۔ (گھبرا کر اپنے آپ سے) خوف کے طوفان میرے خیالات کو برہم کر رہے ہیں۔ اے خداوند! اس عورت کا درخشندہ چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔

(دھوئیں کا بادل تائیس اور وینس کے بُت دونوں کے اردگرد چھا جاتا ہے۔ اتانئیل تائیس پہ نظریں جمائے رہتا ہے اور تائیس مسکراتی ہوئی پُراسرار الفاظ دہراتی ہے۔)

تائیس۔ اے وینس۔ جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود ہے!

اتانئیل۔ اے خدا! اس کی دلآویزی کا جادو میرے استقلال کے سامنے بیکار رہ جائے۔

تائیس۔ اے وینس اپنی بلندی سے نیچے اتر آ۔ اور حکومت کر! وینس جو آسمان کی درخشانی اور برف کی سفیدی ہے! جو درخشندگی ہے راست ہے اور شیریں ہے۔

اتانئیل۔ (اپنے دل کو کڑا کر کے اپنا لباس فاخرہ جو سیاہ پشم کے کرتے کے اُوپر پہنے

ہوئے ہے چادر اتار ڈالتا ہے) میں انیتونئے کا راہب اتانیل ہوں۔
میں مقدس صحراسے آیا ہوں اور میں نفس لذت پر لعنت بھیجتا ہوں اور اس
موت پر لعنت بھیجتا ہوں جس کے پنجے میں تو گرفتار ہے۔ اور اے عورت!
میں تیرے سامنے اس طرح کھڑا ہوں گویا کسی قبر کے سامنے کھڑا ہوں اور
تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تائیس! خدا کے حکم سے زندہ ہوجا!

(تائیس کا رنگ خوف کے مارے فق ہے ——
وہ ہاتھ جوڑے روتی اور سسکیاں بھرتی ہوئی اتانیل
کے قدموں میں گر پڑتی ہے۔)

تائیس۔ مجھے سزا مت دو۔ کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ صحرائے
مقدس کے لوگ ان ہستیوں سے نفرت کرتے ہیں جو عشرت کا نمونہ بن
جاتی ہیں۔ لیکن مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے نہ تقدیر پر نہ فطرت پر اختیار
تھا اور میرا کیا قصور کہ میں حسین ہوں۔ مجھے جان سے مت مارو آہ میں موت
سے خوف کھاتی ہوں۔

اتانیل (جوش کے ساتھ) نہیں تم ابد تک زندہ ہوگی اور ہمیشہ کے لیے یسوع مسیح
کی محبوبہ اور دلہن بنی رہوگی۔ وہ یسوع مسیح جس کی تم دشمن تھیں۔

تائیس (جوشِ مسرت کے ساتھ) میری روح مسرت اور تازگی سے بھر رہی ہے
میں تھرتھرا رہی ہوں۔ یہ مجھ پر کیا جادو کر رہا ہے؟

(نسیس کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے، اور آہستہ
آہستہ قریب تر ہوتی جاتی ہے۔)

نسیس کی آواز۔ اے تائیس! نازک اندام حسینہ! میں آخری مرتبہ تیرے پھول
سے ہونٹوں کا عشق تجھ سے طلب کرتا ہوں۔

تائیس۔ (اس آواز کو نفرت سے سنتی ہوں) آہ نسیس! (گھبراہٹ کے عالم میں
اپنے آپ سے) میری روح اب میرے بس میں نہیں۔ مجھ سے محبت کرو۔
(دیا ایک نفرت کے ساتھ) اس نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔ اے صرف عشق سے

عشق ہے۔

اتانیل۔ تم اس کی آواز سن رہی ہو؟

تائیس (اتانیل سے) ہاں جاؤ! اس سے کہہ دو کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔

اتانیل۔ (تحکم کے لہجے میں) تمہاری دہلیز پر طلوع آفتاب تک میں تمہارا انتظار کروں گا۔

تائیس (سرکشی کی آخری کوشش کرتے ہوئے) نہیں میں رقاصہ تائیس ہوں اور رقاصہ تائیس ہی رہوں گی۔ مجھے کسی چیز پر یقین نہیں۔ اور مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں نہ اس کی نہ تمہاری نہ تمہارے خدا کی۔

(دیوانہ وار ہنستی ہے اور پھر سسکیاں بھرنے لگتی ہے اور گدیلوں پر منہ کے بل گر کر رونے لگتی ہے اتانیل تقدیس اور اعتماد کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔
پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ موسیقی اگلے سین کے آغاز تک جاری رہتی ہے۔

دوسرا منظر

صبح کاذب

تائیس کے محل کے سامنے کا چوک۔

محل کی ڈیوڑھی کے پاس ایروس کا ایک چھوٹا سا بت ایستادہ ہے اور اس کے سامنے ایک چراغ روشن ہے۔ ابھی چاند کی روشنی پھیکی نہیں پڑی۔

ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے سامنے اتانیل فرش کے پتھروں پر

سر رکھے سو رہا ہے۔

دور دائیں طرف کو ایک مکان ہے جس میں نسیس اور اس کے ہمراہی جمع ہیں۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ اور محفلِ نشاط کی موسیقی مدھم سی سنائی دے رہی ہے۔

(تھوڑی دیر کے بعد تائیس کے محل کا دروازہ کھلتا ہے اور تائیس باہر آتی ہے۔ چراغ کو سر سے اوپر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتی ہے اور بچہ سیڑھیوں سے نیچے اُترتی ہے۔ جب اس کی نظر اتانئیل پر پڑتی ہے تو چراغ کو اپنی جگہ پر رکھ کر اور پھر اتانئیل کی طرف واپس آتی ہے۔)

تائیس (اتانئیل کی طرف جھک کر، نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ، اسے) مقدس باپ! میں نے خدا کا پیغام تیری زبان سے سُنا۔ میں حاضر ہوں

اتانئیل (اٹھ کر نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) تائیس! خدا تمہاری راہ تک رہا تھا۔

تائیس (اور بھی نرم لہجے میں اور عجز کے ساتھ) تمہارے الفاظ میرے دُکھے ہوئے دل کا مرہم تھے۔ میں دُعا مانگتی رہی ہوں میں آنسو بہاتی رہی ہوں میری رُوح کے اندر نور کے چشمے اُبل رہے ہیں ——— میں نے ہوس اور نفسانیت کی بے مائیگی کو دیکھ لیا ہے۔ تم نے آنے کا حکم دیا تھا۔ میں آ گئی ہوں۔

اتانئیل۔ اے میری بہن! ہمت کر کہ مسرت کی فجر ہو رہی ہے۔

تائیس۔ (عجز کے ساتھ) مجھے کیا حکم ہے؟

اتانئیل۔ یہاں سے قریب مغرب کی طرف ایک راہب خانہ ہے۔ جہاں برگزیدہ عورتیں فرشتوں کی مانند وسالِ دائمی میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ نفس ہیں تاکہ یسوع مسیح ان سے محبت کرے۔ حیادار ہیں تاکہ یسوع مسیح ان کی طرف نظر اٹھائے۔ باعصمت ہیں تاکہ وہ انہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا اور تجھے مادرِ مقدس البین کے حوالے کر دوں گا۔

تائیس ۔ ابین ۔ دو دمان سیرز کی دختر !

اتانیل (سادگی سے) اور یسوع کی پاکیزہ ترین لونڈی ۔ ڈیرا اسرار بجے میں، وہاں میں تمہیں
ایک تنگ کوٹھری میں بند کر دوں گا ۔ اور پھر ایک دن یسوع مسیح آکر تمہیں
نجات دلائے گا (اس کا جوش بڑھ رہا ہے) مجھ پر یقین رکھو اور خوف مت کھاؤ
وہ خود آئے گا اور تمہاری روح کی گہرائیاں تھرتھرا اٹھیں گی ۔ جب وہ اپنی نور
کی انگلیوں سے تمہارے آنسو پونچھنے کے لیے تمہاری آنکھوں کو چھوئے گا ۔

تائیس ۔ (مسرت سے) آہ مقدس باپ مجھے ابین کے گھر لے چل ۔

اتانیل ۔ ہاں ۔ مگر پہلے ان سب چیزوں کو فنا کر دو جو ناپاک تائیس کی ملکیت تھیں ۔ اپنے
محل کو، اپنی زر و دولت کو، اس مال و منال کو جو تمہاری سیاہ کاری کا شاہد ہے سب
کو پھونک دو سب کو فنا کر دو ۔

تائیس (دعا بھی کتاب سنا کر) مقدس باپ ایسا ہی ہوگا (گھر کی طرف جاتی ہے لیکن
مسکراتی ہوئی ایروس کے بت کے سامنے بیٹھ جاتی ہے) میں اپنے ساتھ
اپنی گزشتہ زندگی کی کوئی یادگار نہیں لے جانا چاہتی بجز اس کے (بت کو اٹھا لیتی
ہے اور اتانیل کے پاس جا کر اسے دکھاتی ہے) بجز اس ہاتھی دانت
کے بت کے جو قدیم زمانے کی ہنرمندی اور دستکاری کی تخلیق ہے ۔ یہ
ایروس کا بت ۔ ایروس جو عشق کا دیوتا ہے (نرم لہجے اور پاکیزہ گفتاری سے)
اے مقدس کا باپ! ہم اس پر بے رحمی کیسے کر سکتے ہیں ۔ عشق ایک نادر دولت
ہے میری تردامنی عشق نہیں ۔ عشق کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے ۔ آہ مجھے اس بات
کا افسوس نہیں کہ میں نے عشق کو اپنا آقا تسلیم کیا بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ میں نے
اس کے احکام کو غلط سمجھا ۔ عشق کا حکم ہے کہ "جو مرد میرا نام لئے بغیر اپنی آغوش
پھیلائے اس کی آغوش سے کنارہ کرو" اس قانون کی وجہ سے اس کا احترام
واجب ہے ۔ اسے لے کر کسی راہب خانے میں رکھ دینا کہ جن کی نظر اس
پر پڑے وہ پھر خدا کی طرف رجوع کریں ۔ کیونکہ عشق ہی زرد ہاں حقیقت سے
(ایک لمحے بعد) جب نیسیس مجھے چاہتا تھا تو اس نے مجھے یہ بت تحفے

طور پر دیا تھا۔

اتائیل۔ (غصے سے بے تاب ہو کر) نسیس! آہ ان مردود ہاتھوں پر لعنت ہو، جن سے یہ تحفہ تجھے ملا۔ اس کا نشان بھی باقی مت رہنے دو۔ (بت کو چھین کر زور سے فرش پر پھینک دیتا ہے۔ جس سے وہ چور چور ہو جاتا ہے۔ اتائیل اس کے ٹکڑوں کو ٹھوکروں سے بکھیر دیتا ہے) اور اپنا سب کچھ شعلوں کے سپرد کر دو۔ یا کسی گہری غار میں دھکیل دو! اپنی گزشتہ زندگی کو پھر خاک میں ملا دو۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی یاد دل سے محو کر دو۔

تائیس۔ (سر جھکائے کانپ رہی ہے) سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محو ہو جائے گا۔ آؤ!

اتائیل۔ چلو۔

(اتائیل اور تائیس کے چلے جانے کے بعد نسیس اور سین نمبر ۲ کے تمام اشخاص داخل ہوتے ہیں۔ شور مچاتے ہوئے اور ہنستے کھیلتے آگے بڑھتے ہیں نسیس سب سے پیش پیش سرخوشی کے عالم میں ذرا لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے)

نسیس اور اس کے ہمراہی۔ دوستو! میرے ساتھ ساتھ رہو۔ ابھی صبح نہیں ہوئی قسمت نے تائیس کی قسمت سے تیس گنی مسرت میرے دامن میں بھر دی ہے اس لئے ایک بار نہیں سو بار خوشی مناؤ۔

مشرق کی رقاصہ لڑکیوں کو بلاؤ۔ رقاصہ لڑکیوں کو سپیروں کو اور مسخروں کو اور رقص کا ہنگامہ صبح تک نہ تھمنے دو۔

مہمانوں کے دروازے کشادہ کر دو۔ مشعلیں روشن کر دو۔ سورج کو شرما دو۔ برف میں لگی ہوئی شراب لنڈھا دو۔ نرم نرم قالین یہیں پر بچھا دو اور کر دو ہل

اور مرتال تم بھی میری آغوش میں آجاؤ

زندگی کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ دیوانگی کے سوا باقی سب حماقت ہے۔

(نسیس کے ہمراہی بڑی مستعدی کے ساتھ اس کا حکم
بجالاتے ہیں وہ خود عیش پرستانہ انداز میں گدیلوں پر گر پڑتا
ہے اس کے اردگرد کردبیل، مرتال، بہت سی لونڈیاں اور
رقاصہ لڑکیاں جمع ہو جاتی ہیں۔)

(شبانہ رقص)

(رقص ہو چکنے کے بعد 'ساحرہ' داخل ہوتی ہے)

نسیس۔ آہ وہ سینہ بے مثال آگئی ——— کردبیل اپنا رباب اٹھالو اور دونوں مل کر حسن کا گیت گاؤ۔

(کردبیل اور مرتال دونوں ساز بجاتی ہیں اور گاتی ہیں
'ساحرہ' ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اور آہستہ آہستہ اپنے
جسم کو لچکاتی ہوئی رقص کرتی ہے اور نرم آواز میں کردبیل
اور مرتال کے ساتھ مل کر گاتی ہے)

کردبیل اور مرتال -(۱) وہ حسینہ آگئی جس کا حسن ملکہ صبا سے بھی زیادہ دلآویز ہے جو آئینوں پر رقص کرتی تھی!

(۲) اور اس کے نقاب کے اندر سے اس کی سُریلی آواز آگ کے تیروں کی طرح نکل رہی ہے۔

(۳) اس کا رنگ کہربا کی مانند ہلکا سنہری ہے اس کے ہونٹ لہو کی مانند سُرخ ہیں۔ اس کی آنکھیں رات کی مانند کالی ہیں۔

(۴) اس کی حرکات سرکنڈے کی جنبش کی مانند نازک اور کسی پرندے کی پرواز کی مانند لطیف ہیں۔

(۵) اس کی نظروں کے دام میں کئی دل گرفتار ہیں - اس کی نگاہیں
بے پناہ ہیں !
(۶) وہ دل چھین لیتی ہے اور وصل کی لذت لثانی ہے اس کے سفاک حسن کا
کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔
(۷) وہ سنگ دل صنم کی مانند ہے جسے علم نہیں کہ وہ جب چاہے تباہ کر سکتی ہے۔
(رقص کچھ دیر جاری رہ کر ختم ہو جاتا ہے۔)
(عین اس وقت اتانئیل ایک روشن مشعل ہاتھ میں اٹھائے
جلدی جلدی محل سے باہر نکلتا ہے۔)

نسیس (طنز آمیز لہجے میں) ارے یہ تو وہ ہے۔ یہ تو اتانئیل ہے۔

سمراہی۔ اتانئیل! دانش مندوں کے دانش مند! تم پر سلام ہو! تائیس نے تمہاری عقل کو اندھا کر دیا! (ہنس کر) وہ دیکھو وہ دیکھو۔ اس راہب کے درخشاں چہرے کی طرف دیکھو!

اتانئیل (مشعل کو زمین پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ بجھ جاتی ہے) اپنی زبان روک لو تائیس خداوند کی دلہن ہے۔ اب وہ تم لوگوں کی ملکیت نہیں رہی۔ ناپاک تائیس ہمیشہ کے لیے مر گئی۔ اور اب ایک دوسری تائیس ——— وہ دیکھو آرہی ہے!

(تائیس داخل ہوتی ہے۔
اس کے بال کھلے ہیں۔ اور اس نے موٹا اونی لباس پہن
رکھا ہے لونڈیاں حسرت زدہ اس کے پیچھے پیچھے آتی ہیں۔
اور بار بار مڑ کر محل کی طرف دیکھتی ہیں۔
محل سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا ہے تھوڑی دیر میں آگ
کے شعلے نکلنے لگیں گے اور آگ سین کے اختتام تک بڑھتی
جائے گی۔
شور و غوغا اور قہقہوں کی آواز سن کر آہستہ آہستہ چوک میں

ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔)

اتائیل۔ (تائیس سے) مقدس بہن! آؤ اس شہر سے ہمیشہ کے لیے بھاگ جائیں۔

لوگوں کا ایک گروہ۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔

ہجوم اور نسیس کے ہمراہی۔ (حائل ہو کر) کیا یہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟
یہ کیا کر رہا ہے؟

تائیس۔ ہاں یہ سچ کہتا ہے۔

نسیس۔ تائیس! تم ہم سے چلی جاؤ گی کیا یہ ممکن ہے؟ (تائیس کو بازو سے پکڑ لیتا ہے۔)

اتائیل۔ (تائیس کو چھڑا کر) ناپاک شخص! ہاتھ لگایا تو جان سے مار دیا جائے گا۔ اس کا جسم مقدس ہے! یہ خدا کی ملکیت ہے۔ (تائیس کو اپنے قریب لا کر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے) آگے سے ہٹ جاؤ۔

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) نہیں نہیں۔ یہ شخص کیا چاہتا ہے؟ یہ صحرا کو واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟

ایک گروہ۔ (اتائیل کو دھکا کر) بن مانس! یہاں سے دُور ہو جاؤ!

ہجوم۔ یہ تائیس کو ہم سے لے جائے گا اچھا! میرے ملبوسات! میرے ہار! میرے گھوڑے! میرے جواہرات! ہمیں ان کی قیمت کون ادا کرے گا؟ کیا کوئی قانون ہماری مدد نہیں کر سکتا؟ یہ تائیس کو ہم سے چھین رہا ہے۔

خوفزدہ عورتیں۔ (جلتے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کر کے) شعلے، آگ، جل جل رہا ہے۔

ہجوم۔ (شور مچاتے ہوئے) تائیس یہیں رہے گی۔ اس شخص کو جان سے مار دو، اسے کسی گڑھے میں دھکیل دو۔ اسے پھانسی پر لٹکا دو۔ اسے چیلوں کے آگے ڈال دو۔

ہجوم میں سے ایک شخص۔ (ایک پتھر اٹھا کر اتائیل کے مارتا ہے جس سے اس کا چہرہ زخمی ہو جاتا ہے) مردود! یہ لے!

تائیل اور تائیس ۔ (ایک دوسرے کے بالکل پاس کھڑے بغیر کسی خوف و اضطراب کے ہجوم کو دیکھ رہے ہیں شعلے بلند تر ہوتے جاتے ہیں، آہ! اگر موت کی گھڑی سر پر آگئی ہے تو آؤ جان خدا کے سپرد کر دیں اور اپنے خون کی قیمت سے ایک لمحے کے اندر ابدی مسرت خرید لیں۔

ہجوم ۔ (ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اشرفیاں اٹھانے لگ جاتے ہیں، اشرفیاں، سونا!

نسیس ۔ (اتائیل اور تائیس سے، جاؤ! خدا حافظ! تائیس تم مجھے بھلا دوگی! لیکن اس سے کیا حاصل؟ تمہاری یاد سے میری روح ہمیشہ خوشبو میں بسی رہیگی۔

(نسیس اور بھی سونا بکھیرتا ہے۔ ہجوم پھر شور مچاتا ہے
اتائیل اور تائیس بھاگ جاتے ہیں۔
محل جل رہا ہے۔)

باب سوئم
پہلا منظر

خیابان ـــــ
کھجور کے درختوں کے سایے میں ایک کنواں۔
دو درختوں میں راہگیروں کے آرام کے لیے ایک جھونپڑی ہے۔ اس سے بھی پرے ریگستان کے کنارے البین کا سفید گھر دھوپ میں چمک رہا ہے۔ سورج بہت بلند ہے۔ کھجور کے درختوں کے نیچے بہت سی عورتیں چپ چاپ کنوئیں بھاتی ہیں۔ اور پھر اوپر آکر چلی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تائیل اور تائیس داخل ہوتے ہیں۔ تائیس تکان کے مارے کھڑی بھی مشکل سے ہوسکتی ہے۔)

تائیس ۔ میں گرمی کی شدت سے نڈھال ہو رہی ہوں۔ آہ میں سختیوں سے مری جاتی ہوں۔ ذرا دم لینے کو ٹھہر جائیں

اتانیل۔ نہیں آگے بڑھی چلو۔ اپنے جسم کو کچل ڈالو، اپنے نفس کو ذلیل وخوار کر دو۔

تائیس۔ (عجز کے ساتھ) مقدس باپ! تم سچ کہتے ہو میں اپنا دُکھ شفیع خداوندی کی نذر کرتی ہوں۔

اتانیل۔ صرف توبہ ہی سے گناہ دُھلتے ہیں اور روح پاکیزہ ہوتی ہے۔ بڑھی چلو! بیدلغزیب جسم ہے تونے کافروں، مشرکوں (اجوکش سے) نفیس کے حوالے کیا تھا۔ آہ! یہ پھر بھی خدا کا بخشا ہوا جسم ہے۔ خدانے اسے اپنے مقدس نام کی عبادت گاہ بنایا تھا اور اب کہ تمہیں حقیقت کی ایک جھلک دکھائی دے گئی ہے جب کبھی تمہارا ہونٹ سے ہونٹ یا ہاتھ سے ہاتھ ملے گا۔ تمہارا دل نفرت اور گھن سے بھر جائے گا۔

تائیس۔ مقدس باپ تم سچ کہتے ہو۔

اتانیل۔ آگے بڑھو، گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔

تائیس۔ (خوف زدہ) کیا ہم ابھی خانۂ خدا سے دُور ہیں؟

اتانیل (درشتی سے) یہ پوچھنا بے سُود ہے آگے بڑھو!

تائیس۔ (لڑکھڑاتی ہوئی) میں نہیں چل سکتی! ـــــ محترم باپ! مجھے معاف کر دو۔
(غش کھا کر گرنے کو ہے کہ اتانیل اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیتا ہے اور سایے میں بٹھا دیتا ہے۔ کچھ دیر چُپ چاپ اس کو دیکھا رہتا ہے اور پھر یک لخت اس کے چہرے سے رحم ٹپکنے لگتا ہے)

اتانیل۔ آہ تمہارے سفید سفید تلوؤں سے خون کے قطرے نکل رہے ہیں۔ میرا دل ترس کھا رہا ہے۔ بدنصیب عورت، سیاہ بخت دختر! اے مقدس تائیس! اے میری بہن! میں نے اس آزمائش کو حد سے زیادہ سخت بنا دیا۔ مجھے معاف کر دو (سربسجود ہو کر روتا ہے اور احترام کے جذبات کے ساتھ تائیس کے خون آلودہ پاؤں چُومتا ہے) مقدس تائیس! محترم تائیس!

تائیس۔ (دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے) تمہارے الفاظ میں صبح کی

سی تازگی ہے۔ چلو اب آگے چلیں۔

اتانیل۔ ذرا مجھ کو ساتھ مدد کر، ابھی نہیں! تازہ پانی اور پھلوں سے تمہارے جسم میں طاقت آجائے گی۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اس مسافر خانے کے پاس کنویں تک جا کر پانی لے آؤں۔ وہ پرے جو سفید جھونپڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ البین کا راہب خانہ ہے منزل قریب ہے ہمت نہ ہارو اور خدا سے دُعا مانگو۔

(آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ درختوں کے پاس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتا ہے وہاں سے ٹوکری میں کچھ پھل لے کر باہر آتا ہے اور پھر لکڑی کا ایک پیالہ لئے کنویں کی طرف جاتا ہے۔)

تائیس (تنہا) اے خدا کے پیامبر! جس کی سختی بھی نیکی ہے۔ تجھ پر خدا کی رحمت ہو کہ تو نے آسمان کے دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ میرے جسم سے خون بہہ رہا ہے اور میری روح مسرت سے بھر رہی ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے میرے تپتے ہوئے ماتھے کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں۔ تمہارا شیریں اور رقت افزا تصور چشمے کے پانی سے بھی تازہ اور شہد سے بھی میٹھا ہے میری روح علائق سفلی سے آزاد ہو کر ایک لامتناہی فضا میں پرواز کر رہی ہے

محترم باپ! تم پر خدا کی رحمت ہو!

(اتانیل پانی اور پھل لئے واپس آتا ہے۔)

اتانیل اپنے ہاتھ دھو لو۔ اپنے ہونٹ تر کر لو، یہ پھل کھالو۔ اور اس تپش کو ٹھنڈا کرو جس سے تمہاری آنکھیں چمک رہی ہیں۔ تمہاری زندگی اب میری بے بہا دولت ہے یہ میری ہے۔ خدا نے اسے میرے سپرد کیا ہے۔

(تائیس کے ہاتھ پر پانی ڈالتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اسے پانی پلاتا ہے تائیس خود پی کر مسکراتی ہوئی پیالہ اسکی طرف بڑھاتی ہے۔)

تائیس۔ اب تم پیو!

اتانئیل - نہیں! تمہیں تازہ دم دیکھ کر میری پیاس بجھ گئی ہے۔ تمہارے دُکھ کو دُور کرنا ہی میری سب سے بڑی خوشی ہے۔ تائیس! اے جان کی راحت!

تائیس۔ اے نیکی کے فرشتے۔

(اسے پھل کھانے کے لیے دیتا ہے اور خود پھر کنویں سے پانی بھر لاتا ہے اس کے بعد مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔ دُور سے حمد کے گیتوں کی آواز مدہم سی سنائی دیتی ہے اور آہستہ آہستہ پھوٹتی جاتی ہے اور البین اور راہب لڑکیوں کا گروہ داخل ہوتا ہے۔)

آوازیں۔ (دُور سے) اے باپ جو آسمان پر حکومت کر رہا ہے — ہمیں آج کے دن رزق عطا فرما!

تائیس۔ کون آرہا ہے؟

اتانئیل۔ محترم البین اور اس کی بہنیں راہب خانے کی کالی روٹی لا رہی ہیں۔ وہ ہماری طرف آرہی ہیں اور خدا کی حمد گا رہی ہیں۔

آوازیں۔ (بہت ہی قریب) خداوند ہمیں آزمائش میں نہ ڈال اور ہمیں بدی سے بچائے رکھ!

(البین اور دوسری عورتیں داخل ہوتی ہیں۔)

اتانئیل۔ آمین!

(اتانئیل کو دیکھ کر البین اور دیگر راہب عورتیں ٹھہر جاتی ہیں اور بہت ادب اور احترام کے انداز میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تائیس بھی اٹھ کر اتانئیل کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔)

اتانئیل۔ (البین سے) محترم البین! تم پر خدا کی برکت نازل ہو۔ میں تمہارے آسمانی چھتے میں ایک ایسی شہد کی مکھی لایا ہوں۔ جسے میں نے فضل خداوندی کی مدد سے ایک بے برگ دگل رستے پر بھٹکتا پایا۔ میں نے اس کمزور و نحیف جان کو اپنے ہاتھ

میں لے لیا۔ اپنے سانس سے اس میں جان ڈالی اور اب میں اسے خدا کی نذر کرنے کے لیے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

البین۔ میری بیٹی میرے قریب آؤ۔

(تائیس کو مادرانہ شفقت کے ساتھ گلے لگا لیتی ہے۔)

اتائیل۔ میں اس سے آگے نہ جاؤں گا۔ میرا فرض پورا ہو چکا۔ پیاری تائیس! خدا حافظ!

اب تم تنگ کوٹھری میں تنہا زندگی بسر کرو، اپنے گناہوں سے توبہ کرو، اور ہر وقت میرے لیے دعا مانگتی رہو!

تائیس (اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) میں تمہارے دستگیر ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوں۔ تم نے مجھے خدا کے دروازے تک پہنچا دیا۔ تم سے جدا ہوتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے۔

اتائیل۔ رقت انگیز الفاظ۔ قابل پرستش آنسو! وہ عاصی خوش قسمت ہے جسے عشق ابدی نے اپنا لیا ہو (جوش کے ساتھ) اس کا چہرہ کس قدر دلفریب ہے۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کا نور چمک رہا ہے۔

تائیس۔ خدا حافظ محترم باپ خدا حافظ! ..... ہمیشہ کے لیے!

اتائیل۔ (جیسے اس پر بجلی گری) ہمیشہ کے لیے!

تائیس۔ دوبارہ ملاقات آسمان پر ہوگی!

البین اور راہب عورتیں۔ آمین!

(عورتیں تائیس کو ساتھ لے کر رخصت ہو جاتی ہیں! اتائیل ان کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے خواب کے عالم میں ہو)

اتائیل۔ (تنہا) اس کے قدم آہستہ اٹھ رہے ہیں۔ درخت اپنی شاخیں جھکا دیتے ہیں گویا اس کے ماتھے کو خنکی پہنچانا چاہتے ہوں۔ اور کئی دن اور پھر کئی سال گذر جائیں گے اور مجھے اس کا چہرہ کبھی نظر نہ آئے گا۔

(عصا کا سہارا لئے مبہوت کھڑا اسی طرف دیکھ رہا ہے پردہ گرتا ہے۔)

دوسرا منظر

(صحرائے تھیبس ——
دریائے نیل کے کنارے سینوبیت راہبوں کی جھونپڑیاں۔ مغرب کی طرف آسمان کا رنگ سُرخ ہے اور معلوم ہوتا ہے۔ آندھی آنے والی ہے۔
راہب اپنا شام کا کھانا کھا چکے ہیں اور آسمان کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
دور بادِ سموم چلنے لگتی ہے۔
صحرا کی گہرائیوں میں سے گیدڑوں کی آوازیں اور شیروں کی دھاڑ سنائی دیتی ہے۔)

راہب۔ آسمان تاریک ہو رہا ہے۔ جان دار اور بے جان اشیاء پر بے ہوشی سی طاری ہو رہی ہے۔ دُور سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہوائیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ قہر کے دروازے کھول دیں گی۔

پالیمون۔ اپنی اپنی جھونپڑیوں کو واپس چلے جاؤ! اور اپنا غلّہ اور پھل سنبھال لو ورنہ آندھی ان کو صحرا میں دور تک بکھیر دے گی (راہب اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں)

ایک راہب۔ (چلتے ہوئے) اتائیل! —— کیا کسی نے اس کو دیکھا؟

پالیمون۔ اسے واپس لوٹے بیس دن ہو چکے ہیں لیکن اسے جانو! جس دن سے وہ واپس آیا ہے نہ اس نے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ اسے جہنم پر جو فتح نصیب ہوئی ہے اس نے اس کے جسم اور روح کو چور چور کر دیا ہے۔

(اتائیل جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ جسم خمیدہ ہے چہرہ تنا ہوا ہے نظریں بےروح ہیں۔)

راہب (راہب کے ساتھ) وہ آگیا!

(اتانیل ان کے بیچ میں سے ان کو دیکھے بغیر گزر
جاتا ہے۔)

چیندا درراہب۔ اس کا دھیان کہیں اور لگا ہے ۔

چیندا ورراہب۔ وہ خدا میں محو ہے۔

راہب (رچیتے ہوئے) اس کی خاموشی کا احترام کرو، اور اسے مت چھیڑو۔

اتانیل۔ (پالیموں سے عاجزی کے ساتھ) محترم باپ! مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے تم سے اپنے درد وکرب کا اعتراف کرنا ہے۔ اے پالیموں! تم جانتے ہو کہ میں نے سیہ کار تائیس کی روح پر فتح پائی۔ اس فتح پر مجھے فخر تھا اور پھر میں اس پرسکون صحرا میں واپس آیا۔ لیکن اب اطمینانِ قلب مجھ سے کوسوں دور ہے میں نے اپنے نفس کو بے رحمی سے کچلا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اپنے جسم کو زخموں سے چور چور کر لیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ میں کسی شیطانی جذبے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس عورت کے حسن کا تصور مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔ مجھے سوائے تائیس کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور اس ایک ہستی میں مجھے جسم کی ہر لذت اور دنیائے حسن کا ہر جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

(شرم کے مارے پانی پانی ہوکر پالیموں کے قدموں میں گر پڑتا ہے۔)

پالیموں۔ (نرمی کے ساتھ) میں نے تم سے نہ کہا تھا "میرے بیٹے ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار رہو"؟ تو پھر تم کیوں جانے پر تلے ہوئے تھے! آسمانی باپ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ خدا حافظ!

(اتانیل کھڑا ہو جاتا ہے پالیموں اسے گلے لگا کر چلا جاتا ہے۔ اتانیل تنہا گھٹنوں کے بل چٹائی پر گر کر اپنے بازو پھیلا دیتا ہے اور خاموشی کے ساتھ خدا سے دعا مانگتا ہے۔ پھر ہاتھ باندھے لیٹ کر سو جاتا ہے۔)

(تھوڑی دیر کے بعد اندھیرے میں تائیس کا تصور چمکتا
ہوا دکھائی دیتا ہے۔)

تائیس: (تائیس سے دلفریب اور رسبد شکن انداز میں) تم کس لئے اس قدر غصے سے
بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں میں جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں
جھٹلا رہے ہو!

آتانیل۔ (عالم خواب میں) تائیس ......

تائیس: وہ کون سی منحوس حماقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے۔ انسان
عشق کے لئے بنا ہے اور تم دھوکا کھا رہے ہو!

آتانیل (گھبرا کر جاگ اٹھتا ہے) ملعون شیطان! میرے سامنے سے ہٹ جا...
آہ! میرا جسم پھک رہا ہے۔

تائیس (غصہ دلاکر) وینس سے سرکشی کرنے والے ہمت ہو تو آجانا!

آتانیل۔ (سراسیمہ) میرا دم نکل رہا ہے! تائیس میرے پاس آؤ!

(تائیس کا قہقہہ سنائی دیتا ہے اور اس کی شکل دفعۃً غائب
ہو جاتی ہے)

(پھر ایک اور خواب مترتب پذیر ہوتا ہے۔ آسمان نکھرا ہوا
ہے اور سامنے البین کا گھر نظر آ رہا ہے ایک انجیر کے
درخت کے سائے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے
اس کے ارد گرد راہب عورتیں گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں)

آتانیل (اس خواب کو دیکھ کر دہشت کے مارے چیخ مارتا ہے) آہ!

آوازیں۔ ایک مقدس ہستی اس دنیا سے رخصت ہونے والی ہے۔ سکندریہ کی تائیس
مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے!

آتانیل۔ (دیوانہ وار) تائیس مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے! (غصے سے بے تاب
ہو کر) تو پھر یہ آسمان گر کیوں نہیں پڑتا؟ سینوں میں دم کیوں ہے۔ روشنی میں چمک
کیوں ہے۔ کون و مکاں فنا کیوں نہیں ہو جاتے؟ تائیس مرنے کو ہے۔ آہ ایک

دفعہ پھر اس کو دیکھ لوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں ـــــ اسے گلے سے لگا لوں۔ اسے اپنے پاس رکھ لوں ـــــ میں اس کو چاہتا ہوں۔ میری عقل اندھی تھی جو اس سے پہلے میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہی میرا سب کچھ ہے۔ اس کا ایک بوسہ جنت سے بھی زیادہ عزیز ہے میں اس کے سب چاہنے والوں کو ایک ایک کر کے قتل کر دیتا۔ نہیں۔ تائیس ابھی نہ مرو۔ نہیں۔ نہیں، میں تمہیں سینے سے لگاؤں گا۔ میری ہو جاؤ۔ میری ہو جاؤ!

(جاگ اٹھتا ہے اور رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔

اندھیرا۔ سیاہ بادل، بجلی اور گرج، موسیقی اگلے سین تک جاری رہتی ہے۔)

تیسرا منظر

(راہبین کے گھر کا باغیچہ ـــــ

ایک درخت کے سائے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے گویا مردہ ہے۔

راہب عورتیں اور البنین اس کے گرد جمع ہیں۔)

راہب عورتیں۔ (ہاتھ باندھے گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں اور زیر لب دعا مانگ رہی ہیں) اے خداوند! مجھ پر رحم کر۔ اے خداوند اپنی محبت کے صدقے اپنی رحمانیت کے طفیل میرے گناہوں کو دھو ڈال۔

البنین (تائیس کو دیکھ کر) خدا بلا رہا ہے اور آج رات یہ پاکیزہ چہرہ کفن کی سفیدی میں چھپ جائے گا۔ تین مہینے تک یہ راتوں کو جاگ جاگ کر دعائیں مانگتی رہتی ہے اور آنسو بہاتی رہی ہے۔ اس کا جسم نحیف و نزار ہے لیکن اس کے گناہ سب دھل چکے ہیں۔

راہب عورتیں۔ اے خدا مجھ پر رحم کر۔ اے خدا اپنی محبت کے صدقے۔

(اتانیل زرد رو اور ازحد مغموم باغ میں داخل ہوتا ہے البین
کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے، اور عاجزی کے انداز میں ٹھہر
جاتا ہے البین آگے بڑھتی ہے اور راہب عورتیں اتانیل
اور تائیس کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں)

البین۔ (اتانیل سے) محترم باپ! تمہارا آنا مبارک ہو، یقیناً تم اس مقدس ہستی کو
برکت دینے کے لیے آئے ہو!

اتانیل۔ (اپنی بدحواسی پر مشکل سے قابو پا کر) ہاں..... تائیس!

البین۔ تمہارے احکام کی پوری تعمیل کرنے کے بعد اب وہ خدا کے دیدار سے
مشرف ہونے والی ہے۔

(راہب عورتیں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور اتانیل کی
نظر تائیس پر پڑتی ہے۔)

اتانیل (بے پناہ درد سے بے قرار ہو کر) تائیس! تائیس!

(بے تاب ہو کر منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ البین اور
راہب عورتیں پرے ہٹ جاتی ہیں اور دعا میں
مشغول ہو جاتی ہیں اتانیل بصد مشکل گھٹنوں کے بل
کھڑا ہو کر اپنے بازو تائیس کی طرف پھیلاتا ہے۔)

اتانیل۔ (بہت ہی ہلکی آواز میں) تائیس!—

تائیس۔ (آنکھیں کھول دیتی ہے اور حسرت زدہ نظروں سے اتانیل کے چہرے
کو دیکھتی ہے) محترم باپ! تم ہو! (اتانیل کا جواب اسے بالکل سنائی
نہیں دیتا) تمہیں وہ شاندار سفر یاد ہے جب تم مجھے یہاں لے کر آئے
تھے؟—

اتانیل۔ میں تمہارے نسوانی حسن کے سوا باقی سب کچھ بھلا چکا ہوں۔

تائیس۔ تمہیں وہ راحت اور آرام کی گھڑیاں یاد ہیں۔ اس خیابان کی

ٹھنڈی ہوائیں ؟

اتانیل۔ (والہانہ) مجھے صرف وہ پیاس یاد ہے جو تمہارے سوا اور کوئی نہیں بجھا سکتا۔

تائیس۔ اور پھر تمہیں وہ مقدس الفاظ یاد ہیں وہ جب تمہاری زبان سے میں نے سچے عشق کی حقیقت کو پہچانا۔

اتانیل۔ (بے قرار ہو کر) میں تمہیں دھوکہ دے رہا تھا!

تائیس۔ اور وہ دیکھو صبح ہونے والی ہے۔ مشرق کے شہابی رنگ کو دیکھو!

اتانیل۔ نہیں، نہیں۔ آسمان بے حقیقت ہے سب کچھ بے ہیچ ہے زندگی اور انسانی محبت کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ میں تم پر مر چکا ہوں۔

تائیس۔ جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ وہ دیکھو خدا کے فرشتے اور رسول آ پہنچے، وہ مسکراتے ہوئے ہاتھوں میں پھول اٹھائے آ رہے ہیں۔

اتانیل۔ میری راحت، میری زندگی، میری بات سنو!

تائیس (اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کانپ رہی ہے) دو سفید سفید پروں والے فرشتے آسمان میں اڑ رہے ہیں اور جیسا کہ تم نے کہا تھا۔ شفیع خداوندی اپنی نور کی انگلیوں سے میرے آنسو ہمیشہ کے لیے پونچھ رہا ہے۔

اتانیل۔ کہو میں زندہ رہوں گی کہو میں ابھی نہ مروں گی!

تائیس۔ سنہری ساز کا ترنم مجھے مسحور کر رہا ہے معطر ہوائیں مجھے مست کر رہی ہیں۔ میری مصیبتوں پر آسمانی برکات کا نزول ہو رہا ہے۔ آہ۔ خداوند آہ مجھے خدا نظر آ رہا ہے۔ (مر جاتی ہے)

(اتانیل چیخ کر گھٹنوں کے بل گر پڑتا ہے)

سیب کا درخت

جان گالزورودی

اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ کے دن ایشرسٹ اور اُس کی بیوی جنگل کے کنارے موٹر میں سیر کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دن بھر سیر کرنے کے بعد رات اس تقریب کی خوشی میں ٹورکی کے مقام پر گزاریں۔ جہاں ان دونوں کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تجویز سٹیلا ایشرسٹ کی تھی جس کی فطرت میں جذبہ پرستی کی ایک جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ سٹیلا میں اب وہ پہلے کا سا حُسن تو نہ تھا۔ نہ وہ نیلی آنکھیں نہ وہ پھول کی سی لطافت نہ وہ چہرے اور اعضا کی نازک پاکیزگی جسے دیکھ کر آنکھوں کو تسکین ہوتی تھی۔ نہ وہ سیب کے شگوفے کی سی رنگت جس نے آج سے چھبیس سال پہلے ایشرسٹ کے دل کو ایک ہی جھلک میں موہ لیا تھا لیکن پینتالیس برس کی عمر ہونے پر بھی اپنے شوہر کی وفادار رفیق تھی۔ چہرہ اب بھی حسین تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے داغ پڑ گئے تھے اور آنکھوں میں ایک لہر یہ سی آگئی تھی۔

سٹیلا ہی نے موٹر کو ایسے مقام پر ٹھہرایا۔ جہاں بائیں ہاتھ کو مرغزار کی اونچی چڑھائی تھی۔ اور جنگل کا ایک تنگ سا خط۔ جس میں زیادہ تر بیچ اور لارچ اور کہیں کہیں چیڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے اس وادی کی طرف بڑھا ہوا تھا جو سڑک سے لے کر پرے جنگل کی پہلی اونچی پہاڑی تک پھیلی ہوئی تھی اسے اپنی جگہ کی تلاش تھی۔ جہاں دونوں بیٹھ کر لنچ کھائیں۔ ایشرسٹ کو تو کبھی کسی چیز کی تلاش

نہ تھی)۔ ادھر اُدھر چاروں طرف مرغزار کے سنہری پھول اُگ رہے تھے۔ لارچ کے ہرے بھرے ہلکے پھلکے پیروں پر اوائلِ اپریل کی دُھوپ پڑ رہی تھی۔ اور ان میں سے سیبوؤں کی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے گہری وادی کا منظر جنگل کے لمبے لمبے ٹیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سیٹلا کو آبی رنگوں سے تصویر کھینچنے کا شوق تھا۔ ہر ارمان انگیز منظر اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اس پر طبیعت ایسی کہ جھٹ ہر بات کا فیصلہ کر لیتی۔ چنانچہ یہی مقام اسے موزوں معلوم ہوا۔ رنگوں کا ڈبہ ہاتھ میں لیا اور موٹر سے نیچے اُتری۔

"کیوں فرینک! یہ جگہ ٹھیک ہے؟"

الیشرسٹ کی شکل کچھ کچھ شیلر سے ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی داڑھی تھی شیلر کی داڑھی نہ تھی۔ گالوں پر کے بال سفید تھے۔ لمبا قد۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ بڑی بڑی بھورے رنگ کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں جو پُر معنی ہوتیں تو چہرہ پہ ایک حسن سا آجاتا۔ ناک ذرا ایک طرف کو۔ داڑھی اور مونچھوں کے بیچ میں ہونٹ ذرا کھلے ہوئے اڑتالیس برس کی عمر۔ چُپ چاپ کھانے کی ٹوکری اٹھائے موٹر سے نیچے اُترا۔

"دیکھو فرینک! قبر!"

مرغزار کی اونچان سے ایک پگڈنڈی نیچے کو اترتی تھی جو جنگل کے تنگ خطے کے ساتھ ہو کر ایک پھاٹک میں سے نکل جاتی تھی۔ جہاں یہ پگڈنڈی سڑک کو عموداً کاٹتی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے کنارے مٹی کی ایک ڈھیری سی تھی۔ چھ فٹ لمبی فٹ بھر چوڑی۔ اوپر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ مغرب کو ایک پتھر کھڑا تھا۔ جس پر کوئی اللہ کا بندہ بلیک تھارن کی ایک ٹہنی اور کچھ نیلے پھول ڈال گیا تھا۔ الیشرسٹ نے قبر کو دیکھا تو شاعرانہ دل امڈ آیا۔ سوچا چوراہے پر تو اس شخص کی قبر بناتے ہیں جس نے خودکشی کی ہو اللہ اللہ فانی انسان بھی کیسے کیسے توہمات پر تکیہ کرتا تھا! لیکن جو بھی یہاں دفن ہے سکھ کی نیند سو رہا ہے۔ قبر کے سرہانے ایک ناہموار سا پتھر ہے۔ سر پر کھلے آسمان کا سائبان ہے اور راہ چلتے لوگ فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ طبعی موت مرتا تو کسی

قبرستان میں سیلا ہوا مقبرہ ہوتا۔ اور چاروں طرف بد وضع قبریں۔ جن پر طرح طرح کے لاحاصل کلمات کندہ ہوتے۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ جانتا تھا گھر کے لوگوں میں فلسفہ بگھارنا بے سود ہے۔ چپ چاپ مرغزار کی جانب چل دیا۔ ایک دیوار کے نیچے کھانے کی ٹوکری رکھی۔ بیوی کے بیٹھنے کو کمبل بچھایا کیونکہ جب اُسے بھوک لگے گی تو تصویر کشی چھوڑ کر یہیں آئے گی، اور جیب سے مرسے کا پالٹس کا ترجمہ نکالا۔ تھوڑی دیر میں سیرئین اور اس کے انتقام کی داستان پڑھ چکا تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان پر بلکے بادلوں کو دیکھ کر ایشیرسٹ کا دل آج اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن نہ معلوم کس چیز کے لیے تڑپنے لگا۔ سچ ہے۔ زندگی اور فطرت انسانی کا آپس میں جوڑ نہیں! انسان کی زندگی کتنی ہی پاک اور ارفع ہو۔ پھر بھی اندر ہی اندر ایک ہوس ایک جستجو لگی رہتی ہے اور زندگی خالی خالی معلوم ہوتی ہے۔ کیا عورتوں کے دل کا بھی یہی حال ہے؟ یہ کون جانے؟ انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے عشق کی تلاش میں رہتا ہے اور مستانہ وار نت نئے جھگڑوں میں پڑنا چاہتا ہے لیکن اگر اس کی تسکین ہو جاتی ہے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی۔ وہاں اب ایک سیری آجاتی ہے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اطمینان مفقود ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ مرض لاعلاج ہے زندگی اور تہذیب یافتہ انسان کا آپس میں جوڑ نہیں۔ انسان کو یہ قدرت تو حاصل ہے کہ حسن کو ہر فن کے کسی نمونہ میں قید کر کے ہمیشہ کے لیے ایک جگہ جکڑ رکھے۔ اور جب اسے دیکھے یا پڑھے ہمیشہ اسی قابل قدر علو اسی تسکین بخش نشے کا احساس ہو۔ لیکن اسے یہ قدرت نہیں کہ اسی طرح اپنی زندگی کے اندر بھی اپنی مرضی کا ایک گلزار بنائے۔ جس میں بقول اُس خوش گفتار یونانی کورس کے "سیب کا درخت ہو موسیقی ہو اور سنہری پھول ہوں"۔ جس انسان کے اندر احساس حسن موجود ہے اسے زندگی میں جنت نہیں مل سکتی۔ دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے۔ بعض بعض لمحے البتہ اس قسم کی دلفریبی سے ضرور معمور ہوتے ہیں جن میں ایک سریع بے خودی آپ ہی آپ انسان پر طاری ہو جاتی ہے لیکن جتنی دیر میں ایک بادل سورج کے

سامنے سے گذر جاتا ہے اتنی دیر میں یہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں جس طرح فنی حسن کو قید کر لیتا ہے اسی طرح ان لمحوں کو قید کر رکھنا ممکن نہیں۔ یہ ان لمحوں کی طرح گریز پا ہیں جس میں انسان کو اس روح فطرت کے درخشاں یا جھلملاتے ہوئے جلوے کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے جو انسانوں سے دُور اپنی سوچ میں مستغرق بیٹھی ہے۔ اس مقام پر اور اس لمحے کے اندر جگہ جگہ دُھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ تھارن کے درخت پر کوکو بول رہا ہے۔ گورس کی خوشبو سے ہوا میں شہد کی سی چاشنی ہے۔ چاروں طرف بلیک تھارن اور نوخاستہ فرن کے چھوٹے چھوٹے پتوں کی ہریاول ہے اور سفید براق بادل پہاڑیوں اور چرکیت وادیوں کے اوپر آسمان پر ہلکے ہلکے اڑ رہے ہیں۔ الیفرسٹ کی آنکھوں کے سامنے قدرت کا جلوۂ پنہاں بے نقاب ہے لیکن چشم زدن میں یہ جلوہ غائب ہو جائے گا جیسے پین کا چہرہ جو ایک چٹان کے کونے پر سے دکھائی دے رہا ہو۔ انسان کی نگہ سے خوفزدہ ہو کر غائب ہو جاتا ہے ــــــ ایشرسٹ یک لخت اٹھ بیٹھا۔ اسے یکلخت اس بات کا احساس ہوا کہ گھاس کا یہ تختہ۔ یہ تنگ سی سڑک ۔ پیچھے یہ پرانی دیوار۔ یہ سب منظر کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ موٹر میں سوار تھے تو اس نے حسب عادت اس طرف توجہ ہی نہ کی تھی۔ لیکن اب تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اس مقام سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس واقع تھا۔ جہاں وہ چھبیس سال ہوئے ایک دن اسی موسم میں ٹور کی روانہ ہوا تھا اور یوں سمجھئے کہ وہ پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی گزشتہ زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آگیا۔ جس کی دلفریبی اور بے خود ہاتھ میں آ کر نکل گئی تھی۔ ایک ایسا لمحہ جو پھڑ پھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دنیا کو اڑ گیا تھا۔ دفعتہً ایک ایسے زمانہ کی یاد پھر تازہ ہو گئی جو شیریں اور شباب سے لبریز تھا لیکن یک لخت منقطع ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھے اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا اور نوخاستہ سبزے کو جس کے بیچ میں ملک ورٹ کے ننھے ننھے پھول اُگ رہے تھے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے تکتا رہا۔۔۔۔۔ اور جو کچھ اُسے یاد آیا وہ یہ تھا۔

(۱)

فرینک ایشرسٹ اور اس کا دوست رابرٹ گارٹن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ زمانۂ تعلیم کا آخری سال گذار چکنے کے بعد یکم مئی کو دونوں سیاحت کی غرض سے پا پیادہ سفر کر رہے تھے۔ برینٹ سے پیدل چلے تھے اور ارادہ تھا کہ چیرگ فورڈ پہنچ کر دم لیں گے۔ لیکن ایشرسٹ کے گھٹنے میں ایک دو روز ہوئے فٹ بال کھیلتے ہوئے چوٹ لگی تھی۔ چلتے چلتے گھٹنے میں درد ہونے لگا یہاں تک کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ نقشہ کو دیکھا تو ابھی سات میل باقی تھے۔ ایک چوراہے کے پاس جہاں ایک پگڈنڈی جنگل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی سڑک کو کاٹ کر نکل جاتی تھی۔ دونوں دوست سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھے سستا رہے تھے اور جیسا کہ نوجوانوں کا قاعدہ ہے کائنات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کا قد چھ فٹ سے اونچا تھا اور جسم چھریرا۔ ایشرسٹ کا رنگ ذرا پیلا تھا۔ تخیل پسند طبیعت۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہتا تھا گارٹن نے نرالی طبیعت پائی تھی۔ جس کا اندازہ پوری طرح لگانا مشکل تھا۔ کچھ کرخت تھا۔ کچھ ٹیڑھا بنکا جیسے زمانۂ قدیم کا کوئی حیوان ہو۔ دونوں کو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ دونوں سر سے ننگے تھے۔ ایشرسٹ کے بال ہلکے رنگ کے۔ ملائم اور لہروں والے تھے اور کنپٹیوں پر سے یوں اوپر کو اٹھتے تھے جیسے کوئی ہمیشہ انہیں پیچھے کو جھٹک رہا ہو۔ گارٹن کے بال سیاہ رنگ کے تھے اور از حد بے ترتیب

دونوں دوست چلتے چلتے میلوں نکل گئے تھے۔ لیکن راستہ میں اپنے سوا کوئی اور رہرو نظر نہ آیا تھا۔

گارٹن کہہ رہا تھا۔ تم میری بات مانو۔ رحم صرف شورِ نفس کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مفقود تھا جب رحم نہ تھا تو دنیا کے لوگ زیادہ مزے میں تھے۔

ایشرسٹ نے جو بادلوں کی حرکت کا تماشا دیکھ رہا تھا جواب دیا۔ بہرحال میرا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں رحم کا وہی رتبہ ہے جو صدف کے اندر موتی کا ہے۔

گارٹن بولا۔ یہ غور دار موجودہ زمانہ کی تمام بے اطمینانی رحم ہی کا نتیجہ ہے جانوروں کو دیکھو۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کو دیکھو انہیں صرف اپنے اپنے دُکھ کا احساس ہے۔ اور اس کا موقع بھی کبھی کبھی پیش آتا ہے لیکن ہمیں دیکھو کہ کسی دوسرے کی ڈاڑھ میں بھی درد ہو تو ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ آخر اوروں پر ترس کھانے سے کیا حاصل؟ میں تو کہتا ہوں کہ وحشیوں کی طرح دوسروں کے غم سے نجات حاصل کرو اور اطمینان سے رہو۔

ایشرسٹ نے کہا کہ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم اس پر کبھی عمل نہ کرو گے۔

گارٹن غور و فکر کے انداز میں اپنے بے ترتیب بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"رکھ رکھاؤ کی زندگی میں انسان پوری طرح نشو و نما نہیں پا سکتا۔ جذبات کو اپنے اوپر حرام کر لینا غلطی ہے۔ ہر جذبہ مفید ہوتا ہے کیونکہ اس سے زندگی کو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔"

"اور اگر کوئی جذبہ توقیر نسواں کے اصول کے منافی ہو۔ تو پھر؟"

"تم نے بالکل انگریزوں کی سی بات کی ہے۔ انگریزوں کے سامنے جذبہ کا ذکر کرو تو وہ سمجھتے ہیں اس سے مراد جسمانی لذت ہے۔ اور وہ جذبہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن شہوت سے نہیں گھبراتے۔ بشرطیکہ کسی اور کو معلوم نہ ہو جائے۔"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک ننھے سے نیلے رنگ کے پھول کو آسمان کے سامنے رکھ کر گھما رہا تھا۔ تھارن کے ایک درخت پر کوکو نے بولنا شروع کیا۔ خوش رنگ آسمان کے نیچے جہاں پھول اُگ رہے ہوں اور پرندے چہچہا رہے ہوں۔ رابرٹ کی باتیں کتنی بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔

ایشرسٹ بولا۔

"چلو اب چلیں کسی فارم میں جگہ مل جائے تو رات وہیں گذاریں۔"

جب یہ الفاظ کہے تو وہ دیکھ رہا تھا کہ سامنے ایک لڑکی ٹوکری اٹھائے مرغزار کی اونچان سے نیچے اتر رہی ہے۔ آسمان کے بالمقابل (جو ایشرسٹ کو لڑکی کے

خمیدہ بازوؤں سے دکھائی دے رہا تھا، اس کے جسم کا خاکہ واضح نظر آ رہا تھا۔ ایشیرسٹ نے حسن کا نظارہ کیا کرتا تھا بغیر یہ سوچے کہ اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ دل میں کہا "بہت خوب!" لڑکی نے گہرے رنگ کے موٹے کپڑے کا سایہ پہن رکھا تھا۔ ہوا کے زور سے سایہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ رہا تھا اور اس کی چھلی پرانی طاؤسی رنگ کی ٹوپی اوپر اٹھ گئی تھی بھورے رنگ کا بلاؤز پرانا اور گھسا ہوا تھا۔ جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سرخ اور کھردرے تھے۔ گردن کا رنگ سانولا پڑ گیا تھا۔ اس کے پریشان بال اس کے

فراخ ماتھے پر بکھرے تھے۔ چہرہ لمبا نہ تھا۔ اوپر کا ہونٹ چھوٹا سا تھا۔ اور دانت چمک رہے تھے۔ بھویں کالی اور سیدھی تھی۔ پلکیں سیاہ اور لمبی لمبی۔ ناک ستواں اور اس کی بھوری آنکھیں تو غضب ہی ڈھا رہی تھیں۔ ان میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ گویا ابھی ابھی وا ہوئی ہیں۔ اس نے ایشیرسٹ کی طرف دیکھا شاید اسے لنگڑاتا ہوا آدمی، سر سے ننگا بال پیچھے کو جھٹکے ہوئے، جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ عجیب معلوم ہوا۔ ایشیرسٹ کے سر پہ ٹوپی تو تھی نہیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بولا۔

"یہاں پاس ہی کوئی ایسا فارم نہیں جہاں ہم رات گذار سکیں۔ میں چل نہیں سکتا۔ میری ٹانگ دکھتی ہے۔"

لڑکی بغیر شرمائے نرم نازک اور پیاری آواز میں بولی۔

"جناب یہاں قریب تو ہمارا ہی فارم ہے۔"

"کہاں؟"

"اس طرف نیچے کو۔"

"ہم وہاں رات گذار سکتے ہیں؟"

"میرا خیال تو ہے۔"

"تو ہمیں راستہ بتا دو۔"

"آئیے۔"

الفریسٹ لنگڑاتا لنگڑاتا ساتھ چل پڑا۔ جب وہ چپ ہوا تو گارٹن نے جرح شروع کر دی۔

"تم ڈیون شائر کی رہنے والی ہو؟"

"نہیں جناب!"

"تو پھر؟"

"میرا وطن ویلز میں ہے"

"ٹھیک میں بھی کہتا تھا کہ شکل سے تم کیلٹ معلوم ہوتی ہو—— تو یہ فارم تمہارا نہیں؟"

"نہیں۔ میری خالہ کا ہے"

"اور تمہارا خالو؟"

"وہ زندہ نہیں"

"تو فارم کا کام کون چلاتا ہے؟"

"میری خالہ اور خالہ کے تین لڑکے"

"تمہارا خالو تو ڈیون شائر کا رہنے والا تھا؟"

"جی ہاں"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہے؟"

"سات سال"

"ویلز کے بعد یہ جگہ تمہیں کچھ پسند بھی آئی؟"

"معلوم نہیں جناب"

"شاید ویلز تمہیں اب یاد نہ رہا ہو؟"

"اچھی طرح یاد ہے وہ جگہ تو کچھ اور ہی تھی"

"مجھے بھی تم سے اتفاق ہے"

الفریسٹ یک لخت بولا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"جناب سترہ سال"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میگن ڈیوڈ"

"ان کا نام رابرٹ گارٹن ہے۔ میرا نام فرینک الشیرسٹ ہے۔ ہمارا ارادہ تو تھا کہ چیگ فورڈ پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں لیکن"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ٹانگ دکھ رہی ہے"

ایشرسٹ مسکرا دیا۔ اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک حسن سا آجاتا تھا۔

اونچان سے نیچے اتر کر جنگل کے برابر سے نکلے تو سامنے فارم دکھائی دیا۔ پتھر کی ایک عمارت تھی۔ لمبی اور نیچی نیچی کھڑکیوں میں پٹ لگے تھے۔ ارد گرد ایک احاطہ تھا جس میں سؤر اور مرغیاں اور ایک بوڑھی گھوڑی اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ پرے کو گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی تھی۔ جس پر اسکاچ فر کے چند درخت اُگ رہے تھے۔ سامنے سیب کے درختوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ جن کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ باغ کے کنارے کنارے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ اور ندی کے پار ایک لمبا مرغزار پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ اور ترچھی آنکھوں والا ایک چھوٹا سا لڑکا ایک سؤر کی رکھوالی کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس ایک عورت کھڑی تھی جو انہیں دیکھ کر آگے بڑھی لڑکی نے کہا۔

"یہ میری خالہ مسز نیرکومب ہیں"

خالہ مسز نیرکومب کی آنکھ بچوں والی جنگلی بطخ کی مانند سیاہ اور تیز تھی۔ گردن میں بھی سانپ کی سی اٹھان تھی۔

الشیرسٹ نے کہا "ہمیں آپ کی بھانجی رستے میں مل گئی۔ یہ کہتی ہے یہاں رات بسر کرنے کا انتظام ہو جائے گا"

"ہو تو جائے گا لیکن آپ دونوں کو ایک ہی کمرے میں سونا پڑے گا۔

مگن بیٹی جاؤ وہ خالی کمرہ ان کے لیے صاف کر دو۔ کریم کا ایک پیالہ بھی لیتی آنا۔ چائے تو آپ پئیں گے "

ٹیوک کے دو درختوں اور چند پھولدار جھاڑیوں سے ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی اس میں سے گزر کر گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ گلابی رنگ کے پھولوں اور ٹیوک کے سبز پتوں کے سامنے اس کی ٹوپی کا طاؤسی رنگ بھلا معلوم ہوتا تھا۔

"آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہو گی۔ چل کر پارلر کے اندر آرام کیجئے۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں ؟"

"پڑھتے تھے اب تو فارغ ہو چکے "

مسز ہیرڈ کومب نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا

پارلر کا فرش اینٹوں کا تھا اور اس پر چمکتی صاف کرسیاں اور صوفہ پڑا ہوا تھا۔ جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی۔ مگر اس پر میز پوش نہ تھا۔ کمرہ اس قدر صاف تھا کہ معلوم ہوتا تھا کبھی استعمال ہی نہیں ہوا۔ ایشرسٹ فوراً صوفے پر جا بیٹھا اور دکھتے ہوئے گھٹنے کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ مسز ہیرڈ کومب اسے بغور دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیمیا کا ایک سابق پروفیسر تھا۔ تاہم لوگوں کو اس لڑکے میں امیرانہ تکبر نظر آتا تھا گو ایشرسٹ کو اپنی عالی نگاہی کی وجہ سے اکثر ان کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوتا۔

"یہاں کوئی ندی ہے جہاں ہم نہا سکیں ؟"

"باغیچے کے ساتھ ایک ندی ہے۔ لیکن اس میں تو بیٹھ کر بھی سر تک پانی نہیں پہنچتا "

"کتنی گہری ہے ؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ فٹ "

"اوہ تو بہت ٹھیک ہے۔ ہے کس طرف کو ؟"

ہ پگ ڈنڈی کے ساتھ چلے جایئے۔ دائیں ہاتھ کو جو دوسرا پھاٹک آئے
گھاس میں گذر کر سامنے ایک بڑا سا سیب کا درخت ہے سب سے الگ
اس کے پاس ہی تالاب ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہو تو تالاب میں مچھلیاں
بھی ہیں۔"

"مسز ہیرو کو سب مسکرا دی اور بولی" جب آپ واپس آئیں گے تو چائے
تیار ہو گی۔"

ندی میں ایک جگہ ایک چٹان کا بند ہ لگا ہوا تھا جس سے پانی رک گیا تھا اور
ایک تالاب سا بن گیا تھا۔ جس کی تہہ نیلی تھی۔ وہ بڑا سا سیب کا درخت سب
درختوں سے نیچا تھا۔ اتنا نیچا کہ اس کی شاخیں ندی کے پانی پر جھکی پڑتی
تھیں۔ کونپلیں پھوٹ آئی ہیں۔ شگوفے کھلنے کو تھے اور قرمزی کلیاں چٹک رہی
تھیں۔ اس چھوٹے سے تالاب میں ایک ہی آدمی نہا سکتا تھا۔ چنانچہ ایشیرسٹ کنارے
پر منتظر کھڑا اپنے گھٹنے کو ملتا رہا اور اس مرغزار کا نظارہ کرتا رہا جس میں چٹانوں
کے درمیان تھارن کے درخت اور جنگلی پھول اُگ رہے تھے۔ پرے ایک
اونچے مگر ہموار ٹیلے پر بیچ کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ ہر شاخ ہوا میں جھوم رہی
تھی۔ بہار کا ہر پرندہ چہچہا رہا تھا۔ اور سورج کی ترچھی شعاعوں سے گھاس پر
دھوپ چھاؤں کی شطرنج سی بچھی تھی۔ اسے کئی چیزیں یاد آئیں کہ معلوم ہوتا
تھا کسی بات کا خیال نہیں۔ اور وہ بغیر کسی وجہ کے خوش تھا۔

(۲)

چائے دیر سے پی گئی۔ لیکن تھی پر تکلف۔ کھانے کو سا تھ انڈے۔
کریم۔ مربہ اور پتلے پتلے تازہ کیک تھے جن پر زعفران کے چھینٹے دیئے
ہوئے تھے۔ چائے کے دوران میں گارٹن کیلٹ قوم کے متعلق ایک طویل
تقریر کرتا رہا۔ ان دنوں ہر جگہ کیلٹوں کا چرچا تھا۔ گارٹن خود بھی کیلٹ تھا
اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کنبے میں بھی اسی قوم کا خون موجود ہے تو اس

قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پہ دراز تھا جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے تھے۔ ہاتھ کا بنایا ہوا سگریٹ اس کے خم دار ہونٹوں کے کنج میں جیسے لٹک رہا تھا۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی سرد مہر آنکھوں کو ایلشیر سٹ کی آنکھوں میں ڈالے اہلِ ویلز کی شائستگی کو سراہتا رہا۔ ویلز کو چھوڑ کر انگلستان میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے انسان چینی کے برتنوں کو چھوڑ کر مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے۔ فرنیک آخر پھر انگریز ہے اسے کیا معلوم اس ویلز کی رہنے والی لڑکی میں کس قدر شائستگی اور اس کی فطرت میں جذبات کی کس قدر گنجائش ہے! اپنے گیلے سیاہ بالوں کو ہلکے ہلکے اپنی انگلیوں سے پریشان کرتا رہا اور وضاحت سے یہ ثابت کیا کہ یہ لڑکی عین ان نظموں کے مطابق ہے جو ویلز کے کسی داستان گو شاعر نے بارہویں صدی میں لکھی تھیں۔

ایلشیر سٹ چت لیٹا گہرے رنگ کا ایک پائپ پی رہا تھا۔ تھا قد آور اس لیے ٹانگیں صوفے سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے گارٹن کی باتوں کو توجہ سے سُنا۔ جب لڑکی دوبارہ کیک لے کر اندر آئی تھی اس وقت سے اس کی شکل رجسٹر دیکھ لینا پھول یا قدرت کے کسی اور حسین منظر کی دید سے کم نہ تھا۔ آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ لڑکی نے عجیب انداز کے ساتھ ایک جھرجھری لے کر اپنی آنکھیں نیچے ڈال لی تھیں۔ اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

گارٹن نے کہا۔ چلو باورچی خانے میں چل کر اسے ایک نظر اور دیکھ لیں۔

باورچی خانہ کی دیواروں پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ چھت میں بڑے بڑے شہتیر لگے تھے جن میں بھنی ہوئی سؤر کی رانیں لٹک رہی تھیں۔ کھڑکی میں پھولوں کے گملے پڑے تھے۔ دیوار پر بندوقیں۔ چینی اور جست کے عجیب و غریب آبخورے اور ملکہ وکٹوریا کی تصویریں کیلوں سے آویزاں تھیں۔ بیچ میں معمولی لکڑی کی ایک لمبی تنگ سی میز بچھی تھی۔ جس پر پیالے اور چمچے رکھے تھے۔ اوپر چھت سے پیاز کی گٹھلیوں کی ایک لڑی لٹک رہی تھی۔ آتش دان کھلا گہرا تھا۔ جس کے ایک طرف دو چھوٹے لڑکے بڑی تمیز کے ساتھ خاموش بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف

ایک بھوری آنکھوں اور سرخ چہرے والا موٹا سا جوان آدمی بیٹھا گن کے چوپڑوں سے بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔ اس کی پلکوں اور سر کے بالوں کی رنگت بالکل ان چوہڑوں جیسی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک بڑے دیگچے میں اسٹو پک رہا تھا۔ جو خوشبو سے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا اور سامنے مسز نیرو کو سب کسی سوچ میں بیٹھی ہچکچا رہی تھی۔ دو اور نوجوان جن کی آنکھیں ترچھی اور بال سیاہ تھے اور جو چہروں سے ان دو چھوٹے لڑکوں کی طرح عیار معلوم ہوتے تھے۔ دیوار کے ساتھ سہارا لگائے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پست قد ادھیڑ عمر کا آدمی۔ داڑھی مونچھ منڈھی ہوئی کارڈرائی کی برجیس پہنے کھڑکی میں ایک پرانا سا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مسز میگن ہی کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور رپیپے میں سے سیب کی شراب کے جگ بھر بھر کر میز پر رکھتی جا رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ یہ لوگ کھانے پر بیٹھنے والے ہیں چنانچہ گارٹن بولا۔

"اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کھانے کے بعد آ جائیں"

اور جواب کا انتظار کئے بغیر دونوں پھر پارلر میں آ بیٹھے۔ لیکن باورچی خانہ کی اس رونق۔ اس گرماہٹ ان خوشبوؤں اور ان چہروں کے بعد یہ چیک دار کمرہ پہلے سے بھی زیادہ کچھ اجاڑ معلوم ہونے لگا۔ دونوں دوست پژمردہ ہو کر پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

"لڑکے شکل سے بالکل جپسی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ایک لڑکا سیکسن تھا۔ وہ جو بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ وہ لڑکی تو نفسیاتی نقطہ نظر سے دقیق مطالعہ کی چیز ہے"

ایشرسٹ کے ہونٹ پھڑک اٹھے گارٹن اسے اسوقت بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا دقیق مطالعہ کی چیز! کیا بکواس ہے۔ وہ لڑکی تو جنگل کا ایک پھول ہے۔ جسے دیکھنے سے دل کو ٹھنڈک سی ہوتی ہے۔ مطالعہ!

گارٹن بولا۔

"جذباتی لحاظ سے وہ لڑکی ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ صرف اس کے بیدار

ہونے کی کسر ہے۔"

"تو کیا جناب اسے بیدار کیجئے گا؟"

گارٹن اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا خم دار تبسم کہہ رہا تھا "کیا بد مذاقی کی بات ہے! بالکل انگریزوں کی سی!"

ایلنہرسٹ پائپ کے کش لگاتا رہا۔ "بیدار ہونے کی کسر ہے۔ اس بے وقوف گارٹن کو تو دیکھو۔ اپنے آپ کو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔" ایلنہرسٹ نے کھڑکی کھول دی اور جسم باہر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا ہو گیا تھا۔ گاڑی خانہ اور فارم کی عمارتیں دھندلی اور نیلی نیلی ... سیب کے درختوں کا باغیچہ غیر واضح نظر آ رہا تھا۔ ہوا میں ان لکڑیوں کے دھوئیں کی بو تھی جو باورچی خانے میں جل رہی تھیں۔ ایک پرندہ جو ابھی جاگ رہا تھا۔ بے دلی سے چہچہایا گویا اسے اندھیرے پر تعجب ہو رہا ہے۔ اصطبل سے ایک گھوڑے کی جو کھڑا دانہ کھا رہا تھا۔ شیروں اور جھولنے کی آواز آئی۔ سامنے جنگل تھا جو تاریکی میں دور دور تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اس سے پرے مجوب ستارے تھے جو ابھی پوری طرح عیاں نہ ہوئے تھے اور جن کی سفید شعاعوں نے گہرے نیلے آسمان کو چھلنی کر دیا تھا۔

ایک الو کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایلنہرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔ "ایسی رات میں باہر گھومنا پھرنا کتنا پُرلطف ہو گا!" تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر کھلے سموں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور تین ٹٹو اس اندھیرے میں دھندلے سیاہ سائے سے گزرتے ہوئے دکھائی دیئے جن کی کالی ایال اور گردنیں پھاٹک کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں جب اس نے پائپ کو ٹھونک کر خالی کیا اور اس میں سے شراروں کی ایک پھلجھڑی سی نکلی۔ تو جانور بدک کر بھاگ نکلے۔ ایک چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی ہلکی ہلکی چیپ چیپ کی آواز مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ ایلنہرسٹ نے اپنا بازو پھیلایا، ہتھیلی پر اوس پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یک لخت اسے اوپر کی منزل میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جوتے کھٹ کھٹ فرش پر گرے۔ اور پھر ایک نرم اور نازک آواز سنائی دی۔

لڑکی کی آواز —— جو بچوں کو بستر میں سلا رہی تھی —— تو الفاظ صاف اور واضح طور پر کان میں پڑے : "نہیں پلک میں بلی ساتھ نہ سلانے دوں گی" پھر ننھے بچوں کے قہقہوں کی آواز آئی کسی نے بلکے سے ان کے ایک تھپڑ مارا - اور پھر کوئی ہلکی آواز میں ایسی پیاری ہنسی ہنسا کہ اینرسٹ کانپ سا گیا پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پھونک ماری ہو - موم بتی جس کی روشنی تاریکی پر انگلیاں پھیر رہی تھی بجھ گئی اور خاموشی چھا گئی - اینرسٹ کھڑکی سے ہٹ آیا اور کمرے میں آکر بیٹھ گیا - اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا اور اس کی روح ملول تھی -

گارٹن نے کہا : "تمہیں باورچی خانہ میں جانا ہو تو جاؤ - میں سونے چلا ہوں"

(۳)

اینرسٹ ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا تھا - لیکن جب گارٹن سونے کے کمرے میں آیا تو گو اینرسٹ بظاہر گہری نیند میں تھا لیکن درحقیقت بالکل جاگ رہا تھا - کمرے کی چھت نیچی تھی - گارٹن بستر میں چت لیٹا تاریکی کے طلسم پر ناک بھوں چڑھا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا لیکن اینرسٹ کو الوؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی - اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا لیکن اس کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ تھی - دنیا کے تفکرات رات کے وقت اینرسٹ کے آرام میں کبھی خلل انداز نہ ہوتے تھے اور سچ پوچھو تو اسے زندگی میں کوئی فکر ہی نہ تھا - بیرسٹروں کی فہرست میں نام درج ہو چکا تھا - تصنیف و تالیف کا شوق تھا - دنیا اس کے سامنے کھلی پڑی تھی - والدین کی وفات کے بعد گھر کے علائق سے بھی پاک ہو چکا تھا - ذاتی آمدنی چار سو پونڈ سالانہ تھی - اب اس کی آزادی میں بھلا کیا حائل تھا ؛ جہاں چاہے جائے جو چاہے کرے - جب چاہے کرے - اس کا بستر سخت تھا - اس لیے اسے بخار نہ ہونے پایا - سرہانے کے پاس ایک کھڑکی کھلی تھی جس میں سے رات کی خوشبو کمرہ میں پھیل رہی تھی - اور اینرسٹ بستر میں لیٹا اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا گارٹن سے کھچا ہوا تھا - اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں - تین دن پیدل سفر میں جس شخص کا ساتھ رہا ہو اس سے کھچ جانا قدرتی امر ہے -

لیکن اس کے علاوہ اس کے باقی تمام خیالات شفقت آمیز تھے۔ بعض تصوّرات سے تو اس کے دل میں ہوکیں اٹھ رہی تھیں۔ بعض سے طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا تھا۔ اسے اس نوجوان کا چہرہ یاد آیا جو باورچی خانہ میں بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ جب دونوں دوست باورچی خانہ میں داخل ہوئے تھے تو اس نے یک لخت آنکھیں اٹھا کر پہلے ان دونوں کو اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کو جو اس وقت سیب کی شراب کا جگ اٹھائے جا رہی تھی ایک نظر دیکھا تھا۔ اس کی نظر میں نہ ذہانت پائی جاتی تھی نہ بے دلی۔ تاہم وہ ایسے آدمی کی نظر ضرور تھی جو دفعتاً چونک اٹھا ہو۔ اس وقت الیشرسٹ نے اس بات کا دھیان بھی نہ کیا تھا لیکن حیرت ہے کہ اس کا تصور نہایت واضح طور پر اس کے ذہن میں محفوظ تھا جس طرح اس لڑکی کا تروتازہ چہرہ اسے نہ بھولتا تھا۔ ویسے ہی اس نوجوان کا سُرخ چہرہ، نیلی آنکھیں، ہلکے رنگ کی پلکیں اور سَن کے سے بال بھی اس کی یاد سے محو نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے سامنے پردہ نہ تھا۔ اس کی بجائے تاریکی کی ایک مستطیل سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تاریکی میں سحر کی روشنی نمودار ہوئی۔ اور ایک نیم خوابیدہ کوسے کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بلیک برڈ نے جس کی آنکھیں ابھی پوری طرح کھلی نہ تھیں۔ اپنی خوش الحانی سے خاموشی کے طلسم کو برہم کر دیا۔ کھڑکی کے چوکٹے میں بڑھتی ہوئی روشنی کی مستطیل کو دیکھتے دیکھتے الیشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اس کا گھٹنا بہت سُوجا ہوا تھا۔ اس لیے پیدل سفر کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ گارٹن نے اگلے دن لندن پہنچنا تھا وہ دوپہر کے وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ہونٹوں پر طنز آمیز تبسم دیکھ کر الیشرسٹ بہت چڑا۔ لیکن جب وہ دوڑتا دوڑتا ڈھلوان سڑک کے موڑ تک پہونچ کر نظر سے اوجھل ہو گیا تو الیشرسٹ کا غصہ فوراً اتر گیا۔ ٹوکے درختوں کی محراب کے پاس گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ الیشرسٹ وہیں دن بھر ایک سبز رنگ کی چوکی پر بیٹھا رہا۔ سُورج کی شعاعیں خوشبودار پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں۔ اور پھولدار جھاڑیوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ الیشرسٹ ایک سرور کے عالم میں بیٹھا کبھی پائپ سُلگا لیتا کبھی منظر کا لطف

اٹھاتا اور کبھی کسی سوچ میں مصروف ہو جاتا۔

ایک فارم کے اندر بہار کے موسم میں بے شمار ہستیاں عالم وجود میں آتی ہیں۔ ننھی ننھی جانیں انڈوں اور کلیوں سے جنم لیتی ہیں۔ فارم کے لوگ اس عمل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور نوزائیدہ ہستیوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگ جاتے ہیں۔ الفرسٹ اس قدر چپ چاپ بیٹھا تھا کہ ایک مادہ ہنس اپنے بچوں کو جن کی گردنیں زرد اور پیلے بھورے رنگ کی تھیں۔ ساتھ لیے شکتی مٹکاتی قریب آ پہنچی اور بچے الفرسٹ کے پیروں کے پاس گھاس کے تنکوں پر اپنی ننھی ننھی چونچیں تیز کرنے لگے۔ کبھی کبھی مسز نیروکوب یا سگن آن کر پوچھاتی کہ کیوں صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں —— الفرسٹ مسکرا کر جواب دیتا۔ نہیں ٹھیک ہے اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ چائے کے وقت وہ دونوں سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی پلیٹس ایک پیالے میں ڈالے اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ سہمے ہوئے گھٹنے کو دیر تک غور سے دیکھتی رہیں اور پلیٹس اس پہ باندھ گئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو الفرسٹ کو لڑکی کا وہ نیچی آواز میں "اوئی" کہنا وہ ہمدردی کی نظروں سے دیکھنا۔ وہ ماتھے پہ ہلکی سی تیوری ڈالنا یاد آیا۔ اور جب اسے خیال آیا کہ گارڈن اس لڑکی کے متعلق کتنی فضول باتیں کرتا تھا تو ایک بار پھر گارڈن سے چڑ ہو گئی اس نے ذرا سوچ کہ [illegible] میں [illegible] کی کیا بات ہے جب لڑکی چائے لائی۔ تو الفرسٹ نے پوچھا۔

"لیکن یہ تو کہو میرا دوست بھی نہیں پسند آیا؟"

لیکن نے منہ سکیڑ لیا۔ گویا ڈرتی تھی کہ کہیں مسکرا دوں تو بدتمیزی نہ سمجھی جائے۔ پھر بولی۔

"بہت ہنسوڑ تھے وہ۔ ہم سب کو ہنساتے رہے۔ وہ بہت لائق معلوم ہوتے تھے۔"

"کیا ایسی بات کہی انہوں نے۔ جو تم سب کو ہنسا دیا؟"

"وہ مجھ سے کہتے تھے۔ تم ہارڈون کی بیٹی ہو۔ بارڈ کیا ہوتے ہیں؟"

"بارڈاں شاعروں کو کہتے ہیں جو آج سے کئی سو سال پہلے ویلز میں رہتے تھے!"

"تو بھلا میں ان کی بیٹی کیونکر ہوئی؟"

"میرے دوست کا مطلب یہ تھا کہ وہ تم جیسی ہی لڑکیوں کے متعلق گیت گایا کرتے تھے۔"

میگن نے اپنی بھنویں سکیڑ کر کہا: "انہیں مذاق سوجھا ہو گا کیا میں ولیسی لڑکی ہوں؟"

"میری بات پر یقین کرو گی؟"

"کیوں نہیں؟"

"میرے خیال میں وہ سچ کہتا تھا۔"

لڑکی مسکرا دی۔

ایشرسٹ نے دل میں کہا: "واقعی تم خوبصورت ہو۔"

"وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو کی شکل و صورت سے سیکسن معلوم ہوتا ہے اس کا کیا مطلب تھا؟"

"جو کون ہے؟ وہ جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور لال لال چہرہ ہے؟"

"ہاں وہ میرے خالو کا بھتیجا ہے؟"

"اچھا! تمہاری خالہ کا لڑکا نہیں؟"

"نہ۔"

"ان کا مطلب یہ تھا کہ جو کی شکل ان لوگوں سے ملتی جلتی ہے جو تقریباً چودہ سو سال پہلے انگلستان پر آ کر قابض ہو گئے تھے۔"

"اچھا ان کا حال تو میں جانتی ہوں۔ کیا جو واقعی سیکسن ہے؟"

"گارٹن کو ایسی باتوں کا جنون ہے لیکن جو کا چہرہ قدیم زمانے کے سیکسنوں سے کچھ کچھ ملتا ضرور ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

میگن کے اس آخری جملے سے ایشرسٹ کے دل میں گدگدی ہوئی مختصر سا جملہ تھا

لیکن اس میں کتنی سادگی اور خوش اسلوبی پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر بھی اس نے کس سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملادی تھی

"وہ کہتے تھے کہ باقی لڑکے تو سب نرے جپسی ہیں۔ یہ بھلا کیوں کہا؟ خالہ ہنس تو دیں لیکن یہ بات انہیں ناگوار ضرور گزری اور میری خالہ کے بیٹوں کو تو بہت غصہ آیا خالو تو کسان تھے۔ کہیں کسان بھی جپسی ہوتے ہیں؟ یوں لوگوں کا دل دکھانا بُری بات ہے۔"

ایشرسٹ کے دل میں آیا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھینچے۔ لیکن منہ سے صرف اتنا کہا۔ "میگن تم سچ کہتی ہو ـــــ اور ہاں کل رات تم ہی بچوں کو بستر میں سُلا رہی تھیں نا؟ مجھے پچھلی منزل میں آواز آرہی تھی۔"

میگن کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی "آپ چائے پیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے کہیں تو میں اور چائے لادوں۔"

"تمہیں کبھی اپنے کسی کام کو بھی فرصت ملتی ہے۔"

"واہ ملتی کیوں نہیں!"

"آخر میری بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے تو تمہیں فارغ کبھی نہیں دیکھا۔"

میگن نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔ جیسے دماغ میں کوئی بات ہے۔ جسے سلجھا نہیں سکتی۔ چہرہ اور بھی لال ہو گیا۔ جب وہ چلی گئی تو ایشرسٹ نے سوچا۔ کیا وہ سمجھتی تھی کہ میں اس سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں تو ایسے مذاق پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایشرسٹ کی وہ عمر تھی جس میں بعض لوگ حسن کو ایک پھول سمجھتے ہیں اور اس نظارے سے ان کے دل میں عورت کی توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایشرسٹ اپنے گرد و پیش سے اکثر غافل رہتا تھا۔ چنانچہ اسے یکایک کس دیر کے بعد ہوا کہ وہ نوجوان جس کے متعلق گارٹن نے کہا تھا کہ شکل سے جپسی معلوم ہوتا ہے اصطبل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے بادامی رنگ کی میلی سی برجیس کیچڑ سے بھرے ہوئے گیٹر اور نیلے رنگ کی قمیص میں وہ ایک رونق کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ بشرے پر ذہانت کے آثار۔ کسی اڑیل جانور کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ چہرہ اور بازو سُرخ تھے۔ سر پہ دھوپ

پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے بال کاتی ہوئی اون کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

جب اس نے دیکھا کہ الشیرسٹ میری طرف دیکھ رہا ہے تو احاطہ میں سے گزر کر باورچی خانہ کے دروازہ کی طرف چل دیا اور مکان کے کونے پر سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ نوجوان دیہاتی۔ دہقانوں کی طرح آہستہ آہستہ بار بار قدم نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے شرماتا ہے۔ الشیرسٹ پر اداسی سی پڑ گئی۔ اکھڑ لوگ! طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالیئے۔ ایسے لوگوں سے نباہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن اس لڑکی کو دیکھو۔ جوتے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھ۔ پھر بھی اس میں کتنی رعنائی ہے؟ شاید گارٹن ہی کا کہنا ٹھیک ہو۔ اور یہ سب کیلٹ خون کا اثر ہو۔ بہت ممکن ہے اس کی تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہو۔ لیکن وہ تو ہیرے کی مانند ہے اسے تو قسمت نے عجیب وا صیل پیدا کیا ہے۔

وہ داڑھی مونچھ منڈا ادھیڑ آدمی جسے کل رات باورچی خانہ میں دیکھا تھا۔ ایک کتے کو ساتھ لے کر احاطے میں داخل ہوا۔ گایوں کو دودھ دہنے لے جا رہا تھا۔ الشیرسٹ کو اب معلوم ہوا کہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔

"اچھے اچھے جانور لئے جا رہے ہو؟"

لنگڑے آدمی کا چہرہ چمک اٹھا اس کی نظریں اوپر کو اٹھی رہتی تھیں (مدتوں دکھ سہنے سے آنکھوں میں اکثر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔)

"وہاں بہت خوبصورت ہیں۔ دودھ بھی بہت دیتی ہیں؟"

"ان کی شکل سے ہی معلوم ہو رہا ہے؟"

"آپ کی ٹانگ تو پہلے سے بہتر ہے؟"

"ٹھیک ہو۔ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی ہے؟"

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا؟ اس دکھ کو میں خوب جانتا ہوں۔ صاحب گھٹنے کی تکلیف بہت بڑی تکلیف ہے۔ میرا گھٹنا دس سال سے خراب ہے؟

الشیرسٹ نے آواز سے ہمدردی کا اظہار کیا (ایسی ہمدردانہ آواز نکالنا مرفہ الحال

لوگوں کے لیے بہت سہل بات ہے۔"

سنگڑا آدمی پھر مسکرا دیا۔

"پھر بھی خدا کا شکر ہے ورنہ وہ تو ٹانگ ہی کاٹنے لگے تھے۔"

"اچھا؟"

"جی ہاں۔ اور پہلے تو بہت ہی بُرا حال تھا۔ میں تو اسے بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں۔"

"میرے گھٹنے پر تو دوا باندھ گئی ہیں جس سے بہت فائدہ ہے۔"

"ایک بُوٹی تھی جو لڑکی کہیں سے توڑ لائی تھی (پھولوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ لڑکی) بعض لوگ صاحب بوٹیوں کی خاصیتیں خوب سمجھتے ہیں۔ میری ماں تو اس بات میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اچھا صاحب خدا کرے آپ جلد اچھے ہو جائیں۔ گڈ آن۔"

الشیرسٹ مسکرا دیا "پھولوں سے واقف ہے اور وہ خود پھول سے کیا کم ہے؟"

شام کے کھانے پر بطخ کا ٹھنڈا گوشت۔ جنکٹ اور سیب کی شراب تھی۔ کھانا کھا چکا تو لڑکی کمرے میں آئی۔

"خالہ پوچھتی ہیں آپ ہمارے میٹھے کیک کا ایک ٹکڑا کھائیں گے؟"

"ہاں مگر باورچی خانہ میں بیٹھ کر۔"

"شوق سے ـــــ آپ کے دوست تو چلے گئے۔ اکیلے آپ کا دل تو گھبراتا ہوگا۔؟"

"ارے نہیں ـــــ لیکن یہ کہو میرا باورچی خانہ میں آنا کسی کو بُرا تو نہ لگے گا؟"

"واہ بُرا کیوں لگے گا ہمیں تو بلکہ بہت خوشی ہوگی۔"

الشیرسٹ کو اپنے گھٹنے کا خیال نہ رہا۔ یک لخت جو اٹھا تو لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے ایک سسکی بھری اور اپنے بازو سامنے پھیلا دیئے۔ الشیرسٹ ان چھوٹے

چھوٹے، کھردرے، سانولے ہاتھوں کو پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جی میں آیا ان ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا لے لیکن اپنے آپ کو روکا۔ لڑکی نے قریب آ کر کندھا آگے کر دیا۔ ایلفرسٹ اس کے سہارے چل کر دروازہ تک پہنچا۔ اسکے شانے پہ ہاتھ رکھنے سے جو لطف حاصل ہوا، عمر بھر کسی چیز کے مس سے نصیب نہ ہوا تھا۔ اتنی عقلمندی ضرور کی کہ چلتے چلتے اسٹینڈ میں سے اپنی چھڑی نکال لی اور باورچی خانے پہنچنے سے پہلے ہاتھ لڑکی کے کندھے سے ہٹا لیا۔

اس رات وہ ایسا غافل سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ صبح اٹھا۔ تو گھٹنے کا ورم بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ دوپہر تک اسی چمن میں بیٹھا شعر موزوں کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام نِک اور رِک تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ہفتے کا دن تھا۔ اس لیے وہ سکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا۔ ایک چھ سال کا شرمیلے مگر ذہین۔ رنگ بہت گورا نہ تھا۔ اور بالوں کی رنگت بھی سیاہ تھی ایلفرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے چنانچہ تھوڑی دیر میں دونوں پٹر پٹر باتیں کرنے لگے۔ سوائے مچھلیوں کے باقی جانوروں کے مارنے کے جتنے طریقے انہیں یاد تھے۔ چار بجے تک ایک ایک کر کے ایلفرسٹ کو سکھا دیئے پھر پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر بیٹ کے پل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں لیٹ گئے۔ گویا اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انہیں ضرور حاصل ہے لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھٹکی۔ ایلفرسٹ بیچ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پہ بیٹھا پرندوں کے گیت پہ کان لگائے انہیں دیکھتا رہا۔ آخر کار نِک مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"حبشی بڈا اس پتھر پہ بیٹھتا ہے۔"

"وہ کیا بلا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ کبھی اسے دیکھا نہیں مگر میگی کہتی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڈے جم کو ایک دفعہ پھر نظر آیا تھا جس دن آبا کے سر میں ٹٹو نے لات ماری ماں سے

پہلے رات کے وقت ہوا یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے۔"

"کون سا راگ بجاتا ہے وہ ؟"   "معلوم نہیں ۔"

"اس کی شکل کیسی ہے ؟"

"کالے رنگ کی، بڈھا جم کہتا ہے اس کے جسم پہ بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آجاتا ہے۔" پھر اپنی ترچھی   سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا "مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ میگن اس سے بہت ڈرتی ہے۔"

"میگن کو کبھی نظر آیا ہے ؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی ۔"

"واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی ؟"

"وہ آپ کے لیے دعا مانگتی ہے ۔"

"چل بدمعاش۔ بھلا تجھے کیسے معلوم ہے ؟"

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی۔ خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر الشیرسٹ پر بھی بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے خود لے سنا ہے ۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سننی چاہئیں تھیں وہ تم اوروں کو سنا رہے ہو۔"

لڑکا چپکا ہو گیا اور پھر بڑے فخر سے بولا۔

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اترتی ہوئی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے لہو اچھا لگتا ہے ۔"

"اچھا جناب کو لہو اچھا لگتا ہے ؟ جِن کہیں کا ؟"

"جن کیا ہوتا ہے ؟"

"جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو۔"

چھوٹے لڑکے نے ماتھے پہ تیوری ڈال کر کہا۔ "جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو

مرے ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بک۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"میں مینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔"

لیکن ایلشہرسٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "خدایا ہم سب پر فضل کر اور مسٹر ایلشہرسٹ پر بھی۔"

بک نے دیکھا کہ ابھی تو اچھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑتا ہوا سپرنڈی پر جا پہنچا جہاں سپرو دونوں نے مل کر ہنسنا اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی تو ایلشہرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ جپسی بتا کیا چیز ہے؟"

میگن نے چونک کر سر اٹھایا۔

"اس کا قدم بہت منحوس ہے۔"

"تم بھوت پریت کو مانتی ہو۔؟"

"اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے۔"

"نظر کیوں نہ آئے گا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڈھے جم نے یونہی کسی ٹٹو کو دیکھ لیا ہوگا۔"

"نہیں ان پہاڑوں میں بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے بھوت رہتے ہیں جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے۔"

"تو بہرحال جپسی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو جپسیوں کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے۔"

میگن نے صرف اتنا کہا۔ "سب منحوس ہیں۔"

"پر کیوں؟ اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی تو خرگوشوں کی طرح، جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل میں جو پھل اگتے ہیں۔ وہ منحوس ہوتے ہیں۔ یہ تھا ان کے درخت بھی تو سب خودرو ہیں۔ یہ تو منحوس نہیں اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو

جنگل میں جاکر اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ آؤں گا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کر آؤں گا۔"

"ایسے نہیں، نہیں!"

"میں ضرور جاؤں گا اور جاکر اسی چٹان پر بیٹھوں گا جہاں ہوا بیٹھتا ہے۔"

لڑکی نے اپنا ہاتھ جوڑ کر کہا:"خدا کے لیے!"

"پر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے؟"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ الفریسٹ پیار کے انداز میں بولا۔

"خیر میں جانوں نہ جانا ہی بہتر ہے۔ آخر اب یہاں سے بھی تو جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"

"جلد؟"

"تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دیں گی؟"

"ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرایہ پر دیدیتے ہیں۔"

الفریسٹ نے لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔

"تم چاہتی ہو میں ٹھہر جاؤں؟"

"ہاں۔"

"تو آج رات میں تمہارے لیے دُعا کروں گا۔"

الفریسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چین بھیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ الفریسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھی۔ اپنے آپ کو بُرا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ میں نے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ گارٹن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر!

(۴)

اگلے ہفتے الیشرسٹ کو یقین ہو گیا کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقہ کی خوب سیر کی۔ الیشرسٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ کیفیتیں آشکارا ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی بیج کے سُرخ و سفید شگوفوں کو جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دُھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی سکاٹچ فر کے تنوں اور ٹہنیوں کو جو تیز روشنی میں ملیا لے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشہ کے عالم میں بیٹھا دیکھتا رہتا یا پھر جنگل میں لارچ کے درختوں کا نظارہ کرتا جو ہوا کے زور سے سلامی ہو گئے تھے پچلے ٹہنے کالے کالے تھے اوپر کی ٹہنیوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جو ہوا کے جھونکوں سے پھڑک اٹھتیں تو درخت میں ایک زندگی سی آجاتی کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا اور بنفشے کے پھولوں۔ گچھوں کو دیکھتا رہتا یا گھورکے ہوئے بریکین میں کھڑا ڈیو بری کی گلابی گلابی تلیوں کو جن کے آر پار دکھائی دیتا تھا انگلیوں سے چھیڑتا رہتا کبھی تک جھپانے لگتے۔ کبھی سبز ہد ہد بولنے لگتے کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کرکے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں سبزہ و گل کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا جب میگن کھانا لے کر آتی اسے یا تو گھر کا کوئی کام کرنا ہوتا یا جانا ہوتا احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرتی ہوتی اس لیے ایک دو باتوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت الیشرسٹ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سلگا لیتا۔ لنگڑے جم یا مسز نیرد کو سب سے باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پرونا لیے بیٹھتی یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی چھلکتی ہوئی جھوری جھوری آنکھوں سے ٹکٹکی لگائے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب نخوت آمیز مسرت ہوتی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت الشیرسٹ باغیچے میں لیٹا بیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک عشقیہ نظم موزوں کر رہا تھا کہ اتنے میں پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی اور درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال گالوں والا دہقان بھاگتے نظر آئے۔ الشیرسٹ سے بیس گز کے فاصلے پر آ کر لڑکی ٹھہر گئی۔ تو جی آ پہنچا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے الشیرسٹ گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ لڑکا آگے بڑھتا گیا۔ لڑکی اسے پیچھے ہٹاتی رہی۔ لڑکی کے چہرہ پر طیش اور پریشانی تھی اور لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ الشیرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا دونوں نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ہٹتی ہٹتی ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ لڑکا گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور چھلانگ مار کر غائب ہو گیا۔

الشیرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حسن کی مورت ہونٹ کو دانتوں میں دبائے بالکل بت بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

الشیرسٹ نے کہا: "میں معافی مانگتا ہوں۔"

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے الشیرسٹ کو ایک نظر دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی۔ الشیرسٹ اس کے پیچھے گیا۔

"میگن"

لیکن وہ نہ رکی۔ آخر الشیرسٹ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو۔"

"آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں"
"اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی ؟"
"تم پر عاشق ہوگا اور کیا ؟"
لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر مارا۔
الشیرسٹ ہنس دیا "کہو میں اسے ڈانٹ دوں "
لڑکی یک لخت جذبہ سے بے قرار ہو کر رونے لگی۔
"آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں"
الشیرسٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی حتیٰ کہ اس کا چہرہ تمتایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے۔ الشیرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا دل میں سوچا کہ میں عورت کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ وہ الھڑ جو میرے مقابلہ میں کتنا حقیر ہے اور یہ احساس محض اتنی بات سے پیدا ہوا کہ اس کھردرے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ میگن اس وقت تک اپنا جسم چرائے کھڑی تھی۔ لیکن اب یک لخت تھر تھر کانپتی ہوئی الشیرسٹ کی طرف بڑھی۔ میٹھی میٹھی سی حرارت الشیرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی دوشیزہ کو میرے ہونٹوں کے مس سے خوشی ہوئی ہے۔ یک لخت بے تاب ہو کر باہیں اس کے گرد ڈال دیں اور سینے سے لپٹا کر اس کا منہ چوم لیا۔ پھر کچھ سہم گیا۔ میگن کا رنگ زرد تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رنگ رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔ بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے۔ اس کے سینے کے مس سے الشیرسٹ کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کر کہا "میگن" اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چہچہایا۔ پھر لڑکی نے الشیرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کائی دار تنوں میں غائب ہو گئی۔
الشیرسٹ ایک پرانے مڑے تڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے

ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور حواس پریشان تھے ان گلابی گلابی کلیوں کو جن میں سے ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی ان شگوفوں کو جنہوں نے میگن کے بالوں کے اردگرد پھولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا۔ حسن کے ہاتھوں شکست کھائی تھی، یا خدا جانے بہار کا جادو چل گیا تھا۔ بہرحال دل مست اور احساس فتح مندی سے لبریز تھا۔ ٹانگیں اور بازو چھلک سب تھے کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز ہے مگر کاہے کا آغاز؟ جھینگے اسے کاٹ رہے تھے۔ مچھر اڑ اڑ کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوا اور بلیک برڈ چہچہا رہے تھے۔ بلبل ہنس رہے تھے۔ قدرت کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں۔ سیب کے شگوفے کھلے ہوئے تھے اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیت میں پہلے سے زیادہ زندگی آگئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھلی جگہ اور کھلے آسمان کی ضرورت تھی جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کر لے۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جھاڑی میں سے ایک مگس پائی سے فاختہ کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ سکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش درجے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے زیادہ نرالا تھا یہاں دردی کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکمیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو ہاتھوں میں تھامے رہنا۔ جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مارے کانپتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔ ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ایک الجھن بھی ہے اس پھول کو آخر کرے کیا؟ دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ شفقت دل

سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا! لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے کس جذبے کے ساتھ اس نے میرے ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں خراجِ عشق ادا کیا جائے تو ان کی فطرت میں ایک کرختگی آجاتی ہے لیکن ان لوگوں میں سے تھا جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود سجدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا ہو جاتا ہے وہ عشق کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک علو پیدا ہو جاتا ہے۔

اخیر سٹ جنگل کے ٹیلوں کے پاس بیٹھا عجیب کشمکش میں گرفتار رہا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی۔ اس کے مزے لوٹنے کو بے قرار تھا۔ لیکن ڈرتا بھی تھا۔ یہ نہ معلوم تھا کہ کس چیز سے لیکن ملتا مزور رہتا دل سے کہتا ایسی خوبصورت لڑکی بھولا بھالا چہرہ چھلکتی ہوئی آنکھیں۔ اس کے دل پر فتح حاصل کر لینا۔ یہ کیا کچھ کم فخر کی بات ہے اب خدشہ کاہے کا ہے۔ لیکن پھر ایک معنوی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا یہ سب کچھ سہی۔ لیکن تم انجام سے پوری طرح واقف نہیں ہو سمجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں محو تھا کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شاہی ونشح کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ لومقست کی آواز نے کہا یہ تمہارے لیے نئی دُنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح چار بجے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند و پرند اسے گھور کر دیکھتے ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور بید کی جھاڑیوں کے بیچ سے راستہ ٹٹولتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ سڑک کی پگڈنڈی پر نکلا اور پھر مرغزار کے کنارے ہوتا ہوا خیمے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیا سلائی جلائی اور گھڑی کو دیکھا بارہ بجنے والے تھے! چھ گھنٹے پیشتر دن کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی اور پہاڑ سے چھپا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی اور کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے اور پھر اس نے یک لخت اپنے عشق رومانی کو بیرونی نقطہ نظر سے دیکھا۔ تصور میں اس کی آنکھ مست یعنی مسز نیرو کاب کی ترشروئی اس کو سانپ کی سی

مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھیں باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دیں جیسے رنگ ڈھنگوں کے شبہات اور ان کے ناشائستہ طعنے سنائی دیتے۔ اگربو کا چہرہ غصے سے لال نظر آیا۔ صرف ڈکو بھری آنکھوں والا جم ہی ایسا تھا جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا۔

گاؤں کے شراب خانہ میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ ہوں گی۔ بوڑھی عورتیں جنہیں اکثر سیر کے وقت سڑک پر چلتے دیکھا تھا کیا کیا باتیں نہ بنائیں گی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کہیں گے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت واقفکارانہ انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا۔ لمحے بھر کو اسے اس اسفل طعنہ زن دُنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گزارنے پر مجبور ہے جس پھاٹک کے سہارے کھڑا تھا اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی۔ اور ایک نور کی جھلک اس کے پاس سے گزر کر نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ ایشرسٹ نے مڑ کر دیکھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ چاند مٹی کے پشتہ پر دکھائی دے رہا تھا لیکن سُرخ اور قریباً گول۔ ایشرسٹ نے گھر کی طرف قدم اُٹھائے۔ پگڈنڈی پر رات اور گوبر اور نوخیلتہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے قوس دکھائی دیتے تھے جیسے آسمان سے ہلال ٹوکون کے بل آ گرے ہوں۔ گھر میں کہیں روشنی نظر نہ آئی۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک یو کے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ نہ معلوم میگی سو رہی ہے یا اس کی جدائی میں پریشان اور بےقرار کروٹیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تک رہا تھا کہ ایک اُلّو بولا۔

بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل و متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُلّو کی آواز جیسے تاریکی میں گونج اٹھی۔ دن کو کوئلوں کا چہچہانا۔ رات کو اُلّوؤں کا بولنا۔ ایشرسٹ کے دل کے ہنگاموں کا اس سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ دفعتاً میگن نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ایشرسٹ درختوں سے ہٹ کر آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا۔ "میگن"۔ میگن پیچھے ہٹی۔ غائب ہو گئی۔ پھر آئی باہر کو جھکی

ایئرسٹ اس گھاس کے قطعہ پر پنجوں کے بل آگے بڑھا۔ سبز کرسی سے ٹھوکر لگی۔ دم روک لیا۔ میگن کے چہرے اور پھیلے ہوئے بازوؤں میں جو غیر واضح نظر آ رہے تھے۔ کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایئرسٹ نے کرسی سرکا کر دیوار کے ساتھ لگا دی۔ اور چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازہ کی ایک بڑی سی چابی تھی۔ ایئرسٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت اندر سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے اور بال پریشان تھے۔ کپڑے اس نے ابھی نہ اتارے تھے۔ بے چاری ایئرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "خوبصورت میگن!" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایئرسٹ کی انگلیوں سے لپٹ گئیں۔ بشرے سے کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس کے چہرے تک ہاتھ پہنچ جانا بھی کتنی خوش نصیبی ہے! اتنے میں پھر ولا سوئٹ برائیڈ کی خوشبو ایئرسٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا بھونکا۔ میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن!"

"گڈ نائٹ جناب!" وہ چلی گئی۔ ایئرسٹ نے پھر سے نیچے اترا۔ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ چپ چاپ جا کر سو رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازوؤں میں [illegible] ہو رہے تھے۔ لیکن وہ غیر متبسم چہرہ جو اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا سو وہ گرم انگلیاں [illegible] یاد آ رہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں اور ایئرسٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

(۵)

[illegible] سو گیا تھا لیکن صبح اٹھا تو طبیعت میں [illegible] تھی۔ جیسے رات کو کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگزشت محض بدن چھینے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔

لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب سی دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آتا پورے جوبن پر تھا۔ راتوں رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھا گئے تھے اور کھڑکی میں سے باغیچہ سیب کے شگوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لباس بچھا دیا ہو۔ جب ایلفرسٹ نیچے اترا تو دل ڈرسا رہا تھا کہ میگن سے سامنا نہ ہو لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کے بجائے مسز نیرید کومب لے کر آئی تو ایلفرسٹ کو ناگوار گذرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز نیرید کومب کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنا تھی اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا؟

"اچھا مسٹر ایلفرسٹ۔ رات آپ کیا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟"

ایلفرسٹ نے سر ہلا دیا۔

"ہم نے تو آپ کے لیے کھانا رکھ چھوڑا تھا لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہو گا۔"

کیا وہ اپنے دیلز کے لہجے میں (جس کیم کی بولی بہت غالب آتی جا رہی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو ——— ! ایلفرسٹ نے اس وقت دل سے کہا "نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

لیکن ناشتہ کر چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش ہر لمحہ بڑھتی گئی۔ دل میں ڈرتا تھا کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہہ دی ہو جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے جو صبح سے اس نے شکل تک نہیں دکھائی وہ نشیلی نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی۔ اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ اسکو پھاڑ ڈالا اور اس کی بتیاں بنا بنا کر اس نے پائپ سلگایا۔ اس ہاتھ کو پکڑ لینے سے پہلے وہ عشق کے مزوں سے بے خبر تھا۔ اور اب تو کوئی بھی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ بے خبر ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا۔ وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی ایلفرسٹ

دروازہ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکیئے کو عین اس کی جگہ پر جہاں
ایشرسٹ کے سر رکھنے سے پچک گیا تھا، چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں یک لخت
مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا
ہے۔ اگر دبے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی تو اور بھی بُرا ہو گا۔
میگن نے تکیے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رُخسار کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی
پھر اسے نیچے رکھ دیا اور دروازہ کی طرف مڑی۔

"میگن"

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ
کے آر پار دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ کو ان جھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور
ان میں رقت انگیز وفا کی جھلک۔ ان کا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رُک رُک
کر بولا۔

"سارا دن تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"میں رات جنگل میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ اب میں
کتاب لینے اُوپر آیا تھا۔"

میگن کا وہ تکیہ کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔
قریب آیا اور اس کی آنکھیں چُوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے
کہا۔" اب بتاؤ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو دفعتہً۔ اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا۔
لیکن اب؟ اب کس منہ سے کہو گے کہ...... " لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے
الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کو سرکتے گئے اور آخر کار میگن کے ہونٹوں
سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساسِ عشق کے ساتھ چُھا ہو۔ لیکن
عشق جس میں کیف اور نشہ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی۔ اس سے
دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہو گا؟

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سے سیب کے درخت کے

پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو۔"

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

میگن کا رنگ فق تھا۔ الیشرسٹ نے کچھ اسے دیکھا۔ کچھ اس سارے واقعہ پر غور کیا۔ سہم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نچلی منزل میں اتر آیا۔ جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا۔ اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ کتاب لانا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس سبز کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے اور پیچھے فارم کے لوگ کام کاج میں مشغول تھے لیکن الیشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ ابتدا ابھی رہا تھا۔ پچھتا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر جو دیکھا تو دائیں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پہ ڈال دیتا کبھی اس ٹانگ پر۔ چہرے کا رنگ ڈوبتے سورج کی مانند تھا۔ نیلی قمیض کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور چمک پکے ہوئے آڑوؤں کی مانند تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں سن کی سی پلکیں نظریں الیشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ الیشرسٹ نے طنز سے پوچھا۔

"کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!"

الیشرسٹ پہلے ہی کون سا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کر بولا۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے لیکن تمہیں خدائی فوجدار بننے کو کس نے کہا۔"

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوانوں کے پسینے کی بو الیشرسٹ کے نتھنوں کو ناگوار گذری۔

"تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

"میری مرضی۔"

"چند یا کی استری ہو گئی تو مرضی ورضی سب بھول جائے گی۔"

"تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے؟"

جو نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہو گیا۔ جوان اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی غصے کے مارے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

"میگن تمہیں نہیں چاہتی۔"

اکھڑ۔ بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر الیئرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حقارت اور غصہ اور حسد سے آگ بگولا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ ایک لات اٹھا کر سی پیچھے کو دھکیل دی۔ اور بولا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری۔"

یہ الفاظ منہ سے نکالے تو سامنے میگن پر نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازہ میں کھڑی تھی۔ جلدی سے پاس آئی۔ اور بولی۔

"دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔"

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ سچ مچ قرمزی ہو رہا تھا!

الیئرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے چھیڑا۔

مینڈک کی مانند موٹا تازہ کتا بڑے مزے سے میگن کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں۔"

"جو آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہتا تھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگن کو تمہاری ضرورت نہیں۔"

لڑکی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک پجارن کی نظروں سے الیئرسٹ کو دیکھا۔ الیئرسٹ کانپ اٹھا۔ جیسے کسی پروانے کے پر جلتے دیکھ لئے ہوں۔

"نہیں !" سر جھکا کر کتے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تازے جسم سے چہرہ ڈھانپے اندر چلی گئی۔

ایلیٹ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مرغزار کے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی ملا۔ گائیں چرا رہا تھا۔ ایلیٹ بولا۔

"جم بڑا اچھا موسم ہے۔"

"گھاس کے لیے بہت اچھا ہے۔ اس لیے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہوں گے۔ مثل ہے کہ جب اوک کے درخت ایش سے پہلے۔"

ایلیٹ نے یونہی پوچھا۔ "جم جب تمہیں حبشی ہوا نظر آیا تھا تو تم کہاں کھڑے تھے؟"

"بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجیے۔"

"کیا واقعی کچھ تھا یا یونہی؟"

"اب تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا کہ کھڑا ہے۔"

"یہ ہوا آتا کیوں ہے؟"

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کسی کی برائی نہیں کرنی چاہیئے لیکن کہتے ہیں کہ مسٹر نیرو کو سب نسل کا حبشی تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ حبشی لوگ اپنی نسل کے آدمی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح خبر پہنچی ہوگی کہ مسٹر نیرو کو سب مرنے والا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھوت کو بھیج دیا کہ جاؤ تم پاس رہو ——— میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

"دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فٹ بال اٹھا رکھا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں بھوت پریت سب جھوٹ ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوئے تو میں نے اپنی آنکھ سے

دیکھے ہیں۔ خود چاہے مجھے بھوت نظر نہ آیا ہو۔"

"چاند نکلا ہوا تھا؟"

"کوئی بارہویں تیرہویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ان درختوں کے پیچھے سنہری دکھائی دے رہا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے بھوت منحوس ہوتے ہیں۔"

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکا دی۔ اوپر اٹھی ہوئی نظروں سے الیٹرسٹ کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔

"صاحب یہ خدا جانتا ہے۔ لیکن آخر بھوت یوں مارے مارے کیوں پھرتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ خدا کے ان بھیدوں کو ہم کیا جانیں۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے۔ بعض کو نہیں آتا۔ اب ہمارے جو کویا ہمارے لڑکوں کو لیجئے۔ سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن میگن کی نظر کیا مجال جو کبھی چوک جائے۔ جو ہوگا۔ دکھائی دے گا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔"

"وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے۔"

"یہ سچ ہے میگن کا دل بڑا نرم ہے۔"

الیٹرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "پائپ بھر لو۔"

"تھینک حضور۔ بس لاکھوں میں ایک لڑکی ہے یہ۔"

الیٹرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

"اس کا دل نرم ہے۔ بجا لیکن میں صحا کس فکر ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر اُدھر کھیتوں میں گھومتا پھرا لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹرکپ کے پھول اگ رہے تھے اور لال رنگ کے بچھڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے۔ لیکن

اوک کے درختوں پر جوڑے جوڑے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا۔ کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے بھرے جوبن پر تھا۔ ککو اور ہزار ہا پرندے چہچہا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے ...... باغ جنت میں ...... ایک بھڑ اس کی آستین پر آبیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں آستین پر آبیٹھیں۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سیب ان شگوفوں سے اُگیں گے۔ وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پر کون ایسا سنگدل ہوگا جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سُرخ رنگ کا ایک جوان سانڈ چر رہا تھا۔ الیشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آئی۔ لیکن سانڈ نے الیشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسیقی سے مست تھا۔ الیشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلیوبل اس کثرت سے اُگ رہے تھے کہ زمین پر ایک نیلی سی دُھند چھا گئی تھی۔ اور سیب کے کوئی بیس درخت شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ الیشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے درختوں اور بٹر کپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن یہاں مٹیالے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں تو جیسے آسمان کا حسن زمین پر اُتر آیا تھا۔ الیشرسٹ اس فرق کو دیکھ کر محو حیرت تھا۔ ککوؤں کا چہچہانا اور ندی کا شور البتہ ویسے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھیوں کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رُخ بدل لیا اور سیب کے درختوں کے سائے بلیوبل کے پھولوں پر پڑنے لگے۔ دیوانہ وار خیال آیا۔ آج صبح اسے چوما تھا آج رات سیب کے پیڑ کے نیچے ملاقات ہوگی۔ بن دیویاں ایسے ہی درختوں پر آرام کرتی ہیں اور سوکھے ہوئے برگین کی رنگت کے نکیلے کانوں والے دیوتا ان کے انتظار میں پڑے رہتے ہیں۔ ہوش میں آیا تو ککو چہچہا رہے تھے اور بہتے پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن سورج پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ ڈھلوان پر ایک خنکی سی آ

گئی تھی اور کہیں کہیں خرگوش باہر نکل آئے تھے۔ سوچا "آج رات" جس طرح ہر شے زمین سے ابھری آرہی تھی۔ اور ایک غیر مرئی ہاتھ کی نرم اور پُراسرار شائستگی سے اس کا حسن ہر لمحہ آشکار تر ہو رہا تھا۔ اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی بھی، جیسے تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سیب کے درخت کی بھی ایک ٹہنی توڑی۔ شگوفوں میں وہی میگن کا سا حسن صحرائی۔ وہی سیبی سا شہابی رنگ۔ وہی تازگی اور کھلے ہوئے پھولوں میں میگن کی سی سفید رنگت، وہی دل کو موم کر دینے والی دلفریبی جلوہ گر تھی۔ ٹہنی کو کوٹ میں لگایا۔ دل کے اندر جو بہار کھل رہی تھی۔ اس کا تمام تر جوش خرسندی کے ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا۔ لیکن خرگوش بدک کر بھاگ گئے۔

(۶)

اوڈیسے کی جلد آدھ گھنٹے سے ایشرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ کتاب بند کر دی اور احاطے میں سے ہو کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ پہاڑی کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک ایش کے درخت کی نیم برہنہ ٹہنیوں میں سے ایک نورانی پُرجلال محافظ فرشتہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ سیب کے پیڑوں کے نیچے ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے۔ ناہموار گھاس کو پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکار لینے کی سی آواز آئی تین بڑے بڑے سؤر ذرا چونکے اور ہل جل کر پھر ایک دوسرے کے پہلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہوا بند تھی لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور قہقہے دو چند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ (نہ معلوم کون سا) لگاتار پپ۔ پپ۔ پپ کر رہا تھا اور ایک نائٹ جار کے اڑنے اور ایک بار کے پلٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک دو قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر کے ارد گرد ایک دھند لی

سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ درختوں پر بے شمار کلیاں اور شگوفے جس کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رفیقوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پروانے یا فرشتے کہیں سے اڑ کر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک تر زمین کے درمیان آکر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس ہوشربا لمحے کے حسن سے مسحور ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچہ میں کیوں آیا تھا۔ وہ حسین لباس جس میں زمین دن بھر ملبوس رہی تھی۔ چاندنی اسے تبدیل نہ کر سکی۔ صرف اس کی وضع بدل ڈالی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ نرم سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ آگے نکل گیا اور بڑے سیب کے درخت

تک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گھیر اور بلندی میں قریباً دگنا۔ کھلے میدان اور ندی کی طرف جھکا ہوا صاف پہچانا جاتا تھا۔

گھنی ٹہنیوں کے نیچے پہونچ کر وہ رک گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ سوز دھیمی آواز میں ڈکرا رہے تھے اس کے مس سے تنے کی کھردری کائی دار سطح میں سے کوئلے کی مٹی کی سی خوشبو نکلی۔ کیا وہ آئے گی! کیا سچ مچ! تھرتھراتے ہوئے مسحور ماہتاب درختوں کے درمیان اس کے دل پر ہر طرح کی بدگمانی نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کی کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لیے ہے۔ الیشرسٹ اور اس دیہاتی لڑکی کے لیے نہیں۔ صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لیے بنا ہے اگر وہ نہ آئی تو کیا طبیعت کو ایک اطمینان ایک خلاص کا سا احساس نہ ہوگا؟ لیکن پھر بھی اس کے کان اس کی آہٹ سننے کے منتظر تھے وہ نہ معلوم پرند بدستور ہپ ہپ کر رہا تھا۔ ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا اور درخت کی ٹہنیوں میں محبوس چاندنی کو جھانک رہا تھا۔ آنکھ کے برابر جو شگوفے تھے وہ معلوم ہوتا تھا

ہر لمحہ زندہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا پُراسرار نقرئی حسن بھی الشیرسٹ کی بے تابی کا جزو بنا جا رہا تھا۔

اس نے ایک ٹہنی جس پر تین شگوفے کھل رہے تھے، توڑلی۔ پھل دار درختوں کے شگوفوں کو نرم، پاکیزہ، مقدس، نوخیز شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینک دینا کیا یہ گناہِ عظیم نہیں ؟ یک لخت پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی سوئر پھر جاگ اٹھے اور ڈکرانے لگے۔ الشیرسٹ درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔

میگن کو دیکھا تو حیرت سے دم روک لیا۔ اس کی خاموش رفتاری ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ الشیرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ الشیرسٹ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"میگن !" اور ہاتھ بڑھا دیئے وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آ لگی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو الشیرسٹ نے اپنے دل کو توقیر نسواں اور دونوں عشق سے لبریز پایا۔ چونکہ وہ اس دُنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی۔ معصوم تھی اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار تھی۔ عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو کیا کرے ؟ مگر چونکہ وہ سر تا حسن اور سادگی تھی اور زندہ شگوفوں کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول کرے اور اس کے دل کی بہار اور اپنے دل کی بہار دونوں کی تکمیل نہ کرے ؟ یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے سے لگایا اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ کتنی دیر دونوں یونہی خاموش وہاں کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ اُلّو بولتے رہے چاند چپکے چپکے بلند تر اور سفید تر ہوتا گیا۔ ان کے اردگرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں

کے وصل نے گفتگو کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتار کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرساتی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹتی ہوئی کونپلیں۔ ندیوں کی سبک پائی۔ ان کی خوش آہنگ اور والہانہ جستجو یہ تقریر و گفتار سے کہیں بڑھ کر نہیں اسی طرح بہار بعض اوقات دزدیدہ بھی ہو جاتی ہے اور ایک پراسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنی انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے بجز اس بوسے کے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب میگن کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے الیشرسٹ کے دل کو نشیلی مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت بخشے۔ عشق کا کہا کون موڑ سکتا ہے؟ لیکن جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوئے۔ تو دوئی فوراً حائل ہوئی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ مونہہ زور تھا۔ الیشرسٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"او میگن۔ تم کیوں آئیں؟"

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی۔ کچھ مجروح۔

"جناب آپ ہی نے بلایا تھا"

"میری جان مجھے جناب نہ کہو"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"فرینک"

"میں نہیں کہہ سکتی۔ ہرگز نہیں"

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"دل پر میرا بس نہیں۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں اور بس"

"بس؟"

دھیمی آواز میں جو مشکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا۔

"آپ کے پاس نہ رہ سکی تو میں مر جاؤں گی۔"

الیشر سٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

"تو آؤ پھر میرے پاس آ جاؤ۔"

"اوہ۔"

اس "اوہ" میں جو طمانیت اور مسرت تھی۔ اس سے الیشر سٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر کراؤں گا۔ اور میگن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤں گا۔"

"اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے۔"

الیشر سٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کل میں ٹورکی جاؤں گا اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لیے کپڑے خریدوں گا۔ ان کپڑوں میں لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہم چپکے سے لندن چلے جائیں گے اور وہاں پہنچ کر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تو شادی کر لیں گے۔"

میگن کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔

"نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اپنی دیوانگی سے خود مسحور ہو کر الیشر سٹ نے کہا۔

"نہیں بلکہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میگن تمہیں مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی؟"

"جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کبھی میرے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ آپ مجھے چاہیں گے!"

یکلخت گھٹنوں کے بل جھک کر الیشر سٹ کے پاؤں چومنے لگی۔

الیشر سٹ کانپ اٹھا۔ فوراً اس کو کھینچ لیا اور بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔

میگن نے کہا۔

"آپ مجھے چڑھنے کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے تمہارے پاؤں چڑھنے چاہئیں۔"

میگن کی مسکراہٹ سے اشیرسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چاند کی روشنی میں اشیرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ۔ ان میں سیب کے شگوفوں کا سا زندہ غیر ارضی حسن تھا۔

اور پھر یک لخت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دکھے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا۔ کسمسا کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑایا اور بولی۔

"وہ دیکھو۔"

اشیرسٹ کو روشن ندی۔ ہلکے سنہری رنگ کے چمکتے ہوئے بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"حبشی ہوا!"

"کہاں؟"

"وہ درختوں کے نیچے۔ پتھر کے پاس۔"

اشیرسٹ نے برافروختہ ہو کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں کی طرف چلا۔ چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں! چٹانوں اور تھارن کے درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا، اور سنتیں بھیجتا! ادھر اُدھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ واہیات: فضول! پھر سیب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ سوروں کے ڈکرانے اور پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی۔ صرف وہ پرانا سیب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی بانہیں تنے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ سخت تنا! کھردری کائی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ کہاں اس کا کھردرا پن۔ کہاں اس کا نرم رخسار! صرف خوشبو۔ جنگل کی خوشبو۔ کم و بیش ویسی تھی۔ اور اس کے ارد گرد شگوفے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن، دمکتے اور

سانس لیتے معلوم ہوتے تھے۔

(۷)

ٹورکی اسٹیشن پر ریل سے اتر کر الشیرسٹ نے سمندر کا رُخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ رُک رُک کر ٹہلتا رہا۔ کیونکہ وہ انگلستان کے ساحلی مقامات کی اس ملکہ یعنی ٹورکی سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اسے لباس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لئے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ۔ گرد آلود بوٹ اور پھٹی پُرانی ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے محض بے خبر کہ لوگ اس بات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس کا بینک لندن میں تھا لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو تو یہیں سے روپیہ نکلوا لے۔ جب بنک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار تصوّرات کو پہلا دھچکا لگا۔ انہوں نے پوچھا آپ ٹورکی میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ لندن تار بھیج دیجئے۔ وہاں سے جواب آئے گا تو ہم بڑی خوشی سے روپیہ ادا کریں گے۔ ٹھوس کاروباری دُنیا کے مشتبہ سانس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیج دیا۔

ڈاکخانے کے سامنے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دوکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو انوکھے پن کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبہ دہقانی کے لیے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دوکان کے اندر گیا۔ ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ماتھے پر خاصے تعجب کے آثار تھے۔

الشیرسٹ بغیر کچھ بولے اسے تکتا رہا۔

"کہیے جناب؟"

"مجھے ایک نوجوان خاتون کے لیے لباس خریدنا ہے۔"

نوجوان عورت مسکرادی۔ الشیرسٹ نے ماتھے پر تیوری ڈالی۔ یک لخت اور بشدّت زور سے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ فرمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا۔
"کس قسم کا لباس چاہیئے آپ کو؟ بہت وضعدار؟"
"نہیں سیدھا سادا"
"یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہے؟"
"معلوم نہیں۔ بس تم سے دو انچ چھوٹی ہوں گی"
"کمر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟"
میگن کی کمر!
"بس یہی جو عام طور پہ ہوتا ہے؟"
"بہت خوب!"

جب وہ چلی گئی تو ایشرسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور یک لخت اُسے خیال پیدا ہوا کہ میگن ـــــ اس کی میگن۔ سوائے کھردری پٹی کے سائے۔ کھردرے بلاؤز اور دیہاتی ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اسے با ہا دیکھا تھا کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پہ بہت سے کپڑے ڈالے واپس آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے طرحدار جسم سے لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا فاختی رنگ ایشرسٹ کو بہت پسند آیا۔ لیکن میگن کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کرسکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھالائی۔ لیکن ایشرسٹ کا دماغ سن ہوگیا تھا۔ کیا چُننے اور کیونکر چُنے؟ ٹوپی اور جوتا اور دستانوں کی بھی ضرورت ہوگی اور فرض کرو سب کچھ خرید کرلے پہنا دیا اور اس لباس نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا۔ جیسے اکثر کپڑے اکثر دیہاتیوں کو بنا دیتے ہیں۔ تو پھر کیا ہوگا؟ سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟

ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ بھی کمیل نہیں۔ غور وفکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ تاڑ گئی ہو اور مجھے ایک بدمعاش شخص سمجھتی ہو۔ آخر کار بولا "یہ فاختئی رنگ

کا لباس علیحدہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دوپہر کے بعد پھر آؤں گا۔"

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

"بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے موزوں لباس نہیں مل سکتا۔

الشیرسٹ نے کہا "غالباً نہیں" اور چل دیا۔

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے ایک بار پھر آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر تصورات میں مشغول ہو گیا۔ تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے: علی الصباح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اسٹیشن پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے۔ جس میں سوار ہو کر وہ اپنے ہنی مون کے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں اور پھر لندن نے انہیں نگل لیا ہے اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں۔

"فرینک الشیرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے۔"

الشیرسٹ کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور سنہرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کا آفتاب دل آفتاب فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشانی بخش رہا ہو۔

"ارے فل ہلی ڈے۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ روپیہ لینے آیا تھا۔ میں جنگل میں رہتا ہوں۔"

"لنچ کے لیے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ۔ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں انہیں خسرہ نکلا تھا۔"

ایک دوسرے کی بانہہ میں بانہہ ڈالے دونوں وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے۔ ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا تو آواز میں بھی بہجت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی کہہ رہا تھا کہ یہاں اجاڑ مقام میں تو سوائے نہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک ہلالی قطار کے سامنے آکر ٹھہر گئے جو سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

"میرے کمرے میں آکر منہ ہاتھ دھولو۔ لنچ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے۔"

الفیرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہاؤس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیضوں پر گزارہ کیا تھا۔ اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ——— کا ہے کا احساس؟ یہ اُسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

ہیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں لنچ کھانے گیا۔ تو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورا۔ آنکھیں نیلی۔ ہیلی ڈے نے کہا۔

"یہ فرینک الفیرسٹ ہے۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔" تینوں کے چہرے یک لخت اوپر اٹھے۔

وہ تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی۔ ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا۔ بال ہلکے رنگ کے۔ سُرخ و سپید رخسار جن کو سُورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھنویں سامنے سے نیچی۔ دائیں بائیں ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی ہیلی ڈے کی طرح بلند اور بشاش تھیں۔ تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔ الفیرسٹ پر ایک متجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں ہٹا لیں اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ڈانٹا اعصابی جو اس کی دلیاں معلوم ہوتی تھیں۔ فارم کی زندگی کے بعد ان کی شوخ، پرجوش، بے تکلف گفتگو۔ ان کا پرسکون منجھا ہوا بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو انوکھا اور پھر اس قدر مانوس معلوم

ہو اکہ مادم ہاؤس کا ماحول یک لخت کسی دُور دراز دُنیا کا خواب معلوم ہونے لگا۔ چھوٹی بہنوں کا نام سینیا اور فریڈا اور بڑی کا نام اسٹیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سینیا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلیں گے! بڑا لطف رہے گا۔"

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر ایشرسٹ نے کہا۔

"مجھے آج سہ پہر واپس جانا ہے۔"

"اچھا؟"

"جانا ملتوی نہیں کر سکتے؟"

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ ایشرسٹ اس کی طرف مڑا اور سر ہلا کر مسکرا دیا۔ کیا حسن تھا ــــ

سینیا نے افسوس کے لہجے میں کہا۔ "ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو۔" اس کے بعد پھر غاروں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"آپ بہت دور تیر سکتے ہیں۔"

"قریباً دو میل۔"

"سچ مچ۔"

"خوب۔"

"واقعی۔"

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دی تھیں۔ ایشرسٹ کو اپنی نئی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔

ہیلی ڈے نے کہا۔

"ایشرسٹ تمہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟"

"میں تو کہتا ہوں رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"

"ہاں ضرور۔"

لیکن ایشرسٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور پھر یک لخت ہی لڑکیاں اس کے

کمیوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑ اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں شامل تھا اور ایک میل کی دوڑ میں اول بھی آیا تھا۔ لنچ ختم ہونے تک اس نے ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتی وہ الشیرسٹ کو ساتھ لئے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سبیلا اور اس کا بھائی تھا ـــــ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔

سبیناؔ اور فریڈیاؔ نے جن کی سڈول پنڈلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں، تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر الشیرسٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ الشیرسٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دیئے۔ جس کے دل میں احساسِ حسن ہو۔ اسے وقت گذرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے نوجوان ڈائنا کنارے پر کھڑی تھیں اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکالتے تھے۔ اسے حیرت اور تعجب سے پکڑتی جاتی تھی۔

الشیرسٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا۔ جب گھڑی جیب سے نکالی تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بج چکے تھے۔ گویا بنک بند ہو گیا ہوگا۔ اور روپیہ آج نہ مل سکے گا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

"آہا ہا ـــــ اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی ہوگا"

الشیرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے میگن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ناشتہ کے وقت میگن سے دبی آواز میں کہا تھا۔

"میری جان میں سامان خریدنے ٹورکی جا رہا ہوں۔ آج شام واپس آ جاؤں گا۔ اگر موسم اچھا ہوا تو آج رات ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا" اسے یاد آیا کہ میگن تھرتھرا اٹھی تھی اور اس کی آواز کو سن کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ دل میں کیا کہے گی؟ پھر یک لخت احساس ہوا کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد ـــ گورا رنگ، ڈائنا کا ساحسن، تالاب پر

کھڑی متحیر نیلی آنکھوں سے اُسے بغور دیکھ رہی تھی۔ انہیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ انہیں کیا معلوم کہ آج رات کے لیے اس کے دل نے کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انہیں معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اُسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلی جائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی۔ کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر یک لخت بولا۔

"آہا ۔۔۔ تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیں گے۔؟"

یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ بیلی ڈے کہہ رہا تھا "لطف آ گیا۔ بس رات کے کپڑے میں تمہیں دے دوں گا" اس تمام خوش دلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن پھر بھی پشیمانی اور تمنا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا اُداسی کے لہجے میں بولا۔

"مجھے ایک بخار سا ہے"

تالاب کے کنارے سے اُکتا گئے تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ الینرسٹ نے مسز نیرو کو رب کے پتہ پر اس مضمون کا تار بھیجا۔

"افسوس ہے مجھے آج رات یہیں ٹھہرنا ہو گا۔ کل آ ؤں گا" اس سے دل کچھ ہلکا ہو گیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی سی گرمی جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پُر سکون اور نیلا نیلا تھا اور الینرسٹ تیراکی کا شوقین۔ خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا اور بیلی ڈے کے ہشاش چہرے کو دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا میگی کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے۔ بیلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور نکٹے روانہ ہوئے۔ بیلی ڈے اور الینرسٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کپڑے اتارے سب سے پہلے الینرسٹ پانی میں داخل ہوا اور اپنی زبانی اپنی جو تعریف ان کو سنا چکا تھا۔ اس کو سچ ثابت کرنے کے لیے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر بہت دُور نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو بیلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی میں اُچھل رہی تھیں اور ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ الینرسٹ

عام طور پر ایسے نظارے کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس کے مقابلہ میں اس کا اپنا کمال بہت نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ جب ان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا۔ میں ایک اجنبی ہوں میری شمولیت کہیں ان کو ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بدن دوشیزہ کے قریب جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سینا نے اسے خود بلایا اور کہنے لگی مجھے تیرنا سکھایئے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ سٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے (یا نہیں) موقع ہی نہ ملا یکلخت اسٹیلا چونک کر پکاری

الیشرسٹ نے دیکھا تو اسٹیلا مرمریں اور نازک بازو ... بازو پھیلائے جسم ذرا آگے کو جھکائے کمر کمر تک پانی میں کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر دھوپ کی وجہ سے چھینٹیں سی پڑ رہی تھیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔ "فل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو"

الیشرسٹ تاڑ گیا کہ فل خطرے میں ہے۔ وہ الیشرسٹ سے سو گز کے فاصلہ پر تھا اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یک لخت اس نے چیخ ماری۔ بازو اوپر کیے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن الیشرسٹ نے "واپس جاؤ اسٹیلا" کہہ کر اسے روک دیا۔ اور خود لپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ بیلی ڈسے دو سے زیادہ غوطہ نہ کھانے پایا تھا کہ الیشرسٹ نے اسے پکڑ لیا۔ جاڑے کی وجہ تشنج اعضا تھی۔ لیکن اسے بچانے میں اسے دقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ اس نے ذرا مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہونچے جہاں الیشرسٹ لڑکی کو روک گیا تھا۔ جب زمین پہ پاؤں لگے تو لڑکی بھی آ گئی۔ انہوں نے فل کو اٹھایا اور ساحل پر لے گئے۔ الیشرسٹ اور اسٹیلا اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہے۔ چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں بیلی ڈسے مسکرانے لگا۔ اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ الیشرسٹ سے بولا "ذرا سہارا دو تو میں کپڑے بدل لوں۔" الیشرسٹ سہارا دینے لگا تو سٹیلا کے تر۔ اشک آلود سرخ چہرے پر جس کا سکون برہم ہو چکا تھا۔ نظر پڑی تو سوچنے لگا۔ میں نے اسے اسٹیلا کہہ کر پکارا تھا۔ اس نے برا

تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے تو ہیلی ڈے نے نچی آواز میں کہا۔

"الیٹرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پی کر بیٹھ گئے۔ ہیلی ڈے کو لٹا دیا۔ مربہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی تو سبینا بولی۔

"آپ نے تو بہت بہادری دکھائی۔"

اور فریڈا بولی۔

"آپ کمال کے آدمی ہیں۔"

الیٹرسٹ نے دیکھا کہ اسٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور وہاں سے اس نے سبینا کو دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ آؤ خونی قسم کھائیں کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ کنکھیوں سے دیکھا کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چبھا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب نیولے نہ بنئے یہاں آئیے۔" چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں۔ میز پر وہ کاغذ پڑا تھا جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی۔ اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے۔ سٹیلا ہیلی ڈے، سبینا ہیلی ڈے فریڈا ہیلی ڈے کاغذ پر بہتے ہوئے لہو سے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر اُدھر پھیل رہی ہوں۔ سبینا بولی۔

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہوا ہے۔ اب تو ہم تمہیں پوجیں گی۔"

اور فریڈا بولی۔ "اسے ہاں واقعی!"

الیٹرسٹ کے لیے کوئی مفر نہ تھا۔ اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے لٹک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو

پرکسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو چھوڑ دیا اور وِنفریڈا بولی۔

"سیٹلا اب تمہاری باری ہے"

ایتھرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔ میز کے اس طرف اسٹیلا کا بھی یہی حال تھا۔ سبینا نے ایک طفلانہ قہقہہ لگایا اور وِنفریڈا پکاری۔

"اب چلو بھی نہیں تو سب مزا کرکرا ہو جائے گا"

ایتھرسٹ کے جسم میں ایک عجیب دعزیب محبوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"یکومت بہت شریر لڑکیاں ہو تم"

سبینا پھر ہنس دی۔

"اچھا تو سیٹلا اپنے ہاتھ چومے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک بھی اس طرف کو مڑی ہوئی ہے"

سیٹلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایتھرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگا لیا۔ چھوٹی لڑکیاں تالی بجانے لگیں وِنفریڈا بولی۔

"بس اب جب موقع آیا ہمیں آپ کی جان بچانی ہو گی۔ میں چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سیٹلا؟ لیکن ایسی ہلکی پانی سی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے مجھے دی تھی؟"

چائے کا دور پھر چلنے لگا۔ ایتھرسٹ نے وہ دستاویز تہہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ پھر خسرے پر، سنار بچوں پر، پیچھے سے شہد کھانے پر اور اسکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایتھرسٹ چپکا سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سیٹلا سے جس کے چہرے کی سفید رنگت پھر عود کر آئی تھی آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہد رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے ساتھ ان بشاش لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے ایتھرسٹ کے دل کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے آنکھیں

نہ بتا سکا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور ایشیرسٹ کھڑکی کے قریب جو نشست تھی اس پر بیٹھ کر سٹیلا سے باتیں کرتا رہا اور اسٹیلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا۔ کل وہ میگن کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہو گی۔ بجز اس کاغذ کے جوان بچوں کے خون سے رنگین تھا۔

بچے! اسٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں تیز تیز۔ قدرے خشک اور محجوب تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشیرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں۔ سٹیلا کے انداز میں ایک جنگلی۔ ایک دوشیزگی پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے کی محبوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ بیلی ڈے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا۔ اس لیے وہ کھانے پر نہ آیا۔ کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔

"میں تو آپ کو فرینک بلایا کروں گی۔"

اسفریڈا پکار اٹھی۔ "فرینک۔ فرینک۔ فرینکی۔"

ایشیرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔

"جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر ایشیرسٹ کہہ کر بلائے۔ اسے جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ مسٹر ایشیرسٹ کہنا کیا فضول معلوم ہوتا ہے۔"

ایشیرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔ جس کا رنگ حجاب سے سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرما رہی ہے۔ اللہ رے شرم۔"

ایشیرسٹ نے دائیں بائیں دونوں لڑکیوں کے سنہری بال پکڑ لئے۔ اور بولا۔

"دیکھو لڑکیو سٹیلا کو مت چھیڑو ورنہ میں تم دونوں کو باندھ دوں گا۔"

فریڈا بولی۔ "تم بہت وحشی ہو؟"

اور بیتیا نے ہنسا اور کر کہا "تم جاسے سٹیلا بلاتے ہو۔"
"تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے۔"
ایئرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دیئے۔ سٹیلا! اس گفتگو کے بعد وہ چلا۔ اسے کس نام سے پکارے گی؟ لیکن اس نے نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا تو ایئرسٹ نے عملاً کہا۔
"گڈ نائٹ سٹیلا۔"
"گڈ نائٹ مسٹر۔ گڈ نائٹ فرینک! آج تم نے بہت بہادری دکھائی۔"
"اس کا ذکر مت کرو۔"

سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا لیکن لمحہ بھر کو اس نے ایئرسٹ کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور پھر یک لخت اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

ایئرسٹ خالی کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف کل رات کا ذکر ہے کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگوفوں کے نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چمٹائے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھپیڑے سے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لیے کہ ———— اس نے اپنی گمراہی کو نہ دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لئے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیر باد کہنے والا تھا؟ لیکن پھر سوچا میرا ارادہ اس سے شادی کرنے کا ہے میں نے اسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرہ راستہ میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گزرا تو ہیلی ڈے اندر سے پکارا۔
"تم ہو! ایئرسٹ! اندر آجاؤ۔"
ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ منہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔
"بیٹھ جاؤ۔"

الشیرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس پہ بیٹھ گیا۔

بیلی ڈے یک لخت بول اٹھا "تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو گزشتہ زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن میرے حافظے میں ماضی کا بیشتر حصہ جوں کا توں مدفون رہا۔ شاید میں ابھی موت سے بہت دور تھا۔

"تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟"

بیلی ڈے پہلے تو کچھ نہ بولا اور پھر کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا جس سے میں ایک دفعہ قریباً —— اب میں کیا بتاؤں تم خود سمجھ لو۔ میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ بہر حال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ ورنہ اس وقت تاریک گہرے سمندر میں جو استراحت ہوتا۔ وہاں نہ بیٹھنے کو بستر ملتا اور نہ پینے کو تمباکو۔ کچھ بھی نہ ملتا۔ الشیرسٹ جب ہم مر جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟"

الشیرسٹ بولا۔

"ہم چراغوں شعلوں کی طرح بجھ جاتے ہیں"

"واللہ!"

"شاید بجھنے سے پہلے تھوڑا بہت ٹمٹماتے ہوں"

"یہ تو بہت عجیب خیال ہے۔ بہر حال —— میری بہنیں تو اچھی طرح پیش آئیں"

"بہت اچھی طرح"

بیلی ڈے نے اپنا پائپ ہٹا دیا۔ اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے ایک دوسرے پر رکھے اور کھڑکی کی طرف سر موڑ کر بولا۔

"بیچاری بھی نہیں"

بیلی ڈے بستر پہ دراز تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ الشیرسٹ نے اپنے دوست پر نظر ڈالی تو کپکپی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اگر

زندہ نہ ہوتا تو سمندر کی تہ میں پڑا ہوتا۔ چہرے پہ مسکراہٹ نہ ہوتی۔ اور یہ بشاشت ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی۔ شاید بیٹنا بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں دفن ہو جاتا اور حشر کے لیے (نہیں دن کا!) منتظر رہتا۔ دفعتہً الیئرسٹ کی مسکراہٹ عجیب و غریب چیز معلوم ہونے لگی۔ یہی زندگی کا تسلسل ہے۔ یہی سب کچھ ہے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہیئے۔ شمع بجھا دوں؟"

بیلی ڈے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ موت بہت بڑی چیز ہے گڈ نائٹ الیئرسٹ"

الیئرسٹ کا دل بھر آیا۔ بیلی ڈے کے ہاتھ کو دبا کر نچلی منزل میں آ گیا۔ ہال کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکانوں کی قطار کے سامنے جو چمن تھا۔ وہاں جا پہنچا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ تارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لائلک کے پھولوں کی رنگت کہیں کہیں ایسی پُراسرار دکھائی دیتی تھی۔ جیسی رات کے وقت اکثر پھولوں کی دکھائی دیتی ہے اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ الیئرسٹ نے اپنا رُخسار ایک ٹہنی پہ رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں تو ننگی سڑک کے بچے کو بینٹ سے چھپائے سامنے کھڑی دکھائی دی۔

"مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے ایک دفعہ ——— تقریباً ——— میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا" یک لخت سر کو لائلک کی شاخ سے ہٹا لیا۔ اور گھاس پر ٹہلنے لگا۔ دونوں سروں پہ دو لیمپ روشن تھے ان کی روشنی میں تصور لمحہ بھر کو پھر زندہ ہو گیا۔ الیئرسٹ اس کے ساتھ شگوفوں کی زندہ سانس لیتی ہوئی سفیدی کے نیچے کھڑا تھا۔ ندی ہنستی کھیلتی بہہ رہی تھی۔ چاندنی کی نیلاہٹ تالاب کے پانی پر چمک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ اور پیار بھری محبت اور عشق نیازمندی کی جھلک وہ آگ لگا دینے والے لبے۔ اس کا فرسلت کا وہ حسن اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آیا۔ لائلک کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں رات کے

وقت منزی کی آواز نہ تھی۔ یہاں سمندر کا شور تھا اور سمندر سرسرا رہا تھا اور آہیں بھر رہا تھا۔ کوئی ننھا پرندہ۔ کوئی اُلّو۔ کوئی نائٹ جار۔ یہاں بولتا نہ اڑتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آ رہی تھی۔ اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اور لائلک کی خوشبو سے فضا معمور تھی۔ کسی اونچی منزل میں ایک ہوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب احساسات نے شورش بپا کر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ بلویا جا رہا ہو۔ پیٹا جا رہا ہو۔ جیسے بہار اور عشق پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ رستہ ڈھونڈ رہے ہوں انہیں رستہ نہ ملتا ہو۔ یہ لڑکی جس نے اسے فرینک کہہ کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتہً کھینچ لیا تھا۔ یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے سرکش، خلاف شرع عشق کے حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف پیٹھ موڑ سے گوتم بدھ کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت آلتی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ گیا۔

کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور —— شاید —— پھر اسے پھینک دے؟ "کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں ایک دفعہ تم خود ہی سمجھ لو۔" دونوں ہتھیلیاں دائیں، بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں! ابھی گھاس میں کچھ گرمی باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی سمائی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا اپنے آپ سے پوچھا۔

"میں کیا کروں؟" شاید میگن کھڑکی کے پاس کھڑی شگوفوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے! بے چاری میگن! پھر خیال آیا "کیا ہرج ہے؟ میں تو اسے چاہتا ہوں! لیکن —— لیکن۔ مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس کو اس لیے چاہتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں!"

پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر کالے سمندر کو تکتا رہا۔ آخر اٹھا۔ اعضا جیسے جڑ گئے تھے اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی

تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر آ رہی تھی۔ جا کر سو رہا۔

(۸)

الیشیرسٹ گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آنکھ کھل گئی۔ پھر کرخت آواز میں پکارا۔

"اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے"

الیشیرسٹ یک لخت اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں ـــــ ہاں ہاں یاد آ گیا؟ باقی لوگ مربہ کھا رہے تھے۔ سٹیلا اور ہیناؔ کے درمیان ایک نشست خالی تھی الیشیرسٹ اس پر جا بیٹھا۔ ہیناؔ کچھ دیر غور سے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"ذرا جلدی کیجئے ساڑھے نو بجے یہاں سے چلنا ہے"

"الیشیرسٹ ہم پیری ہیڈکوارٹر جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی چلنا ہو گا"

الیشیرسٹ نے سوچا: "میں ان کے ساتھ جاؤں ناممکن! مجھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے" اس نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔

سٹیلا نے جلدی سے کہا۔

"ضرور چلیے"

اور ہیناؔ بولی۔

"آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا؟"

فریڈا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

"آپ چلتے نہیں تو میں آپ کے بال کھینچوں گی"

الیشیرسٹ نے سوچا "ایک دن اور سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کر لوں گا ایک دن اور!" اور پھر بولا۔

"اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میرے بال کھینچنے کی ضرورت نہیں"

"بہترا"

اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک اور تار بھیجنے کا ارادہ کیا۔ لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا

انہیں کیا بتائے کہ کہیں نہیں آ سکتا۔ بہرکیف سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گئے الشیرسٹ بینا اور مزنڈا کے بیچ میں چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے شیلا کے گھٹنوں سے جا لگے تھے۔ راستہ میں "اب جینکنز" کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا یہ تھا کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کروں گا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں جا گئے پھر سے (نہانے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے۔ کھیل کھیلتے رہے اور جس قدر سامان خورد و نوش ساتھ لائے تھے سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں الشیرسٹ کے کندھے سے لگ کر سو گئیں۔ الشیرسٹ کے گھٹنے شیلا کے گھٹنوں سے چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ تیس گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس طرح ملائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ شیلا سے شاعری کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ شیلا نے الشیرسٹ کو اور الشیرسٹ نے شیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعراء کے نام بتائے۔ یک لخت لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"فل کہتا ہے آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے فرینک!"

الشیرسٹ نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔"

لڑکی نے جلدی سے کہا۔

"میرا تو یہ عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا بھلا پھر فائدہ ہی کیا؟"

ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے الشیرسٹ نے جواب دیا۔

"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان ایمان بھی لے آئے۔"

"لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟"

یہ کہا اور نظر بھر کر الشیرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

الشیرسٹ اس کے جذبات کو مجروح تو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن برتری کی خواہش غالب آگئی۔ بولا۔

"جب تک انسان زندہ ہے اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا جز ہے۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے؟"

الشیرسٹ نے سوچا اب ضرور اسے صدمہ ہوگا۔ بولا۔

"یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا ہوں کیونکہ وہ بہت دلکش ہے اور اس کے الفاظ ہمیشہ سچے رہیں گے۔"

"لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جز نہیں مانتے؟"

الشیرسٹ نے سر ہلا دیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ الشیرسٹ کو یک لخت میگن کی دُعا یاد آئی "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر الشیرسٹ پر بھی" اور کون ایسا ہوگا جو اس لڑکی کی طرح یوں اس کے لیے دُعا مانگے۔ اس لڑکی کی طرح جو اس وقت ضرور منتظر ہوگی اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ دل نے کہا۔

"تم کس قدر ذلیل ہو۔"

یہ خیال بار بار اس کے دل میں اٹھتا رہا لیکن اس کی چبھن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اکثر یہی ہوتا ہے، حتیٰ کہ ذلیل بننا نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی اور تعجب کی بات ہے اس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا۔ ذلیل بات ہے یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے اور جب بچوں کے سونے کا وقت

آپہنچا اور وہ چلے گئے تو سٹیلا پیانو پر جا بیٹھی۔ ایلہرسٹ کھڑکی کے باہر اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں سے سٹیلا کو دیکھتا رہا (سر کے بال ہلکے رنگ کے ان کے نیچے وہ لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی!)

سٹیلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہیں تھی۔ لیکن بلا تکلف بجاتی تھی۔ ایلہرسٹ کو وہ ایک دلکش مورت معلوم ہو رہی تھی جس کے اردگرد ہلکے نیلے رنگ کا نور جھلملاتا تھا۔ گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں جیسا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا۔ کس کی جرأت ہے کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گذر ہونے دے۔ وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام "وارم" تھا؛ اس کے بعد ہیلڈے نے اپنی بانسری نکالی اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر انہوں نے ایلہرسٹ کا گانا سنا۔ اور سٹیلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی۔ "اغ گرول نخت" کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ چھوٹی لڑکیوں نے (جو نیلے رنگ کے ڈریسنگ گاؤں پہنے تھیں) دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد کھلبلی مچ گئی اور بقول سبینا کے "بڑا مزہ آیا۔"

اس رات کو ایلہرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے وہ بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ دو دن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر ربط پیدا ہو گیا تھا اور ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے دل پر اس قدر احاطہ کر لیا تھا کہ فارم اور میگن ——— خود میگن؛ خواب وخیال ہو گئی۔ کیا سچ مچ اس سے اظہار عشق کیا تھا؛ کیا سچ مچ اسے جگائے جانے کا اور اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟ نہیں نہیں وہ مسحور ہو گیا تھا۔ اس پر جادو چل گیا۔ بہار کا۔ رات کا۔ سیب کے شگوفوں کا! اس کو۔ اس کمسن بچی کو جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔ اپنی داشتہ بنانا۔ اس خیال کے آتے ہی ایلہرسٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل سے کہا "میں نے بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔"

شومان کی موسیقی اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی۔ اسے تصور میں سیلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ مرمری ہلکے رنگ کے بال۔ لچک دار گردن۔ مدوگر فرشتوں کا سا نور۔ اس نے سوچا۔ "میرے حواس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ بدنصیب سیگن!"

"خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر الشیرسٹ پر بھی!"

"میں صرف آپ کے پاس ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

اور اس نے چہرہ تکیئے میں ڈھانپ لیا۔ ہچکی بندھ چلی تھی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے اور بھی آفت!

جوان آدمی اگر اپنے دل کی   کی بھڑاس نکال لے تو اس کی بے چینی مٹ جاتی ہے۔ الشیرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔ جب نیند آنے لگی تھی تو سوچ رہا تھا۔ "آخر کیا ہوا ——— چند روز ——— مہینہ بھر میں بھول جائیں گے۔

اگلے دن صبح کے وقت اس نے بنک سے روپے وصول کیے۔ لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ اس فاختئی رنگ کے لباس کی بجائے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خرید لیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہے۔ دوران سے دل میں امنگیں اٹھ رہی ہیں۔ لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا۔ جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرما کر بولی۔

"فرنیک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

فیرر کی "سوانح یسوع" الشیرسٹ مسکرا دیا۔ سیلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکرمند ہے۔ اس پر کچھ ہنسی آئی۔ کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوئی کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم ان کے عقائد کی حمایت میں کچھ بولے۔ شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور ہیلی ڈے اپنے اپنے جال کی مرمت کر رہے تھے الشیرسٹ سیلا سے مخاطب ہوا۔

"مذہب انعام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ ملے گا۔

گویا انعام کے لیے ہمیں بھیک مانگنا سکھاتا ہے۔ یہ رجا درحقیقت ہم سے پیدا ہوتا ہے۔"

وہ صوفہ پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے پر گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یک لخت نگاہ دوڑائی۔

"نہیں اس کی وجہ اور ہے اور اس سے کہیں گہری ہے۔"

ایشرسٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی اور بولا۔

"کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عمیق ہے اور اس کی تہہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

سٹیلا نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔

"میں نہیں سمجھی۔"

ایشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا اور بولا۔

"ذرا غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لیے ہوں کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے۔"

"تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں۔؟"

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل! ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

"اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو۔"

جب گرہیں لگا رہے تھے تو اور راحت ملتی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کے درخشاں۔ پرسکون، خواہرانہ تصور کے انوار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا۔ جیسے اس طوکس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ اگلے دن وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر "ٹوٹنس" جانا چاہتے ہیں اور بیری پومرائے کاسل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ماضی کو

دل سے ٹھوکر دینے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ اس نے اسے فتح نہ کیا اور گھوڑوں کی طرف پیٹھ کر کے بیلی ڈے کے ساتھ لینڈو میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور اسٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ الشیرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا میگن —— خود میگن!——

پرلی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا۔ وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر الشیرسٹ نے یک لخت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھ میں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دیہاتیوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متامل تھے اور اس کی حالت رحم کی طالب۔ جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اور یہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے یا واپس پلٹ جائے اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آ گئی؟ بہانہ کیا بنایا ہوگا؟ یہ کس امید میں پھر رہی تھی۔ گاڑی کے پہیے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے دور ہوتا گیا۔ لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس سے کہہ رہا تھا کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جب گاڑی اسٹیشن کی طرف مڑی تو الشیرسٹ سے نہ رہا گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔

"میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤں گا۔ اور تمہیں کاسل میں آ ملوں گا۔" یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ بیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موڑ سے اسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ الشیرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن کے قریب تر اور بیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا ہو گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا۔ کیا فرق پڑ گیا؟ اس سے جو ملاقات ہو گی اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی

کراہت کو کیونکر کم کرے۔ اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہیلڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچ چکا ہے کہ میگی سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کرے گا۔ تکلیفیں سہے گا۔ پچھتائے گا اور پھر اکتا جائے گا۔ محض اس لیے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لیے کہ وہ سادہ لوح ہے۔ بھولی ہے۔ شبنم آلود ہے لیکن شبنم جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دُور سے پھیکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی۔ ہجوم میں نظر آ رہی تھی جس سے میگن کی متامل حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر کھڑکی پہ نگاہ ڈالتی تھی کہ کیا کسی مرد کو اس سے بھی زیادہ دُکھ کا لمحہ نصیب ہوا ہو گا؟ جو ارادہ کرتا تھا۔ دل اسی پہ ملامت کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا۔ درد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ جسے سن کر ایک راہ گیر ملازمہ مڑ کر اس کا منہ تکنے لگی۔ سامنے دیکھا تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سہارا لینے کو ٹھہر گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رُک گیا۔ شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس نظارے سے باز نہیں رہ سکتی۔ ایشرسٹ نے سوچا اس بے چاری نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل نہ جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔

چند ہفتوں کے عیش کی خاطر میں اس کی زندگی کے چیتھڑے اڑا دوں؟ یک لخت تصور میں سٹیلا کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے ملائم بال ہوا سے اس کے ماتھے پر نظر آئے۔ یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور احترام نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے گا۔ مڑ گیا اور جلد جلد اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی متفکر آنکھیں راہ چلتوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور پھر وہ سمندر کی طرف پلٹا۔ وہ ٹوپی اب نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ دھبہ سیر بینوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ سینے میں خلا سا محسوس ہوا (جب توقف و تامل کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے چھن جائے تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز

چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہیں دی۔ آدھ گھنٹہ تک وہ اس کی تلاش میں پھرتا رہا۔ اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ سٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔

حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پہ سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے آس پاس بے پروا ننھے بچے بیٹھے اور بالٹیاں لئے کھیلتے رہے۔ اس متلاشی سرگرداں لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا۔ لیکن یہ رحم بھی کم دبیش خون کی اس سرگرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا۔ جو بہار نے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے امان جذبہ باقی رہ گیا تھا۔ تو قیر نسواں کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں۔ اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرم جوشی کے لیے دل پھر بے قرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے اس رات کا پھر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لیے یوں مضطرب تھا۔ جیسے کوئی جنگل کا دیوتا کسی بن دیوی کے لیے مضطرب ہوتا ہے۔

اس ندی کا پر کیف شور۔ سٹرکپ کے پھولوں کی دمک۔ وہ پرانی تاریکی چٹانیں ککو اور سیٹل کی کوک اُلوؤں کا بولنا۔ سُرخ چاند کا مخملی تاریکی میں سے شگوفوں کی زندہ سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرہ کا نظر آنا دہ تھا وہاں پہنچ کر رہ جاتا تھا) اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سیب کے درخت تلے دو دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو محصور کر لیا۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔

یہ کیا ہے جو رحم کے جذبات اور ان بے قرار خواہشات کے ساتھ دست و گریباں ہے اور جس نے اسے مفلوج بنا کر گرم گرم ریت پہ لٹا رکھا ہے؟ تین ملائم بالوں والی لڑکیاں۔ ایک دلفریب چہرہ۔ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے۔ ایک نازک ہاتھ جو اس کے ہاتھ کو بھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے اس کا نام پکار کر

کہتی ہے" تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں ؟"

یہ کچھ اور اس کے علاوہ ایک عجیب فضا۔ جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ نیم انگریزی وضع کا جس میں جا بجا گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارن فلا اور گلاب کے پھول اور لونڈر اور لائنک کی خوشبو ہو، خنک اور دلفریب۔ انسانی مس سے غیر ملوث مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا نچوڑ، جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا یک لخت اسے خیال آیا "ممکن ہے وہ ادھر ہی کو آنکلے اور مجھے دیکھ پائے" اٹھ کھڑا ہوا ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی اس پر جا بیٹھا۔ سمندر کی چھینٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں۔ اس سے ہوش و حواس پھر بجا ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور وہاں جنگلوں میں اور چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی رومانی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہنا۔ قطعاً ناممکن ہے۔ اسے کسی بڑے شہر میں لے آنا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی تو قدرتی مناظر کا ایک جزو ہے۔ اسے شہر میں لاکر رکھا تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کر رہ جائے گا اور دونوں ہی میں غائب بھی ہو جائے گا۔

لندن میں اس کی سادگی اور اس کا گنوارپن اس قدر نمایاں ہوگا کہ اسے محض کھلونا سمجھ کر رکھنا پڑے گا۔ جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی مائل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا۔ ان خیالات میں محو تھا اور یہ سب باتیں اس پر روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میگن کا بازو اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیچے سرکا جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے۔ میگن کا چہرہ اوپر تک رہا ہے۔ اس کی کھوئی ہوئی نظروں میں ایک التجا ہے اور اس کے سیاہ بال بھیگے ہوئے ہیں۔ بس تصور نے دل میں پنجے گاڑ دیئے۔ ہر چند اسے دل سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ خیال اسے رہ رہ کر ستاتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں

جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل بہل جائے اور یہ بخار اتر جائے کپڑے اتار دیئے اور تیر کر دور نکل گیا۔ چاہتا تھا تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سُن ہو جائیں۔ اس لیے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعتہً بغیر کسی وجہ کے اسے خوف سا معلوم ہوا فرض کرو وہ واپس ساحل تک نہ جا سکا اور سمندر کی رَو اسے بہا کر لے گئی۔ یا ہیلی ڈے کی طرح اس کے پٹھے اینٹھ گئے۔ تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ سُرخ رنگ کی چٹانیں بہت دُور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑے گی۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائے گی۔ لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائے گا (فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے) فل ہیلی ڈے کے الفاظ اسے پھر یاد آئے۔

"کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں، شاید ——— بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے" مجنونانہ خوف کے اس لمحہ میں اس نے قسم کھائی کہ میں میگن کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے پہن لئے۔ اس کا دل زخمی تھا۔ لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا۔ جسم خنک اور ترو تازہ تھا۔

ایشیرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس ہیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا اور چائے پر خوب پیٹ بھر کر کھایا تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک بخار آیا تھا جو اب اتر چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی تھی۔ چائے۔ توس ان پر مکھن لگا ہوا۔ مربہ غرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔ تمباکو کی خوشبو آج تک اتنی اچھی معلوم نہ ہوئی تھی۔ خالی کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا رُک جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا۔ پھر سٹیلا کے سینے پرونے کی ٹوکری اٹھائی۔ تاگے کی گوٹوں اور خوش رنگ ریشم کی ایک لچھی کو مس کرتا رہا۔ ٹوکری میں ایک تھیلی تھی۔ جو کسی خوشبودار بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر سونگھا۔ پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا اور ایک انگلی سے مختلف سُر بجاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ کل پھر وہ بجائے گی۔ اور میں پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل

ہوتی تب۔ جو کتاب لسیلا نے اس کے پاس لاکر رکھ دی تھی۔ وہ وہیں پڑی تھی۔ اسے اٹھاکر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن میگن کی اداسی پھر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی میں سے جھک کر باغیچہ میں جو تھرتھر بول سے تھے۔ ان کو سنتا رہا۔ اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا جو درختوں کے نیچے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آتا تھا۔ ایک ملازمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھاکر لے گئی۔ لیکن وہ وہیں کا وہیں کھڑا شام کی ہواؤں کا لطف اٹھاتا رہا۔ اس کوشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے اندر داخل ہوتی ہوئی دکھائی دیں۔ سیلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ٹوکریاں اٹھائے چلی آرہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایشرسٹ اضطراراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سحر کو محسوس کر کے جھڑتا تھا۔ لیکن ان کی پُرسکون معصومیت اور سیلا کی دید سے مسرت اندوز ہونا چاہتا تھا۔

پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کہ سیلا اندر داخل ہوئی۔ لیکن کچھ کھوئی سی جیسے کوئی مایوسی ہوئی ہو۔ پھر ایشرسٹ پر نظر پڑی۔ مسکرادی۔ اس کا تبسم بجلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے ایشرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور رنج بھی ہوا۔

"فرینک تم نہ آسکے نا؟"

"ہاں آنا ہی نہ ہوسکا۔"

"دیکھو ہم کیسے بنفشے کے پھول چن کر لائے ہیں۔ اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔" سیلا نے پھول آگے بڑھا دیئے۔

ایشرسٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مبہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یک لخت مر بھی گئیں۔ میگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ اُوپر تک رہی تھی راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"وہ بہت خوبصورت ہیں" اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پہ جا گرا اور دونوں بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ قرعہ چھینک چکنے کے بعد۔ میگن کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ کم وبیش بیلی ڈے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ قسمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ اسے یہاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

سٹیلا کا کیا حق تھا کہ اس کا دلفریب محبوب حسن اسے یقین دلا دے کہ وہ میگن سے کبھی شادی نہیں کرے گا اور اس کے عشق کو مغموم ثابت کر کے اس کا دل تاسف اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگن بے چاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہو گی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہو گی کہ ایشرسٹ پہلے سے پہنچ گیا ہو گا۔

تاسف اور حسرت سے بے تاب ہو کر ایشرسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چُپ چُپ تھا۔ اس کی اداسی کو دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے سب کے سب تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت بے لطفی سے کٹا۔ کئی بار ایشرسٹ کی آنکھیں سٹیلا سے چار ہوئیں۔ وہ پریشان اور مجروح نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ بگڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

رات بھر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کے پاس پہنچا تو تنہائی کے عالم میں پُرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پسیجا۔ مغرور احمق سمجھتا ہے کہ میگن کو بہت ہی صدمہ ہو گا۔ ہفتے دو ہفتے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملے گا نیک لڑکا!

سٹیلا کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس ضبطِ نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک کرخت قہقہہ لگایا۔ لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کو شرم سی آنے لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا۔

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر تصویر بنا رہی تھی چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ کس قدر حسین ہے۔ جسم کو آگے جھکائے۔ مو قلم ہاتھ میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہے۔

بڑے ملائم لہجے میں بولا۔

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ حسبِ عادت جلد جلد بولی۔

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہو گی۔ لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے نا؟"

الیئرسٹ نے جواب دیا۔

"ان دوستوں میں ــــ تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت سریع اور درخشاں تبسم سے اس کے چمکتے دانت پھر دکھائی دیئے۔

تین دن کے بعد الیئرسٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا؟

اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی۔۔۔۔۔

یہی وہ واقعات تھے جن کی یاد اب الیئرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ کے دن گرلس کے بیچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو

رہی تھی۔ جہاں اب پنیچ پُن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہوگا۔ جہاں میگن اسے پہلی دفعہ آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس فارم اور باغیچے اور جیتی ہوئے والے مرغزار کو پھر جا دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سٹیلا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

بلندی پر وہ چیڑھ کے درختوں کا جھنڈا درعقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان اسے اچھی طرح یاد تھی! فارم کے دروازہ تک پہنچ کر رُک گیا۔ وہ پتھر کی نیچی عمارت۔ یو کے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل جُوں کے تُوں تھے وہ پُرانی سبز رنگ کی چوکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چائے لی تھی۔ پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سوّر بھی ادھر اُدھر پھر رہا تھا۔ کیا سچ مچ چھبیس سال گذر چکے ہیں یا محض کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری داڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دُنیا میں واپس آ گیا پھاٹک کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خار دار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنارے تک جا پہنچا۔ جہاں وہ پُرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا! ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے جبکہ میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ ایک درخت کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا اور اس کی خوشبو نے جو بیں سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اُوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے۔ ایک ککو کی کوک سنائی دے رہی تھی۔

دھوپ کھلی ہوئی تھی اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقامِ حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ ویران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا اور ان کے پاس وہی پتھر جہاں کبھے تھے جیسے ہوا آن کر بیٹھتا بت گم شدہ شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بے دردی سے اس کی شیریں بینیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے الیئرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر ملوث حسن سے بھری ہوئی دُنیا میں انسان اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ جو مسرت اسے حاصل ہوا سے دل سے جُدا نہ ہونے دے جسطرح یہ آسمان جُدا نہیں ہونے دیتے: لیکن انسان بے بس ہے!۔

ندی کے کنارے پہنچا تو اس چھوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا۔ شباب اور بہار کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے۔ پھر یک لخت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا پھر اس چوراہے پر جا پہنچا۔

موڑ کے پاس ایک کڑبڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شوفر سے باتیں کر رہا تھا۔ الیئرسٹ کو دیکھ کر وہ یک لخت رُک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

الیئرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کہہ رہا ہے "مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے؟"

بولا "یہ ایک قبر ہے"

"لیکن یہاں کیوں؟"

بڈھا مسکرا دیا۔

"یہ لمبی داستان ہے۔ میں اُسے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں۔"

الیشرسٹ نے تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ پائپ بھر لو۔ بڈھے نے اپنی ٹوپی کو چھُوا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی مٹی کا پائپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو جھریوں اور بالوں میں سے اُوپر کو تک رہی تھیں۔ ابھی چمک باقی تھی۔

"جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ دُکھ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

"اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھُول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تنہائی بھی نہیں یہاں اب تو جب سے یہ موٹروں کا جھمیلا شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گذرتے ہیں۔ پچھلے زمانہ کی اور بات تھی اب تو یہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس بیچاری نے خودکشی کر لی تھی۔"

الیشرسٹ نے کہا۔

"سمجھ گیا۔ جب ہی چوراہے میں دفن ہے۔ میرا خیال تھا۔ اب یہ دستور نہیں رہا۔"

"مگر یہ تو بڑے عرصہ کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کا پادری بڑا خدا ترس تھا۔ اگلے میکس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائیں گے اور جب یہ واقعہ ہوا۔ اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مسز نیرو کومب کے ہاں کام کیا کرتا تھا۔ اب وہ فارم نک نیرو کومب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کر دیتا ہوں۔"

الیشرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پائپ سُلگا رہا تھا۔ دیاسلائی بجھ گئی۔ لیکن الیشرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا۔

"اچھا؟" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! جب میں گذرتا ہوں یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی گو انہوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا بلکہ یہیں دفنایا جہاں وہ خود چاہتی تھی۔"

بڈھا مزدور ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا مڑا تڑا ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر بلیوبل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا۔"

بوڑھے نے کہا۔

"بس یوں سمجھئے کہ کسی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کسی سے عشق تھا۔"

قبر پر ہاتھ پھیر! مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ایشرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی ڈاڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھڑک رہے تھے۔ کہا۔

"اچھا؟"

"یہ موسم بہار کا واقعہ ہے۔ بس یہی موسم تھا جو اب ہے یا غالباً چند دن بعد ہو گا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ فارم میں ایک کالج کا لڑکا آکر ٹھہرا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنا ذرا کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے کہ اسے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔"

بڈھے نے پائپ منہ سے ہٹایا، زمین پر تھوکا۔ پھر بولا۔

"بات یہ ہوئی کہ یہ لڑکا ایکا ایکی یہاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھیلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک فارم میں پڑی ہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ اس

نے اپنی چیزیں منگوا کیوں نہ لیں۔ ایلنیشریا ایسا ہی کچھ نام تھا اس لڑکے کا۔"

ایلفیرسٹ نے پھر کہا:"اچھا!"

بڈھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے اس لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے حواس بجا نہ ہوں۔ وہ تو کچھ دیوانی سی ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ فارم میں ایک اور لڑکا تھا۔ جو نامی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ میں جانوں لڑکی اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اسکی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات میں شام کے وقت بچھڑوں کو لے کر آتا تو وہ لڑکی باغیچے میں بڑے سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوئی اور بالکل سامنے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڈھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایلفیرسٹ نے کہا:"اچھا!"

"ایک دن مجھے یاد ہے میں نے اس سے کہا کہ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اس کی خالہ بڈھی مسز نیروکس سب دونوں ویلز سے آئی تھیں) میں نے کہا۔ تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔"

کہنے لگی نہیں جم کسی چیز کا دکھ نہیں۔

میں نے کہا:"دکھ کیسے نہیں۔"

تب اور ضرور ہے۔ کہنے لگی نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے۔ میں نے کہا تو پھر تم روتی کیوں ہو؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائے گا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے اس سیب کے درخت تلے دفن کیجو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا تمہیں کچھ ضرور ہونے لگا ہے۔ پگلوں کی سی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ وہ بولی نہیں میں پگلوں کی سی باتیں نہ کروں گی۔ میں نے دل میں سوچا لڑکیوں

کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ چنانچہ اس بات کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ لیکن دودن کے بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بچھڑوں کو لئے آرہا تھا کہ میں نے ندی میں سیب کے درخت کے پاس کالی سی چیز پڑی دیکھی۔ میں سمجھا سؤر ہے۔ پھر خیال آیا یہ بھی کوئی سؤر کے لیٹنے کی جگہ ہے قریب پہنچا تب معلوم ہوا کہ کیا ہے؟

بڈھا رُک گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو تک رہی تھیں۔ نظر میں چمک تھی اور دُکھ بھرا تھا۔

"ندی میں ایک چٹان ہے اس میں رُک کر پانی کا ایک تالاب بن گیا ہے وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر میں نے اس لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اوندھی پڑی تھی اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے شگاف میں سے سنہری پھولوں کا ایک پوداگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح پرسکون اور خولبصورت تھا جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ اتنے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے اور سچ پوچھئے تو اس کے چہرے سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار و قطار رو دیا وہ کتنی خولبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جون کا مہینہ تھا لیکن اسے سیب کے شگوفے کی ایک آدھ ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی۔ اسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اسے شادی مرگ ہوئی تھی ورنہ اس بناؤ سنگھار سے کیوں مرتی۔ اور پھر پانی بھی فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ تو میں آپ سے کیسے کہدوں کہ یہ جنگل جادو ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے اسے بھی معلوم تھا اور کوئی کہے کہ جادو نہیں۔ تو میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ سیب کے درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سنکر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور خودکشی کی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے یہاں دفنا دیا۔ ہمارے پادری کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا"

بڈھے نے پھر ٹھیری پر ہاتھ پھیرا اور پھر رُک رُک کر بولا۔

"لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

داد لینے کے لیے اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ لیکن ایفرسٹ وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں پیچ چن رکھا تھا۔ اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا لیٹ گیا تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا؟ یہ عشق کی دیوی سائپرین کا انتقام؟ اس کی پُرنم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بھیگے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے اور اس نے دل سے پوچھا۔

"میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز، گل ریز، مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور میگن دونوں کے دل میں کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جان لینا مطلوب تھا؟ تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے اور ہپالٹس"۔ کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے۔
اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے۔
تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لا سکتا۔
وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موج اور آب جو میں
شباب اور خود سری سے مست ہے۔
ہر وہ شے جو سینہ زمین سے پھوٹتی ہے۔
یا سورج کی شہابی شعاعوں میں سانس لیتی ہے۔
ہاں یہ سب کچھ ہر مرد اور ہر عورت
سب کے اوپر اے سائپرین، اے سائپرین حکومت کرتی ہے۔
صرف تو۔۔۔

یونانی پچ کہتا ہے۔ بیگن! حسرت زدہ بیگن! پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی! بیگن چاند سیب کے درخت کے نیچے راہ تکتی ہوئی! بے جان۔ مردہ بیگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے!

ایک آواز کانوں میں پڑی۔

"وہاں ہو تم۔ ہاں آؤ دیکھو"

البیرسٹ اٹھا۔ بیوی نے جو تصویر کھینچی تھی اسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"فرنیک اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟"

"ہاں"

"لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ بتانا؟"

البیرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا "کمی؟ سیب کا درخت۔ موسیقی اور سنہری پھول!"

(کاروان)

تنقیدی مضامین

فہرست

انگلستان کا جدید تھیٹر

چونکہ مجھے تھیٹر اور اس کے فن سے خاص دلچسپی ہے اس لیے سفر یورپ کے دوران میں، میں نے اپنی فرصت کا بیشتر حصہ اس کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس سے میرا مقصد صرف اپنی پیاس بجھانا تھا۔ یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ ہندوستان واپس آ کر اس کے متعلق کوئی تبلیغ کروں گا، یا کسی رسالے یا اخبار میں کوئی سلسلۂ مضامین شروع کروں گا۔ میرے احباب میں سے سید امتیاز علی تاج کا تجربہ ہندوستانی ناٹک کے متعلق بہت وسیع ہے اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق بھی ان کی معلومات کا ذخیرہ حیرت انگیز ہے وہ اور میں اپنے پرانے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر گرودت سوندھی کے زیر قیادت ایک کلب بنا کر برسوں سے ناٹک کے شوق کو پورا کر رہے ہیں چنانچہ اس موضوع پر کل بے کا ہے امتیاز صاحب کو خط لکھتا رہا، اور واپسی پر بھی انہیں سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ باقی رہے پروفیسر سوندھی سو میرا انہیں کچھ بتانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ان حالات میں ہرگز اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کوئی مضمون لکھتا اور حق تو یہ ہے کہ اگر امتیاز صاحب کی یہ رائے نہ ہوتی کہ میرے بعض بعض مشاہدات قارئین نیرنگِ خیال کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں یہ تو مضمون کبھی ظہور میں نہ آتا۔

ایک تو ہندوستان کا تھیٹر یورپ کے مقابلے میں اس قدر حقیر ہے کہ یورپ کے تھیٹر کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا بے معنی بات ہے اور ایک ہندوستانی رسالے میں اس کا کما حقہٗ بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ دوسرے موضوع اس قدر وسیع ہے کہ میں کسی طرح بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، لہٰذا اگر آپ اس تحریر سے کسی طرح بھی مستفید یا لطف اندوز نہ ہوں تو کم از کم میرے اس تامل کے شاہد تو ضرور رہیں جس کا اظہار میں شروع ہی میں کر رہا ہوں۔

اس وقت میں صرف ایک تھیٹر کا ذکر کروں گا جس کا نام فیسٹیول تھیٹر (FESTIVAL THEATRE) ہے اور جو کیمبرج (انگلستان) ہی میں ہے۔ خوبیٔ قسمت سے اس تھیٹر کا افتتاح عین اس وقت ہوا جب میں کیمبرج پہنچا۔ لیکن اس کے لیے اسکیمیں مدت سے تیار ہو رہی تھیں اور اس کے شروع ہونے سے پہلے جو جو بیانات وقتاً فوقتاً اس کے متعلق اخباروں میں شائع ہوتے رہے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم انگلستان میں اس تھیٹر کی نظیر نہ ہوگی مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں نے لندن سے کیمبرج کا سفر کیا تو سفر کے دوران میں ٹائمز کے کالموں میں اس تھیٹر کے آئندہ پروگرام کا حال بہت انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ یونیورسٹی کے کھلتے ہی پہلا کھیل دکھایا گیا۔ اور اس دن سے لے کر آج تک میں نے سب کھیل دیکھے ہیں اور آج کل جہاں یورپ کی اور باتیں یاد آ رہی ہیں۔ وہاں فیسٹیول تھیٹر کا فراق کچھ کم افسوسناک نہیں۔

شروع ہی میں اس تھیٹر کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے گئے تھے۔

"فیسٹیول تھیٹر کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ
ہر ملک اور ہر زمانے کے عظیم الشان ڈرامے
سٹیج پر پیش کرے۔ اور اس بات کا مطلق
خیال نہ رکھے کہ لوگوں کو کس چیز کی عادت
پڑی ہوئی ہے یا اور لوگ جو محض کتابوں
ہی کے کیڑے ہیں اور جو ڈراموں کا بحیثیت
تصانیف کے مطالعہ کرتے ہیں اور ناٹک
کے فن کے نقطۂ نظر سے ان پر غور نہیں
کرتے۔ ان کے دماغ میں ڈراموں کا تصور
کیا ہے۔ دنیا کے سب سے دلچسپ ڈرامے
یہاں دکھلائے جائیں گے موجودہ زمانے
میں جو تھیٹر محض تجارتی اغراض کے لیے کھلے
ہوئے ہیں ان میں اعلیٰ ڈرامے کے فن کو

تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ ان تھیٹروں کا
انصرام ایسی نفع اندوز کمپنیوں کے ہاتھ میں
ہے جن کے نزدیک ڈرامے کا فن کچھ معنی
نہیں رکھتا اور وہ لوگ جو اس فن کے
دل دادہ ہیں اور فی الواقع اس فن کے
اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے پبلک کے سامنے
پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کرنے سے
قاصر ہیں کیونکہ عام تھیٹروں میں عمارت
کی ساخت اور سٹیج کا سامان پچھلی صدی
سے چلا آتا ہے اور جدید ترین طرزِ ادا
کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو یہ کہ عام تجارتی تھیٹر اصل فن سے محض بے خبر ہے اور صرف عامۃ الناس کی اسفل خواہشات کو پورا کرنا ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے کیونکہ روپیہ کمانے کا یہی ایک ڈھنگ ہے دوسری بات یہ کہ تھیٹروں کا طرزِ تعمیر اور سٹیج کی مشینری وغیرہ خود انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی فرسودہ اور بے کار ہے یہ دونوں باتیں بہت حد تک تفصیل طلب ہیں لیکن مضمون کو اس قدر طول دینا کہ ہر تفصیل سلجھ جائے میری طاقت اور تنگیٔ خیال کی ضخامت سے افزوں ہے۔ انگلستان کے عام تھیٹروں میں سے ہر ایک ہی کھیل ہر رات، مہینوں بلکہ بسا اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے دیکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے اس لیے ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کھیل بہت ہی مقبول ہو تو سال ڈیڑھ سال تک آمدنی کا ذریعہ بنا رہتا ہے۔ اور کوئی بڑا کھیل فیل ہونے پر آ گئے تو دوسرے ہی دن فیل ہو جائے جب ایک کھیل ختم ہو جائے تو پھر دوسرا کھیل تیار کیا جاتا ہے اور وہ بھی اسی طرح اپنی مقبولیت کی حد تک دکھایا جاتا ہے برخلاف اس کے نیشنل تھیٹر میں ہر ایک کھیل صرف ہفتہ بھر تک ہوتا رہتا ہے جب یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوں تو تھیٹر بھی بند ہو

جاتا ہے حق تو یہ ہے کہ یہ تھیٹر یونیورسٹی ہی کے سر پر قائم ہے کیونکہ یہاں کھیلوں کا جو معیار ہے اس کے مطابق دیکھنے والے بھی ایسے ہی تربیت یافتہ آدمی ہونے چاہئیں جو یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں اس لئے اس تھیٹر کا قیام لندن یا کسی بڑے شہر کی بجائے کیمبرج ہی میں مناسب سمجھا گیا

کھیلوں کے انتخاب میں بہت ہی وسعتِ نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو جدید سے جدید کھیل جو عام تھیٹروں کے مالک اس ڈر کے مارے قبول نہیں کرتے کہ

کہیں ان کی جدت عامۃ الناس کے ناپسند نہ ہو اور کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا پڑے پیش کئے جاتے ہیں (بشرطیکہ ان میں فن کے اعتبار سے کوئی خاص خوبی ہو) اور دوسری طرف قدیم سے قدیم یونانی کھیلوں کے دکھانے میں ماہرین تھیٹر کمال فن کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور ان دونوں کے مابین ڈرامے کے ہر مشہور دور کا ایک نہ ایک نمونہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ملک و قوم کی کوئی قید نہیں چنانچہ یہاں میں نے جرمن اور فرانسیسی اور امریکن اور ہسپانوی آسٹرین اور ناروین سبھی مصنفوں کے کھیل دیکھے ہیں۔ البتہ ہوتے سب انگریزی زبان میں ہیں۔ اور پھر اس کے علاوہ ٹریجڈی، کامیڈی، فارس وغیرہ سب اصنافِ ڈرامہ شامل کر لیے جاتے ہیں۔

یہاں کی سٹیج کا حال خاص طور پر بیان کرنا ضروری ہے کہ یہی چیز ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ افسوس کہ میرے پاس کوئی ایسی تصویر نہیں جس سے خالی سٹیج کا منظر پیش کر سکوں اس لئے کام تصویر ۲ سے نکالنا پڑے گا (اس تصویر میں سٹیج پر جو سین لگا ہوا ہے وہ ایک قدیم یونانی کھیل کا ایک سین ہے، سٹیج کا بہت سا حصہ سینری کی وجہ سے رک گیا ہے تاہم جو حصہ نظر آتا ہے وہ بعض نکات بیان کرنے کو کافی ہے۔

پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ سٹیج اور حاضرین کے درمیان بڑی بڑی سیڑھیاں ہیں جو تصویر میں سب سے وسط کو نظر آ رہی ہیں اسٹیج کے اوپر جو سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں وہ سین کا حصہ ہیں لیکن جن سیڑھیوں کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں وہ تعمیر سٹیج کا مستقل حصہ ہیں گویا اگر آپ تماشائیوں کی پہلی قطار میں بیٹھے ہوں۔ تو سٹیج آپ کے پاس سے بتدریج اٹھنی شروع ہوتی ہے، حتیٰ کہ آپ سٹیج کی سب سے

بڑی سطح پر پہنچ جائیں اس سطح کا کچھ حصہ سٹیج کی سیڑھیوں اور سٹیج کی سیڑھیوں کے درمیان دکھائی دے رہا ہے اس حصے پر آپ غور سے دیکھیں تو حلقے کی شکل میں ایک خط سا کھینچا ہوا ہے یہ ایک دائرہ ہے جس کا کچھ حصہ پچھلی سیڑھیوں کے نیچے آ کر چھپ گیا ہے اس دائرے کے اندر جس قدر حصہ سٹیج کا ہے وہ باقی سٹیج سے علیحدہ ہے اور بوقت ضرورت اس حصے کو گھمایا جا سکتا ہے۔

سٹیج ساری کی ساری ایک ہی ہموار سطح نہیں بلکہ اس کا عقبی نصف حصہ اور بھی ایک درجہ اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔

اسی تصویر میں سب سے پیچھے جو ایک سفید سا پردہ نظر آتا ہے وہ دراصل ایک سفید دیوار ہے جو سیدھی نہیں بلکہ گول ہے جیسے جلتی ہوئی شمع کو ہوا کے جھونکے سے بچانے کے لیے ہاتھ کو خم کر کے شمع کے پیچھے رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ دیوار پختہ کمل اینٹوں کی بنی ہوئی ہے تاکہ ایکٹروں کی آواز اس سے بخوبی منعکس ہو سکے اور اس پر بہت پختہ سفید رنگ کا پلستر ہے جس پر کسی چیز کی رگڑ سے خراش وغیرہ آنا بہت محال ہے اس دیوار کو اصطلاح میں سائیکلوراما (CYCLORAMA) کہتے ہیں اور یورپ کے جدید تھیٹروں میں اس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تھیٹر کا وہ حصہ جہاں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ تصویر ۱ میں دکھایا گیا ہے (یہ گویا وہ منظر ہے جو ایکٹر کو سٹیج پر سے دکھائی دیتا ہے) اس سے آپ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ تھیٹر کی لمبائی بہت کم ہے۔ ایکٹروں کو خواہ مخواہ چلانا نہیں پڑتا، ورنہ تقریر کی وہ تمام خوبیاں جو آواز کے ہلکے ہلکے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہیں ضائع ہو جائیں۔ تھیٹر کے اس حصے کی شکل گھوڑے کے نعل کی مانند ہے وہ سب جو اوپر کی منزلوں میں ہیں، اور فرش کی نشستیں بتدریج اوپر کو اٹھتی جاتی ہیں گویا فرش نہیں فرش کی بجائے بہت سی سیڑھیاں ہیں اور ہر سیڑھی پر کرسیوں کی ایک قطار رکھی ہے صرف دو راستے آمد و رفت کے لیے خالی چھوڑ دیے ہیں۔

اس کو انگلستان کے باقی تمام تھیٹروں پر تفوق حاصل ہے اور جو اس کے لیے خاص طور پر باعثِ ناز ہے۔ وہ یہاں کی روشنی کا انتظام ہے۔ فٹ لائیٹس وہ لیمپ جو سٹیج کے کنارے پر ایکٹروں کے قدموں میں لگے ہوتے ہیں اور جن کا رُخ ایکٹروں کی طرف ہوتا ہے وہ قطعاً مفقود ہیں۔ سامنے سے روشنی کے آنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ سب سے اوپر کی گیلری میں چار بڑے بڑے لیمپ لگے ہیں (تصویر ۱) جن کا رُخ سٹیج کی طرف ہے اور بڑی احتیاط کے ساتھ ایسے زاویے پر لگائے گئے ہیں کہ ان کی شعاعیں سیدھی ایکٹروں پر تو پڑتی ہے لیکن سائیکلوراما پر نہیں پڑتی سٹیج کے اوپر ایک پل سا بنا ہے (اس کے طول و عرض کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس پر سے کوئی چیز گرائی جائے تو سٹیج کے عین وسط میں آ گرتی ہے) اس پر لیمپوں کی قطاریں لگی ہیں۔ بعض کا رُخ تو بالکل نیچے کی طرف ہے۔ بیسیوں چھوٹے لیمپ ایسے ہیں جن کی روشنی سائیکلوراما پر پڑتی ہے اور بس سات سات لیمپوں کی ایک ایک قطار ہے۔ ان سات لیمپوں کے سامنے قوسِ قزح کے سات مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہیں۔ اور چونکہ انہی سات رنگوں میں سے مختلف رنگ انتخاب کر کے ان کو مختلف تناسب میں ملا کر دنیا کا ہر ایک رنگ بنایا جا سکتا ہے اس لئے سائیکلوراما پر جس قسم کے رنگ کی روشنی ڈالنی مطلوب ہو ڈالی جا سکتی ہے۔

ان لیمپوں کے علاوہ اور بھی لیمپ ہیں جو مختلف موقعوں پر لگے ہیں لیکن ان کا بیان ضروری نہیں۔

سائیکلوراما کے لیمپوں کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے اگر ان کے سامنے عام قسم کے شیشے لگائے جائیں تو یا تو حرارت کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں یا ان کا رنگ مدھم پڑ جاتا ہے اس لیے ان میں ایک خاص قسم کا شیشہ استعمال کیا جاتا ہے جو جرمنی میں بنتا ہے اور جو بہت مہنگا ہوتا ہے۔

مگر ایک اور بات کا ذکر باقی ہے اس کے بعد اس سٹیج کے ذکر کو بند کر کے رکھ دوں گا۔ ہر ایک لیمپ کے جلانے کا سوئچ علیحدہ ہے صرف یہ نہیں بلکہ اور سوئچ کے ساتھ ایسا انتظام بھی ہے کہ لیمپ کی روشنی نہایت آہستہ آہستہ بالکل ہی

بے معلوم طور پر مدھم یا تیز کی جا سکتی ہے۔ تمام لیمپوں کے تار ایک خاص کمرے میں جاتے ہیں جہاں بٹنوں کی قطاریں لگی ہیں۔ اور جہاں سے تھیٹر کا ماہر روشنی اپنا کام کرتا ہے۔ اس ماہر کو اپنی نشست پر سے سٹیج بالکل نظر نہیں آتی لیکن مسٹر رنج جو آج کل وہاں یہ کام کر رہے ہیں ان کے تجربے کا یہ عالم ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مختلف بٹنوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سائیکلوراما پر کس رنگ اور کس شدت کی روشنی پڑ رہی ہوگی یا ان کو کس رنگ کا کپڑا دکھا دیجئے وہ بجلی کے بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر آپ سے کہہ دیں گے کہ اس وقت سائیکلوراما پر جو رنگ ہے اس میں اور اس کپڑے کے رنگ میں سر مو تفاوت نہیں اور وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ ریہرسل کے دوران میں جب ڈائرکٹر مختلف رنگ آزماتا رہتا ہے تو ہال اور بجلی کے کمرے کے درمیان عارضی ٹیلیفون لگا دیتے ہیں۔ ڈائرکٹر تو تماشائیوں کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے، ماہر روشنی اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ڈائرکٹر ہدایات دیتا رہتا ہے کہ مثلاً سرخی مائل کہربائی رنگ مطلوب ہے ماہر روشنی اپنی انکل سے محض بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر اس کی تعمیل کرتا ہے حالانکہ سائیکلوراما خود اسے نظر نہیں آتا۔

تصویر ۱۲ میں سائیکلوراما کو دیکھتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کی گہرائیاں دور تک پھیلی جا رہی ہیں۔ جب تک مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ دیوار ہے مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

یہ تمام وہ سامان ہے جس کی مدد سے وہاں کے خداوند تھیٹر دنیا کے اعلیٰ ترین ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ سینری کے متعلق ان کے بعض خیالات انوکھے ہیں پردے پر پینٹ کی ہوئی سینری تو خیر ذلیل سے ذلیل تھیٹر بھی وہاں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ بیشتر دل تھیٹر کا رجحان زیادہ تر ایسی سینری کی طرف ہے جس میں انتہا درجے کی سادگی ہے بڑے سے بڑا کام نکل سکے۔ تصویر ۱۳ کا سین محض لکڑی کے کندوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن سیڑھیوں اور ستونوں کے تناسب سے پاکیزگی اور رفعت ٹپکتی ہے سائیکلوراما کا رنگ اس سین میں آسمانی ہے۔

تصویر ۱۴ ایک محل کا منظر ہے کالے پردوں میں سائیکلوراما دکھائی دے

دیا ہے۔ یہ ایک ڈرامے کا آخری سین ہے کھیل اس واقعے پر ختم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ ادا یوں کیا گیا کہ بادشاہ سٹیج پہ آگے کو بڑھتا بڑھتا سیڑھیوں پر سے اتر کر تماشائیوں میں سے ہوتا ہوا تھیٹر سے باہر نکل گیا۔ فلیٹی دل کی یہ خاص جدت ہے کہ اکثر اوقات ایکٹر تماشائیوں میں سے ہو کر سٹیج پہ آتے ہیں اور اسی طرح باہر نکل جاتے ہیں۔ البتہ یہ صرف وہیں کیا جاتا ہے جہاں موزوں معلوم ہو۔

تصویر ۲۲ ان کی سینری کی سادگی کا ایک اور نمونہ ہے یہ منظر ایک خوشنما باغ ہے آسمان (یعنی سائیکلوراما) کا رنگ شہابی ہے جو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ درخت بہت ہی نفاست اور سادگی سے پیش کیے گئے ہیں

تصویر ۲۵ والے منظر میں بہت ہی گھنا جنگل دکھانا مقصود تھا۔ اس سین پر صرف تین طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک تو سائیکلوراما روشن ہے اس کے علاوہ دائیں بائیں دو چھپے ہوئے لیمپوں سے روشنی کی شعائیں ستونوں پر پڑ رہی ہیں (بے شمار ستونوں میں دو تین درختوں کو کھڑا کر دیا۔ یہ ستون اور بھی کئی ڈراموں میں استعمال ہوں گے) اس لیے درخت گو صرف تین ہی لیکن جو اثر پیدا کرنا مطلوب تھا وہ ہو گیا۔

ایک خدائی فیکٹری دکھلانے کے لیے جو جو انتظامات کرنے پڑے۔ ان کو سوچتے ہوئے دماغ گھبرا جاتا ہے لیکن اس تھیٹر نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ سٹیج کے اوپر کے پل پر جو لیمپوں کی قطاریں لگی تھیں ان کا سایہ سائیکلوراما پر ڈال دیا یعنی ان تمام لیمپوں کو ان کے پیچھے ایک اور لیمپ روشن کر دیا نتیجہ تصویر ۲۵ سے ظاہر ہے۔

تصویر ۲۷ میں ایک ڈرامے کا آخری منظر ہے ڈرامے کی کہانی مصر کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ دو لاشوں کی میاں بنا کر لے جا رہے ہیں صرف سائیکلوراما روشن ہے باقی سب تاریکی ہے لیکن چونکہ آخری سین ہے لوگ کیریکٹروں سے کب کے آشنا ہو چکے ہیں اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ البتہ روشنی کی اس ترتیب سے سین میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔



١

٢





٣

٤





د

٨





٥

۶



سائیکلوراما پر روشنی کی بجائے سائے ڈالنے کی مثال اوپر پیش کی جا چکی ہے اس کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ کیجیے جو میرے خیال میں بہ اعتبار فن کامیاب تر ہے۔

تصویر وہ شکسپیئر کے رچرڈ سوم کا وہ سین ہے جہاں رچرڈ سویا ہوا ہے اور طرح طرح کے پریشان خواب دیکھ رہا ہے ہیبت ناک صورتیں دکھائی دے رہی ہیں سٹیج پر ایک بلب کسی چیز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو سائے سائیکلوراما پر پڑ رہے ہیں ان سے ہیبت اور وحشت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اور بہت سے مناظر پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن امید نہیں کہ نیرنگ خیال میں ان سب کے متعلق تصاویر چھاپنے کی گنجائش ہو اور تصاویر کے بغیر میرا کچھ بیان کرنا بے معنی ہو گا۔ اس لیے اس قصہ کو یہیں ختم کیے دیتا ہوں اس امید پر کہ ان چند مثالوں سے قارئین کو اس تھیٹر کے طرز و نہج کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا۔

صرف ایک کھیل کے دو سین تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں ایک تو تصنیف ہی بالکل نرالے طرز کی ہے اور اس کے علاوہ جس طریقے سے یہ ڈرامہ پیش کیا گیا وہ بھی سٹیج کے فن کی بعض جدت طرازیوں پر روشنی ڈالتا ہے اس کھیل کا نام (THE ADDING MACHINE) یعنی جمع کرنے والی مشین ہے اس کھیل میں جو "پیغام" مضمر ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور (اس سے کم درجے پر) انگلستان اور یورپ کے بعض اور ممالک میں جو حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہزارہا افراد (مثلاً کلرک اور مزدور) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی زندگی بالکل ایک مشین کی طرح چلتی ہے گویا روح اور اس کی تمام لطافتیں مر چکی ہیں۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام میں کوئی لطف نہیں برسوں تک ایک ہی دفتر میں ایک بے رونق سی مصروفیت میں مبتلا ہیں۔ ہر صبح اسی وقت پر کام کو جانا۔ اسی کرسی پر بیٹھنا دن میں ہندسے جمع کرتے رہنا۔ ہر شام اسی گھر کو واپس آ جانا۔ کوئی تفریح نہیں کوئی انوکھے خیالات نہیں۔ کوئی ترقی کی امید نہیں۔ اس کاروباری دنیا میں نیرنگی بالکل مفقود ہے۔ بے رنگ یکسانیت چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک کلرک

یا ایک مزدور یا دوسرے مزدور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے سب کے سب جانوروں کی طرح ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں، سب ایک ہی جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں غرضیکہ کولہو کے بیل کی طرح پیدائش سے مرگ تک ایک ہی نقطے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں جس کلرک کی زندگی پیش کی گئی ہے اس کا نام مسٹر زیرو یعنی صفر ہے۔ ڈرامے کے بیشتر افراد کے ناموں کی بجائے اسی طرح ہندسے دیئے ہوئے ہیں یعنی کسی میں کوئی انفرادیت نہیں۔ کسی کی کوئی خاص شخصیت نہیں گویا یہ ذی روح اشخاص نہیں۔ بلکہ مشین ہے ایک بالکل دوسرے جیسا۔ ان میں تمیز کرنا ہو تو بجز اس کے کہ ہر ایک پر ایک ایک لیبل لگا دیا جائے اور کوئی طریقہ نہیں اسی لیے افراد کو ہندسوں سے تعبیر کیا گیا ہے، صرف چونکہ کھیل کے "ہیرو" یعنی منجملہ ان انسان نما مشینوں کے ایک خاص مشین کو باقی مشینوں سے تمیز کرنا تھا اس لئے اس کا نام زیرو رکھ دیا۔

کھیل کا پلاٹ اور اس کو سٹیج پر ادا کرنے کا ڈھنگ دونوں ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔ میں صرف اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ تفصیلات میں کمی بیشی ممکن ہے مگر اتنی نہیں کہ اس سے کوئی خاص فرق پڑے۔ پہلا سین مسٹر صفر کی خواب گاہ کا ہے۔ میاں بیوی دو بستروں پر ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ بیوی بدمزاج ہے اور ہر وقت میاں کو ڈانتی ڈپٹتی رہتی ہے گویا نہ صرف یہ کہ اس کلرک بے چارے کی زندگی دفتر ہی میں بے رونق ہے بلکہ گھر پر بھی اس کو کوئی آرام کوئی خوشی نصیب نہیں۔ ایک سین میں بیوی نہایت غصے میں بلند آواز کے ساتھ بول رہی ہے اور میاں کو طرح طرح کی باتوں پر ملامت کر رہی ہے۔ میاں سامنے سے کچھ نہیں بولتا۔ چنانچہ اس تمام سین میں میاں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا، صرف کبھی کبھی جب لمحے بھر کے لئے بیوی آرام لینے کے لیے ٹھہر جاتی ہے تو اس وقفے میں مسٹر صفر کے دماغ میں اپنے محدود سے خیالات گونجتے رہتے ہیں۔ اس کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ جہاں بیوی چپ ہوتی ہے پردے کے پیچھے

سے چلپا نچ ایکٹر بھاری اور ڈراؤنی اور نہایت ہی مدھم آواز میں ہندسوں کا ایک بے معنی سا سلسلہ دہرانے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ پھر خاموشی چھا جاتی اور بیوی پھر بولنے لگ جاتی اس کے دوران میں مسٹر صفر لب تک نہ ہلاتا صرف بے قراری سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور پھر جیسے نیند میں ڈوب جاتا تھا۔ جو ایکٹر پردے کے پیچھے سے بولتے تھے ان کی آوازیں ایک بجلی کے آلے کے ذریعے سے تمام ہال میں گونجتی تھیں۔ گویا پانچ چھ آوازوں والا مہیب دیو سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ہندسوں کے دہرانے سے مطلب یہ تھا کہ مسٹر صفر کی روح روزمرہ کی بے رنگ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے آتنی مردہ ہو چکی ہے اور نئے خیالات کے پیدا ہونے کی طاقت اس درجہ سلب ہو چکی ہے کہ دفتر کے دن بھر کے کام کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ دل و دماغ پر اس مشین کی طرح طرز زندگی نے اس قدر قابو پا لیا ہے۔

دوسرا سین دفتر کا ہے، پیچھے سیاہ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ سٹیج کے عین وسط میں ایک بہت اونچا سا دو رخا ڈیسک ہے دونوں طرف دو اونچے سٹول ہیں جن پر بیٹھنے سے آدمی کے پاؤں زمین سے تین فٹ کے قریب اونچے رہتے ہیں ایک طرف مسٹر صفر بیٹھا ہے دوسری طرف ایک کام کرنے والی عورت بیٹھی ہے ڈیسک کے عین اوپر ایک لیمپ لٹک رہا ہے۔ لیمپ تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس میں سے جو پیلی پیلی تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار سا نیچے ڈیسک پر پڑ رہا ہے وہ ارد گرد کی تاریک فضا میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ سب سامان سٹیج کے اس حصے پر ہے جو گھمایا جا سکتا ہے۔ مسٹر صفر اور لڑکی دونوں نے آنکھوں پر سبز رنگ کے چھجے لگا رکھے ہیں، لڑکی کے سامنے بل فارموں کا ایک ڈھیر ہے۔ ایک بل کو اٹھاتی ہے، رقم بلند آواز سے بول کر اس کو فائل میں لگا دیتی ہے پھر دوسرے بل کو اٹھاتی ہے اس کو بھی یونہی پڑھتی ہے غرضیکہ متواتر یہی کئے جاتی ہے مسٹر صفر ہر رقم کو دہراتا ہے اور سامنے جو رقموں کی فہرست رکھی ہے اس پر نشان لگاتا جاتا ہے یہ رقمیں جس لہجے میں بولی اور دہرائی جاتی ہیں اس سے تھکن اور بے

رونقی مٹکتی ہے۔ بیچ میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے ہیں ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے مگر بغیر نظر اٹھائے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی کی مردہ ہوسوں اور شکست خوردہ امنگوں کا پتہ چلتا ہے معروضیت کا یہ عالم ہے کہ مسٹر صفر کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا یہاں شاید برسوں سے اس لڑکی کے سامنے بیٹھا کام کر رہا تھا لیکن کبھی جی بھر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی دل میں یہ امید ہے کہ آج نہیں کل میری ترقی ہوگی آخر آتنے سالوں سے کام کر رہا ہوں مالک کمپنی سے آج تک صرف ایک مرتبہ گفتگو کا موقع ملا وہ یوں کہ ایک دفعہ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ "نوازش" لیکن کیا ہوا آخر کبھی تو اس کو خیال آئے گا کہ یہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

اتنے میں دفتر کی سیٹی بجتی ہے۔ دن کا کام ختم ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ سٹولوں پر سے اترتے ہیں دونوں کی حرکات میں اس درجہ مماثلت پیدا کرنے سے صرف یہی بتانا مقصود تھا کہ ان کی زندگیاں بالکل مشین کی مانند ہو گئی ہیں لڑکی باہر چلی جاتی ہے مسٹر صفر جانے ہی کو ہے کہ مالک کمپنی اندر داخل ہوتا ہے بڑے تحکم کے انداز میں پوچھتا ہے تم کو یہاں ملازم ہوئے کتنے سال ہو گئے تم کیا کام کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ، اور آخر میں مسٹر صفر سے کہتا ہے کہ جو کام تم یہاں کرتے یعنی رقمیں جمع کرنے کا، اس کے لیے ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو تم سے کہیں تیز کام کرتی ہے وہ مشین میں نے منگائی ہے اس لیے تم آج سے برخواست کئے جاتے ہو۔ یہ سب کچھ بہت تیز تیز بولتا ہے مسٹر صفر کچھ احتجاج کرتا ہے وہ نہیں ملتا اس بحث کے دوران میں دونوں کی آوازیں بلند تر ہو جاتی ہیں سٹیج گھومنے لگتی ہے لیکن مسٹر صفر اور مالک کمپنی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ گویا سٹیج گھومتی رہتی ہے۔ لیکن وہ دونوں اپنی جگہ پر قائم ہیں آوازیں اور بھی بلند ہوتی جاتی ہیں۔ گفتگو لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی ہے سٹیج پر سرخ اور سفید رنگ کی روشنی کبھی چمکتی کبھی بجھتی ہے۔ پردے کے پیچھے سے ایکٹر ڈراؤنی سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ مہیب تر ہوتی جاتی ہیں۔ الفاظ کچھ بھی

سمجھ میں نہیں آتے کہیں ایک گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے قسم قسم کے شور سنائی دیتے ہیں مسٹر صفر میز پر سے فائل اٹھا کر اس کے نوک دار لوہے سے مالک پر حملہ کرنے کو بڑھتا ہے آوازیں اور شور اور روشنی کی چمک اور سٹیج کا گھومنا سب کچھ بہت تیز ہو گیا ہے تماشائیوں کے دل دھڑکنے لگتے ہیں مسٹر صفر دفعتاً اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھاتا ہے یک لخت ایک زور کا دھماکہ سنائی دیتا ہے (یہ آواز پیتل کے ایک تھال کو زور سے زمین پر مار کر پیدا کی گئی تھی) اور تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں مکمل خاموشی اور تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر جو دوبارہ لمپ روشن ہوتے ہیں تو پردہ گر چکا ہوتا ہے تماشائیوں کے دل کی دھڑکن درست ہوتی ہے تو زور سے داد دیتے ہیں۔

یہ اس حیرت خانے کی جھلک ہے مکمل ڈرامے کو اس تفصیل سے بیان کرنے کی ہمت اور فرصت کہاں۔

یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

نیاز مندان لاہور

یہ تنی فرہنگیں اور فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں تو تو اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا مغز نہ پاؤ گے (غالب)

کاروان کا یہ دوسرا نمبر دنیا کے سامنے ہے۔ یہ رسالہ پنجاب کے چند نوجوانوں کی محنت کا نتیجہ ہے جنہوں نے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کی زیر قیادت اور اس سال جناب چغتائی اور جناب مجید ملک کے زیر ہدایت اس بات کی کوشش کی ہے۔ کہ حسب استطاعت ان فنونِ لطیفہ کے ذریعے جن کا ظہور سطح قرطاس پر ممکن یا سہل ہے، ہندوستان کے موجودہ اہل فن کے مزاج سے تعلیم یافتہ حضرات کو روشناس کرایا جائے اس میں کسی صوبے کی قید نہیں اور فہرست مضامین سے ظاہر ہوگا کہ اس مبارک دریوزہ گری کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض دل پسند نام اس فہرست میں نظر نہ آئیں تو اس کو سائل کے استغنا پر نہیں اس کی نامرادی پر محمول کیجئے۔

ادب و انشا کے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے نہ اس لئے کہ اور کوئی زبان در خورد اعتنا نہیں۔ نہ اس لئے کہ پنجاب میں صرف یہی ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے نوجوانوں کا وہ طبقہ جسے کاروان سے وابستگی کا فخر حاصل ہے، اپنی تہذیب، اپنی تربیت اور اپنے جذبات، عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو ہی کو اپنے لیے بہترین ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ مبصرین سے

پوشیدہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو پی، حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہلِ بینش بھی یہ بات کہہ کر بے کار بہل جاتے ہیں کہ یو پی میں یہ زبان محدود ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والیِ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے جہاں اس کی نشوونما محض خونِ عشاق کی مرہونِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان محدود ہے وہاں تو محدود بھی ہے، جہاں آتالیقِ شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کچھ کٹ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک پرجذبہ تنومند نوجوان کی سی ہے جس کا خون گرم ہے، مادہ جس کے اعضا میں لچک ہے جو چلا کہیں ملتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی کی پٹری پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اقتصادی نوکر کو ہوتا ہے یعنی یہ کہ سوائے گرمیِ حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احساس نہیں لیکن قوتِ نامیہ خود ہی رستہ ڈھونڈتی ہے جو بخطِ مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یو پی سے کسبِ فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یو پی کی روایات سے یک قلم مقاطعہ کرنے پر تلا ہوا ہے، کذب اور مبالغہ ہوگا۔ یو پی کے اساتذۂ قدیم میں سے کون سا ایسا ہوگا جسے پنجاب نے ایک بار سو بار ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیوان ہے جس کی ورق گردانی نہیں کی، وہ کون سا ایسا شاہکار ہے جسے حرزِ جان بنا کر نہیں رکھا لیکن یو پی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لیے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوتِ نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یو پی میں ادبِ اردو کا ایک سسکتا ہوا سانپ ہے جو کبھی کبھی ایک خفیف سی پھنکار لیتا ہے اور بس اب یو پی صرف اعتراض کر سکتا ہے رہنمائی نہیں کر سکتا اور نہیں جانتا کہ اس کا چڑچڑاپن اس کا مربیانہ انداز اس کی معلمانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یوں ایک خود بین ہستی کا اپنے انحطاط کی خبر سننا ناگوار ہے لیکن یہ بات بھی ایک نشتر زنی کے مثل ہے اس میں معمول کی دلداری کا خیال

کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجیے، جو کسی یو پی کے مرتب کیے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید ڈرامے پر ہے تو ڈرامے کے اصولوں سے کچھ بحث نہیں۔ مناظر کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں۔ اگر افسانہ ہے تو توازن کا ذکر نہیں، فضا کا احساس نہیں، مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر توجہ نہیں، اصل سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں۔ اجتہاد کو سمجھنے کی استعداد نہیں، صرف زبان کے اعتراضات پر زور ہے۔ اس محاورے پر، اس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل معاملے کے متعلق پھوٹے منہ سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کر سکیں۔ زمانہ کہاں پہنچ گیا، کارواں اردو کی منزلیں طے کر گیا، لیکن حضرات یو پی ہنوز مسکنت اور نمکات کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو اشوک کا ایک کتبہ سمجھتے ہیں، جو دہلی یا لکھنؤ میں نصب ہے اور حسن کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہیں۔

گذشتہ سال کے کارواں پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کیے تھے لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یو پی کے حضرات کو اس مشغلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زمانے میں یو پی کے پاس یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے کہ چڑچڑے پن کا یہ عالم ہے کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا ہنر اب یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے فقرے کو بڑی سے بڑی فرہنگ کے ساتھ پرکھیں۔ اہل قلم کی ہر قوت کو محض تذکیر و تانیث کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گود میں لات ماردیں۔ مطالب یا فن یا حسن بیان کی طرف ڈر کے مارے صرف کنکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چارگی کو "اچھا ہے یا خوب ہے" جیسے بے معنی نظروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائگی کو غیرت

املاؤں کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال بجھکڑ کی کوئی ارزاں کتاب مبادیات انتشار کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے پھوسڑوں سے اپنی ٹھنڈی کی بہت سترپوشی کرکے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشۂ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہے۔

اگر یوپی کے سب رسالے اسی جہل سے مرکب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا محض بے سود تھا لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوشگوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم اپنے ذوق اور اپنی متانت طبع کے یوپی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد علی گڑھ میگزین اور جامعہ سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے ساتھ ٹکرانے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لیے روح پرور تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسم اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات کو ترقی کا پرچم سمجھتا ہے۔ لیکن علی گڑھ میگزین بھی جب کاروان پر تنقید لکھنے بیٹھا تو اس نے اس تنقید کا تقریباً نصف حصہ زبان کی لغزش کی نذر کر دیا۔ افسانوں پر پانچ سطروں کا ایک پیراگراف لکھا اور وہ بھی ایسا جس میں علم کم اور متانت پلوش بچپن زیادہ پایا جاتا ہے تصاویر کے متعلق صرف اتنا لکھ دیا کہ سب کی سب دلکش اور دلاویز ہیں۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں لیکن نہ اس قدر گراں

کے شگافوں میں سے تنقید نگار کا کوئی اپنی نظر نہ آئے۔ البتہ یہ بڑے وثوق سے کہہ دیا کہ معراج مونث ہے مذکر نہیں اس کا جواب در اصل تو یہ ہے کہ بہت اچھا صاحب معراج مونث ہی سہی لیکن اس کی وجہ سے آپ کو صرف اتنی ہی زحمت اٹھانی پڑے گی کہ جہاں "معراج تھا" لکھا ہے وہاں پنسل سے "تھا" کی بجائے تھی کر لیجیے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مضمون کو پڑھیے۔ اگر لطف آئے تو کہیے اچھا ہے ورنہ اس پر نمک ڈالیے۔ خفیانہ انداز اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے بقول آپ کے ہم اس قسم کے اعتراضات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمیں آزردہ کرنے سے کیا حاصل؟ اس غلطی کو اگر آپ نظر انداز کر دیتے تو نہ صرف آپ کی تنقید کا معیار ہی بلند رہتا بلکہ ہماری دلی عقیدت بھی متزلزل نہ ہونے پاتی۔ ناسخ نے کیا خوب کہا ہے ؎

کسی کی ہوئی تک رسائی ہو سکے گو عرش تک بھی
عزیزو گر نہیں معراج ممکن عرش اعظم کا

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے اور عجب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں۔

خیر! یہ تو تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے نادر قلم کا تجربہ ہے حالانکہ تازہ ترین اشاعت میں انہوں نے "آغاز داستان" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ملاّ مہر کی خصوصیات اس کی دلچسپیاں اور لغزشیاں پیام سے نہ کہلوائیے۔۔۔"

(خصلت کا یہ غلط استعمال خاص علیگڑھ میگزین کا حصہ ہے اور "خصوصیات کہلوانا" تو ایسا محاورہ ہے کہ کیا کہیے۔)

"ہم چھوٹے ہوؤں سے ملا (جناب) اس مطلب کو یوں ادا کرتا تو آپ ہی ترپانہ تبسم سے فرماتے کہ میاں بچے بڑے ہوؤں چاہیے۔"

سب سے پہلے صاحب مسرت ہر تعلیم یافتہ وغیرہ کسی ایسی قائم نہیں ہوتی جب قائم ہو جائے گی تو جو آپ کا دل چاہے کہیے گا۔ فی الحال تو ہمیں بڑے صاحب کو مسرت

ہوئی ہے وہ قیام کی تجویز ہے)

پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے.... (مضمون کی نہیں ہوتی، مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے۔)

• تمام ضروری خبریں اور اہم اجتماعوں کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی آٹھ غلطیاں ہیں کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سوجھنی چاہئیں)

معلوم ہوتا ہے آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لیے باعث فخر و ناز سمجھے ہے ہم چھپنے کے مہینے تو دو یوپی کے رسالوں میں سے زبان صرف و نحو اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہل بصیرت کی عبرت کے لیے مرتب کر سکتے ہیں، لیکن ہم نے اپنا کم یہ پیشہ اختیار نہیں کیا، اور سچ پوچھیے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ مشغلہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہم نوشت و خواند کو وجہ مسرت اور ذریعہ اتحاد سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص کریدتے رہتے ہیں آپ نے زبان کو اپنے لئے مرد تسمہ پا بنا لیا ہے۔ جو کمبخت ہے مگر جس نے آپ کا ٹینٹوا دبا رکھا ہے۔

• جامعہ کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ جامعہ کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی توجہ کو جذب کرنا بھی باعث سعادت ہے ان کا جوش عمل اور ان کا تبحر علمی ہم جیسے مبتدیوں کی تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ یہ زبان کا جنون ان کی سلامت طبع کو بھی ملوث کر رہا ہے۔ اور وہ بھی تنقیص کے نشے سے بے خود ہو کر تفکر و تعمق سے بے نیاز ہوتے جاتے ہیں۔ اس زبان درازی کا حوصلہ ہمیں صرف اس سے ہوا کہ "جامعہ" نے فہرست اغلاط میں منزل گاہ جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا۔ اور کہہ دیا کہ یہ ترتیب صحیح نہیں، غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔ یہی دو ادعا اور تحقیق

ہے جس کی ایک موٹی سی نزیوپی کے اکثر داعنوں پر بھی ہوئی ہے ۔ اے کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اپنے لہجے میں تھوڑا سا منکسرانہ مگر مخلصانہ تامل پیدا کر لیتے۔ اے کاش اب بھی کبھی کبھار اپنا انداز طالب علمانہ بنا لیا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں ؎

کس ندانست کہ منزل کہ مقصود کجاست

ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

لیکن اسے پڑھ کر بھی وہ شاید یہی کہیں گے کہ "ترکیب صحیح نہیں غالباً قافیہ کی مجبوری تھی،

جامعہ کے جس نمبر میں کاروان پر تنقید چھپی ہے اسی نمبر میں زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوءِ ادب سمجھتے ہیں لیکن ارباب جامعہ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں ۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے اور "مل پیم" اور "قومی سیرت" اور "اصلاح" مدنظر ہے اور ہمیں خوشی ہے۔ اور ہمیں امید ہے اور اسی قسم کی آیات سے "فالوا لسعد و من خلیہ" پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے، اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم آنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا "دستن مخصوص" بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل دردمند رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہان میں امت مرحومہ کے لیے بھلائی کا موجب ہوگا ۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابل بحث ہیں۔ مل گرمحو میگزین اور جامعہ دونوں نے ان کا ذکر کیا ہے، اور کنایتہً بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے ٹھیٹھ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے

"مجھے سمجھ نہ آتا تھا" بولتے ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنایا ہے تو اس قسم کے تصرفات لابُد ہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گی۔ اس کے ثبوت اور جواز دونوں کے لیے کسی زبان کی تاریخ ارتقاء کا مطالعہ کیجیے اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشوونما نصیب ہونی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں بلکہ اِن ہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی اور وہ ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ اور دلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کر لیں۔ چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ بازیچے جانا ہے کتابے پڑھے لکھے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں کہ یہ کیا چڑھتا تیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا پنجابی ڈھنگوں کی طرح بائیں کرو، ریختی مت بولو۔ کاروان کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے ؎

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے

ان سے کہا گیا کہ "تو نے ... کرنی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ کو کرنی ہے" رکھ لیجیے۔ انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ "تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے" میں ترنم زیادہ ہے۔ میں مصدر کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا مصرعے یا جملے کے ترنم کے مطابق جہاں پنجابی محاورہ مجھے مفید مطلب نظر آتا ہے وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خوان کے اسے استعمال کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں، یوپی کے حضرات اس حق سے محروم ہیں وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں۔

علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علم بردار اور آئینہ دار ہیں۔ جس فضا میں یہ رسالے ترتیب پاتے ہیں، وہ ہندوستانی

کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر معاون حضرات اہلِ پنجاب کے نزدیک بوجوہ محبوب و متقدر ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے اور خدا گواہ ہے کہ ان کا حسنِ اخلاق اور ان کی بالغ نظری ہمارے نزدیک مسلم اور ان کی صحبت کی یاد (ہر چند کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی) بالیدگیٔ روح کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں تنقید کی رہنمائی کریں گے۔ ادب و انشا کے مقابلے میں ایسے معیار قائم کریں گے جو کم از کم نصف صدی تک اہلِ علم کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دیں۔ صوبجاتی اور علاقائی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے، اور اپنے رویے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ آصفیہ سے نہ ہو سکے گی، بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھیل رہی ہے جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچنے کو تیار ہے اس لئے صدمہ ہے اگر اس سے بار بار یہی کہا جائے کہ تمہارا اتحاد رذیل ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں۔ ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں رہزنی کو آپ کی شایان نہیں سمجھتے۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم نیازمندوں کو شرفِ باریابی بخش کر ہماری عقیدت اور ہماری دریا دلی سے بزمِ اردو کی زینت کو دوبالا کریں گے۔ نہ یہ کہ قلعہ معلیٰ کے کھنڈروں پر نت نئے تالے ڈالے چلے جائیں گے۔

— ۔ —

ہمارے زمانے کا اردو ادیب

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ اجلاس منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا اس میں انھوں نے اردو ادب کے جدید دور یعنی اقبال کے فوراً البعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص چبھتے ہوئے انداز میں اس پر اظہارِ رائے زنی کی تھی اس مضمون کی اصل خوبی تو ان کی انگریزی انشا پردازی ہے جس کا اردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کرتے۔ زیرِ نظر ترجمہ محض اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں ان کے اندازِ نظر اور جدید اردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ خیال سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دوگونہ تھا نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے اس لئے اس مقالے کی 'معروضیت' اور 'بے لاگ مطالعہ' شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پر چڑھ کے دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ دو ایک بزرگوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور ان پر ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔

ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک کرشمے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

گیارہ سال پہلے، جب اقبال آپنے اسلاف سے عالمِ بالا میں جا کر ملے

تو دور نزدیک کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکٹھے ہوئے غالب اور میر، حالی، شبلی اور گرامی، حتیٰ کہ نظیری، رومی اور حافظ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گومگو کی حالت میں بھی گزرے مثلاً جب خودی کے مسئلے پر ایک عالمانہ بحث رومی اور اقبال کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے اور تقدیر امم پر اقبال کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالب کے خراٹے بھی سنائی دیئے مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بے حد سازگار رہی۔ رجائیت پہ پہلے اقتباسات کتابوں سے یا حافظے سے بآواز بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی بے زبان لہروں پر حکمت اور ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا بہت سے قضیے سامنے آئے۔ اور ان میں سے کئی ایک حل نہ ہو سکے اس کے باوجود فہم و بصیرت کے تازہ اور فرح بخش نقش و نگار دریافت ہوئے۔ اقبال قدماء میں سے نہ تھے پھر بھی قدماء کے لیے اجنبی نہ تھے۔ بس ذرا نئے نئے اور پھر پورے لگتے تھے۔

آج کا نوجوان اردو ادیب، اگر اسکو سفر پہ وقت سے پہلے روانہ ہونا پڑے، اس محفل میں کیسا لگے گا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کا استقبال مروت اور شفقت سے کیا جائے گا مگر یہ خوف بھی ہے کہ وہ ذرا کھویا کھویا سا لگے گا۔ قدماء سے اظہار خیال اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ نیا مسافر اپنے اور ان پیشروؤں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل پائے گا جسے پاٹنے کے لیے اس کو کتب خانۂ فردوس میں طویل نشستوں کا پروگرام بنانا پڑے گا۔ وہ حالات کی مجبوری سے اپنے اجداد کا جائز ورثہ وصول نہیں کر سکا الا ماشاء اللہ۔ راشد اور فیض، فراق اور فرحت اللہ بیگ، جوش اور حفیظ، ماضی کیساتھ ان سب کے مراسم اچھے ہیں اگرچہ انھوں نے، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ، اپنے آپ کو حال یا مستقبل کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے، مگر وہ پیہم کم ہوتی ہوئی اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور سلف کی ایسی یادگار میں نجو بنا تھے پھر کب پیدا ہو۔ ہمارے لکھنے والوں کی اکثریت اپنے آپ روایت سے دور ہوتی جا رہی ہے مولوی نذیر احمد جو آج سے پچاس برس پہلے کے ناول نگار تھے، انبیاء

کو کراہت اور شعرا کو لذت کے ساتھ نقل کرتے۔ مگر بات یہ ہے کہ مصنف اور اس کے کردار دونوں میں حوالہ دینے کی اہلیت تھی، دونوں نے ادب کی ایک مشترک دولت ورثے میں پائی تھی جو اس دور کے ذہنوں میں صاف ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے اردو ناول نگار میں اور اس کے ہیرو میں کوئی بات مشترک ہے تو یہ ہے کہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کر سکتے، یہ نہیں۔ وہ بلا نوش قسم کا قاری ہے مگر دلاتی تاثرد ں کی چھاپی ہوئی "بہار کی فہرستیں" "خزاں کی فہرستیں" اور سمندر پار کے ایڈیشن، کچھ ایسے تسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ نہ چکھنے اور جانچنے کی فرصت رہ جاتی ہے نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی بجائے دور کا نصاب بھی الجھا ہوا ہے اور پیچھے مڑ کے دیکھنے کی تو تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے کے اردو ادیب کا مستقبل ہو تو ہو، ماضی کوئی نہیں

اس قطع تعلق کی وجوہات گوناں گوں اور پیچیدہ ہیں۔ اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب نے جس نظامِ تعلیم کے تحت نشو و نما پائی ہے۔ یہ سب اسی کا قصور ہے۔ رسمی تعلیم پچھلے پچاس ایک سال میں شرافت اور (یا تقدس کے اس قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور) یا اس دنیا کے لیے انبیا و شعرا کی مناسب مقدار کی مدد سے تیار کرتا تھا۔ پرانے مسلمات غائب ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیاء شعرا بھی۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم نے سرانجام دیا ہے۔ باقی اس عرصے میں ہماری تعلیم ایک نئے تصور کی تلاش میں جو پرانے تصور کی جگہ لے سکے، تجربوں یا ٹامک ٹوئیوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ ٹامک ٹوئیاں اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں۔ بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ دنیا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے، اور لکھنے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے۔ اس نصف صدی میں بہت سے اور رشتے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو معاشرے کو بقا اور استحکام

بخشتی تھیں، اسی وقت تک کارآمد تھیں جب تک معاشرے کا ناک نقشہ درست تھا، ناک نقشہ پھیل پھیل کر یوں متزلزل ہو گیا ہے، جیسے پانی کی سطح پر تیل کے لہریئے، قدیم معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ قدیم معاشرہ باقی نہیں رہا، وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لیے لازم ہے اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے، کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا، نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لیے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے۔ رسم و رواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف، وہ قدیم انبیاء اور شعراء دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اس چیز سے جو اسے ماضی کی یاد دلائے، یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح سی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں مگر خیر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جنبش تمام الفاظ و تلمیحات اور حکایات علائم کے ذخیرے سے جو فن کار مصنف کو نازک اور کارآمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہو گیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں اور لکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد پھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی واردات اور نفسیاتی... مشاہدات مضمر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، انسانی تجربے کے طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے، اگر طیف کا ایک خط گم ہو جائے تو ہم اس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے۔ اسی پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے ہیں اسے ان چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اس

نے اپنی تخلیقی شخصیت پہ ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دو چند ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گو مگو میں گرفتار اور بیزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ لفظ جن سے اس نے پہلو تہی برتی تھی، اب اس سے پہلو چراتے ہیں۔ (سر) ڈبنی سن روس نے جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے۔ جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا، ادبی حوالوں کے زیر عنوان انہوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شیکسپیئر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور انگریزی روایت کے تحت قومی تہوار معروف شخصیتوں کے القاب، خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے، حتیٰ کہ ایک جز گھسے پٹے چٹکلے پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے، اسی انداز سے اردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا! اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی مشکل درپیش نہیں، وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خبل کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے، علماء اور ماہرین تعلیم، تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے، بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ ہر بیرونی زبان دوگونہ رحمت ہے۔ اس ملک کے لیے جس کی وہ زبان ہے۔ اور اس کے لیے بھی جس نے اسے اختیار کیا۔ ان کا ارشاد بجا ہے۔ کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں کی اکثریت کے لیے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا، کچھ کام بھی کرنا ہے۔ اظہار خیال اس کا فرض ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے ذریعے۔ چاہے کتنی زبانوں

سے اس نے ذہنی غذا حاصل کی ہو۔ ذہن تو اس کے پاس ایک ہی ہے ایک دریچہ سبز ہے تو دوسرا سرخ مگر ذہن میں یہ دونوں رنگ آرام سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے، وہ آپس میں گھل مل کر ایک تیسرے رنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو ایک دریچے کے پاس ذرا زیادہ سبز ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ، مگر نہ تو کہیں پوری طرح سبز ہے اور نہ پوری طرح سرخ۔ یہ لطیف اور پراسرار روشنی اس کے لیے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے۔ اور باعث فخر بھی، مگر اس ملی جلی روشنی کو سبز یا سرخ فلٹر میں سے اپنے اصلی رنگ میں گزارنا کتنا مشکل ہو گا، ایک لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات آپ سے نہیں کہہ سکتا جب تک کہ دونوں زبانیں استعمال نہ کرے، مگر اس صورت میں بھی ایک دقت ہے، اس کا ذہن کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ذہن کی دو لہریں یکے بعد دیگرے بہم چھڑتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں، اگر اس کو ایک زبان کا پابند کر دیا جائے اور پوری بات کہنے کی مجبوری بھی ہو تو نیم واضح اور بے ربط و مہمل قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی، اس کی تحریر کی نیت میں آپ کو عجیب قسم کے خم و

پیچ نظر آئیں گے اور ابہام و اشکال کی کئی صورتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر انگریزی ساخت کے چلے ہوئے ڈھنگی اردو میں ملبوس دکھائی دیں گے جن کو دونوں زبانوں کے ماہرین ہی سمجھ سکیں گے، زبان ایک نازک اور لطیف آلۂ اظہار ہے جسے فن کار بڑی مہارت سے برتتا ہے مگر یہ دوغلی زبان معنی کے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور گونگے کے اشاروں سے زیادہ قابل فہم نہیں ہوتی، لفظ اپنے معنوں کو ساتھ لے کے نہیں چلتے بلکہ محض دور سے ان کی طرف اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں جب احساس شکست قوی ہو جاتا ہے تو اردو کا ادیب اردو کو چھوڑ کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے گو فلٹر سبز ہو یا سرخ مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے ہم پہلے کچھ لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب اپنے آپ کو ایک نئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے، یہ معاشرہ اس کے فہم و بصیرت کی حدوں سے بڑھ کر وسیع

اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ اس کے اسلاف کے تجربے اور مشاہدے سے ماورا ہے۔ اور اسی وسیع و عریض حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنا ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو۔ جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی وہ بڑے پرجوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرز کی محفل بنا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب ایک نہ ایک انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے، محفلیں، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں، معاشرہ سازی کی جبلی اور مجنونانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان آوارگیوں اور سیاحتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے زندگی کے کل کو پالے اور چونکہ بیرونِ خانہ سے اس کا رابطہ قائم نہیں ہوا، اس کو درونِ خانہ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے، زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے۔

پی۔ ای۔ این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آرتھر کیسٹلر نے بتایا تھا کہ تورگنیف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوتے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ گرم پانی کی بالٹی کیسٹلر کے نزدیک الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت اور کھلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی جو فن کار کے لیے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیسٹلر نے یہ بھی کہا تھا کہ باہر کی دنیا ادیب کے دل میں ایک زبردست خواہش کو جنم دیتی ہے، یعنی یہ کہ وہ کھڑکی بند کر کے بیٹھ جائے اور اپنے تخلیقی سرچشمے پر اکتفا کرے مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ باہر کی ہوا دباؤ ڈالنے کی بجائے اس کو باہر بھی کھینچ سکتی ہے تاکہ وہ گرم پانی سے اپنے پیر نکال کر کھڑکی پر جھک جائے۔

ہمارے اردو ادیب کو بازار کے واقعات سمجھنے یعنی مشاہدہ اور مرکزیت پیدا کرنے کی ضرورت کچھ اس شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو اکثر و بیشتر کھڑکی پر جھکا دیکھ کر ہمیں حیرانی نہیں ہونی چاہیے۔ باہر منظر اس کے لیے اتنا دلفریب ہوتا ہے کہ وہ چیخنے چلانے سے بھی باز نہیں رہ سکتا، وہ لکھنے کی میز پر واپس نہیں آتا اور گرم پانی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا ابھر آئی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے بے شمار چیزیں ہیں اور چھان بین کے لیے بے پناہ مسالہ ہے۔ اس حالت میں اس عظیم فن پارے کی توقع بے جا ہے اور یہ امید بھی عبث ہے کہ وہ اپنے پیر گرم پانی میں ڈالے رکھے گا اور گلیوں بازاروں کے ہجوم میں شامل نہیں ہوگا۔ آنے والے فنکار ساتھیوں کو اس کے یہاں مقصد کی سنجیدگی ملے گی، اور آگے بڑھ کر دیکھنے اور مستقبل کو تلاش کرنے کی ہمت، چاہے اسلاف کی دعائیں اس کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔ اس کی تیز نظری، اضطراب، آگاہی اور بے جگری، نئی راہوں پر چلنے کا عزم اور کچھ کھونے پانے سے اس کی بے نیازی یادگار رہے گی۔ ہم اس سے بڑا خراج تحسین اس کو نہیں دے سکتے کہ اس کی مشکلات اور مجبوریوں، تکلیفوں اور تعزیروں کو سمجھیں تاکہ اس کی جد و جہد اور اس کے کارنامے کی بیش از بیش قدر کر سکیں۔ میں نے اس جگہ یہی کرنے کی کوشش کی ہے

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی کے افسانے میں ایک لڑکی دوسری کے متعلق کہتی ہے کہ "سعیدہ موٹی تھی تو کیا، کمزور تو حد سے زیادہ تھی بے چاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔" جب میں نے عصمت کی کلیاں اور چوٹیں دونوں مجموعے ختم کر لیے اور چند دیباچے اور مضامین ان کے مداحین اور معترضین نے ان پر ازراہ تنقید و تعارف لکھے ہیں ان سے بہرہ یاب ہو چکا تو استعارے کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔

اس فقرے کے معانی کو کھینچ تان کر پھیلا لیجیے اور اس پر تھوڑا سا فلسفانہ رنگ پھیر لیجیے، تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کو بیان کرنے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے جو حال فربہی کا ہے وہی حال کجی اور معروف اور متداول لیبلوں کا ہے جو مستعمل الفاظ اور عادات مستمرہ کی شکل میں نسم قسم کی اشیاء پر چپکے نظر آتے ہیں ذہنی کسالت اور خوف اور بزدلی کے باعث ہم اکثر فیصلے لیبلوں ہی کو دیکھ کر صادر کر دیتے ہیں ان سے آگے نکل کر اصل چیز کو جانچنے اور تولنے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ ماتا اور عشق پر دل گدازی کا لیبل مدت سے لگا ہوا ہے اس لیے جہاں ان کا ذکر آئے کہنے اور سننے والے دونوں ایک ملو اور ایک پاکیزہ رقت کے لیے پہلے ہی سے تیار ہو بیٹھتے ہیں جنسی مشاغل تحقیق کی پستی کی طرف لے جاتے ہیں چنانچہ ان کا بیان بغیر کراہت یا اخلاقی غیظ کے ہو تو لوگ برہم ہو جاتے ہیں بہن بھائیوں کا سا پیار جاننا چاہیے کہ پاک محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے لہٰذا بہن بھائی کے درمیان بجز اس جذبہ عالیہ کے

کسی اور تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب ضرور سمجھی جاتی ہے عصمت چغتائی کے رہنما جن انتہا پسند ایسے ہی کیلے ہوتے ہیں تو اب ان کی بہترین انشا سے محروم رہ جاتا لیکن ان کی بصیرت اس سے کہیں زیادہ دوررس ہے۔ وہ لیلیوں کے فریب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کی کیفیتیں ایسی ہیں جن سے وہ اکیلے ہیں دوچار ہونے سے نہیں گھبراتیں، ایسے انشا پرداز کا بغیر حوصلہ مشاہدہ، دقت نظر اور جرأت بیان کے گذارہ نہیں۔ اور یہ ادب کی خوش قسمتی ہے کہ عصمت کو یہ تینوں نعمتیں میسر ہیں۔

برخلاف اس کے احساس محرومی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جرأت اور دقت نظر ہی سے عصمت کے نقادوں کو حصہ وافر نہیں ملا۔ فی الحال ان کا ذکر جانے دیجئے جن کو عصمت کی تحریروں میں اپنے اخلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے۔ وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیل گوند سے چپکے ہوئے نہیں بیجوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی لکیر والی جدول بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے ان کا حرام ہے۔ نامحرم کا ذکر ہم مقرر کر چکے ہیں کہ فحش ہے، محرم کا ذکر معاملہ بندی ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا بچہ فطرت کو منظور ہے تو ہوا کرے، ہمارے ادیب کو منظور نہیں۔ اور یہ فطرت کا مطالعہ! محض ایک ڈھونگ! آوارہ مزاجوں کا عذر آوارگی! ہمیں بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور نہ کر سکا اب کسی کی کیا مجال ہے ہم جب کھلونوں سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلائیں گے ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ ے

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی
کوئی ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے ـــــ اور انہیں کی شکایت ہے بیگانوں کی سی نہیں جو عصمت چغتائی کے قدردان اور مداح ہیں۔ ان کے مضامین کو پڑھ کر روح میں ایک بالیدگی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں، اور نئی نئی راہیں کھلتی

ہیں، گلہ ہے کہ وہ بھی ہر پھر کر لیبلوں ہی کے چکر میں پھنس جاتے ہیں افسوس کہ عصمت مرد نہیں اور افسوس کہ لیبلوں میں سے سب سے بڑا اور گمراہ کن لیبل عورت ہے۔ مردذات کے قرنوں کے خرابیوں اور محرومیوں سے چپکا ہوا۔ عورت دلفریب ہے مکار ہے صنف نازک ہے ایک معمہ ہے کمزور ہے کم عقل ہے، مجموعہ اضداد ہے ..... جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چار گھڑے گھڑائے معنی ذہن انکل کے سامنے رکھ دیتا ہے چنانچہ اسی قریب میں آکر ایک ہونہار اور ذہین دیباچہ نویس فرماتے ہیں

عصمت کے افسانے گویا عورت کے
دل کی طرح پُر پیچ اور دشوار گذار نظر
آتے ہیں، میں شاعری نہیں کر رہا اور

اگر اس بات میں شاعری ہے تو اسی
حد تک جہاں تک شاعری کو بھی بات
میں دخل ہوتا ہے مجھے یہ افسانے اسی
جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو
عورت میں ہے، اس کی روح میں
ہے، اس کے دل میں ہے۔ اس کے
ظاہر میں ہے، اس کے باطن میں ہے

اب نہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا لیبل کس قسم کی چیز پر لگا رکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو وہ جوہر بھی کھلتا جو بہ قول ان کے عصمت کے افسانوں میں ہے لیکن ان کے رنگین تصورات و مفروضات کے خلوت کدہ میں ہمیں کیونکر باریابی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ دیباچے کا مقطع ہے :-

• عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگار
کم وہ سے پٹ گئے ہیں بشرمندہ

ہو رہے ہیں، آپ ہی آپ خفیف
ہوتے جا رہے ہیں، یہ دیباچہ بھی اسی
خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

لیجئے، عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر میرے عزیز کی ناقدانہ نظر بہک گئی، دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کے جوہر لیکن آخر میں کہہ گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح کہ دو ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب و تجسس ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں (یعنی مردوں) کے لیے شرم و ندامت کا موجب ہے۔

ایک اور مقتدر دیختہ کا دیباچہ نویس نے بھی معلوم ہوتا ہے انشاء پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں اردو ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔" گویا ادب بھی کوئی ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے بیچ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلم لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تنک ہی ملا اور بوجھ تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے، خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی جو انشاء پرداز عورتوں کے ادب کو انشاء پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہر حال اس توقع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنا پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔

اسی طرح جہاں کسی افسانے میں خاندان، گھر بار، اعزا و اقربا کا ذکر آ گیا یا کسی متمول لڑکے نے کسی مفلس لڑکی پر ہاتھ ڈالا، جو شیلے اور درد مند دل رکھنے والے نقادوں نے مسرت کا نعرہ لگایا اور بغلیں بجائیں کہ سماج کی خبر لی جا رہی ہے۔ اب غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ عصمت کے اچھے افسانوں میں ماحول محض اسم لئے شامل

فسانہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں، کردار کہیں تو رہیں گے کسی سے تو ملیں گے،
افسانہ کا جو ڈھانچہ ہے اس کا کوئی گوشت پوست تو ہوگا، پھر اس کے بغیر بھی
چارہ نہیں کہ یہ ماحول جن معاشی اصولوں کی وجہ سے پیدا ہوا خود وہ اصول جانچے
اور پرکھے جا رہے ہیں۔

عصمت کے بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن پر شبہ ہوتا ہے کہ سماج کو سامنے
رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے جہاں بھی سماج کو اپنا نشانہ بنانے کی کوشش
کی ہے ان کا ہاتھ چھوٹا ہی پڑتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سماج کی جن باتوں سے
عصمت کا جی برا ہوتا ہے ان پر عصمت نے غور ضرور کیا ہوگا۔ لیکن تلخی کام و دہن
ابھی ان کے رگ و پے تک نہیں پہنچی اور جب تک یہ نصیب نہ ہو سماجی کمزوریوں
پر اخباروں میں مضامین لکھ بیٹھنا ہیں۔ ان کو فن کی لپیٹ میں لانے کا خیال
چھوڑ دینا چاہیے۔ عصمت کو فی الحقیقت شغف سماج سے نہیں شخصیتوں بلکہ
اشخاص سے ہے۔ ان کے جوش اور ہوس سے تو جسم پھڑکنے لگتا ہے اور
دوران خون تیز ہو جاتا ہے۔ یا اعصاب میں انجماد اور طبیعت میں تناؤ پیدا
ہو جاتا ہے۔ اگر عصمت اور سماج کا باہم ذکر اس نقطہ نظر سے کیا جائے کہ ان کی
فنی انشا، ان کا سارا رجحان اور ان کا سارا اسلوب انتخاب ایک خاص زمانے
اور خاص سماجی کش مکش کی پیداوار ہیں تو یہ بحث مناسب ہی نہیں بلکہ نتیجہ خیز
بھی ہوگی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اردو میں عصمت جیسے ادیب اس صدی کے
اوائل میں بھی مفقود تھے۔ اور اس سے پہلے کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ ایک امر واقعہ
ہے اور اس میں کئی دلچسپ نکتے مضمر ہیں جن کی توضیح یقیناً خیال انگیز ہوگی۔

لیکن حالات سے اثر پذیر ہونا اور حالات کا مفسر ہونا دو مختلف چیزیں ہیں
اس بات کا مطالعہ کرنا ہو کہ بعض سماجی حالات نے کیونکر عصمت جیسی انشا پرداز
کو پیدا کیا تو شوق سے کیجیے لیکن اس شوق میں خواہ مخواہ سماج کی بناء عصمت
کے سر نہ منڈھ دیجیے۔ سیب درخت سے گرا تو یقیناً کشش ثقل ہی کی وجہ سے
گرا لیکن اس کارگزاری کے صلہ میں سیب کا نام نیوٹن نہیں رکھا جا سکتا نہ سیب

کو سیب سمجھنے یا کچھ اس کی ریتی ہوتی ہے۔

عصمت کے دونوں مجموعوں میں ڈرامے، افسانے اور ایکٹ تینوں قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ ان میں ڈرامے سب سے کمزور ہیں اور اس کی کئی وجوہ ہیں اوّل تو یہ کہ ڈرامے کی ٹیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی۔ یا یہ کہیے کہ ابھی تک ان کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہیں۔ تو ناپ کر قینچی سے نہیں کترتیں یونہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر ٹیڑھے بنا ڈالتی ہے چنانچہ بھونڈے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی سین جب پھیلتے سمٹے بغیر ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان کہیں بھی رک جائے۔ خیر اس قدرتا دک مزاجی سے کیا حاصل ہ کمیر نہ سہی دلیا ہی سہی پیٹ بھر جائے تو کیا مضائقہ ہے ڈرامے کو ڈرامہ نہ سمجھئے کہانی سمجھ کر پڑھئے اور فرض کر لیجئے کہ کہانی کو ڈرامے کی شکل دی جائے تو ایک جبر اپنے اوپر مزید کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قصہ اوّل سے آخر تک مع اپنے نشیب و فراز کے تمام تر افراد قصہ ہی کے اقوال و افعال کے ذریعے بیان کرنا پڑتا ہے مصنف سے یہ آزادی چھن جاتی ہے کہ ساتھ کرداروں کے جذبات، خیالات کو اپنی زبان سے واضح کرتا جائے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پابندی عصمت کے بس کا روگ نہیں۔ افسانہ ہو تو عصمت کو کسی اوٹ یا نیوسکے واضح کرنے میں دقت پیش نہیں آتی، انہیں افسانہ نویس کے اس حق سے فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے کہ جب چاہا کیریکٹر سے کچھ کہلوا لیا، جب چاہا خود کچھ کہہ لیا۔ لیکن جب اپنی زبان بند ہو اور سب کھیل کیریکٹروں ہی کو کھیلنا ہو تو عصمت قاصر رہ جاتی ہے اور ان مجبوریوں میں گھر کر ان کا مطلب اکثر فوت ہو جاتا ہے یہی نہیں بلکہ مکالمے بھی پھیکے ہو جاتے ہیں اور ان میں اس کرارے پن کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا جو ان کے افسانوں کے مکالموں میں اکثر پایا جاتا ہے ریڈیو کے پیچھے میں کچھ قدرچستی اور چھریلا پن ہے۔ بعض اوقات تو مکالمہ کچھ ایسا

بے جوڑ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ واقعہ کیا پیش آیا۔ چنانچہ ان کا ڈرامہ "انتخاب" کے واقعات بیشتر اس کے کہ سمجھ میں آسکیں بہت کچھ وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہی نقص ان کے افسانہ "تاریکی" میں بھی رہ گیا ہے۔ ڈرامہ نویس کو تو اجازت نہیں کہ وہ سیدھے ہم سے بات کرے باقی رہے کیرکٹر سو وہ آپس میں الجھی سلجھی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ (ڈرامہ جو ٹھہرا) مگر ہمارے پلے کچھ نہیں پڑنے دیتے ڈرامہ نویس عدم تعاون پر مجبور ہے اور کیرکٹروں کو تعاون کا سلیقہ نہیں۔ ان حالات میں ڈرامہ کامیاب ہو تو کیونکر! پھر ان ڈراموں میں (جہاں تک میری سمجھ میں آئے ہیں) عصمت کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ چند ٹائپ پیش کریں۔ یعنی ہر شخص ایک طبقہ کا نمائندہ بن کر سامنے آئے مگر اس کے لیے اشخاص کا ادراک نہیں گروہ کا احساس چاہیے۔ اور عصمت اور گروہ میں وہ انہماک نہیں جو اشخاص میں ہے تو پھر نہ معلوم انہوں نے یہ مصیبت کیوں مول لی۔

علاوہ ان سب باتوں کے ان ڈراموں کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں عصمت نے جس قسم کے لوگوں کا نقشہ کھینچنا چاہا ہے ان سے وہ ٹھیک گھل مل نہیں سکیں۔ یعنی وہ مرفہ الحال لوگ جو کہلاتے تعلیم یافتہ ہیں مگر جن کی ترکیب میں تعلیم کم اور یافت زیادہ ہوتی ہے۔ جو خوش حالی، بے حسی، اخلاق اور اپنے رنگ و روغن کے بل پر اپنے مشاغل اور اپنی گفتگو میں بے تکا پن اور چمک پیدا کر لیتے ہیں جس کی بدولت وہ "سمارٹ سیٹ" کہلاتے ہیں۔ اور کم نصیب لوگ کچھ ان سے نفرت کچھ ان پر رشک کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس طبقے کی بعض حماقتوں اور خود فریبیوں پر عصمت کو غصہ آتا ہے جس کو وہ بیان کرنا چاہتی ہیں۔ اور اس کی عشرتوں پر تھوڑا سا رشک جس کو وہ خود بھی نہیں جانتیں لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس چمکیلے طبقہ کو انہوں نے دور ہی سے دیکھا ہے، قریب آنے کا موقع نہیں ملا کہ اس کے نقوش اور خدوخال واضح دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس کے خوب و زشت اور ظاہر و باطن کا وہ اچھی طرح موازنہ

کرسکیں، چنانچہ جب عصمت اس قسم کے کیریکٹروں یا ان کے ماحول کی تصویر کھینچتی ہیں تو نوک پلک کبھی درست نہیں ہوتی، چھری، کانٹے "ارغنون" (یعنی چہ؟) ٹینس ڈرائنگ روم، ڈنر سیٹ، الم غلم اس قسم کی اصلی اور خیالی چیزیں جمع کر کے ایک کباڑخانہ سا بنا لیتی ہیں۔ گو ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس ساز و سامان سے امیرانہ ٹھاٹھ باندھا جائے اور کچھ اس یقین کے ساتھ اسباب چنی جاتی ہیں کہ ان کی سادگی پر رشک آتا ہے۔

کیریکٹروں کی گفتگو اور حرکتیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جب مصنف ہنساتے تو رونا آتا ہے اور رلاتے تو ہنسی آتی ہے۔ ایک تصنع تو ان میں وہ ہے جس کا مصنف کو علم ہے لیکن ایک تصنع ان میں ایسا بھی آجاتا ہے جس سے مصنف خود بے خبر ہے۔ اور جو دراصل اس کے اپنے تصنع کا عکس ہے یعنی کیریکٹروں کی سطحیت کو تو بے نقاب کرنا ہی تھا اپنی سطحیت بھی ساتھ بے نقاب ہو رہی ہے ایکٹروں سے پہلے کیریکٹر خود ایکٹ کرتے ہیں۔ بات بات پر اپنی زندگی میں تھیٹر کی سی سچویشن (SITUATION) پیدا کر لیتے ہیں۔ اور کچھ اس طرح جنتے ہیں کہ ان کے توضیر خود ڈرامہ نویس کے حسن مذاق پر شبہ ہونے لگتا ہے "سانپ" میں عصمت نے چند ایسی عورتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بزعم مصنف یہ "شکاری عورتیں" ہیں یعنی وہ رنگین تریا چلتر سے مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔ لیکن ان کی تھکی ہوئی باتیں سنئے اور ان کی اکتا دینے والی خوش فعلیوں کا تماشا کیجئے۔ تو اس نتیجے پر پہنچئے گا کہ کسی چوہے کا شکار تو یہ شاید کرلیں لیکن اس سے زیادہ کی امید بے چاریوں سے خام ہے معلوم ہوتا ہے چند کم عقل چھوکریاں ہیں جنہوں نے کوئی ارزاں قسم کا خوش پوش امریکن فلم دیکھ لیا ہے۔ اور گھر میں دو ایک جگہ صوفے کرسیاں بچھا کر اس کی نقل آتارنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ قیاس اس امکان کو بھی رد نہیں کرتا کہ وہ فلم خود مصنف ہی نے دیکھا ہو۔ اور اس کی ارزانی کا احساس اس کو نہ ہوا ہو۔ ایک مکالمہ تو اس ڈرامے میں ایسا ہے کہ اسے بے ساختہ میلو ڈرامٹک

اسلوب کی وجہ سے کشت زعفران سے کم نہیں ۔ رفیعہ کی منگنی غفار سے ہو چکی ہے لیکن اب وہ اس سے نہیں ظفر سے شادی کرے گی ۔ غفار کو اس سانحۂ جانکاہ کا علم یوں ہوتا ہے ۔

رفیعہ ۔ نہیں میں تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی ۔

غفار ۔ (جوش سے) برباد نہیں ۔ تم میری زندگی آباد کروگی ۔

رفیعہ ۔ نہیں ۔ میں تمہیں نگل جاؤں گی ۔ سانپ جو ٹھہری ۔

غفار ۔ (شدت جوش سے کانپ کر) کیسی باتیں کرتی ہو ۔ تم مجھے نگل بھی جاؤ تو میرے لیے عین راحت ہوگی ۔

خالدہ (رفیعہ کی سہیلی) مگر اب تو رفیعہ نے فیصلہ کر لیا ۔

غفار ۔ (چونک کر) کیا فیصلہ کر لیا ؟

خالدہ ۔ یہی کہ تمہیں وہ نہ نگلے گی ۔

رفیعہ ۔ ہاں اب تو میں ظفر کو نگلوں گی ۔

(ظفر پریشان ہو کر مسکراتا ہے)

غفار ۔ (سمجھ کر) تو ۔۔۔ تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ٹھکرا رہی ہو ۔

رفیعہ ۔ (ادا سے) اب تم نے بھی غلیظ شاعری شروع کر دی ۔

غفار ۔ (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور ظفر تم مجھے دھوکا دیتے رہے

ظفر ۔ غفار ، بچے نہ بنو ۔ یہ فتنہ تمہارے بس کا نہ تھا ۔ شکر کرو کہ میرے ہی اوپر بیتی اور تم بچ گئے ۔ تم دیکھنا میری وہ گت بنائے گی کہ توبہ ہی بھلی ۔

غفار ۔ کاش میری ہی وہ گت بن جاتی ۔

خالدہ ۔ مگر غفار سوچو تو ۔۔۔

غفار ۔ ایک عرصہ دراز سے بزرگوں نے یہ بات طے کر دی تھی ۔

خالدہ ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آبائی حق تو تمہارا ہے پر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے وہ ایک ضدی ہے !

خدا کرے تم خوش رہو۔

عصمت اس سین کو کامک سین سمجھ کر لکھتیں تو شاید ڈرامہ نویسوں میں ان کا نام رہ جاتا لیکن افسوس کہ ان کے ہونٹوں پر جیسے مسکراہٹ نظر نہیں آئی، اور جب مصنف ہنسانے والی باتیں لکھے اور خود اسے ہنسی کی کوئی بات نظر نہ آئے تو افسوس ہوتا ہے۔

کچھ ایسا ہی سپاٹ پن ڈراموں کے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں عصمت نے ان جدید نما چھچھلے لوگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ہی ٹھیک بیٹھتی ہیں نہ کیریکٹر کا نقشہ ہی درست ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میگزینوں میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑے ہیں۔ اور پیشہ ور افسانہ نویسوں کی طرح رسمی رومان کا رنگ دے کر جھوٹ موٹ ایک بات بنالی ہے "نیکچرز" اور "شادی" پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے اور "میرا بچہ" میں تو برنارڈ شا کے "آرمز اینڈ دی مین" کے پہلے سین پر کچھ اس طرح سے ہاتھ صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں۔

یہ سیلیا اور نیلی اور زارطونز اور پارٹیوں کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ اجنبی رہتی ہیں۔ اس کی تہ کو وہ جب پہنچیں گی۔ تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ان کی دنیا وہی ہے جو ان کے بہتر افسانوں یعنی جوانی، ڈائن، بیڑا، بھول بھلیاں، ساس، بیمار اور تل میں پائی جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں عورتیں پردے کے پیچھے سے فقرے چست کرتی ہیں جس میں زینوں پر اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے جس میں نولڑکی پلنگڑیوں پر پٹاریاں رکھی ہیں بہترا نیوں کی جوان بہوئیں کمر لچکا کر چلتی ہیں۔ الھڑ لڑکیاں گدبدیتی پھرتی ہیں۔ اور تلیاں میں ڈبکیاں لگاتی ہیں۔ جس میں گلگلے بچے ماں کے پیٹ سے چھپکلی کی طرح چپکے ہوئے ہیں چپڑ چپڑ منہ مارتے ہیں اس کے گرد و پیش میں وہ اس بے تکلفی اور احساس ہم آہنگی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں کہ اسی کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں چنانچہ وہ کس سہولت کے ساتھ دو ہی چار خط کھینچ کر اس دنیا کو کاغذ پر لے آتی ہیں عصمت

کے بہترین افسانوں میں آپ کو فضا اور ماحول کے لمبے لمبے پر تکلف ڈسکرپشن (DESCRIPTION) کہیں نہ ملیں گے جو بات ہے وہ ایسے پتے کی ہے کہ اختصار سے تشنگی اور خلا کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ بساط کے شروع کے فقرے ہیں۔

سورج کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر میں ہی روشنی پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے کھسیٹی اور اے لو پھر پیروں پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھادھم کھٹوں کی آواز چھت پر سے آئی۔ خدا غارت کرے سپاہی بیٹیوں کو۔ ساس سے بے حیا بہو کو سا جو نکلے کے چھوکر دں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔ دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی سما ہے کو جئے۔ لے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر۔ ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریاں کا دل آپہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔

اتنے تھوڑے سے الفاظ میں اس سے زیادہ کوئی کیا رنگ بھرے گا اور رنگ بھی ایسے کہ نہ ضرورت سے زیادہ شوخ اور نہ ضرورت سے زیادہ ہلکا یہی حال "بیزار" کے ایک ٹکڑے کا ہے۔

چھوٹے تال سے گذر کر بیابیہ سے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منے بیوپاری شہر کی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کم بخت جاڑا تو اب کے ایسا دانت پیس کر پیچھے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا گرمی تو جیسے تیسے

کٹ جاتی ہے، چاہو جتنا نہاؤ، پیاؤ
پرسے ٹھنڈا پانی جتنا چاہو پی لو،
نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ، نہ کو

تو دھوتی کا بھی پرہن منت نہ ہونا
پڑتا تھا، سیاہ سوت کا ڈورا جو اس
کے چکھڑی جیسے پیٹ پہ سے پھسل
کر کولہے کی ہڈیوں پر منہ سے مک
جاتا تھا، ضرورت سے زیادہ تھا، نہ سے
تلیا میں ڈبکی لگائی، کناروں پر اکڑوں،
بیٹھ گئے اور لو کے چپاکوں سے سوکھ
گئے ہیں۔

اور اس سے بھی مختصر یہ کہ۔

اندھیری سنسان راتیں جیسے تیسے
کٹنے لگیں۔ بھیڑ کی روٹیاں اور لوٹا بھر
مٹھا حاصل کرنے کے لئے سارے گھر
کو دن بھر تیرے میرے کھیت میں
بٹتے بٹتے گزر جاتی۔ تیرا گھاس پھیل لاتی
بھینسوں کو بھی دن لگے اور دودھ چرانا
بھی شروع کر دیا، کون دیکھتا بھالتا۔
کانجی ہاؤس ہیں ہی ایک تو ضبط ہو گئی
دوسری بیاہنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ بھینس
جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو پتہ بھی نہیں
چلتا۔ نہ اس کی کمر جھکے نہ بال کھچڑی
ہوں۔

اِن اقتباسات میں پانچ پانچ چھ چھ فقرے ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کو یہاں نقل بھی کر لیا ورنہ اس قسم کے ایک ایک دو دو فقروں کے کنارے تو کئی جگہ ہیں۔

یہ دنیا بیشتر مفلسوں اور اکھڑوں کی دنیا ہے۔ بہرحال امیروں، نفاست پسندوں اور تراشیدہ لوگوں کی دنیا نہیں، اس میں ناقے ہیں غلاظتیں ہیں (اور غلاظتوں کا حال عصمت کتنی برہم ہو کر اور برہمی کے مزے لے لے کر بیان کرتی ہیں) عیالتیں ہیں، بد زبانیاں ہیں، ہاتھا پائیاں ہیں، بیماریاں ہیں۔ ڈھیروں بچے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں زندگی کا ایک خطہ ہے جو دبائے نہیں دبتا، امنگیں ابھرتی ہیں، جوانی اپنے کرشمے دکھاتی ہے۔ ذہن میں شرارتیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ اور نفس انسانی کا پہلوان زور آزمائی کرتا ہے جن افسانوں کو میں نے بحث کے لئے منتخب کیا ہے ان میں آپ کو بہت بڑی بلندی یا بہت پرمعنی گہرائی نظر نہ آئے گی، عمیق امن، خاموش آسودگی یا مسرتِ عالیہ کہیں نہ ملے گی نہ وہ حزن و ملال ہی ملے گا جو کہر کی طرح دل پر جم جاتا ہے اس میں ٹریجیڈی کی کوشش ہے نہ کامیڈی کی لیکن انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ اسی طرح دوڑتا ہوا جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے۔ لبالب اور ابلتا ہوا اڈکر آتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

ان افسانوں کا موضوع کیا ہے اگلے وقتوں کے لوگ ان افسانوں کو (اگر ایسے افسانے انہیں ہاتھ نہیں آتے تو) عشقیہ افسانے یا عشقیہ افسانے ہی سمجھو کہتے۔ لیکن عشق کے معنی اس قدر پھیل چکے ہیں کہ عشقیہ سے یہاں کام نہ چلے گا لیلےٰ مجنوں کا عشق، صوفیوں کا عشق، مزدوروں کا عشق، نظموں کا عشق امرد پرستوں کا عشق، سبھی طرح کے عشق ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج جدا ہے۔ اس لیے عشق کے لفظ سے نہ جانے کہنے والے کا مفہوم کیا ہو۔ اور سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں۔ جنسی بھوک پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں لیکن محض اس سے بھی بات نہیں بنتی کیونکہ جنسی بھوک تو دانتے بی ایٹرس سے بے کر کسی ایک سمجھ کو لگتا ہے عصمت کے افسانوں میں جو جذبہ مرد عورت کو

ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے اس کی کسی قدر اور تخصیص کرنی چاہیے۔ ایک بات تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اس جذبے میں شاعرانہ لطافتوں کی رنگینی نہیں پائی جاتی۔ اس کا رومان سے کوئی تعلق نہیں۔ عصمت کے کسی افسانے میں مرد یا عورت کے حسن کا کبھی ذکر نہیں آتا کیونکہ جو جذبہ ان کے پیش نظر ہے اس کی تحریک کے لیے حسن کی ضرورت نہیں رہ محض خون کی مادیک حرارت اور جسم کی جھلسا دینے والی گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان کے جسم میں یہ آگ لگتی ہے تو وہ کبھی اس کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ اس آگ سے کوئی پیچیدہ نفسیاتی معمے پیدا نہیں ہوتے، صرف تند و تیز شراب کا سا نشہ رویں رویں میں سرایت کر جاتا ہے۔ دل کی کیفیت جسم ہی سے رنگ پکڑتی ہیں۔ اور جو کرب یا تسکین بھی نصیب ہوتی ہے اس کا مظہر اوّل سے آخر تک جسم ہی رہتا ہے۔ عصمت ہی کے فقرے ہیں کہ: "شہر کے تندرست لوگوں کا گھر بڑی لیسی چہرشے بیویوں سے اجڑ جاتا ہے اور جب تک بدن بہت ہے اور گال چکنے ہیں سب کچھ ہے اور پھر کچھ نہیں۔" "اور پھر وہ بیمار تھا تو کیا۔ دل تو مردہ نہ ہوا تھا پھر اس میں بیوی کا کیا قصور۔ وہ نوجوان تھی، اور رگوں میں خون دوڑ رہا تھا، مگر وہ کبھی جھوٹ موٹ کو بھی اس سے کچھ کہتا تو وہ اینٹھ جاتی۔" مطلب یہ کہ جسم مردہ ہو تو میاں دل کی زندگی سے کام نہیں چلتا۔ جسم کا شعور عصمت کے افسانوں میں اس قدر نمایاں ہے کہ پڑھنے والا جسم کے متواتر ذکر سے خود مصنف کی طرح ہیبت زدہ اور مسحور ہو جاتا ہے۔ "ملو دبلا پتلا آئے دن کا مریض تھا، اور پھر جب جوانی آئی تو خون کی حدت سے اس کا چہرہ سانولا ہو گیا۔ اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھلی دار مضبوط شاخوں کی طرح چلنے ہونے بالوں سے ڈھک گئے۔" ... "بیگم جان کے اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ اور پنڈلیاں سفید اور چکنی ..." "ربو کا گٹھا ہوا ٹھوس جسم اور کسی ہوئی چھوٹی سی توند اور بڑے بڑے پھولے ہونٹ جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے ہیں ..." "بیمار کا متوالا پڑ رہی سرخ حقدر پڑی گھنی دار مونچھ ...

اور جس کے جبڑے چکی کی طرح چلتے ہیں۔ رانی کے چکنے چکنے یا وہ گال اور وہ دیس جگہ سمائل ...... شرافی کے سینے پر کتنے بال تھے، گھنے پسینے میں ڈوبے ہوئے اور اس کے سکے ہوئے ڈیٹرموں اور رانوں کی مچھلیاں کیسے اچھلتی تھیں، اور وہ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اور چکنی جیسی موٹی انگلیاں ... بہادر کے بڑے بڑے بالوں دار ہاتھ اور اس کا سماوری سینہ ... جنگی کھونٹے جیسی ناک ... غرض جسم سے کہیں چھٹکارا نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دل لبھانے والا جسم یا آراستہ جسم اپنے تناسب میں رعنائیاں لئے ہوئے یا پاکیزگی اور نفاست کے لیے داد طلب، نہیں، بلکہ محض جسم اپنی گرمی سے پُرنم اور مقناطیسی خون کی حرارت سے سنسناتا ہوا، یہ جسم بھی ایک آفت ہے، یہ ہم پر اپنی خواہشوں کے ساتھ اندھے شتنڈے کی طرح یا بقول عصمت کے "یوان ہاتھی کی طرح سوار ہے جب خواہش پھنکارتی ہیں۔ اور جسم جسم کو پکارتا ہے تو ان افسانوں کے کیریکٹر آہیں نہیں بھرتے، غزلیں نہیں گاتے شعر نہیں لکھتے، بلکہ بغیر چون و چرا کے اس پر اسرار آواز کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اور وہ جدھر لے جائے بغیر سوچے بوجھے اسی طرح چل دیتے ہیں۔ مائیں گھڑکتی ہیں رسا سیس الجھتی ہیں بے پروا لوگ عُبار دے جاتے ہیں۔ افلاس کی سڑاند سے دم گھٹتا ہے لیکن اس کے قدم نہیں رکتے یا عصمت کے الفاظ میں یوں کہئے کہ " جوانی غربت کو نہیں دیکھتی، بن بلائے ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور بے کہے چل دیتی ہے پیٹ بھر روٹی نہ ملی تو کیا بہادر نے خواب تو کوئی روک نہ سکا، جمپر اور شلو کے تئیں جوڑے تو کیا جسم نے پیر روک لئے، وہ تو بڑھتا ہی گیا۔ اور یہاں غربت اور شلوکوں کی جگہ کچھ ہی رکھ لیجئے، جسم کے پیر نہیں رکتے۔

اور جب اس جسم میں طوفان آتا ہے" اور پیٹ پر گن کھجورے رینگنے لگتے ہیں: اور دل و دماغ پر اندھی کیفیتیں طاری ہو جاتی ہیں تو یہ عجیب عجیب پر باندھ لیتا ہے لیکن جسم اپنا بدلہ جسم ہی سے لیتا ہے چنانچہ اس کش مکش کے زیر اثر طلم اور گداز اور ملائمت نہیں پیدا ہوتی کیریکٹر تخیل کے ریشم میں لپٹ کر غنودہ نہیں ہو جاتے

بلکہ ان میں کرخت قسم کا العڑپن اور درشت قسم کی شرارتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو چھیڑتے ہیں، دق کرتے ہیں، کپلپا کر کھٹولیوں پر پٹخ دیتے ہیں ننگے جسم پر بدھیاں ڈال دیتے ہیں، ہونٹوں کو چٹکیوں سے مسل دیتے ہیں پیرے ویئر دباتے ہیں۔ تھپڑ رسید کرتے ہیں، بال پکڑ کر جھٹکے دیتے ہیں، دھولیں مارتے ہیں، جھاپ کس کس کر لگاتے ہیں، گھیسٹتے ہیں، چھوڑتے ہیں، یعنی ملک پر کچھ ہی گندے جسم کی گرفت کبھی ڈھیلی ہونے نہیں پاتی۔ اور یہ جذبہ شروع سے آخر تک اپنے کھردرے پن اور بدویت کی شان کو نہیں چھوڑتا۔

تو پھر عصمت کے افسانوں کا موضوع جسم ہے؟ نہیں یہ کہنا تو درست نہ ہو گا کیونکہ یہ افسانے بلاشبہ ادب کے دائرے میں شامل ہیں۔ اور ادب (یا کسی بھی آرٹ) کا موضوع جسم نہیں ہو سکتا یعنی وہ جسم جو علم الاعضا کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ جسم نہ چاند تارے۔ بقول نہ سحر آرٹ کو تو ذہنی کیفیات سے سروکار ہے۔ کیونکہ آرٹ کا منصب ذہنی المدات کا بیان اور بالآخر ان کیفیات کی تربیت ہے یہ سب چیزیں تو محض محرکات ہیں۔ ان میں نہ سہی دوسری سہی اس سے گزر جائیے کہ کس چیز کا نام لیا ہے۔ یہ دیکھئے کہ ذکر کیا ہو رہا ہے۔ اگر ذہنی کیفیات کا دخل نہ ہو تو عضو مقصود نہیں ایک کیمرا ہے۔ ادیب ادیب نہیں نقل نویس ہے اور جسم کا وقائع نگار علم الاعضا کا ماہر اور شارح تو بن سکتا ہے ادب پیدا نہیں کر سکتا۔

جو کچھ میں اوپر بیان کر چکا ہوں اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عصمت کی جنسی کشش کی ماہیت واضح کر دی جائے۔ اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے محرکات اور مظاہر کیا ہیں لیکن بحیثیت آرٹسٹ کے عصمت کو پرکھنے کے لیے بالآخر یہ دیکھنا پڑے گا کہ جنسی بھوک سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کو انہوں نے کس طرح برتا ہے اپنی مخلوق کو ان سے جو رنگینی بخشی ہے وہ کس رتبے کی ہے۔ اور روح کے لیل و نہار میں ان کا کیا مقام ہے ان سوالوں کا جواب میں مجملاً اوپر ایک دو جگہ دے چکا ہوں، اس سے زیادہ تفصیل شاید سودمند نہ ہو ایسی

باتوں کو جہاں تک ہو سکے بحث سے مخلص دلا کر مذاق کے سپرد کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن ایک بات ظاہر ہے کہ جو آرٹسٹ عصمت کی طرح اپنی مخلوق کو یوں جوا نیت کے کنارے تک لے جاتا ہے وہ تلوار کی دھار پر چلتا ہے۔ چنانچہ ان کے مشہور افسانے "لحاف" میں میں سمجھتا ہوں، ان کا قدم آخر اکھڑ ہی گیا۔ ان کی لغزش یہ نہیں کہ اس میں انہوں نے بعض سماجی ممنوعات کا ذکر کیا ہے۔ سماج اور ادب کی شریعتیں کب ایک دوسرے کے متوازی ہوئی ہیں۔ میلے کے ڈھیر سے لے کر کہکشاں تک سبھی چیزیں احساسات کی محرک ہو سکتی ہیں۔ اور جو چیز محرک ہو سکتی ہے وہ ادب کے املاک میں شامل ہے۔ آپ جس زمین سے چاہیں شعر کہہ لیں۔ اس سے کیا غرض کہ زمین کون سی ہے۔ غرض تو اس سے ہے کہ شعر کیسا ہے۔ اس لیے اس پر معترض ہونے کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے ویسی باتوں کا ذکر کیوں کیا، لیکن اس کہانی کی قیمت گھٹ یوں جاتی ہے۔ کہ اس کا مرکز ثقل (یا عسکری صاحب کی اصطلاح میں اس کا "تاکیدی نقطہ") کوئی دل کا معاملہ نہیں، بلکہ ایک جسمانی حرکت ہے۔ شروع میں یہ خیال ہوتا ہے کہ بیگم جان کی نفسیات کو بے نقاب کریں گی۔ پھر امید بندھتی ہے کہ جس لڑکی کی زبانی یہ کہانی سنائی جا رہی ہے، اس کے جذبات میں دلچسپی ہوگی۔ لیکن ان دونوں سے ہٹ کر کہانی آخر میں ایک اور ہی سمت اختیار کر لیتی ہے اور اپنی نظریں امنڈتے ہوئے لحاف پر گاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ پڑھنے والا بے چارہ اپنے آپ کو اس قسم کے لوگوں میں شامل پاتا ہے۔ جو مثلاً جانوروں کے معاشقے کا تماشا کرنے کے لئے سڑک کے کنارے اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔

عصمت نے کچھ تھوڑے سے اسکیچ بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک بھی دلچسپی، دقت نظر اور عصمت کی مخصوص کنایہ بازی سے خالی نہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں کوئی "دوزخی" کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب میں اس اسلوب نظر کی مثال نہیں ملتی۔ جو عصمت نے اس اسکیچ میں اختیار کیا ہے۔ ان چند صفحات میں عصمت کچھ اس طرح اپنے پروں کو پھیلا کر اڑتی ہیں۔ کہ دیکھتے ہی دیکھتے

اپنے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہیں ۔ میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں عورت بن کر ... میں بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں ۔" انہیں اس عذر خواہی کی ضرورت بھی یوں پیش آئی کہ اپنی دیانت پر تو ایمان تھا پڑھنے والوں کی دیانت پر ایمان نہ تھا لیکن چند ہی فقروں میں وہ اپنے خلوص اور اپنی جرأت سے پڑھنے والوں کی ہمت بلند کر دیتی ہیں ۔ آرٹسٹ کسی کا بھائی نہیں ہوتا کسی کی بہن نہیں ہوتی ، احساسات اور اقدار کی دنیا میں ایسے رشتے تو محض اتفاقات کا نام ہیں ۔ چند لیبل ہو نہ معلوم کن چیزوں پر لگے ہوئے ہیں ۔ لیبل ہٹا کر دیکھئے ۔ تو نیتوں اور ذہنوں کا امتحان ہو گا ۔ اور ذہن بلا پائے گا ۔ عصمت نے کس قدر خود اعتمادی کے ساتھ لیبلوں کو ہٹا کر پھینک دیا ہے ۔ اور جو زندگی میں بھی لاش تھا اس کی لاش کو بھی زندہ کر دکھایا ہے ۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں عصمت کی زبان کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے لغوی مذاق میں بھی ہمارے لیے ایک ہدایت ہے عصمت کی انشا پر فارسی اور عربی کا اثر بہ نسبت اور ادیبوں کے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ اور یہ بے نیازی الفاظ تک ہی محدود نہیں بلکہ ترکیبوں اور فقروں کی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے ۔ اس طرح ان کی تحریر بجز ایک آدھ لا حاصل سی نقالی کے انگریزی تراکیب اور انگریزی اسالیب خیال سے بھی پاک ہے ۔ اس زمانہ کے اکثر انشا پردازوں کو بہ وجہ اپنی تعلیم یا ماحول کے اس سے مفر نہیں کہ ان کے کلام میں وقتاً فوقتاً انگریزی کے سُر بھی سنائی دیے جائیں ۔ اردو میں مغربی تلمیحات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں ۔ چنانچہ عام مصنفوں میں کہیں اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گٹھلیاں تو اکثر مل جاتی ہیں ۔ عصمت انگریزی کے خیر و شر دونوں سے مبرا ہیں ۔ یہ تو بتانا ناممکن ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور اس پاک کلامی کی وجہ سے پیدا نہ ہوا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی بدولت وہ ٹھیٹھ اردو کے بہت سے ایسے الفاظ سامنے لے آئی ہیں جو آج تک پردے سے باہر نہ نکلے تھے ۔ اور جن کو اب انہوں نے نئے نئے مطالب کے اظہار کے قابل

بنا دیا ہے۔ گویا۔ ادبِ اردو انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی۔ اُدھر خانہ نشین الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت اور روانی ہے اور جملوں کا زیر و بم روزمرہ کا سا پھر تیلا زیر و بم ہے۔ اس لیے ان کے فقروں کا سانس کبھی نہیں پھولتا، اور ان میں منشیانہ ثقافت اور تکلف نہیں آنے پاتے، مختصر یہ کہ الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ساخت ان دونوں رستوں سے وہ انشا کی زبان کو زندگی کے قریب تر لے آئی ہے۔ جس کے لیے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے۔ اس نیک کام میں عصمت کے علاوہ چند اور قابلِ زبان انشا پرداز بھی شریک ہیں (اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام اہلِ زبان کے سوا کسی دوسرے کے لیے کچھ ایسا آسان بھی نہیں) لیکن عصمت کے احسان کا بوجھ کچھ اس وجہ سے ہلکا نہیں ہو جاتا،

عصمت کوئی قد آور ادیب نہیں۔ اردو ادب میں جو امتیاز ان کو حاصل ہے۔ اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا، اور یہ مضمون بذاتِ خود اس امتیاز کا اعتراف ہے لیکن بھول نہ جانا چاہیے کہ ہمارا افسانہ ابھی سنِ رشد یا سنِ بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آج کل جب کہ نظروں کو وسعت نصیب ہو رہی ہے۔ اور دنیا بھر کا ادب کتاب کی طرح ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے، اردو ادب کے قدر دانوں میں یہ حوصلہ پیدا کرنا چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ادب کا دنیا کے بہترین ادب سے مقابلہ کرتے رہیں، تاکہ تناسب کا احساس کند نہ ہونے پائے، مقامی تعصبات کی حقیقت واضح ہوتی رہے اور دل میں امنگ پیدا ہو ہمارے ادب پر بدیسی کے پات ضرور سکنے چکنے ہیں لیکن اس میں ابھی بڑے بڑے پھول نہیں لگے، اتنی حد بندی کر لینے کے بعد ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہیے، کہ عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعثِ فخر ہے،

انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں، کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کوڑ رستے آنکھوں سے اوجھل تھے، اس کارنامہ کے لئے اردو خوانوں ہی کو نہیں بلکہ اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہیے،

ہیبت ناک افسانے

"ہیبت ناک افسانے" کا پیکٹ جب یہاں پہنچا میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری عدم موجودگی میں چند انگریز احباب نے جو کتابوں اور اشیائے خورد نی کے معاملے میں ہر قسم کی بے تکلفی کو جائز سمجھتے ہیں، پیکٹ کھول لیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے، بجز چند ایسے کلموں کے جو غصے یا رنج کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں اور جو بار بار سننے کی وجہ سے انہیں یاد ہو گئے ہیں۔ اردو تقریر میں ان کی قابلیت یہیں تک محدود ہے۔ تحریر میں اخبار "انقلاب" کا نام پہچان لیتے ہیں، وہ بھی اگر خط طغریٰ میں لکھا تھا ہو۔ چنانچہ جب واپس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی رائے قائم کر رکھی تھی۔ سرورق پر جو کھوپڑی کی تصویر بنی ہوئی ہے اس سے ایک صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ کتاب

"میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا"

سے متعلق ہے۔ ایشیا کے ادیب (عمر خیام، گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب سمجھے کہ فن جراحی کے متعلق کوئی تصنیف ہے۔ ایک بولے جادو کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ (ہندوستان کے مداریوں کا یہاں بڑا شہرہ ہے) ایک خاتون نے

کتاب کی سرخ رنگت دیکھ کر بالشویکی شبہات قائم کر لیے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ گو یہ سب کی سب کہانیاں میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں، اور ان میں سے اکثر تراجم کتابی صورت

میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دلفریبیاں جو مجھے کبھی کسی تصنیف کو مسلسل پڑھنے پر مجبور کر سکتی ہیں سب کی سب یہاں یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو۔ تحریر میں وہ سلاست اور روانی کہ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ اور پھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس سے ہندوستان یا انگلستان میں کہیں بھی مفر نہ ہو۔

یہ کتاب تیرہ ہیبتناک افسانوں کا مجموعہ ہے جن کے مصنف کا مدعا یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں ہر افسانے میں درد و کرب خوف و دہشت یا پھر مرگ و ابتلا کی ایسی خونی تصویر کھینچی جائے کہ بدن پر ایک سنسنی سی طاری کی جائے۔ ایڈگر ایلن پو کے پڑھنے والے ایسے افسانوں سے بخوبی آشنا ہوں گے۔ حق تو یہ ہے کہ پو اس فن کا استاد تھا۔ اور یہ جو آج کل کسی صنف ادب کی کثرت فرانس میں نظر آتی ہے عجب نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ پو ہی کی بدولت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پو کا اثر مسلم ہے اور ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جہاں کسی نہ کسی صورت میں اس نے اپنا رنگ نہ پھیر رکھا ہو۔ پیرس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لیے وقف ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں۔ اس کمپنی نے اس قسم کے ڈراموں کا اچھا خاصا مجموعہ مہیا کر رکھا ہے۔ تھیٹر کی ڈیوڑھی میں چیدہ چیدہ ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کہیں کوئی بدنصیب موت کی آخری انگڑائیاں لے رہا ہے۔ چہرہ تنا ہوا ہے۔ اور آنکھیں باہر پھوٹی پڑتی ہیں۔ کہیں کوئی سفاک کسی حسینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے۔ بائیں ہاتھ سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں خون آلود چھری ہے اور لڑکی کی آنکھوں سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ کھیل کو ہیبتناک بنانے کے لیے جو جو تدابیر بھی ذہن میں آسکتی ہیں۔ ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنی شکل، شباہت اپنی آواز اور اپنی حرکات کے ذریعے ایک خوف سے کانپتی ہوئی فضا پیدا کر سکتے ہیں۔ پردہ اٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی

بلکہ چراغ گل کر کے لکڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے ہیبت اور کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد و کرب یا خوف و دہشت کے مناظر یا افسانوں سے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو درد کہا جائے اس سے خوشی کیسے حاصل ہوگی۔ لیکن یہ ہمارے متداول الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ اصل خیال کو یوں اس فقرہ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ الفاظ کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرین نفسیات دکھ درد، کرب وغیرہ اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے مجتنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بہت سی ایسی کیفیات جن کو ہم عام زبان میں درد، دکھ وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ لہٰذا اوقات اس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے حصول کے لیے جد و جہد کرتے ہیں اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ یقیناً آپ کے پڑوس میں کئی ایسی عورتیں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور واویلا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تمنا پوری کریں۔ جرائم اور اموات کی گھناؤنی سے گھناؤنی تفصیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کئی اخبارات کی مقبولیت کا باعث ہے۔ لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ یا میں بعض دہشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے تامل نہ ہونا چاہیے کہ کہیں لوگ اس کو ہماری طینت کے کسی نقص پر محمول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں رومن قوم کے ہجوم اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے ماتحت دیکھنے آتے تھے۔ ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اور کشت و خون کا یہ نظارہ ہزارہا لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری

تہذیب اس تیا دنک کی تحمل نہیں لیکن افسانوں اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کمیائی سے کشید کر کے ہمہ بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھرتھراہٹ پیدا کر لیتے ہیں۔ تو کم از کم ہم تو کسی طرح بھی نادم نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹول لیجیے۔

اعصاب میں ایک تھرتھراہٹ! بس یہی ان افسانوں کا مقصد ہے اور جس کامیابی، جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد کی تکمیل چاہی ہے اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالعہ اہل فن کو اس کے ترجمے کی خواہش ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابلِ وقعت ضمانت نہیں پیش کی جا سکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی خود مترجم نے کتاب کے دیباچے میں واضح کر دی ہے۔

"موسیو لیول بے انتہا سلیس عبارت
استعمال کرتے ہیں جس کی پختگی اور
روانی پڑھنے میں نظم کا سا لطف
دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت
سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف
چیزوں کے بیان میں تناسب کی سمجھ
بے حد تیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل
کہانی ایک نفیس اور صاف
ستھرے ترشے ترشائے ہیرے
کی طرح دلکش معلوم ہوتی ہے۔"

یہ اختصار دہشت انگیز افسانوں کی ایک ضروری صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان میں وہ تیزی نہیں رہتی جس سے سنسنی پیدا کی جا

سکے، اور پھر یہ اختصار ہر رنگ میں شاملِ حال رہتا ہے۔ ورنہ افسانے یا ڈرامے کی کامیابی میں نمایاں طور پر فرق پڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ میں کبھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں۔ اور خود تھیٹر بھی بہت چھوٹا سا ہے۔ چند دن ہوئے میں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو ہیو والپول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لیے بھی لندن کا ایک بہت چھوٹا سا تھیٹر منتخب کیا گیا۔ اس تھیٹر کا نام لٹل تھیٹر یا چھوٹا تھیٹر ہے۔

باقی رہا امتیاز کا ترجمہ۔ میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کے متعلق ایک بسیط تنقیدی مضمون سپردِ قلم کر دیں تاکہ "ہیرا" اور "تائیس" اور "مذہب اور سائنس" اور "عذرا" اور "لیلےٰ" ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لیے ایک معیار مقرر ہو جائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں، خصوصاً اس وقت جب کہ میرے زیرِ نظر صرف ہیبت ناک افسانے ہے اور میرا قلم بہت اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہنا کہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں۔ اس وقت تک بے معنی فقرہ ہے جب تک کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کر دوں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ "گدھا" کس کو کہتے ہیں۔ کسی انگریز کے لیے اس لفظ کے معنی سکھا دینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا لیکن اس لفظ کے ساتھ "ابے گدھے" سے لے کر خرِ عیسیٰ تک جو شعر و ادب، فلسفہ و مذہب، رسم و عادات، محاورہ اور روزمرہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے اس کو منتقل کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے اور پھر اس کے لیے بصیرت، ذہانت، مذاق اور مطالعے کی ضرورت

ہے۔ امتیاز کو خدا نے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعۂ السنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے لیے وقف کر رکھا ہے ہاں، وہ انگریزی جانتے ہیں اس لیے، جب کبھی ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھ دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھنے کیلئے ہندوستان میں مجھ سے بدرجہا بہتر نقاد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیازمندوں میں سے ہوں مجھے سنبھل کر قلم اٹھانا چاہیے۔ مبادا قارئین میرے جذبات کی تو تعریف کریں لیکن میری تنقید کو محض اظہار نیازمندی سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

شام پڑ رہی تھی، بیغر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے تو وہاں پڑ کر رات بسر کرے۔ اور کوٹ سمجھ لیا جو کچھ سمجھو ایک بدرا سا اس کے پاس تھا۔ اسی میں گھس گیا۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھڑی سی باندھ کر کندھے پر اٹھا رکھی تھی ہٹائی کی بغل سے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ چھوٹا سا پڑ رہا اور نیلے آسمان پر تاروں کو ایک ٹک ٹکی باندھے ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چپ چاپ تھیں۔ دور بہت فاصلے پر گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بیغر کا دل بھر آیا۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا، میرے ماں باپ کون تھے، لاوارث کو ثواب کمانے کے لیے کسی زمیندار نے لے لیا تھا، اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔ بچہ ہی سا تھا تو وہاں سے نکل بھاگا۔ ادھر ادھر اس فکر میں پھرنے لگا کہ کہیں کچھ کام مل جائے جس سے روٹیوں کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کشمکش زندگی گزر

رہی ہے۔ دکھوں کے سوا جینے کا کوئی مزا نہ دیکھا تھا۔ جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں جلیبیوں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لیے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اٹھائی تھی۔ چاہتا تھا کہ مر جائے۔ ایسی نیند سوئے کہ پھر کبھی آنکھ نہ کھل سکے۔ جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا۔ بے درد تھے۔ شکی تھے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا، ہر ایک اس سے ڈرتا ہے۔ بچے دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اس کو چیتھڑوں میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔

پھر بھی کبھی کسی کا برا نہ چاہا تھا۔ سیدھی سادی اور نیک طبیعت پائی تھی۔ جسے مصیبتوں نے مردہ بنا دیا تھا۔

یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک اہلِ زبان کے لیے باعثِ فخر و ناز رہی۔ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان رتن ناتھ سرشار، داغ اور امیر، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد سے ورثہ میں ملی۔ اور اسی خزانے کے سکوں سے جنہیں خود اہلِ زبان، محض سکوں کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب لاہور کا ادیب فرانس اور انگلستان کا متاعِ ادب خرید خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس قدیم دولت سے ادبِ جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف امتیاز ہی کا کام تھا۔

اب ایک اور حصے کو پڑھیے جو دہلی اور لکھنؤ دونوں سے بے نیاز ہے بلکہ جو اکثر پرانی وضع کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برہم کر دے گا۔

اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ آخر کار جب میں نے میز پر سے نظریں اٹھائیں تو دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے سبز لبادہ کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دماغ بالکل کی وہ کیفیت طاری تھی جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بے تعلق نظروں سے ادھر ادھر تکتا رہا۔ مدھم روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور بے وضع نظر آ رہی تھی۔ اگر کچھ روشنی تھی تو ان جگہوں پر جہاں سونے کے ذرے ہوتے

ہوئے سورج کی آخری شعاعیں میز آئینہ اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھیں کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ اس پر شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی کیونکہ میں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست زاویے تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا۔ شام کا دھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہر چیز کو جیسے نگلے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اٹھی ہے۔ وہ گوشت پوست سے منڈھا گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے ہیں۔ حلقوں میں آنکھیں جڑی گئی ہیں۔ بہت جلد کسی انوکھے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا ہے۔

وہ سر جس ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر استہزا کا ایک تبسم تھا۔ یہ کوئی اس قسم کا گریز یا تصور نہ تھا جو انسان کا تخیل پیدا کر لیا کرتا ہے۔ یہ چہرہ واقعی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ تو میں بے قرار ہو گیا، کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لوں لیکن بلا لطافت رخسار جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہو گئے۔ ایک ہلکی سی گہرائی نے اسے ملفوف کر لیا۔۔۔ اور پھر مجھے عام کھوپڑیوں کی طرح ایک کھوپڑی نظر آنے لگی:

یہ اُردو نہ بازار میں پیدا ہوئی نہ گھر میں اس نے نہ لشکر میں پرورش پائی نہ قلعے میں بلکہ یہ صرف ملک کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے نئی تہذیب کی ضروریات نے اسے ایجاد کیا اور مطالعے اور خوش مذاقی نے اسے یہ دلفریب صورت بخشی اس بارے میں ہمارا ادب سجاد حیدر، ظفر علی خاں ڈاکٹر اقبال اور ابو الکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے جنھوں نے بعض ایسے دروازے کھول دیئے کہ ترقی کے نئے راستے آنکھوں کے سامنے پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے ہیں جو نے امتیاز کی قادر الکلامی کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ ایک ہی تصنیف میں اسکے متبائن ڈھنگ یک رنگی کے منافی ہیں۔ اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا، کہ جب آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیر ملکی تہذیب میں ڈوبی ہوئی ہو محض اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی ضیافت طبع کے لیے کسی دیسی بات میں ڈھالنے کی کوشش کریں تو یقین مانیے انشاء پردازی کا کوئی ایسا فن نہ ہوگا جس سے آپ بے نیازی برت سکیں۔ اس کے لیے قلم نہیں بلکہ دسوں انگلیاں دس چراغ ہونی چاہیئں۔

"پطرس" از کیمبرج

(مخزن مئی ۱۹۲۰ء)

پاکستان میں تعلیم کا مستقبل

یہ امر کس قدر قابل مسرت ہے کہ سب سے پہلے جو کل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی وہ تعلیمی کانفرنس تھی، جو سال گذشتہ ماہ نومبر میں کراچی میں ہوئی یہ وہ وقت تھا جب سرحد پار سے مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا، اور کشمیر کا مسئلہ روز بروز اس قدر زیادہ نزاکت پکڑتا جا رہا تھا کہ بہ مشکل توجہ کسی دوسری طرف مبذول کی جا سکتی تھی، اور پھر دیگر اہم ترین سیاسی مسائل کے مقابلے میں تعلیم کا نمبر ویسے بھی بعد میں آتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال گزر چکا اس عرصہ میں نہ تو تعلیم کی مد میں کوئی کثیر رقم مخصوص کی گئی اور نہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا، نہ ہمارے نظام تعلیم اور طریق امتحان میں کوئی انقلاب برپا ہوا۔ اور نہ رضاکاروں اور کارکنوں کی کوئی جماعت ناخواندگی کے خلاف جہاد کرنے کے لیے میدان عمل میں اتری لیکن یہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال کو رائیگاں کھو دیا تو وہ بزعم خود غلط ہے اس لیے کہ اس عرصہ میں تعلیمی مسائل پر جوش و خروش سے گرماگرم بحثیں بھی ہوئی ہیں اور سنجیدگی و متانت سے غور و خوض بھی۔ اوائل سال ہی میں پاکستان کے طول و عرض سے ماہرین تعلیم کا اجتماع منعقد ہوا تاکہ پاکستان کے تعلیمی مسائل کو سامنے لاکر ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اگر مجھے ایک فرسودہ سا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ ہماری تعلیمی آزادی ہماری پونجی ہے محض اس کی ملکیت

احساس فرد اعتماد پیدا کر دیتی ہے لیکن جلدی یا دیر میں ہمیں اس پونجی کو مزید
استعمال کرنا پڑے گا ورنہ اس کی حیثیت مردہ دھات سے زیادہ نہ رہے گی استعمال
کی کئی صورتیں ہیں ۔ پونجی فضول خرچ کر کے ہم دوبارہ مفلس بن سکتے ہیں
پونجی کو ایسی مد میں لگایا جا سکتا ہے جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہو یا سوچ سمجھ کر
پونجی کو کسی سود مند کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے تعلیمی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ
ہم جس طرح چاہیں جس کو چاہیں جو چاہیں پڑھائیں تعلیمی آزادی کا مطلب یہ
ہے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم بلکہ یوں کہیئے مکمل نصاب تعلیم میں حسب ضرورت
مناسب رد و بدل کرنے کی آزادی، سات کروڑ بندگان خدا کو جہالت کی تاریکی
سے نکالنے کے لیے نہایت تفصیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے
میں مفصل تعلیمی رپورٹوں کی ترتیب وتدوین بھی ایک امر ناگزیر ہے پاکستان کے
ماہرین تعلیم خواہ وزارتوں میں ہوں خواہ یونیورسٹیوں میں خواہ خالص علمی حلقوں
میں کئی ماہ سے غیر معمولی خلوص اور محنت سے اس قسم کی رپورٹیں مرتب کرنے
کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کوششوں کے نتائج تاحال برآمد نہ ہو سکنے
کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف تعلیمی مسائل پیچیدہ ہیں بلکہ ہمارے سامنے تعلیم کا
نصب العین بھی مکمل طور پر واضح نہیں بہت سی حقیقی اور واضح چیزیں غیر حقیقی
اور مبہم چیزوں سے کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکی ہیں کہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے ،

موجودہ طریق تعلیم کو گذشتہ کئی برسوں سے بالاتفاق آراء مذموم قرار دیا
جاتا رہا ہے موجودہ نظام تعلیم سے بے اطمینانی و بددلی کے احساسات ہر جگہ
موجود تھے اگرچہ ان جذبات کے اسباب وعلل مختلف تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان
بنتے ہی لوگوں نے فوراً اس طرف توجہ کی اور موجودہ نظام تعلیم کے نقائص سے
آزاد ہونے کی مساعی شروع کر دیں ۔ موجودہ نظام کے نقائص وعیوب کی مفصل
و مکمل فہرست تیار کرنا تو یقیناً بے حد دشوار ہے تین باتوں پر غالباً سب متفق
ہوں گے

اول تو انگریزی زبان کی حیثیت .... ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں

انگریزی کو ذریعہ تعلیم اور لازمی مضمون ہونے کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے وہ صرف قومی بلکہ خاص علمی نقطۂ نگاہ سے بھی بے حد قابلِ اعتراض ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ یہ طالب علم کی ذہنی نشو و نما کو محدود بھی کر دیتا ہے یونیورسٹی کی تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور اس اقدام کا جواز بجز ہمارے نظام کے بانی کی حماقت خالص دعزور لے جا کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی ناقومیت .... اس "ناقومیت" کے مختلف مظاہر ہیں مثلاً ایک طرف تو یہ کہ دیسی ملکی قومی زبانیں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف مادی اعتبار سے فضول و بے سود ہے بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ناکارہ اور لایعنی ہے

تیسری خصوصیت یہ ہے ہماری تعلیم کی "محدودیت" .... پڑھے لکھے لڑکوں اور مردوں کی تعداد پندرہ فی صد سے بھی کم ہے اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہیں اور عورتوں کا تناسب فی صد تو اس سے بھی کہیں کیا گزرا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نقائص کو دور کرنے کا ہمارے پاس کیا طریقہ ہے ابھی تک ہم کسی آخری فیصلے یا قطعی نتیجے پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن بحث و تمحیص کے دوران میں بعض جدید رجحانات اور نئے میلانات منظر عام پر آئے ہیں ان کا جائزہ بے سود نہ ہوگا۔ مثلاً زبانوں کے مسئلہ پر کراچی کی تعلیمی کانفرنس میں بہت کچھ کہا گیا لیکن پھر بھی بہت کچھ نہیں کہا گیا۔ صدر نے خطبہ صدارت میں کہا تھا کہ:

> پاکستان میں صوبائی زبانوں کو
> نشو و نما کے زیادہ سے زیادہ موقع
> ہم پہونچانے چاہئیں چنانچہ ہمیں
> ان صوبائی زبانوں کو مختلف صوبوں

میں نہ صرف ذریعہ تعلیم قرار دینا ہوگا
بلکہ دیگر ایسے طریقے بھی اختیار کرنے
ہوں گے جن سے وہ تہذیب و تمدن
جو کسی خاص صوبائی زبان سے مختص
ہے اس زبان کے توسط سے ترویج
و ترقی پا سکے۔ لیکن اس کے ساتھ
ساتھ ہمیں یہ بھی مد نظر رکھنا ہوگا کہ
ہماری (پاکستانی) کلچر کی وحدانیت
و یگانگت کو صدمہ نہ پہونچنے پائے
ثقافتی وحدت کو برقرار رکھنے اور
مختلف صوبوں کے درمیان ذریعہ مراسلت
و مکاتیب و اظہار و استظہار کا کام
لینے کے لئے ایک خاص زبان کی
ضرورت ہے اور اس سلسلے میں
اردو زبان کے حقوق خاص طور پر قابل
غور ہیں اردو نہایت آسانی اور عمدگی
سے بیرونی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر
سمونے اور جذب کرنے کی صلاحیت
رکھتی ہے اردو کا تعلق فارسی عربی
سنسکرت اور انگریزی سے تاریخی
ہے اردو میں گراں بہا ادبی سرمایہ
موجود ہے ان سب وجوہ کی بنا پر میں
سمجھتا ہوں کہ اردو پاکستان کی قومی
زبان بننے کی مستحق ہے۔ جہاں تک انگریزی

کا تعلق ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ

تعلیم قرار دینا یقیناً مضرت رساں
ہے لیکن پھر بھی آئندہ کئی سال
تک ہمیں انگریزی زبان کو یونیورسٹی
کی تعلیم میں اور بین الاقوامی مراسلت
ومکاتبت کے ذریعے کی حیثیت سے
صف اول میں جگہ دینا پڑے گی گذشتہ
تیس چالیس برس سے فرانسیسی
کی جگہ انگریزی دنیا کی ممتاز ترین زبان
ہوتی جارہی ہے علاوہ ازیں محض
ذاتی منفعت کے نقطۂ نگاہ سے
قطع نظر ہمیں اس قدر جلد ایک
ایسی زبان ہاتھ سے نہیں کھودینی
چاہیے جو نہایت آسانی سے ہمیں
مغربی سائنس اور کلچر سے روشناس
کراتی ہے ۔

فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا
ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے لہذا ان زبانوں
کے مطالعے کو بھی ہمارے نظام تعلیم
میں ممتاز حیثیت حاصل ہوگی ۔

(خطبہ صدارت پہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)

اس اقتباس کو دو مرتبہ پڑھنے کی ضرورت ہے پہلی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس میں ہماری قیادت کا کافی سامان ہے لیکن دوسری دفعہ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں ایک پیچیدہ مسئلہ کو صرف بیان کیا گیا ہے حل معلوم کرنا محال

باقی ہے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ نہیں تو نصف درجن زبانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کو خاص اہمیت دی جائے گی کلچری یگانگت و وحدانیت کی خاطر صوبائی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما کا موقع دیا جائے گا توسیع کی خاطر انگریزی کو صف اوّل میں جگہ دی جائے گی۔ منفعت کی خاطر فارسی اور عربی کو ممتاز جگہ دی جائے گی ثقافتی اثاثہ کی حفاظت کے سبب اب سوال یہ ہے کہ آیا تکمیل حیات ملی کی خاطر ہمارے لئے ان تمام زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے یا ان میں حقِ انتخاب یا کم از کم حقِ ترجیح بھی ہو سکتا ہے مختلف صوبوں میں مختلف حلقوں میں اس مسئلہ پر غور و فکر ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک کہیں سے نصِ قطعی کے صدور کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

زبان اردو کے متعلق مختلف نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے صدارتی خطبہ میں اسے پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) بننے کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بہت غیر واضح اور مبہم سی بات ہے اور بعد کے مباحث سے ظاہر ہوا کہ اس سے مختلف معانی تعبیر کرنا ممکن تھا مثلاً اس مسئلہ پر جب کمیٹی میں بحث ہوئی تو کمیٹی نے سفارش کی کہ اردو کی تعلیم و تدریس کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے اور اسے بتدریج زیادہ سے زیادہ حد تک ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے دوسرے لفظوں میں مشرقی پاکستان والے اسکولوں میں بنگالی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں۔ یہ تو ہوئی کمیٹی کی سفارشیں جن میں پنجابی ماہرینِ تعلیم کی اکثریت تھی لیکن جب معاملہ پوری کانفرنس میں پیش ہوا تو مشرقی بنگال نے اس کی زبردست مخالفت کی اور آخری جو سمجھوتہ ہوا اس کی حیثیت کچھ نیم صدوں نیم پردوں کی سی تھی کانفرنس نے مجلس دستور ساز سے سفارش کی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حیثیت اس سے بھی کمتر تھی جو اسے صدارتی خطبے میں دی گئی تھی کانفرنس نے یہ بھی سفارش کی کہ اردو کی تعلیم کو تمام

اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے لیکن اسے کس منزل سے شروع کیا جائے۔ اس کے تعین کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دے دیا گیا۔ صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو اسے ذریعہ تعلیم بنائیں اور نہ چاہیں تو نہ بنائیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ اردو کو اکثر قومی زبان کے خطاب سے نوازا جاتا ہے لیکن وقت آنے پر صورت مختلف ہو جاتی ہے ممکن ہے سیاسی رہنماؤں کی زیر قیادت مشرقی بنگال اردو زبان سے قطعی بے تعلقی کا اعلان تو نہ کرے لیکن مشرقی بنگال میں اردو زبان کے لیے بیش از بیش جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت ہے جب تک انگریزی موجود ہے اس وقت تک ایسے صوبے کے لیے اردو کا قومی زبان (لنگوا فرانکا) ہونا بھی زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتا۔ سندھ اور صوبہ سرحد نے پنجاب کا ساتھ دے کر اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ آگے چل کر اگر سندھی نہیں تو پشتو یہ دعوے نہ کر دے کہ قومی یگانگت کے اندر ثقافتی انفرادیت کے تحفظ و بقا کی خاطر پاکستان کی تعلیمی ترقی میں مجھے اور زیادہ اہمیت ملنی چاہیے۔

مغربی پاکستان تو بلاشبہ اردو کا سب سے بڑا پرستار ہے مغربی پنجاب میں پنجابی کی حمایت کو وطن سے غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ پنجابی کو سکھوں نے اپنی مذہبی زبان قرار دیا ہے ممکن ہے جب سکھوں کی یاد بھی فراموش ہو جائے تو پنجابی کا یہ گناہ بھی معاف ہو جائے لیکن اس سے پہلے نہیں لہٰذا مغربی پنجاب میں اردو نہایت آسانی اور سہولت سے اپنا راستہ طے کر رہی ہے۔ حسب ماضی میں تقسیم سے پہلے اردو کی ترویج و ترقی میں جن لوگوں نے روڑے اٹکائے وہ غیر مسلم نہیں بلکہ وہ قدامت پرست تھے جن کے نزدیک عروج و زوال عربی فارسی کے مترادف تھا انھوں نے اپنے علاوہ چند اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بھی خیال تمام راسخ کر دیا کہ چونکہ اردو اور ہندی دونوں "جدید ہندوستانی زبانیں" ہیں لہٰذا اردو کی ترویج و ترقی کے سارے منصوبے دشمن

کی پالیسی ہیں اور ان چاروں کو مزدور ناکام بنانا چاہیے، خواہ اس میں لنبا عرصہ ہی کیوں نہ لگ جائے لیکن اب اس قسم کے خیالات کا وجود نہیں چند ہی ماہ کے عرصہ میں پنجاب سکول بورڈ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دو تین سال ہی کے عرصے میں تمام اسکولوں میں اردو ذریعۂ تعلیم ہو جائے گی اور یونیورسٹی نے بھی انٹرمیڈیٹ بی۔ اے میں اردو کو دیگر انتخابی مضامین کے برابر اہمیت دی ہے۔

اردو کی حقیقی ترقی کا کام واقعی محنت طلب ہے یونیورسٹی میں تمام مضامین کے لیے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ اردو میں ان مضامین پر کس قدر جلد کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اور کتابوں سے مراد محض نصاب کی کتابیں ہی نہیں بلکہ اعلیٰ و تحقیقی مواد جو طالب علم اور استاد دونوں کے ذہنی آفاق کے لیے وسعت اور پس منظر کے لیے پختگی کا سامان میسر کرے یہ کام اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ بجز حکومت کے شاید اور کوئی ادارہ اتنا بڑا کارخانہ قائم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا لیکن تاحال اس قسم کے اقسام کی کوئی علامتیں ظاہر نہیں ہوئی ہیں۔

ہماری تعلیم کو ہمارے قومی جذبات و تصورات ہمارے ہی مقاصد اور نصب العین کے مطابق بنانے کے لیے فکری تشکیل نو کی ضرورت ہے چنانچہ اس سلسلے میں کراچی کانفرنس میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئیں۔

پاکستان کے نظامِ تعلیم کی اساس اسلامی طرزِ فکر پر پڑنی چاہیے خصوصاً عالمگیر اخوت رواداری اور عدل و انصاف کے اوصاف حسنہ پر زیادہ زور دیا جائے۔

عرفِ عام میں ہم اسے آزاد (لبرل) اعلان کہہ سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بالاتفاق منظور کر لیا گیا تھا در حقیقت اس قرارداد نے بہت سے ماہرینِ تعلیم میں تشنگی باقی رہنے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ جن اوصاف پر یہاں زور دیا گیا ہے وہ اسلام سے مختص نہیں کوئی مذہب بھی ان کے اپنے ہونے کا دعوے کر سکتا ہے ان کا نظریہ تھا

کہ اوصاف و خصائل کی جگہ "عقائد" کا لفظ استعمال کیا جائے اور عالم گیر اخوت رواداری اور عدل کی جگہ توحید رسالت و آخرت کو دی جائے کیوں کہ ان کے نزدیک موخرالذکر عقائد ہی اسلام کا طرۂ امتیاز تھے اس سے اجمالاً یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سے طریقۂ فکر ہماری تعلیم پر غلبہ پانے کے لیے برسر پیکار ہیں۔ اور ابھی تک "آفاقیت" اور "قومیت" کا مجادلہ ختم نہیں ہوا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری تعلیم اسلامی رنگ میں رنگی جائے گی کیونکہ طلباء اور اساتذہ، منتظمین، مصنفین، ممتحنین میں اکثریت مسلمانوں کی ہو گی۔ لیکن سوال محض تشکیل نو کی ماہیت اور وسعت کا ہے اگر اس مسئلہ پر آزادانہ بحث کا پورا موقع دیا جائے تو ہماری قوم کی ذہنی کشمکش مختلف مظاہرہ میں عیاں ہو جائے گی اور اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ہر کمیٹی سب کمیٹی پینل یا بورڈ جو مجوزہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے وہ اس ذہنی کشمکش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے چلئے یہ مان لیا کہ ہماری تعلیم میں قومی رنگ ہونا چاہیے لیکن "قومیت" کے مفہوم میں اختلافات ممکن ہیں اور یہ اختلافات ہر جگہ پر اپنا سر اٹھا دیتے ہیں۔ مثلاً ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن عربی بھی ہے کیونکہ "قومی" کا مطلب "پاکستانی" بھی ہو سکتا ہے "مسلم" بھی ہو سکتا ہے لیکن بعض ماہرین تعلیم نے تو نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ عربی کو مدرسوں کے ابتدائی مدارج میں ہی لازمی قرار دیا جائے۔ پنجاب کی ایک سلیبس کمیٹی میں یہ احساس قوی تھا کہ مڈل سکول میں عربی اور فارسی کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ لیکن اس تجویز کو اس خدشہ کی بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ اگر طلباء کو حق انتخاب دیا گیا تو وہ زیادہ تر عربی کی بجائے فارسی چن لیں گے اس سے کم از کم والدین اور نصاب مرتب کرنے والوں کی آراء کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری کشمکش ادبی اور افادی مضامین کے بارے میں ہے افادیت کے حامی ادبی مطالعہ کو محض تعیش تصور کرتے ہیں اور جہاں کہیں ان سے بن پڑتا ہے وہ اقبال کے قومی شاعر ہونے کی توجیہہ و تاویل پیش کرتے ہیں ان دو الجھنوں کے علاوہ دو اور

بڑی بڑی الجھنیں ہیں: "موعظ بر مقابلہ استاذ ......" فارسی صرف، گلستان کے ذریعے پڑھائی جا سکتی ہے، فارسی کیلئے سعادت پڑھنے کا محض ایک ذریعہ ہے (۲) مذہبی طرزِ فکر بر مقابلہ عقلی طریق فکر ...... کیا تاریخ فلسفہ کو انسانی فکر و ذہن کے ارتقاء کے مطالعے کی حیثیت سے پڑھایا جائے یا محض کلماتِ کفر کے مجموعے کی حیثیت سے

یہ الجھنیں ہمیں ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں ہمیں ایک طرف زاہدانِ خشک کا پیش کیا ہوا اسلام اور دوسری طرف قوتوں اور تحریکوں کا حقیقی یا غیر حقیقی چیلنج نظر آتا ہے اس امر پر زبردست اختلاف ہے کہ کس حد تک اسلام بغیر اپنی مخصوص اساس کھوئے افکار جدید کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا ہم جدید ہونے کے ساتھ ساتھ "اسلامی" بھی ہو سکتے ہیں؟ کسی نے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ آیا ہمارے لئے واقعی اسلامی ہونا بالکل ضروری ہے سوال ہمیشہ یہ کیا گیا ہے کہ آیا ہمیں "ماڈرن" ہونے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات مختلف اور متضاد ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح ان سب کو ایک نہج میں پرونا ہوگا ورنہ ہمارا نظام تعلیم ہماری احتیاجات کا بار اٹھانے کی استعداد سے محروم ہو جائے گا۔ سرسید کے زمانے میں بھی اس قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں اس وقت بھی سطح پر ابھر آئی تھیں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سرسید پر ہندوستان میں اسلام کی بیخ کنی کا الزام دہراتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی ہمیں روحانی اور ذہنی سکون حاصل نہیں۔

اس مسئلے کا حل یا تو وقت کے ہاتھوں ہو سکتا ہے اس میں دیر لگے گی یا زبردست جنگ کے ذریعہ اس میں خدشہ ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب ہوگی یا قابل قیادت کے توسط سے جو اس وقت موجود معلوم نہیں ہوتی جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی مباحث کا نتیجہ سمجھوتہ اور اشتراک نہیں۔ بلکہ اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا رہے گا اشتعال کی علامتیں ابھی سے ظاہر ہیں۔ اگر ہم ہر

مختلف نقطۂ نگاہ کو تسلیم کر کے اپنے نصابوں میں اضافہ کرتے گئے تو طلباء تو ایک طرف رہے ہماری تعلیم بجائے خود اس بار گراں کی شاید متحمل نہ ہو سکے، ہر تجویز کو اس شدومد سے پیش کیا جاتا ہے اور اسے لازمی قرار دیئے جانے پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظام کے تحت جو طالب علم بھی کامیاب ہو کر نکلے وہ ایک ہی وسیع طریق کے مطابق چلا رہا ہو۔ اب تک انگریزی اردو، فارسی، عربی، دینیات، اسلامی تاریخ، عسکری تربیت اور سائنس ان سب کو لازمی مضامین قرار دیئے جانے کی تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں کہا گیا ہے کہ انہیں نہ صرف کالجوں اور سکولوں میں بلکہ مقابلے کے امتحانوں میں بھی لازمی قرار دے دیا جائے ہمارے سامنے جو خطرہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعلیم کا مواد بہت کم ہوگا، بلکہ یہ کہ بہت بھاری ہو گا۔ اس قدر بھاری کہ یا تو تعلیم بالکل ناممکن ہو گی یا تو بالکل فضول ہوگی۔

تعلیمی حلقوں میں انگریزی کے متعلق بہت کم کچھ کہا سنا جاتا ہے بس خاموشی سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگریزی ابھی جاری رہے گی لیکن انگریزی کی پرجوش حمایت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بین الاقوامی رتبہ اور اہمیت کا تو احساس ہے لیکن اس کی معاشری اہمیت پہلے ہی بہت کم ہو چکی ہے۔ اور اس کی کلچری وقعت سے اگرچہ اعلانیہ انکار تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اسے پسند نہیں کرتے ان حالات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا یا یہ کہ آیا اس کا مستقبل بھی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کے خلاف جو معاندانہ جذبہ پایا جاتا ہے خواہ وہ فطری اور حقیقی ہو اور خواہ انتقامی ہو اس کا بالآخر اثر یہ ہوگا کہ اس معمول کی تعلیم کا معیار گر جائے گا ایسے ماہرین تعلیم بھی موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حال کو خالی از خطرہ تصور نہیں کرتے ان کا کہنا ہے ہمیں منصور و ہارون و مامون کے بغداد کے مقابلے کا بغداد علمی از سر نو تیار کرنا پڑے گا لہٰذا ہمیں زبانہ حال کو زمانہ قدیم بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجعت

الی الوطن سے پہلے ہم اس سے مغربی سائنس اور کلچر کے تمام راز ہائے سربستہ اخذ کر چکے ہوں لیکن بظاہر علامات سے پتہ چلتا ہے کہ ہم اپنے کلچر اور زبانوں کے تحفظ و بقا کے جوش و خروش میں اس انگریزی زبان سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لیں گے جو ہمارے لئے منفعت بخش ہو سکتی ہے۔

ان خطرات، مشکلات اور الجھنوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک واقعاتی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً سائنٹیفک بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ٹیکنالاجیکل تربیت کی خواہش پاکستان میں اس وقت سب سے بڑی اپنگ ہے زندہ رہنے کی اپنگ اس وقت دنیا کے کونے کونے سے آوت جنگ کی جھنکار سنائی دیتی ہے حتیٰ کہ اس نوزائیدہ مملکت کو بھی اپنے حالات کو صنعتی اور جنگی نقطۂ نگاہ سے جانچنا پڑتا ہے یقیناً مذہب کی روح بے شک سائنس کی جان ہے لیکن زندہ رہنے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی اپنگ اس شدید حد تک قوی ہے کہ بڑے سے بڑا اقدامت پرست ملا بھی سائنس کو محض چند ظاہری شرائط کا پابند بنا کر منظور کرنے کو تیار ہے، سائنس دانوں، ٹیکنیکل ساز و سامان کی مانگ کو بلا رد و کد فوقیت اور برتری دی جاتی ہے اور تعلیمی مباحث میں سائنس ایک ایسا طلسماتی لفظ ہے جس سے اختلاف آرا پر مہر لگ جاتی ہے غالباً یہی وہ نکتہ اتفاق ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کو دور کرنے کا باعث بن سکتا ہے ہمیں سائنس کی زیادتیوں کا پتہ ہے ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سائنس کا نظریۂ حقیقت و صداقت، بہت محدود اور تنگ ہے ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ سائنس حسن و مسرت کے سے لطائف کو سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہے اور نہیں اس کے غیر اخلاقی و اخلاقیات سے بے نیاز نقطۂ نظر کا بھی علم ہے لیکن ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اگر سائنس ہمیں اپنی الجھنوں اور پریشانیوں سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے تو اس کی راہ چلنا اس سے بدتر راہ چلنے سے بہتر ہے۔

اختتام سے قبل تعلیم عامہ و تعلیم بالغاں کے بارے میں بھی دو چار کلمے مناسب رہیں گے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تعلیم کی موجودہ رفتار جاری رہی تو ملک بھر سے ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے لیے کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو سال درکار ہوں گے اگر ہم فوق الطبیعیاتی کوشش کا مظاہرہ کریں اور اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لے آئیں یعنی یہ کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو استاد بنا دیں اور ہر گلی کے کونے کو اسکول بنا دیں تو ڈیڑھ سو سال کا کام ربع صدی میں نمٹ پا سکتا ہے افسوس ہے کہ اس محاذ پہ کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ برطانوی راج پر سب سے بڑا داغ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ہمارے فائدے کے لیے نہیں بلکہ اپنے فائدے کے لیے پڑھایا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہوگا اگر ہمارے ارباب اختیار بھی برطانوی روایت کو برقرار رکھیں اور اسے نہایت احتیاط سے پروان چڑھاتے رہیں

ایڈیٹنگ کا فن

اگر خوش قسمتی سے مجھے دس حضرات بھی ایسے مل جائیں جو اس مضمون کو پڑھنا گوارا کریں تو ان میں سے کم از کم ایک بزرگوار تو ایسے ضرور ہوں گے جنہیں سینما سے نفرت ہے اور اظہارِ نفرت میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے باقی حضرات میں بھی بعض ایسے ہوں گے جو کبھی کبھی اس گناہ کا ارتکاب تو کر بیٹھتے ہیں لیکن اقبالِ جرم نہیں کرنا چاہتے اور اکثر اوقات اپنے سینما تشریف لے جانے کی تاویل یوں فرمایا کرتے ہیں۔

"کل شام کو کوئی شغل نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں میری بیوی رونلڈ کالمین کے فلموں کو بہت پسند کرتی ہے میں نے سوچا کہ لاؤ ہم بھی چلے چلیں چنانچہ ہم ....."

لیکن اس جگہ نہ تو میں ان اصحاب کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں جنہیں سینما سے نفرت ہے نہ دوسرے گروہ کو جسے بیوی کے سر الزام تھوپنے میں لطف آتا ہے اس لطف و مسرت سے محروم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر سینما واقعی آرٹ کہلانے کے قابل ہے اور اس کے کمالات کا کوئی جداگانہ مظہر اور اس کے آرٹ کا کوئی مخصوص ذریعۂ اظہار ہے تو وہ کیا ہے۔ مصور کے کمالات کا مظہر خطوط اور رنگ ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فلم کار کن چیزوں سے کام لیتا ہے۔ اس کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس مواد کے امکانات کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے اس قسم کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ فلم کیوں کر بنایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح ہمیں یہ بتانے میں آسانی ہوگی کہ سینما میں کس قدر

وسعت ہے آپ جانتے ہیں کہ فلم متحرک کیمرے کی تصویر کے ایک سلسلہ کا نام ہے جو یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں یا یوں کہیے کہ سینما کے شاٹ جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں، تو انہیں فلم کہا جاتا ہے۔ شاٹ فلم کے ایک ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کی تصویر متحرک کیمرہ میں بیک وقت لی جاتی ہے جہاں تسلسل ٹوٹا۔ شاٹ ختم ہو جاتا ہے جب کیمرہ دوبارہ چلنے لگتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔

قصہ (یا جو کچھ بھی فلم کا موضوع ہو) کے انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ فلم نامے کا مرتب کرنا ہے۔ میں یہ تو تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ فلم نامہ کتنے مرحلوں کے گزرنے کے بعد تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے بلکہ میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ فلم نامے میں قصے یا موضوع فلم کی تمام روئداد کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے "شاٹوں" میں تقسیم کیا جاتا ہے ہر شاٹ کا حال پورے تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اس کی تمام جزئیات کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے گویا وہ تمام اجزا جن کی ترکیب سے فلم کی تکمیل ہوتی ہے اسی ترتیب اور تقدم و تاخر کے ساتھ قلم بند کر دیئے جاتے ہیں جس ترتیب کے ساتھ انہیں پردے پر دکھانا منظور ہے، ہر شاٹ کے متعلق پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شاٹ کا موضوع کیا ہوگا۔

آیا وہ یکبارگی نمودار ہوگا۔ اور یکبارگی غائب ہو جائے گا (یا سینما کی اصطلاحی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ اسے ابتدا میں اور خاتمہ پر کاٹا جائے گا) یا وہ ابتدا میں بتدریج نمودار ہوگا اور خاتمہ پر بتدریج غائب ہو جائے گا، اور آیا تصویر کے نمودار ہونے اور غائب ہونے کا یہ عمل آہستہ آہستہ ہوگا یا بسرعت اور اگر یہ دونوں صورتیں نہیں تو کیا وہ پہلے شاٹ میں سے رفتہ رفتہ نمودار ہو کر اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جائے گا جسے اصطلاح میں عمل تحلیل کہتے ہیں اور آیا عمل تحلیل آہستہ آہستہ ہوگا یا تیزی سے پھر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شاٹ لیتے وقت کیمرہ ایک ہی جگہ رہے گا یا آگے بڑھ کر معمول کے قریب ہو جائے

گا یا پیچھے ہٹ جائے گا یا اس کے متوازی حرکت کرے گا۔ اور یا گھوم کر پورے منظر کی تصویر لے گا۔

" فلم نامہ میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ جس چیز کا شاٹ لیا جا رہا ہے، کیمرہ اس کے سامنے اتنی ہی بلندی پر ہو گا جتنی بلندی پر انسان کی آنکھ ہوتی ہے یا کسی اور نقطۂ یا زاویے سے شاٹ لیا جائے گا۔ کیمرہ اس سے کس قدر فاصلے پر ہو گا۔ شاٹ قریبی ہو گا یا وسطی یا بعیدی۔ غرض فلم نامے میں ان تمام سوالوں کے جواب اور ہر شاٹ کے متعلق تفصیلی ہدایتیں موجود ہوتی ہیں۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فلم نامہ میں شاٹ اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں جس ترتیب سے انہیں پردے پر دکھایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاٹ لیتے وقت بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ شاٹ تو اسی ترتیب سے لئے جاتے ہیں جس میں زیادہ سہولت ہو۔

فرض کیجئے کہ ایک کہانی کا آغاز لاہور سے ہوتا ہے اور خاتمہ بمبئی میں۔ اگر ضرورت پڑے تو آپ بمبئی کے تمام سین پہلے لے لیں گے۔ اور لاہور کے بعد میں۔ اور پھر انہیں فلم نامے کے مطابق مرتب کر لیں گے اور اگر کیفیت یہ ہو کہ کہانی کا ایک سین تو ایک مقام قدرتی یا سٹوڈیو میں مصنوعی طور پر تیار کردہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے سین کا تعلق کسی دوسرے مقام سے ہو اور مناظر کے مقامات متواتر اسی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں، جیسا کہ اکثر فلموں میں ہوا کرتا ہے تو آپ وہ تمام مناظر جو ایک جگہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک مرتبہ لے لیں گے۔ اور پھر دوسری جگہ پہنچ کر تمام متعلقہ مناظر کا عکس لے لیا جائے گا اس بات کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ ترتیب کے لحاظ سے جو سین پہلے ہے اسے پہلے لیا جائے۔ اور جو بعد میں ہے اسے بعد میں فلم بند کیا جائے۔ اس کے بعد آپ گھر آ کر تمام عنوانات کے فوٹو لے لیں گے۔ جب تمام واقعات اور عنوانات کا عکس لے لیا جائے گا تو سلولائڈ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک ایک شاٹ الگ الگ کر لیا جائے گا پھر ہر شاٹ

میں کسی قدر کانٹ چھانٹ ہوگی، ہر شاٹ کے دونوں سروں پر کسی قدر زائد فلم لے لیا جاتا ہے تاکہ بعد میں اُسے کاٹ کر تناسب پیدا کر دیا جائے اور آخر میں یہ شاٹ مناسب ترتیب کے ساتھ جوڑ دیے جائیں گے اور فلم کی تکمیل ہو جائے گی۔ فلم کی قطع و برید اور از سرِ نو شیرازہ بندی جسے تدوین یا ایڈیٹنگ کہتے ہیں، فلم سازی کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ بعض ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو حقیقت میں فن اسی کو سمجھتے ہیں۔

سینما ایک "صوری" فن ہے۔ تمام صوری فنون سے کم عمری کے باوجود اسے ایک حیثیت سے ان پر فوقیت حاصل ہے تمام صوری فنون "حرکت" کے اظہار سے قاصر ہیں۔ بہت ہوا کنایۃً "حرکت" کا مفہوم ادا کر دیا لیکن فلم کو یہ دشواری نہیں وہ "حرکت" کو بیّن اور واضح طور پر ظاہر کر سکتا ہے عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے کیونکہ فلم میں تو کوئی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان ہو اور جس میں واضح طور پر حرکت نظر آئے اور وہ فلم ہی کیا ہے جس میں حرکت اور اس کا اتار چڑھاؤ اس کا تھم جانا یا رک جانا اور یا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ امتیاز فلم کو ہی حاصل ہے کہ مسلسل حرکات اور روانی کو اس کا اصول موضوعہ قرار دیا جا سکتا ہے گویا فلم کا آغاز حرکت سے ہوتا ہے اور ایک شاٹ سے دوسرے شاٹ کے درمیانی فاصلہ میں بھی تسلسل یا روانی موجود ہوتی ہے اور یہی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ نے بہتر سے تصویر دار پوسٹ کارڈوں کے البم تو دیکھے ہوں گے جن پر تفریح گاہوں اور صحت افزا مقامات کے مناظر ہوتے ہیں۔ یہ تصاویر ایک خاص تعلق کی بنا پر ایک دوسرے سے منسلک تو ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں یہ خاصیت کہاں ہے کہ ایک تصویر دوسری تصویر میں ڈھل جائے اور اس تواتر تحلیل سے ایک تسلسل پیدا کرے یعنی فوٹو سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ لیکن یہ کون بتائے گا کہ کیوں کر ہوا؟ اس

کے اظہار پر صرف فلم ہی قادر ہے۔ جب تک واقعہ کی پوری ترتیب اور پوری صورت اور کیفیت اس کی بالذوا طیہ سمجھ میں نہ آجائے لطف نہیں آتا۔

ناولسٹ الفاظ میں منظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ ڈراما نگار مکالمے سے یہ کام لیتا ہے۔ فلم نگار کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ فلم نامہ لکھنے کے لیے قلم اٹھائے تو اس کے ذہن میں ایسی مرئی اشکال ہوں جو بہ آسانی ایک دوسرے پر ڈھلتی چلی جائیں۔

ایک کہانی میں جو فلم کے لیے لکھی گئی ہے ایک فقرہ یہ ہے۔

• زید اس کے مکان میں اکثر آیا کرتا تھا۔ یہ جملہ بحیثیت فقرے کے بامعنی اور اظہار مطالب پر پوری طرح قادر ہے۔ لیکن اسے بعینہٖ فلم کی صورت میں منتقل کر دینا ناممکن ہے۔ ناولسٹ کے قلم سے جب یہ جملہ نکلا تھا تو اس کے ذہن میں اشکال و صور نہیں بلکہ الفاظ تھے۔ یہ تو اس صورت میں فلم کے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں الفاظ کے بجائے تصاویر ہوتیں۔ اکثر ایک غیر معین عدد ہے جس کے معنی کئی مرتبہ کے ہیں۔ اگر فلم میں زید کو اس مکان پر پانچ چھ مرتبہ آتا دکھایا جائے تو کہیں جا کر اکثر کا مفہوم پورا ہو گا لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر کا مفہوم ادا کرنے کا یہ طریقہ بے حد سر خانہ ہے ایک فلم میں یہ مشکل اس طرح حل کی گئی تھی کہ زید مکان میں قدم رکھتا ہے تو بچے خوشی سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور کتا اچھلتا اور دم ہلاتا اس کی جانب لپکتا ہے۔ اس طرح تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ زید اس مکان میں نووارد نہیں بلکہ اکثر آتا ہے۔

• لسے ووس آف پیرس "، نام فلم میں جس کا ڈائریکٹر چارلی چپلن تھا یہی مفہوم زیادہ لطیف طریقے پر ادا کیا گیا ہے مکان میں نہ تو بچے دکھائے گئے ہیں۔ اور نہ کوئی پالتو حیوان تھا نوکروں کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا۔ زید ایک مکان میں داخل ہوتا ہے صوفے پر جا بیٹھتا ہے کچھ دیر سیکسوفون بجاتا رہتا ہے پھر اسے خیال آیا ہے کہ میرے پاس رومال نہیں وہ بغیر کسی پس و پیش

کے اٹھتا ہے اور دوسرے کمرے میں جاکر اور نہایت بے تکلفی سے ایک دراز کھول کر ایک رومال نکال لیتا ہے۔

لیکن یہ تو ایسی مثالیں ہیں کہ کہانی پہلے موجود تھی۔ بعد میں اسے فلم کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بہتر یہ ہے کہ تصاویر سے کہانی مرتب کی جائے گی۔ گویا تصویر بمنزلہ بیج کے ہے جو کہانی کے پودے کو جنم دیتی ہے اس کے برعکس کہانی کو بیج اور تصویر کو پودا فرض کر لینا سخت غلطی ہے میں یہاں بعض اچھے فلموں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں جس کی ترتیب میں کسی خاص غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک نقاد نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہی فہرست بطور دلیل پیش کی ہے۔

دی کرونز ٹوبکن، دی کیبنٹ آف ڈاکٹر کیلی گاری اے وومن آف پیرس دارننگ شیڈوز دی سالویشن ہنٹرز۔ دا یول، دی پلگرم۔ برلن اور دی میرزیج سرکل۔

یہ سب کے سب کامیاب فلم ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی کسی ناول یا ڈرامے سے ماخوذ یا مختار نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب کسی ناول کو فلم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹرنس کو لیجیے۔ فلم میں خیر ایک تو یہ جاہلانہ تصرف کیا گیا ہے کہ کہانی کو مسرت انجام بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے ذرا قطع نظر کر کے دیکھیے تو بھی فلم اکثر حیثیتوں سے ناکامیاب نظر آئے گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹامس ہارڈی نے جو مطالب الفاظ میں ادا کیے ہیں۔ انہیں تصاویر میں ظاہر کرنے کے لیے ہارڈی جیسے نکتہ رس دماغ کی ضرورت نہ سہی اتنا تو ضروری ہے کہ فلم کار تصاویر کے فن میں اتنی ہی مہارت رکھتا ہو جتنی مہارت ہارڈی کو الفاظ کے فن میں تھی لیکن بدقسمتی سے وہ بے چارہ اس مہارت اور قابلیت سے محروم تھا۔ اس فلم کے بہترین حصے جن میں فلمکار نے بزعم خود بڑا کمال صرف کیا ہے دیکھیے تو زیادہ سے زیادہ آپ اسے ہارڈی کی کتاب کا بھدا سا مصور ایڈیشن کہہ لیجیے

گا۔ اب اس کا مقابلہ ایک اور فلم پیٹراٹ سے کیجئے یوں تو وہ بھی ناول سے ہی ماخوذ ہے لیکن جو نکتے میں پیش کر رہا ہوں اسی کے اعتبار سے بے حد کامیاب اور مختلف حیثیات سے جامع ثابت ہوا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فلم کا ڈائریکٹر لرانسٹ لوبش جیسا شخص ہے جس کا شمار کاملین فن میں کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں فلم کی کامیابی کا راز خود ناول میں نہاں ہے میں ذیل میں ناول کے ایک حصے کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

" یکایک فوجی افسر تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کا ایک ہاتھ سلام کے لیے ٹوپی پر جا پہنچا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی بے حس و حرکت مورت کھڑی ہے۔ مزار کے پیش خدمت کا دھڑ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اور سارا جسم دوہرا ہو گیا تھا اس کے کولہوں کو دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اس کے کندھے زانوؤں کے ساتھ پیوست ہو گئے تھے۔ پیشانی پر رگیں ابھری ہوئی تھیں اور سر سینے کے ساتھ جا لگا تھا۔

زار دروازے میں کھڑا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے پھڑک رہے تھے۔ برآمدے میں جس قدر لوگ تھے وہ انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اس کی نظریں ان سے گذر کر برآمدے کے بیرونی حصے تک جا پہنچی تھیں۔ زار اس کیفیت میں سڑق کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کے چہرہ پر بدستور وہی محویت چھائی ہوئی تھی اس کا داہنا کندھا بائیں کندھے سے اونچا معلوم ہوتا تھا۔ اور بار بار پھڑکتا تھا۔ وہ ایک سن رسیدہ شاف کپتان کے پاس سے گذرا۔ پھر یکبارگی پلٹا۔ اور رسالے کے بھاری بھرکم بھوت کو ٹھوکر ماری۔ اپنی غلطی محسوس کر کے فوجی قاعدے کے مطابق سیدھا کھڑا ہو گیا۔ زار نے سر اٹھایا اور کپتان کے چہرے پر جو ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا نظریں گاڑ دیں۔ اور بلند آواز میں پکارا۔

"مرادیف"

ایڈجوٹنٹ تین قدم آگے بڑھ کر زار کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ زار نے

شاف کپتان کی طرف اشارہ کرکے کہا" اسے ازراہ تنبیہہ پیدل فوج کی رجمنٹ متعینہ موبلیف میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

مرادلیف نے حکم کی یادداشت رکھ لی زار کی مطالعہ گاہ کے دروازے میں کونٹ پالین کا مضبوط جسم اور خشونت آمیز چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے معتوب کپتان پر نظر ڈالی جس کی نگاہوں میں غصہ کی بجلیاں کوندرہی تھیں۔ اور اس کے ابرو کسی قدر اوپر چڑھ گئے۔

کیا اس سے زیادہ واضح اور سینما کے مقاصد سے اس قدر مطابقت رکھنے والا کوئی ناول لکھا جاسکتا ہے۔ ہر لفظ بجائے خود ایک تصویر ہے۔ جس میں معنی حرکت کرتے نظر آتے ہیں پھر جب قلم نگار کا قلم ان تصویروں میں رنگ بھرتا ہے تو اور ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً زار ایک جگہ کہتا ہے۔

سنو! میں تمہیں ایک راز بتاتا ہوں میرا باپ بھی قتل کیا گیا ہے اور غالباً میرا بیٹا بھی کسی دن میری طرح قتل کردیا جائے گا۔

اب قلم کار کی جدت طرازی دیکھئے کہ زار کے منہ سے یہ الفاظ کہلوانے کی بجائے اس کے باپ دادا کی تصویر دکھائی جاتی ہے جو نہایت موزوں طریق پر ہماری نظروں سے گزرتی ہے زار آخری تصویر کے سامنے جو اس کی اپنی شبیہ ہے ٹھہر جاتا ہے یہ عجیب پرحسرت منظر ہے زار کی آنکھوں میں التجا اور استفہام کی ملی جلی کیفیت نظر آتی ہے نگاہیں کچھ مانگ بھی رہی ہیں کچھ پوچھ بھی رہی ہیں۔ ایک جگہ ناولسٹ لکھتا ہے کہ" زار نے گھونسا تان کر کہا میں زار ہوں اور زار رہوں گا" قلم نگار نے یہاں بھی اپنی معنی آفریں قلم کے عجیب کرشمے دکھائے ہیں زار بھاگ کر اپنے دربار کے کمرے میں پہنچتا ہے تالیاں پیچھے پیچھے ہیں زار بھاگ کر چبوترے پر چڑھ جاتا ہے اور تخت کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے، پھر دایاں ہاتھ بلند کرکے کہتا ہے۔

" میں زار ہوں اور زار رہوں گا"

قلم نگار کے قلم کی ہلکی سی جنبش نے اس منظر کو کہاں پہنچا دیا۔ جب ناول

کے الفاظ کو جو خود تصاویر سے کم نہ تھے یوں واضح تر کر دیا جائے تو ایسی فلم کی کامیابی پر کیسے تعجب ہو سکتا ہے۔

فلم میں ہر نئی اشکال سے بنتا ہے وہ بہ آسانی دوسرے قالب میں ڈھل جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری تصویر لے لیتی ہے اور یہ رنگ بدلنے اور نئے نئے پیکر اختیار کرنے والی شکلیں اپنے حالات کی ترجمان آپ ہوتی ہیں ہر تصویر واضح اور غیر مبہم معنی رکھتی ہے جن کی شرح بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ذہن خود بخود انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہر خیال کو سینکڑوں طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے، ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ہزاروں تصویریں بن سکتی ہیں ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پورے غور و فکر کے بعد تصاویر کا انتخاب کیا جائے اور وہی تصاویر منتخب کی جائیں جو سب سے زیادہ واضح ہوں، اور ہمارے مفہوم ذہنی کو پوری طرح ادا کر سکیں کیمرہ دیکھتا ہے، سنتا ہے چھوتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے گویا وہ انسان کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے لیکن اس کی آنکھ بے پروا تماشائی کی آنکھ نہیں، بلکہ وہ ہر چیز کا مطالعہ غائر نگاہ سے کرتا ہے اور فلمکار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت اسے سہارا دینے کے لیے موجود ہے۔

فرض کیجیے کہ ہمارے سامنے دربار شاہی کا منظر ہے تماشائی اگر اس منظر کا پوری طرح مطالعہ کرنا چاہے گا تو وہ بالا خانے پر چلا جائے گا تاکہ بلندی سے تمام منظر اچھی طرح دیکھ سکے۔ پھر بھی اس کی خواہش یہ ہوگی کہ بادشاہ کو قریب سے دیکھے درباریوں کے ہجوم میں مل مل کر ایک ایک چیز پر نظر ڈالے۔ فلمکار تماشائی کی توجہ پوری طرح تصرف کر لیتا ہے۔ تماشائی انہیں چیزوں کو دیکھتا اور یاد رکھتا ہے جنہیں فلم ڈائرکٹر انہیں دکھانا چاہتا ہے اور پھر ان مناظر کا انتخاب اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ تماشائی انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی امتحان میں فلم کار کے جوہر کھلتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے

کہ فلم میں جو قدرت ہے وہ تھیٹر میں نہیں۔

فلم کی قدرت کا دائرہ اس اعتبار سے بھی وسیع ہے کہ وہ جزئیات اور تفصیلات کو نہایت واضح طور پر پیش کرنے کی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فلم کا کیمرے کی مدد سے جوہر مرئی کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور تصویر کی روح کو بے نقاب کر دیتا ہے چنانچہ ایک نقاد لکھتا ہے کہ:

کیمرہ ہمیشہ زندگی کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایسی ایسی پوشیدہ چیزوں تک پہنچنا اور انہیں بے نقاب کر دینا چاہتا ہے جنہیں عام تماشائی کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ کیمرے کی قدرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ جو چیز بھی اس کے سامنے آتی ہے وہ اسے سلولائڈ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بہت دیر کے بعد اچھی خاصی کوشش کر کے ہماری نگاہ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم تصویر کے محاسن کو سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن فلم میں نہ اتنا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے نہ تصویر کی خوبیاں سمجھنے کے لیے کوئی کوشش کرنا ضروری ہے۔

فلم کو ایک اور بھی سہولت حاصل ہے جو اس سے بھی بڑھ کر کہیں اہم ہے۔ فلم اپنے لئے الگ زمان و مکان پیدا کر لیتا ہے جو حقیقی زمان و مکان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سٹیج میں کسی حد تک یہ بات ہے کہ امتداد زمانہ کو واضح کرنے کے لیے پردہ گرا دیا جاتا ہے یا اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن فلم اس بارے میں تھیٹر پر سبقت لے گیا ہے۔ سٹیج پر ہر کیرکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک حرکت کرتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اسی وقت رونما ہوتا ہے اور کسی ایکٹر یا پروڈیوسر کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ اس بعد مکانی کو جو ان دونوں نقاط کے درمیان حائل ہے دور کر دے یا اس وقت کو جو فاصلہ طے کرنے میں صرف ہوتا ہے مٹا ڈالے اور تماشائی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جب کیرکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی جانب حرکت کر رہا ہو تو وہ اپنے ذہن کو معطل کر رکھے۔

اب دوسری طرف فلمکار کو دیکھیے جو اس بعد مکانی کو بڑی آسانی سے مٹا دیتا ہے۔ وہ ایک شاٹ اس وقت لیتا ہے جب کیریکٹر نقطہ الف پر ہوتا ہے اور دوسرا اس وقت جب وہ نقطہ ب پر پہنچ جاتا ہے پھر دونوں شاٹ ملا دیے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے آپ کی ساری توجہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے وقت کو ایک دھارا سمجھئے جس کے بعض لمحے اہم ہوتے ہیں اور بعض غیر اہم۔ فلمکار کی ہنرمندی غیر اہم لمحوں کو نظر انداز کر کے بلکہ ٹھوکر کر کے ایک نیا زمان پیدا کر دیتی ہے جس میں محض اہم لمحے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو ایک جگہ وقت کا دھارا تھم جائے اور دوسری جگہ بہتا دکھائی دے اور دو مختلف حالات پر بیک وقت دو مختلف کیفیتیں نظر آئیں اور تو اور وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ وقت کا سیل دو شاخوں میں تقسیم ہو جائے اور دو دھارے پہلو بہ پہلو بہتے نظر آئیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلم میں جب کوئی ایسا منظر دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف ایک مصیبت زدہ کی زندگی کے آخری لمحے ہیں اور دوسری طرف کوئی اسے نجات دلانے چلا ہے تو فلمکار اپنے فن کے ایسے ہی عجائب و غرائب دکھایا کرتا ہے۔

جس طرح آپ فلم میں نیا زمان پیدا کر سکتے ہیں اس طرح نیا مکان بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ڈائریکٹر چند ایسے مناظر فلم بند کر لیتا ہے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کے درمیان بعد مکانی حائل ہے لیکن وہ ان تمام اجزاء کو ملا کر ایک نیا "فلمی مکان" بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک روسی نقاش کلیشا نامی نے جو فلم سازی کے فن میں بصیرت رکھتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں تجربے کے طور پر حسب ذیل مختلف شاٹ جمع کیے تھے۔

۱:۔ ایک نوجوان بائیں جانب سے دائیں جانب جاتا دکھائی دیتا ہے۔

۲:۔ دوسری جانب سے ایک عورت آتی ہے۔

۳:۔ وہ دونوں ملتے اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ نوجوان انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔

۴:۔ ایک وسیع سفید رنگ کی عمارت دکھائی جاتی ہے جس کی سیڑھیاں بہت فراخ ہیں۔ تو وہ سیڑھیوں سے چڑھ کر مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام مناظر الگ الگ مقامات پر لیے گئے تھے۔ اور پھر انہیں متذکرہ طور ترتیب سے فلم کے پردے پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں کو ایک مرتب واقعہ نظر آیا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت آپس میں ملتے ہیں۔ مرد پاس کے مکان کی طرف اشارہ کر کے اندر چلنے کی دعوت دیتا ہے اور دونوں مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سارے اجزا الگ الگ مقامات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً وہ نوجوان ماسکو کی ایک پبلک عمارت کے قریب تھا۔ اور عورت شہر کے دوسرے حصے میں تھی۔ مصافحہ انہوں نے ایک تھیٹر کے پاس کیا جو ان دونوں مقامات سے بہت دور واقع ہے۔ سپید رنگ کی عمارت کا شاٹ کسی امریکن فلم سے لیا گیا تھا۔ در حقیقت یہ سپید رنگ کی عمارت امریکہ کا مشہور قصر سپید تھا اور سیڑھیاں جن سے وہ چڑھ کر مکان میں داخل ہوئے ایک گرجا کی سیڑھیاں تھیں۔ اب یہ سمجھئے کہ سلولائڈ کے مختلف ٹکڑے ملانے سے ایک نیا "فلمی مکان" پیدا ہو گیا جو محض نمائش سراب ہے اور در حقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی چیز ہے جسے تخلیقی جغرافیہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پڈوکن سب سے پہلے فلم کار ہے جس نے فلمی مکاں و زماں کا تخیل وضاحت سے پیش کیا۔ گو اب دنیا کے ہر ملک میں اکثر ڈائرکٹر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور فائدہ کیوں نہ اٹھائیں اس سے کیمرہ کی قدرت کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال جو برف پڑی تھی اس سے اگلے سال کام لیا جا سکتا ہے۔ ایکٹر دہلی کے قطب مینار سے کودتا ہے اور دریائے راوی میں آگرتا ہے۔ آپ کسی کمرے سے باہر قدم رکھئے۔ اپنے آپ کو شالامار باغ میں پائیے گا۔ خواہ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے سے کئی سال پہلے یا کئی سال بعد شالامار باغ میں قدم رکھا ہو گا۔

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ فلم کے حدود کس قدر وسیع ہیں۔ اور ان کا دائرہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ فلم کا نقطۂ نگاہ ایک نہیں کئی ہیں۔ وہ جس زاویہ سے چاہے دنیا پر نظر ڈالے جس نقطے سے چاہے مشاہدہ کرے اور سارے

جزئیات کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے اس میں یہ بھی قدرت ہے کہ نیا زمان و مکان پیدا کرے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ ڈائریکٹر کی خواہش کے سوا کسی کا طابع نہیں۔ فلم کے سامنے ساری کائنات اور زمانہ کا لامتناہی سلسلہ پڑا ہے اسے اختیار ہے کہ زمان و مکان کے دامن میں جتنے رنگا رنگ جلوے ہیں ان میں سے جسے چاہے منتخب کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے اور ایک فلم پر کیا موقوف ہے ہر فن میں انتخاب کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پہلے مثال کے طور پر "اے ومن آف پیرس" کے ایک شاٹ کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا۔ اور یہ پہلا فلم تھا جو چارلی کی نگرانی میں تیار ہوا لیکن اس میں خود اس نے پارٹ نہیں کیا بجز ایک نہایت ہی معمولی مختصر پارٹ کے۔ جہاں تک ڈائریکٹر کے فرائض کا تعلق ہے، یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ میں نے جو مثال پیش کی تھی، وہ آپ کو یاد ہوگی۔ اور ابھی آپ کے ذہن سے اس شخص کا خیال محو نہیں ہوا ہوگا، جس نے دراز سے رومال نکالا، تو ایک مردانہ کالر بھی گر پڑا۔ اس نے کالر اٹھایا اور پھر دراز میں رکھ دیا۔ عورت کے مکان میں مردانہ کالر کا پایا جانا اور مہمان کا اس پر اظہار تعجب نہ کرنا۔ غور کیجئے ایک کتنا بلیغ انداز بیان ہے جس انتخاب کی بدولت جزئی باتوں میں کیا کیا نزاکتیں بھری جا سکتی ہیں۔ اور کیا کیا معنی پنہاں کیے جا سکتے ہیں: ان ٹارسن، میں جس کا ڈائریکٹر ڈی ڈبلیو گریفتھ تھا۔ ایک عورت دکھائی گئی جس کا خاوند کسی مقدمہ میں ماخوذ تھا۔ وہ بجلدی اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ دیکھیں جج مقدمے کا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ ہمیں صرف اس کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ یا ہاتھ جنہیں بار بار مروڑتی ہے لیکن اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے تشویش و فکر کے جتنے نقطے ہو سکتے تھے، ان میں سے ڈائریکٹر نے صرف وہی منتخب کر لیے ہیں، جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں۔

ایک اور مثال سنئے، پچھلی گرمیوں میں "لاسٹ پر فارمینس" نامی ایک فلم لاہور میں دکھایا گیا تھا۔ پال جینوس ڈائریکٹر تھا۔ اور اڈویٹ ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا

تھا۔ کہانی کا موضوع تو کچھ ایسا شاندار تھا لیکن صنعتی اور فنی حیثیت سے یہ فلم جس درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور ڈائریکٹر نے اپنی قابلیت کے جو کرشمے دکھائے تھے، ان کے لحاظ سے بہت قابلِ تعریف تھا۔ اس میں سے ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مداری ایک شعبدہ دکھاتا ہے وہ یہ کہ اس کا ایک اسسٹنٹ ایک صندوق میں داخل ہوتا ہے۔ صندوق کے پہلوؤں میں سوراخ ہیں جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ ان سوراخوں میں سے صندوق میں اس طرح تلواریں داخل کی جاتی ہیں کہ اس کا بچ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے تلواریں نکال لی جاتی ہیں لیکن اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ تلواریں نکال لی جاتی ہیں صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے تو وہ صحیح وسالم نکل آتا ہے تماشائی اس کے لیے پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ اور بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، کہ کب صندوق کا ڈھکنا اٹھتا ہے۔ مقصود اس بے چینی کو بڑھانا اور کانپتے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا ہے۔ صندوق سے تلواریں نکال کر اس طرح سٹیج پر کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ ان کے قبضے اوپر کی جانب ہیں۔ اور نوکیں فرش پر دھنسی ہوئی ہیں۔ ڈائریکٹر کو اس مقام پر یہ فکر تھی کہ کسی طرح دیکھنے والوں پر اضطراب و بے تابی اور تذبذب کی کیفیت طاری ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا شاٹ لیا جس نے تماشائیوں کو عجیب حیص بیص اور گومگو میں مبتلا کر دیا۔

مداری سٹیج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے تلواروں کا ایک کٹہرا سا بن گیا ہے۔ کیمرہ نشیب میں رکھ دیا گیا تاکہ مداری کا سر تلوار کے دستوں کے عین اوپر نظر آئے تلواروں کے دستے بوجھل ہیں اس لیے ان میں ایک لرزش پیدا ہو رہی ہے۔ اور پھل لچک رہے ہیں ان کے اوپر مداری کا ہولناک چہرہ دکھائی دیتا ہے اس شاٹ نے دیکھنے والوں پر وہی کیفیت طاری کر دی جو آرکسٹرا کے گمبھیر لرزاں کارڈ سے پیدا ہو جایا کرتی ہے

ایک اور فلم اشپ پوٹکن میں جس کا ڈائریکٹر آئزن شٹائن تھا، ایک منظر دکھایا گیا

تھا کہ باغی اپنے جہاز سے اوڈیسہ تھیٹر پر گولہ باری کرتے ہیں۔ اس منظر کے پہلے شاٹ میں توپ کو فائر کرتے دکھایا گیا ہے، دوسرے شاٹ میں دکھایا گیا ہے کہ آتش گیر مادہ پھٹ گیا ہے، بہت بڑا دھماکہ ہوا جس سے تھیٹر کا پھاٹک کانپ اٹھا ہے اس کے بعد تین شاٹ آتے ہیں ایک میں تو ایک پتھر کا شیر دکھایا گیا ہے، جو پڑا سو رہا ہے، اور دوسرے شاٹ میں شیر کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور تیسرے میں شیر کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ تینوں شاٹ ملا دیئے گئے ہیں۔ تو یہ نظر آیا کہ پتھر کا شیر یک بیک کھڑا ہو کر چیخنے لگتا ہے ایک نقاد کا خیال ہے کہ اس منظر سے وہی اثر ہوا کہ جو بگل پر تین چڑھتے ہوئے سر بجانے سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ہم یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں، کہ جنگی جہاز کا منظر اوڈیسہ میں لیا گیا تھا۔ پتھر کے شیروں کی تصویریں کریمیا میں فلم بند کی گئیں تھیں، اور پھاٹک کی تصویر ماسکو میں۔ یہ گویا "تخلیقی جغرافیہ" کی ایک اور مثال ہے۔

اب ایک اور مثال سنئے۔ یہ موضوع کے حسنِ انتخاب کی مثال نہیں، بلکہ اس سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جس زاویے سے شاٹ لیا جاتا ہے اس کے انتخاب میں کتنی احتیاط برتی جاتی ہے۔ "دا ایول" جو ہندوستان میں "ویرائٹی" کے نام سے دکھایا گیا ایک ایسا فلم تھا جس کے لیے "ایل جننگز" ایکٹر اور ڈوپان فلمساز مستحقِ تحسین ہیں۔ تماشائیوں کو ہال کی چھت کے وسط میں جو بہت بلند ہے بازی گر جھولتے نظر آتے ہیں۔ اور ہر بازی گروں کو کبھی چھت میں برقی روشنی کے قمقمے دیواریں اور تماشائی نظر آتے ہیں۔ یہ سب جلوے ان کی نگاہوں میں اس طرح آتے ہیں گویا ناظرین سمندر کی لہروں کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہے ہیں۔ یہ مختلف مناظر یکے بعد دیگرے نہایت سرعت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں، تو سر گھومنے لگتا ہے اگر کسی دوسرے زاویہ سے تصویر لی جاتی تو یہ اثر پیدا کرنا ناممکن تھا۔

اوپر کی مثالوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تصویروں کے انتخاب میں کتنا غور و فکر کیا گیا ہوگا، اور پھر ان سے دیکھنے والوں پر جو اثر ہوا اسے پیش نظر رکھے،

تو فلم کار کے حسنِ انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہ کیمرے کی کارفرمائیاں نہیں بلکہ فلم کار کے دماغ کی کرشمہ سازیاں ہیں کیمرہ دیکھتا بھی ہے اور دکھا بھی سکتا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا تو فلم کار ہی کا کام ہے کہ وہ کیا دیکھے اور کیا دکھائے۔

فلم کے ناظر یعنے کا فن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے، فلم کار کو ایسے نئے نئے طریقے ہاتھ آتے جاتے ہیں جن کی بدولت وہ فلم کی جزئیات کو نمایاں کر کے پیش کر سکتا ہے ان نئے نئے طریقوں کے طفیل ڈائریکٹر کو یہ قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اظہارِ واقعات پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اہم واقعات کو زیادہ نمایاں اور واضح کر کے پیش کرتا ہے۔ ان میں رنگ بھرتا ہے اور جو واقعات زیادہ توجہ کے محتاج ہیں انہیں ہمارے ذہن پر نقش کر دیتا ہے۔

تصویر کو واضح اور نمایاں طور پر پیش کرنے کا ایک طریقہ کلوز اپ یا قریبی شاٹ ہے کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے تو قریبی شاٹ سے وسطی شاٹ تک پہنچتا ہے اور وسطی شاٹ سے ہٹتا ہے تو بعیدی پر آ ٹھہرتا ہے گویا جوں جوں جزوی حرکات کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے وہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے جب تصویر مدہم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے تو تماشائی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ معمول سے رفتہ رفتہ جدا ہو رہا ہے۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ ابھرتی ہے تو جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ اِن کے علاوہ بعض اوقات کیمرہ گھومتا ہے اور پورے منظر کو فلم بند کر لیتا ہے بعض اوقات سلد اور وسیع منظر سامنے ہوتا ہے تمام جزئیات دکھائی دیتی ہیں، اور پھر کسی ایک جگہ پر تماشائی کی توجہ مرکوز بھی کر دی جاتی ہے یعنی کوئی چیز جسے نمایاں کرنا مقصود ہو ایک چھوٹے سے حلقے میں اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ وہ ہماری توجہ جذب کر لیتی ہے پھر کبھی ایک شاٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے ان مختلف طریقوں کو فلم سازی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ چنداں محتاجِ بیان نہیں۔

اب تدوین یعنی ایڈیٹنگ کو لیجیے جسے فلم سازی کا آخری مرحلہ سمجھنا چاہیے ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سارے ڈرامے کو فلم بند کر لیا جاتا ہے، تو سلولائڈ کو

کاٹ کر شاٹ الگ الگ کر لیے جاتے ہیں پھر ہر شاٹ میں کس قدر قطع و برید ہوتی ہے اور آخر کار سب شاٹ مناسب ترتیب و تسلسل سے جوڑ دیے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں تو بجائے خود ایڈیٹر کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی فلم کے بگڑنے اور بننے کا مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو کہیں ایڈیٹر کی باری آتی ہے۔ اور اس کے کام کو فلم سازی کے دوسرے معنوں کے مقابلے میں رکھا جائے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو زیادہ دماغی محنت صرف نہیں کرنا پڑتی، وہ مشین کی طرح ایک ہی دھرّے اور بندھے ہوئے قاعدہ پر چلتا ہے یعنی مختلف شاٹ جمع ہو جاتے ہیں تو انہیں کاٹ کر جوڑ ملایا جاتا ہے لیکن روسی اور جرمنی ڈائرکٹر تدوین کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اسے تدوین کی بجائے تعمیر کہتے ہیں ان کے نزدیک تدوین میں طبیعت کی اپج اور تخلیقی قوت کے جوہر دکھانے کی ضرورت ہے میں بھی اس مضمون کے اغراض کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تدوین کو محدود چیز نہ سمجھا جائے اور اس کے یہ وسیع معنی مراد لیے جائیں ورنہ بعض باتوں کے لیے مجھے الگ عنوان قائم کرنے پڑیں گے، ایک مرتبہ کلیسہانے کہا تھا کہ تمام فنونِ لطیفہ میں دو چیزیں ضروری ہیں۔ اول مواد دوم اس کی ترتیب کا اسلوب یہ ضروری ہے کہ مواد کو اس فن سے خاص مناسبت ہو مصور کا مواد مختلف رنگ ہیں جنہیں وہ کینوس کی سطح پر ترتیب دیتا ہے مغنی کے نزدیک آوازیں مواد ہیں جن کے مطابق مرتب کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فلم ساز کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس کی ترتیب کا طریقہ کیا ہے کہ انہیں ایک خاص تسلسل سے جسے ذہن کی تخلیقی قوت معلوم کر سکتی ہے جوڑ دیا جائے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک فلم سازی کا فن ایکٹر کی حرکات و سکنات سے شروع ہوتا ہے اور شاٹ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ در اصل مواد کی فراہمی کے مدارج ہیں۔ فلم ساز کا اصل کام تو اسی وقت شروع ہوتا ہے جب ڈائرکٹر فلم کے مختلف ٹکڑوں کو آپس

میں جوڑنے لگتا ہے کیونکہ انہیں جیسے جوڑا جائے ویسے ہی معنی پیدا ہوتے ہیں۔

فلم ایڈیٹر کے ذمہ دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو اس امر کا فیصلہ کہ شاٹ کتنا لمبا ہے دوسرے یہ بات کہ شاٹ کس ترتیب سے جوڑے جائیں ان دونوں باتوں میں سے ترتیب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ فلم کے معنی کا انحصار اجزاء کے سیاق و سباق اور سان کے باہمی ربط پر ہے جس طرح ایک جملے کے معنی کا انحصار الفاظ کی ترتیب پر ہے اسی طرح فلم کے معنی بھی اجزا کی ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جملے لیجئے، کتے نے آدمی کو مار ڈالا، آدمی نے کتے کو مار ڈالا، دیکھئے لفظوں کی ترتیب میں تھوڑے سے الٹ پھیر سے سارے جملے کے معنی بدل ڈالے یہ مثال فلم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، ایک متبسم چہرے کا شاٹ لیجئے۔ دوسرا شاٹ ایک بچے کا ہو جو کھلونے سے کھیل رہا ہو، اور تیسرا شاٹ اسی چہرے کا لیکن اب تبسم کی بجائے ابرو پر بل پڑے ہوئے ہیں، اگر یہ تینوں شاٹ اسی ترتیب سے دکھائے جائیں تو آپ ان کو دیکھ کر یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص بچے کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا اب ساری ترتیب الٹ دیجئے۔ یعنی آخری شاٹ پہلے آ جائے اس کے بعد بچہ کھیلتا نظر آئے پھر متبسم چہرہ دکھائی دے تو اس کے معنی بالکل بدل جائیں گے، اسی مثال سے پہلے آپ کو معلوم ہو گا کہ جو شخص فلم کے اجزا کو ترتیب دیتا ہے اسے ڈائرکٹر کہہ لیجئے یا ایڈیٹر کے نام سے پکاریے بہر حال وہی فلم کا جنم داتا ہے۔ فلم کی کامیابی میں ایکٹر کی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں۔

بعض روسی ڈائرکٹر تو تدوین کی قدرت کے اس حد تک قائل ہیں کہ ان میں سے ایک نے تدوین کی رنگا رنگیوں کو واضح کرنے کے لئے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے اس نے کسی فلم سے مشہور روسی ایکٹر موس یوخین کے کئی کلوز اپ یعنی قریبی شاٹ لئے اس نے کلوز اپ بھی ایسے منتخب کئے تھے جن میں ایکٹر کے چہرے پر کسی جذبے کے اثرات نظر نہیں آتے ہیں۔ پھر اس نے اپنی فلم

کے دوسرے شاٹوں کے ساتھ تین مختلف طریقوں پر شاٹ جوڑ دیا ایک کلوزاپ کے ساتھ ایک شاٹ جوڑا جس میں میز پر شوربے کی ایک پلیٹ پڑی دکھائی گئی تھی۔ ان دونوں کے ملانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موس یوخین شوربے کی جانب دیکھ رہا ہے۔ دوسری مرتبہ اس نے اسی کلوزاپ کے ساتھ ایک اور شاٹ جوڑا جس میں ایک مردہ عورت کا تابوت دکھایا گیا تھا تیسری مرتبہ اس نے ایک لڑکی کا شاٹ لیا جو کھلونوں سے کھیل رہی ہے۔ اور اسے موس یوخین کے کلوزاپ سے جوڑ دیا۔ اس ڈائرکٹر نے لندن کی فلم سوسائٹی کے سامنے اس کے نتائج کی دلچسپ داستان ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

جب یہ تینوں تصویریں ایسے لوگوں کو دکھائی گئیں جو اس راز سے واقف نہ تھے تو ان پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ ایکٹر کے کمال فن کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ انہیں پہلی تصویر میں ایکٹر کے چہرے پر فکر اور سوچ کے آثار نظر آئے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ شوربے کی پلیٹ کو بھول چکا ہے اور اس کی طرف اب کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دوسری تصویر پر انہیں ایکٹر کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیات نظر آئیں گویا مردہ عورت کا تابوت دیکھ کر اسے بہت قلق ہوا ہے تیسری تصویر میں انہیں ایکٹر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم دکھائی دیا جو گویا لڑکی کو کھیلتے دیکھ کر پیدا ہو گیا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ تینوں تصویروں میں ایک ہی چہرہ ہے جس سے اصلاً کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ فلم سازی میں جتنے لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں سب کو کوئی نہ کوئی اہمیت حاصل ہے۔ بجز ایکٹر کے ہم میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو ایکٹر کو اتنا بے حقیقت نہیں سمجھتے۔ تاہم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ شاٹ کے اثر کا انحصار اس کے سیاق و سباق پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلم کے اجزا کی ترتیب میں ایکٹر کو مطلق کوئی دخل نہیں۔

لیکن فلم کے مختلف اجزا کو مرتب کر دینا ہی کافی نہیں۔ ایڈیٹر میں یہ سمجھ بوجھ بھی ہونی چاہیئے کہ اجزا کی لمبائی کتنی ہو کیونکہ جس طرح موسیقی میں نہ صرف

سروں کا آتار چڑھاؤ بلکہ ان کی کمی بیشی بھی اپنا اثر پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح فلم میں بھی شاٹوں کی کمی بیشی سے خاص خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں اور ان سے دیکھنے والوں پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں۔ یہ آہنگ و تناسب کا سوال ذرا ٹیڑھا سا ہے اور اس قابل ہے کہ سینما سے شغف رکھنے والے لوگ ان کا مطالعہ مجھ سے زیادہ وسیع ہے اس جانب توجہ کریں۔ میں صرف چند سرسری باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں اس جگہ صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں پڈوکن نے یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کی ہیں، کہ مختلف مقاصد کے لیے آہنگ میں کیا تبدیلی ہوتی ہے یعنی شاٹ پے در پے جس رفتار سے آتے ہیں وہ رفتار کس طرح بدلتی رہنی چاہیئے اس سے منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مناظر کو فلم بند کرنے میں وقت و محل کے اعتبار سے کیا کیا خاص طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

عنوان

• مزدوروں کی بغاوت فرو کر دی گئی۔

۱: تصویر آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے اور زمین پر خالی کارتوس اور بندوقیں پڑی نظر آتی ہیں۔

۲: کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور لینز کے سامنے سے ایک لمبا پشتہ گزرتا ہے جس پر مزدوروں کی لاشیں پڑی ہیں۔

۳: ان میں ایک عورت بھی ہے جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے ایک ٹوٹے ہوئے کھمبے کے ساتھ ایک پھٹا ہوا جھنڈا لٹکا ہوا ہے، یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۴: قریب سے شاٹ لیا جاتا ہے۔ عورت جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے، لینز کی طرف گھور گھور کر دیکھتی ہے، یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۵: پھٹا ہوا جھنڈا ہوا میں لہراتا ہوتا ہے۔

یہ تو ایک ابتدائی واقعہ کی مثال ہے جس میں سکون بلکہ سکوت اور غم پایا جاتا ہے ایک شاٹ دوسرے میں اس لئے تحلیل ہو جاتا ہے تاکہ نگاہ کے سامنے آہستہ آہستہ آئے۔ اور اس سکوت و سکون کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور تصویر کے آہستہ آہستہ نمودار ہونے اور غائب ہو جانے سے بھی یہی واضح کرنا مقصود ہے کہ فلم کا یہ مختصر سا حصہ بذاتِ خود ایک واقعہ کی سی اہمیت رکھتا ہے اب ایک پُر شور اور ہنگامہ خیز واقعہ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ ایک گوشے سے مزدوروں کا جم غفیر دوڑتا نظر آتا ہے وہ لینز کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ سب کے سب یکے بعد دیگرے لینز کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔

۲۔ ایک مزدور ایک آہنی سلاخ پر سے کودتا ہے اور بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے پھر یک بیک ٹھہر جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

عنوان

"سب سے پہلی دکان کو بچاؤ"

۳۔ ایک مزدور کرین پر چڑھ جاتا ہے۔

۴۔ دھواں ہوا میں بلند ہوتا ہے بھاپ کی سیٹی بجتی ہے

۵۔ مزدور کرین پر چڑھا ہے اسے جھک کر نیچے دیکھتا ہے۔

۶۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ (یہ شاٹ اوپر سے لیا گیا ہے)

۷۔ مزدور جو کرین پر پوری قوت سے چلاتا ہے۔

"پہلی دکان کو بچاؤ"

۸۔ اوپر سے شاٹ لیا گیا ہے۔ بھاگتے ہوئے مزدور ٹھہر جاتے ہیں تھوڑی دیر توقف کرتے ہیں اور پھر بھاگ نکلتے ہیں

۹۔ ایک عورت ان سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

۱۰۔ کلوز اپ دکھایا جاتا ہے عورت گر کر پھر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا

سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی ہے۔

۱۱۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی شاٹ پردہ پر اپنے اصلی وقت سے آدھ سیکنڈ زیادہ دکھایا جائے تو سارا تاثر خاک میں مل جائے گا اور جو اثر پیدا کرنا مقصود ہے پیدا نہیں ہوگا۔

اب اس سے بھی زیادہ آسان مثال لیجئے یہ بھی پڈوکن نے ہی پیش کی ہے اور کسی بازار کے حادثے کے متعلق ہے۔ حادثہ اس طرح دکھایا گیا ہے۔

۱:۔ ایک بازار دکھائی دیتا ہے جس میں گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں ایک راہگیر بازار کو عبور کرتا ہے اس کی پشت کیمرے کی جانب ہے۔ پاس سے ایک موٹر کار گزرتی ہے جو اس کے اور کیمرے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

۲:۔ موٹر ڈرائیور کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہ بریک پر قدم رکھتا ہے اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔

۳:۔ جو بد نصیب حادثے کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھول دیا ہے۔

۴:۔ یہ شاٹ موٹر ڈرائیور کی نشست سے لیا گیا ہے۔
گھومتے ہوئے پہیے کے قریب ٹانگیں نظر آتی ہیں۔

۵:۔ موٹر کے پہیے گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۶:۔ گاڑی ٹھہر گئی ہے اور اس کے پاس لاش پڑی ہے۔

اس واقعہ میں اگر مرنے والے کا منہ دو سیکنڈ کے بجائے ایک منٹ تک کھلا دکھایا جاتا تو سارا اثر خاک میں مل جاتا۔

یہ تو تعمیری تدوین کی مثالیں ہیں۔ یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تدوین کے اس اہم شعبہ پر بھی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے۔ جسے اصطلاح میں "تخلیقی تدوین" کہتے ہیں جس میں ایڈیٹر کے ذہن رسا کے عجیب

عجیب کرشمے نظر آئیں۔

میں گزشتہ اوراق میں "دی لاسٹ پینا مینس" نام ایک فلم کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ چند اشخاص تھیٹر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں اور ایک پیشہ ور ماہر مسمریزم ان پر عمل کر رہا ہے اب اس عمل کا اثر فلم کے ذریعے دکھانا مقصود ہے اور فلم کے لیے حقیقتاً یہ موضوع بہت مشکل ہے صحیح عمل پیدا کرنے کے لیے پہلے عامل کے چہرے کا قریبی شاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں چند اشخاص کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ اور وہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر اس طرح دکھائی گئی کہ دونوں تصویریں ایک دوسرے کے بیچ میں جھلملاتی نظر آتی تھیں اس دوسری تصویر میں بڑے بڑے اونچے مکانات جیسے نشے میں جھومتے دکھائے گئے ہیں۔ یہ شاٹ دوسرے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جس میں وہ تماشائی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے۔ جب عامل کا چہرہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے۔ کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے اور دھندلکے سے تماشائیوں کے چہرے ابھرتے نظر آتے ہیں اور پھر کیمرہ قریب آجاتا ہے یہ تمام شاٹ خاص آہنگ و تناسب سے یکے بعد دیگرے دکھائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پردے پر رنگا رنگ شکلیں نظر آتی ہیں۔ کوئی دبدبے سے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے کوئی پیچھے ہٹتی ہے کوئی آگے بڑھتی ہے اور کوئی جھوم رہی ہے چنانچہ اس کا اثر بے حد حیرت انگیز ہوتا...... ایڈیٹر تماشائیوں پر اس قسم کے جو اثرات طاری کر دیتا ہے ان کا تجزیہ آسان نہیں چنانچہ اس کے کمال فن کی مثالیں مہیا کرنا مشکل ہے۔ پڈوکن نے اپنی فلم "دی اینڈ آف سینٹ پیٹرز برگ" سے ایک مثال پیش کی ہے جسے اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ جنگ کے مناظر کے آغاز میں میں ایک ہولناک دھماکہ دکھانا چاہتا تھا اور کہ یہ دھماکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فلم کے پردے پر نمودار ہو جائے۔ میں نے بہت سا ڈائنامیٹ زمین میں دفن کر دیا پھر اسے اڑایا اور اس کا شاٹ

لیا اس سے بڑا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن یہ فلم کے کسی کام نہ تھا بڑے پر محض ایک بے جان سی حرکت دکھائی دی بہتیرے تجربات کے بعد آخر کار میں فلم کے پردے پر دھماکہ ہوتا اور اس کے تمام اثرات دکھانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی یوں کہ ڈائنامیٹ کے دھماکے کا جو شاٹ لیا اس کا کوئی ٹکڑا استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی میں نے ایک مشعل سے دھوئیں کے بادل پیدا کئے اور شورش و تصادم کا اثر پیدا کرنے کے لیے بگنزم فنیلز سے کام لیا اس شاٹ کے درمیان میں نے ایک دریا کا شاٹ بھی داخل کر دیا جو میں نے اس سے پہلے کسی زمانے میں لیا تھا۔ اس طرح پردے پر وہ مرئی شکل آ گئی جسے میں پیدا کرنا چاہتا تھا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن اس غرض کے لیے کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی گئی تھی جو درحقیقت دھماکہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

میں اس مثال کی روشنی میں آپ پر ایک مرتبہ پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں، کہ دراصل تدوین ہی فلم کو جنم دیتی ہے فطرت محض خام مواد مہیا کرتی ہے جس سے ایڈیٹر اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے حقیقت اور فلم میں یہی تعلق ہے ۔۔۔۔ فلم کے مضمون کو انہی الفاظ پر ختم کر دینا چاہیے میرا یہ مضمون سینما کے مبادیات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان میں رہ کر جو لوگ سینما کا مطالعہ کرتے ہیں، انہیں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں خوش قسمتی سے لاہور میں دنیا کے بعض بہترین فلم دکھائے گئے ہیں جن کی وجہ سے لاہور کی خوش قسمتی انگلستان کے بڑے بڑے شہروں کے لیے بھی قابلِ رشک ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ سینما کے زر پرست مالکوں اور قدامت پسند سنسر کے نزدیک ابھی تک اکثر ایسے فلم مردود ہیں جنہیں انسانی ذہن و عقل میں عظیم ترین کامیابی سمجھنا چاہیے اور جنہیں ان کے دیکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے

امید ہے جب آپ اس نوع کی مجبوریوں کو میری دوسری خامیوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ مضمون غنیمت معلوم ہو گا۔

خطباتِ پطرس

ترتیب

مسئلہ تونسیہ

پاکستان کے مستقل نمائندہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر کا متن جو انہوں نے ۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو حفاظتی کونسل میں تونیسیہ کے مسئلے پر کی۔ پروفیسر مرحوم اس اجلاس کے صدر بھی تھے:—

اس اجلاس کے مقررین کی فہرست میں اگلا نام پاکستانی وفد کا ہے اگر میرے رفقاء کو اعتراض نہ ہو تو میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں تقریر شروع کر دیتا ہوں۔

فرانس کے نمائندے نے اس معاملے کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں میرے وفد نے انہیں اسی غور اور توجہ سے سنا جن کے وہ مستحق تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی تھی کہ فرانسیسی نمائندے نے ایجنڈا منظور کرنے کے ضمن میں طریق کار کی بحث کے متعلق سب سے پہلے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی تاہم جب انہوں نے اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی مخالفت کی تو میری خوشی حیرت میں بدل گئی۔ حیرت اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسی وفد کی طرف سے اس قسم کے رویہ کی توقع نہ تھی۔ اس لئے ہوئی کہ اصل مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے تو سخت اختلاف کیا اور تقریر ایسی کر ڈالی جو یہ سوال ایجنڈے پر آجانے کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نمائندے نے یہ طرز عمل بظاہر اس لئے اختیار کیا کہ کم از کم انہیں اس سے واقعی سیر حاصل بحث ضروری محسوس ہوئی۔ جب واقعہ یہ

ہے تو اس کا یہ کہنا ہمارے لئے یقیناً حیرت کا موجب ہے کہ وہ ایجنڈے کی منظوری کے خلاف رائے دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے خود تقریر کے لئے موقع کی تلاش تھی۔ اسے موقع مل بھی گیا اور اس سے فائدہ بھی اٹھا لیا گیا۔ گویا ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ حالانکہ وہ دوسروں کو اس موقع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ بالفاظ دوسرے جو لوگ اس میز کے گرد جمع ہیں انہیں اس موقعہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انہیں بحث میں حصہ لینے کا ٹھیک ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا فرانس کے نمائندے نے اپنے لئے حاصل کرنا مناسب جانا۔ لیکن یہ بات ایک حد تک نا واجب و غیر مناسب ہے کہ خود تو تقریر کر لی اور فرانس کا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا ——— میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی قابلیت سے پیش کیا ——— گویا اس نمائندے کی حد تک ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ پھر ایجنڈے کی منظوری کی مخالفت کر کے دس دوسرے وفود کو اظہار رائے کا موقع دینے سے اختلاف کی کوشش ان کے حقوق پر چھاپہ مارنا ہے جو اس غرض سے حفاظتی کونسل کو تحریری خواہش بھیج چکے تھے۔

نمائندہ فرانس نے اپنی تقریر میں جس منطق کا سہارا لیا ہے اگر اس کی پیروی کی جائے تو نہ محض یہی ضروری نہیں کہ ایجنڈا منظور کر لیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان دس وفود سے کہا جائے کہ وہ فوراً حفاظتی کونسل میں اپنی نشستیں سنبھال لیں اور فرانس کے زاویہ نگاہ کی مخالفت میں اپنا موقف پیش کریں ——— واضح رہے کہ یہ وفود ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو بحیثیت اقوامِ متحدہ کی رکن ہیں اور اس معاملے کے متعلق حفاظتی کونسل سے درخواست کر چکی ہیں۔

فرانس کا نمائندہ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا یعنی دس وفود نے حفاظتی کونسل کے نام اپنے مکاتیب کے ساتھ جو توضیحی نوٹ اور خوشگوار ریمارک منسلک

فرانس کے نزدیک ناخوشگوار ــــ بھیجے تھے ان میں سے وہ تمام عبارتیں پڑھ دیں جن کی تردید اس کے خیال کے مطابق ضروری تھی۔ موصوف نے نہ صرف ان باتوں کا جواب دینے پر زورِ فصاحت صرف کیا بلکہ انہیں بہتان سے بھی تعبیر کیا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے گیارہ ممالک پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حکومتِ فرانس کے خلاف بہتان آمیز بیان دیا ہے۔ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس الزام تراشی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے دس وفود بھی ــــ اگر انہیں اظہارِ خیال کا موقع ملا تو ــــ اس کے خلاف احتجاج ہی کریں گے۔ نہ ہمارا یہ منصب ہے، نہ ارادہ اور نہ خواہش کہ ان کے عظیم ملک کو یا اس کی حکومت کو غیر ذمہ دار طریق سے بہتان طرازی کا نشانہ بنائیں۔

فرانس کے نمائندے نے اپنی تقریر میں متعدد واضح اشارے کئے ہیں اور رمز و کنایہ سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہم دس یا گیارہ سادہ لوح قوموں نے "پیلس ڈی چیلو" کی رواقوں میں سوچے سمجھے بغیر بعض غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پھر ہم نے وہ قدم اٹھا لیا جو ہرگز اٹھانا نہیں چاہیئے تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ موصوف نے اپنی بات کہہ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع دیا کہ ہم نے کس درجہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ ذمہ داری کے احساس کا کتنا اچھا ثبوت دیا اور کتنے تامل و تذبذب سے یہ معاملہ خود غرض کی غرض حفاظتی کونسل کے سامنے لائے ہیں۔

اب ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ حکومت تونیسیہ کے دو وزیر ــــ ایسے وزیر جنہیں اپنی وزارت کے زمانے میں حکومت فرانس کا اعتماد بھی حاصل تھا ــــ پیرس پہنچے۔ حفاظتی کونسل کے صدر کو ایک مکتوب بھیجا جس میں کونسل کی توجہ تونیس کے بعض افسوسناک اور الم انگیز حالات کی طرف منعطف

کرائی۔ اس خط کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ مکتوب طویل عرصے تک اقوام متحدہ کے دفتر خانہ میں پڑا رہا۔ سوچ کی کرنیں نہ اسے پیرس کے "پیلیس ڈی چیلو" میں چھو سکیں اور نہ نیویارک کے اس ایوان میں جس میں بے شمار کھڑکیاں موجود ہیں۔ اسے لوگوں کی نگاہوں تک پہنچنا اس دن نصیب ہوا جب میرے وفد نے درخواست کی کہ اس کی نقلیں تمام ارکان کے پاس بھیجی جائیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ مکتوب حفاظتی کونسل کے صدر کو پہنچایا گیا تھا اور ہم کے نمائندے ایک وفد کی شکل میں جنرل اسمبلی کے صدر مسٹر پیڈ لانزوود کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استدعا کی کہ وفد فرانس سے نیز اس کی وساطت سے حکومت فرانس سے کہا جائے کہ اہل تونیسیہ کو پابوسی کی اس منزل پر نہ پہنچایا جائے جس کے بعد انسان "تنگ آمد بجنگ آمد" کا مصداق بن جاتا ہے۔ امن عالم کا تقاضا بھی ہے۔ معاہدہ حفاظت کا تقاضا یہی ہے اور قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا تقاضا بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل اسمبلی کے صدر نے ہمارا پیغام پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا اور اسے پورا کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ پیلیس ڈی چیلو کے برآمدوں میں سراسیمہ وار گشت لگانے والے لوگ تیونس کے وزیر نہ تھے بلکہ ہم تھے جو بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ہم اس پیغام کے جواب یا اس سلسلے میں کسی اشارے کا انتظار کرتے رہے افسوس کہ نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی اشارہ ہوا۔

مزید انتظار کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر جنرل اسمبلی کے صدر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ ہمارے جذبات حکومت فرانس تک ایسے ذرائع سے پہنچا دیئے جائیں جنہیں جناب بہتر خیال فرمائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار جنرل اسمبلی کے

اجلاس میں کرتے۔ لیکن اس اجلاس کے آخری ایام میں بھی اچھا معلوم نہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے کام میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا کر دیں۔ صدر نے ہم سے پھر یہ وعدہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسی دور میں تونیسیہ قتل عام، فسادات، گرفتاریوں اور تخریبی کارروائیوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ـــــ میں صرف تشدد کے واقعات کا ذکر کر رہا ہوں اور اس مرحلے پر کسی کو ان کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہتا ـــــ اس سارے علم کے باوجود ہم صرف اس امید پر بڑے صبر و تحمل سے انتظار کرتے رہے کہ حکومت فرانس خود دانش مندی سے کام لے گی موقع کی نزاکت کا احساس کرے گی۔ ان لوگوں کے ساتھ خوشگوار سمجھوتے کا بندوبست کرے گی جن کا شمار روئے زمین کی شریف ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

ہمارا انتظار بہت دنوں تک جاری رہا۔ ہم نے آپس میں مشورے کئے۔ اس مسئلے پر بحث و تمحیص جاری رکھی۔ ہم نے مختلف ذرائع سے غیر رسمی طور پر اور دوستانہ انداز میں حکومت فرانس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ یہ مسئلہ بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ایسا نہیں کرنا واجب جلد بازی سے کام لیتے ہوئے حکومت فرانس کو پریشانی میں مبتلا کر دیا جائے۔ بشرطیکہ اس کے ارادے نیک ہوتے اور ہمیں یہی امید تھی کہ اس کے ارادے نیک ہیں۔

عام احساس یہ تھا کہ اس معاملے کو جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے آخری ہفتوں میں یا اس سے بھی پہلے پیش کر دیا جائے۔ لیکن زیادہ دور اندیش اصحاب کی رائے کو فوقیت حاصل ہوئی۔ ہم سے کہا گیا کہ تحمل سے کام لینا چاہئے چند ملکوں نے کہا کہ یہ پیغام حکومت فرانس تک پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ بھی پورا کر دیا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ آیا ہمیں یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کر دینا چاہیئے؟ اس ضمن میں ہمیں ایک بڑی رکاوٹ پیش آ گئی کیونکہ کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ انہی ممالک کو جن کے نام موجودہ شکایت نامے پر درج ہیں افسوسناک اور ملخ شکوار تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہم میں سے بعض نے مراکش کا مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تھا۔ عارضی ایجنڈے کی اس شق کو جنرل کمیٹی کے روبرو زیر بحث آنا تھا۔ اس کمیٹی میں ان ممالک کو اکثریت حاصل نہ تھی جن کے نام اس دستاویز پر ثبت ہیں۔ جنرل کمیٹی نے اس مسئلے پر بحث کی اجازت نہ دی۔ یقیناً اس نے کہا کہ اس سوال پر بحث فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ اس وقت ہمیں خوب معلوم تھا کہ فی الحال کا مطلب ایک غیر معین عرصے کے لئے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ معاملہ جنرل اسمبلی کے ابتدائی اجلاس میں زیر بحث آیا اور اس پر متعدد نمائندوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا لیکن ہم اس سوال کو ایجنڈے پر لانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم دل شکستہ ہو گئے۔ پھر بھی مزید انتظار مناسب سمجھا۔ نیویارک پہنچے۔ آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم ہر روز اخباروں میں تشویش انگیز خبریں پڑھتے رہے۔ ہر روز نئی صلاح حوال کی نئی امیدیں باندھتے رہے۔ ہر روز یہی توقع لگی رہی کہ فرانس اور اہل تونیسیہ کے درمیان بہتر مفاہمت ہو جانے کی علامات ظاہر ہوں گی۔ ہم اہل تونیسیہ اور جمہوریہ فرانس کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہے لیکن خبریں روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہمیں اخبارات کی خبروں پر ہی کاملاً انحصار نہ کر لینا چاہیئے اور غالباً بہتر ہوگا کہ اہل تونیسیہ میں سے چند اصحاب کو نیویارک بلایا

جاتے۔ تاکہ ہم ان پر جرح کر سکیں اور معاملے کو حفاظتی کونسل میں لے جانے سے قبل ذمہ دار وفد کی حیثیت میں یہ جان لیں کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ اہلِ تونسیہ کے نیویارک آنے کی راہ میں سخت اور ناقابلِ عبور مشکلات حائل ہیں۔ پتہ چلا کہ تونسیہ کے ذمہ دار وزراء سے ان کے سفارتی پروانہ ہائے راہداری واپس لے لئے گئے ہیں اگر فرانس کا نمائندہ اس بیان کی تردید کر دے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ بہرکیف یہ امر واقعہ ہے کہ وزراء پروانہ راہداری کی مشکلات کے باعث نیویارک نہیں آ سکتے تھے۔ عالم اضطراب میں ہم نے کچھ اور لوگوں کو بلوانے کی بے انتہا سعی کی۔ لیکن ان کے راستے میں بھی ہر طرح کی مشکلات حائل تھیں۔

اس کے بعد ان جملہ اقوام کے عظیم دوستوں نے جن کے نام یہاں دیئے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا کہ حکومتِ فرانس کو پارلیمانی بحران سے سابقہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک یہ بحران دور نہیں ہو لیتا، حکومت مذکورہ سے اس معاملے میں کسی واضح اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم کچھ زیادہ پُرامید نہ تھے۔ پھر بھی ہم نے سوچا دانشمندی نہ سہی جوانمردی کا تقاضا یہی ہے کہ فرانس میں حکومت کو استحکام مل جانے کا انتظار کیا جائے آخر یہ بھی ہو گیا اور حکومت کو استحکام مل گیا۔ ہمیں فرانس کی خاطر اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب ہم پر اُمید تھے کہ حکومت فرانس کوئی قدم اُٹھائے گی۔

حکومت کے استحکام کے چند روز بعد ہم نے دیکھا کہ صرف یہی نہیں تونسیہ میں صورتِ حال اصلاح پذیر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے سامنے مایوسی، دہشت اور حیرت کا ایک طوفان امڈ آیا۔ جب ہم نے سنا کہ جمہوریہ فرانس نے تونسیہ کی پوری کابینہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ پوری کابینہ سے میری مراد وزارت کے تمام وہ افراد ہیں جو حکومت فرانس کے تابع نہیں آ سکتے تھے مجھے معلوم ہوا کہ حکومت فرانس کابینہ کے

دو خبروں کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ وہ کابینہ تھی جسے ۱۹۵۰ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان مصالحت ہو جانے پر ترتیب دیا گیا تھا اور یہی کابینہ تھی جسے فرانس اور تونیس کے درمیان بہتر مفاہمت کے لئے اصلاحات کے معاملے پر حکومت فرانس کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔ کابینہ اب جیل میں پہنچ گئی۔ تونیس کے ممتاز افراد میں یہ آخری لوگ تھے جو قید ہوئے۔ تونس سے سب سے بڑی اور مقبول عام پارٹی یعنی حزب دستور کا کوئی نیشنلسٹ لیڈر ایسا نہ تھا جو پہلے جیل میں نہ پہنچ چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اطلاع کے مطابق ہزاروں تونیسی نظر بندی کے کیمپوں میں پہنچا دیئے گئے تھے بیسیوں ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ اگر اس اطلاع کی تردید کی جا سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ تونیس کے بعض علاقوں سے اطلاعات حاصل کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

ہم نے پھر بھی انتظار کیا اور سوچا کہ بہر حال ہم پوپ سے بڑے کیتھولک ہونے کا دعوے نہیں کر سکتے۔ اگر خود اہل تونیس ایک اور حکومت کی تشکیل کریں اور وہ خوش اسلوبی سے کام کرنے لگے تو ہمارے لئے کوئی وجہ اضطراب نہ ہو گی۔

ہمیں اس انتظار میں بہت دن گزر گئے اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ باکوش نام کے ایک صاحب کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کی سابقہ کیفیت معلوم کرنی چاہی اور ایسے لوگوں سے حالات دریافت کئے جو اس کے ماضی سے آگاہ تھے انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب کسی وقت سول کے سرکاری ملازم تھے۔ دوران جنگ میں تھوڑی دیر کے لئے وزارت عظمےٰ کی گدی پر براجمان ہوتے تھے۔ تونیس میں ان کی قیادت تسلیم کرنے والے افراد زیادہ نہ ہوں گے اور یہ تنہا بزرگوار ہیں جنہوں نے ہماری دانست میں فرانس کے دباؤ کے تحت وزارت عظمےٰ کا عہدہ قبول کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر آمادگی ظاہر

کر دی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ کابینہ وزارت تشکیل کریں گے۔ ہم نے انتظار کیا اور دن گزرتے گئے۔

یہ مسٹر باکوش وزیر اعظم ہیں۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کی ساری قوت اور امداد ان کی پشتیبان ہے اور حکومت فرانس ان کی امداد و اعانت کے لئے کمر بستہ ہے۔ لیکن یہ حضرت اب تک کوئی کابینہ نہیں بنا سکے "ہیرلڈ ٹربیون" اور "نیویارک ٹائمز" میں یہ اطلاعات شائع ہوئی ہیں کہ تونیسیہ کے اس وزیر اعظم کے خلاف عوام کی ناراضگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ بے (حکمران تونیسیہ) سے ملنے کے لئے محل میں تشریف لے جاتے ہیں۔ تو عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔

وزیر اعظم بازفرانسیسیوں نے دباؤ ڈال کر ایک اور ایسے شخص اور صرف ایک شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جو وزیر بننے کے لئے تیار ہو گیا۔ ان صاحب نے عوام کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے ہوئے وزارت کے سنگھاسن پر بیٹھنے کی حامی تو بھر لی۔ لیکن جب عملاً وزارت سنبھالنے کا وقت آیا تو اس نے دیکھا کہ عوام کی خفگی اور نفرت اس کے خلاف حد سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وزارت کا یہ "تاج" سر پہ رکھنے سے انکار کر دیا اس پر فرانسیسیوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تونیسیہ نے آج کل برائیوں اور خرابیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں کا دستور یہ ہے کہ آپ وزیر بنئے اگر اس سے انکار ہے تو سیدھے جیل جائیے۔

اس کے بعد ہم نے سنا کہ فرانس کی جانب سے موسیو ہاٹکلوک نئی اصلاحات لے کر تونیسیہ پہنچے ہیں۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہل تونیسیہ کے لئے امیدوں کا جو پشتارہ لے کر گئے تھے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس اجلاس میں

دوسرے ممالک کے جو نمائندے تشریف فرما ہیں ان کے لئے میں غیر اہم کردہ اطلاعات میں سے چند فقرے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تمام مندوبین کو پتہ چل جائے گا کہ موسیو ہاٹکلوک کے تونیس پہنچنے کی کیا کیفیت تھی اور یہ اس لئے گئے تھے کہ تونیس کو دوست بنائیں اور فرانس کے دعوے کے مطابق اسے آزادی اور اصلاحات کی دولت سے مالامال کر دینے والے تھے۔

موسیو ہاٹکلوک ۱۳ جنوری کو تونیس پہنچے۔ ان کے استقبال کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کی سب سے بڑی تقریب بنا یا گیا۔ جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آپ نے ایک بحری جنگی جہاز سے اتر کر ساحل پر قدم رکھا۔ شہر پر فرانسیسی فوجوں نے قبضہ جما رکھا تھا وہ جدھر سے گزرے سڑکیں مسلح فوجوں کی قطاروں سے اٹی پڑی تھیں۔ سارا شہر بکتر بند گاڑیوں، مسلح کاروں اور ٹینکوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا یہ عام استقبال نہ تھا بلکہ فرانسیسی نمائندے کی آمد کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کے لئے موزوں ترین موقع بنا یا گیا تھا۔

ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے پہلی ہی ملاقات میں ان پر واضح کیا کہ وہ ان سے براہ راست روابط رکھنا پسند کریں گے۔ تاہم وزیراعظم نے ریذیڈنٹ جنرل کو ان کی جانب سے مطلع کر دینا ضروری سمجھا کہ تمام سرکاری روابط وزیراعظم کی وساطت سے ہونے چاہئیں۔

جب حکومت تونیس نے ۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنی شکایت اقوام متحدہ میں پیش کی تو اس وقت ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے علیحدگی اور تخلیہ میں گفتگو کرنے کا مطالبہ کیا۔ بے نے انکار کر دیا اور انہیں وزیراعظم سے بات کرنے کی ہدایت کی۔ ۱۵ جنوری کو ریذیڈنٹ جنرل نے لکھا کہ وہ بے سے وزیراعظم کی موجودگی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے متعدد شرائط پیش کیں۔

ایک یہ کہ اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ دوسری یہ کہ وزارت بدل دی جائے۔ تیسری یہ کہ بے دو فرمانوں پر دستخط کریں۔ ایک کے ذریعے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیں اور دوسرے کے ذریعے جنرل گارڈے کو وزیر دفاع کا عہدہ سونپ دیں۔ یہ جنرل گارڈے وہی ہیں کہ جس کے نامۂ اعمال میں مڈغاسکر میں سب سے بڑا فوجی اقدام شامل ہے بے نے وزیراعظم کو ہدایت کی کہ ریذیڈنٹ جنرل کو ان شرائط کا جواب دے دیا جائے وزیراعظم نے جو جواب دیا وہ ریکارڈ میں موجود ہے اس نے بتایا کہ وزیراعظم کو بے نے تونیسیہ کے متعلق اقوام متحدہ میں شکایت پیش کرنے کا مجاز بنایا تھا۔ اس سے نمائندہ فرانس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ شکایت بے کی ہدایت پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کے لئے خود وزیراعظم کے اختیارات ہی کافی تھے۔ لیکن اگر یہ موقف پیش کیا جائے کہ بے کو ہی اجازت یا ہدایت دینا چاہئے تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اجازت یا ہدایت بے سے حاصل کر لی گئی تھی۔

اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل اور جنرل گارڈے کو پیرس طلب کر لیا گیا وہ ۲۱ مارچ کو تونیسیہ واپس پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے بھی انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ چنانچہ ۲۴ مارچ کو بات چیت کے لئے انہیں طلب کیا گیا لیکن اس موقع پر تونیسیہ کے وہ تمام وزراء بھی موجود تھے جو اس وقت شہر میں تھے۔ ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے کہا حکومت فرانس بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ کابینہ کو موقوف کر دیا جائے اور اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ بے نے یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے ایک دستاویز بے کو دکھائی۔ جس پر فرانسیسی وزیر خارجہ کے

دستخط تھے اس میں لکھا تھا ــــ کہ ریذیڈنٹ جنرل امن و قانون بحال کرنے کے لئے ــــ مجھے امید ہے کہ میں بعد کسی موقع پر یہ واضح کرسکوں گا کہ استعمار پیشہ حکومتوں کے نزدیک "امن و قانون" کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے ــــ اور فرانس کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کارروائی کرنا مناسب سمجھیں۔ اس کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ بے نے جواب میں اس مسئلے پر سوچنے کے لئے مہلت مانگی اور اس سوال پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔ ریذیڈنٹ جنرل نے انہیں صرف تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا۔ یہ سلوک فرانس کی حکومت تونیسیہ کے حکمران سے کر رہی ہے جس کے بارے میں فرانسیسیوں کو دوستی کا دعوےٰ ہے۔ ریذیڈنٹ جنرل پستول کی نالی سیدھی کرکے اور اسلحہ کی قوت کا ہولناک مظاہرہ کرکے اس عمر رسیدہ اور قابل احترام بادشاہ کو ایسا جواب دینے کے لئے مجبور کر رہا تھا اس طریق سے جواب حاصل کرکے منطقی اور آئینی ضمیر کے سوا اور کسی ضمیر کی تسکین نہیں ہوسکتی۔

جب بے کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تو انہوں نے جمہوریہ فرانس کے صدر کو بحری تار بھیجا جس میں بتایا کہ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل نے حکومت کے نام سے ان پر کس طرح دباؤ ڈالا ہے۔ ساتھ ہی ریذیڈنٹ جنرل کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا اسی رات ریذیڈنٹ جنرل نے تونیسیہ کے وزیر اعظم و تین اور وزرا کو گرفتار کر لیا ایک اور وزیر موجود تھا لیکن بڑھاپے اور بیماری کے باعث اسے گرفتار نہ کیا گیا۔ یہ جناب سعد اللہ تھے اس بوڑھے اور بیمار وزیر نے ریذیڈنٹ جنرل کو لکھا مجھے گرفتار کر لیجئے تاکہ میں قید و بند میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ سکوں۔ ان سب کو تونیسیہ کے جنوبی علاقے میں بھیج دیا گیا سینکڑوں سیاسی کارکنوں صحافیوں، مدرسوں، وکیلوں اور دوسرے معززین کو جن کی ہمدردیاں نیشنلسٹوں کے

ساتھ تھیں۔ گرفتار کر لیا گیا۔ تمام نیشنلسٹ اخباروں کو بند کر دیا گیا۔ تمام باقی اسکولوں کے دروازوں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے پاس ایسا ذریعہ نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ ملک بھر میں جس قدر گرفتاریاں ہوئیں ان کی صحیح تعداد کیا تھی تاہم یہ امر بعد روشن کی طرح واضح ہے کہ نظر بندی کے جو بڑے بڑے کیمپ قائم کئے گئے تھے ان میں مقید نیشنلسٹوں کی تعداد ہزاروں سے کیا کم ہو گی؟

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ فرانسیسی فوجوں نے بے کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ ریذیڈنٹ جنرل ۲۵ کی صبح کو بے سے ملنے کے لئے گیا مگر اس انٹرویو میں کسی دوسرے کو موجود رہنے کی اجازت نہ دی گئی اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے اعلان کیا کہ بے نے ایک فرمان جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس پر بے نے دستخط نہیں کئے تھے۔

ہماری اطلاع کے مطابق تونیسیہ کے حکمران اور ریذیڈنٹ جنرل کی اس خفیہ ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ بے کے لئے ہرگز خوشگوار نہ تھا۔ لیکن جب ریذیڈنٹ جنرل ملاقات کر کے باہر آیا۔ تو اس نے موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اندر تو بڑے پیار محبت کی باتیں ہوتی رہیں"، یہ ہولناک اور کرب انگیز تمسخر اس بوڑھے شخص سے کیا گیا جس کے تمام ساتھی اس سے چھین لئے گئے تھے اور جو تونیسیہ میں فرانسیسی سامراج کے بھاری فوجی دباؤ کا مقدور بھر مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

موجودہ صورت حال کا یہ نقشہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک آلۂ کار کو جس کا نام باکوش ہے وزیر اعظم بنا دیا۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ وہ کب تک وزیر اعظم رہے گا۔ البتہ اگر مجھے پیش گوئی کرنے کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ اسے اپنے

ضمیر کی ملامت یا جیل میں اپنے مقید نیشلسٹ بھائیوں کی ملامت کے زیر اثر یہ عہدہ جلد از جلد ترک کرنا پڑے گا۔ حالت یہ ہے کہ وہ تا حال اپنی کابینہ میں ایک بھی وزیر نہیں لے سکا اور ادھر ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ فرانس کے حکام اصلاحات کی خوبصورت سکیموں اور تونیسیہ کو خود مختاری دینے کے منصوبوں کے ساتھ منتظر کھڑے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ان سکیموں اور تجویزوں کے بارے میں گفتگو کس سے کریں گے؟ انہیں آخر بات چیت کس سے کرنا ہے؟ کیا خواہش یہ ہے کہ جس میز پر بیٹھ کر انہیں گفتگو کرنا ہے اس کے دونوں جانب صرف فرانسیسی ہی ہوں یا پھر ان کی کٹھ پتلیاں ہوں؟ اگر ان کا مقصد کچھ کام کرنا ہے اگر الفاظ بے معنی نہیں ہو گئے اور اگر وہ فی الواقعہ کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف انسانیت کے نام پر بلکہ علم عقل اور منطق کے نام بھی علی الرغم لازم ہے کہ وہ بات چیت ان لوگوں سے کریں جو فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کا کیا فائدہ جو خود فرانسیسیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے ہیں؟

اس وقت صورت حال یہ ہے لیکن فرانس کے نمائندے نے کہا ہے کہ "چند ہفتے قبل تو حالات ایسے تھے جن پر حفاظتی کونسل یا جنرل اسمبلی میں بحث کے لئے شاید کوئی وجہ جواز ہوتی۔ آج یہ صورت ہرگز نہیں اور حالات کی ابتری ختم ہو چکی ہے اب تونیسیہ میں امن، خوشحالی، شادمانی اور دوستی کا دور شروع ہو رہا ہے"۔۔۔

لیکن حالات وہی ہیں جو اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ہزاروں تونیسی جیلوں میں بند ہیں پوری کابینہ جیل میں ہے اور نیشلسٹ تحریک کے تمام بڑے لیڈر جیل میں ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی عزت و حرمت نہ صرف اپنے ملک میں ہے بلکہ باہر بھی ہر جگہ انہیں ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کیا یہی وہ خوشحالی اور شادمانی کی صبح ہے جس کی نوید ہمیں فرانس کے نمائندے

نے سنائی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں اس صورتِ حال پر بحث نہیں کرنی چاہیئے؟

اس مسئلہ میں یہ میری پہلی مداخلت ہے میں اسے مختصر رکھوں گا کیونکہ مجھے معلوم ہے وقت کم ہے اور دوسرے مندوبین بھی کچھ کہنے کے خواہاں ہیں۔ میں اس مسئلے پر پھر اظہارِ خیال کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مختصر طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری اطلاع کے مطابق شاید ہم اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے لیے سات مثبت ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلے تو ہم سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ لیکن اب تک ہمارا خیال یہی ہے کہ اتنے ووٹ ہمیں نہیں مل سکیں گے۔ ہمارے رفقا کو معلوم ہے کہ یہاں ووٹ نہ دینے کا مطلب بھی منفی ووٹ ہوتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مسئلے کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے قبل پیرس کے اجلاس میں مسئلہ مراکش کا ہوا تھا لیکن کونسل میں یہ سوال گیارہ ملکوں نے پیش کیا ہے یہ تمام ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں اور انہیں غیر ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اقوامِ متحدہ کے ایوانوں میں یونہی گھومتے پھرتے ہوں۔ وہ اقوام متحدہ ہیں سا اقوام متحدہ کا معتقد بن جاتے ہیں۔ انہیں اعتماد و یقین ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے جس میں وہ دکھ درد کا مداوا تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی راہِ نجات نہ ہو۔

کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اہلِ تونیسیہ اپنی تکالیف کے ازالہ کے لئے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے سیاست سے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؟ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے انہیں کہاں بھیجنا چاہتے ہیں؟ میں یہ سوال تمام ان فرانسیسیوں سے کر رہا ہوں جن تک میری تقریر کے اجزا جلد یا بدیر پہنچیں گے اگر تونیسیہ جیسی صورت حال پر اقوام متحدہ میں بحث نہیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہے اگر مظلوم و مقہور اقوام گیارہ ذمہ دار

ملک کی وساطت سے ـــــ نمائندہ فرانس اور دوسرے نمائندوں کو خوب علم ہے کہ یہ ممالک چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے ایشیا سے عبارت ہیں - اپنی آواز یہاں نہیں پہنچا سکتیں تو پھر ہم لوگ یہاں کس غرض سے جمع ہیں؟ عملی طور پر مالا ایشیا اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ نہیں کہہ رہا کہ فرانس کو سزا دیجئے یہ بھی نہیں کہتا کہ تونیسیہ کو آج ہی پروانۂ آزادی دے دیجئے صرف یہ کہتا ہے کہ از راہ کرم اس سوال پر بحث کیجئے لیکن اگر سلامتی کونسل کے سات ارکان اس مسئلے کو زیر بحث لانے کے لئے نہیں مل سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گیارہ قوموں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جہنم کی راہ لو۔ ہم تمہارے سوال پر بحث نہیں کریں گے تم اس مسئلے پر خواہ کتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہو لیکن ہم اسے اپنے ایجنڈے پر بھی لانے کے لئے تیار نہیں۔ تاکہ سچائی بروئے کار آجائے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی۔ ہم نے شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں اور ہم آگ بجھانے والے محکمے کے پاس یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ فلاں آگ کو دیکھئے اور اسے بجھائیے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے۔ یہ بڑی عجیب صورت حال ہے اس کے باوجود ہم اس سوال سے دلچسپی لیتے رہیں گے کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم انسانوں کا ہے جنہیں ہم اپنے بھائی سمجھتے ہیں۔ جن ممالک نے اس مکتوب پر دستخط کئے ہیں ان میں سے اکثر ماضی قریب تک خود اسی طرح محکوم و مجبور تھے۔ ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ وہ نامساوات کی ان مصیبتوں کو بھول گئے ہوں۔ جن کا تختہ مشق وہ محکوم ہونے کے باعث بنے ہوتے تھے۔ بہر حال ہم اہل تونیسیہ کی حالت زار کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم ان سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنے صوابدید کے مطابق خواہ کوئی فیصلہ کرے یا کرنا چاہے (اس کونسل کی میز پر بعض ایسے آدمی بھی براجمان

ہوں گے جن کا طرزِ عمل پکار پکار کر کہہ رہا ہو گا کہ ہم اس معاملے کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے روادار نہیں، ہم اپنے دلوں میں چراغ روشن رکھیں گے اور جو کچھ ہم سے ہو سکے گا کر گزرنے میں قطعاً دریغ نہ کریں گے۔

اس مقام پر میرا وفد فی الحال رک جانا چاہتا ہے۔ نمائندہ فرانس نے تاریخ ماضی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا وفد ان کے متعلق بھی جواب کا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے اس وقت تونیسیہ کی صورتِ حال کے مزید پردے چاک ہو جائیں گے اور وہ استعماری کیفیتیں سامنے آ جائیں گی۔ جو وہاں موجود ہیں اور اس پوری بے چینی اور اضطراب کی بنیاد و اساس ہیں۔ فی الحال ہم صرف طریق کار کی بحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ میری تقریر میں مطلب کے بعض نکات بھی زیر غور آ گئے ہیں لیکن ان کا اصل باعث نمائندہ فرانس کی تقریر تھی جس نے مطلب کے معاملات اپنی تقریر میں شامل کر لیے۔

یہاں میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

۲

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں تونیسیا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں پروفیسر احمد شاہ بخاری ــــ پطرس ــــ کی دوسری تقریر جو انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کے اجلاس میں کی۔ بخاری اس وقت کونسل کے صدر بھی تھے:

تقریریں کرنے والوں کی جو فہرست میرے پاس موجود ہے اس میں اگلا نام پاکستان کے وفد کا ہے۔ اگر حفاظتی کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت سے کونسل سے خطاب کروں گا۔

اب تک حفاظتی کونسل کے تمام گیارہ ارکان اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کے بارے میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ چھ ملکوں کے وفد اسے ایجنڈے میں شامل کرنے کی حمایت نہیں کریں گے۔ ان میں مختلف ملکوں کے وہ دوست اور رفیق بھی شامل ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں انتہائی احترام ہے۔ ان میں سے تین ملک ایسے ہیں کہ جو عام لوگوں کے نزدیک زبردست استعماری مفاد کے نمائندے ہیں جو تھے ملک کی عظمت و شان میں بھی کلام نہیں۔ اسے استعماری مفاد سے بھی کوئی علاقہ نہیں تاہم اس نے مذکورہ بالا ملکوں ہی کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس بارے میں دوٹوں کی نوبت آئی اور جب کبھی بھی آئی ہم ہار جائیں گے۔

کل کا دن ــــ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء ــــ اقوام متحدہ کی سرگزشت میں ایسا دن متصور

ہوگا جب مختلف معاملات پر آزادانہ غور و بحث کو دبا دینے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ میرے دور اندیش رفیق چین کے نمائندے ڈاکٹر سیانگ نے اقوام متحدہ میں وسیع تجربے کی بنا پر ہمیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ اس انجمن کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا واقعہ ہوگا جب ایک معاملے کو محض ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں کونسل کے اندر اس درجہ شدت اختیار کی گئی کہ اسے ختم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں آج کا دن ایک اور لحاظ سے بھی یادگار رہے گا اس لئے کہ ایک پالیسی کو حد درجہ افسوسناک اور الم انگیز طریق پر الٹ دیا گیا۔

"پچھلی مرتبہ میرے وفد نے حفاظتی کونسل سے خطاب کیا تو اس کی ضرورت میرے معزز دوست نمائندہ فرانس کے خطاب کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ میرے لئے یہ امر حد درجہ غیر مناسب ہوگا کہ میں اس دوسرے موقع کو بھی ان کی تقریر پر نکتہ چینی کے لئے استعمال کروں۔ مجھے ایسے طرز عمل سے محترز رہنا چاہئے میری آرزو ہے کہ اس موقع پر اپنے رفیق کے سامنے خود حکومت فرانس کی رائے میں سے چند اقتباسات پیش کروں۔ یہ رائے اس مسئلے پر دی گئی تھی کہ کسی مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ اس وقت دی گئی تھی۔ جب تونیسیہ کا مسئلہ قطعاً زیر بحث نہ تھا۔ ۳ ستمبر ۱۹۴۶ء کو حفاظتی کونسل یونان کے خلاف یوکرین کی شکایت پر بحث کر رہی تھی۔ اس وقت نمائندہ فرانس نے جو تقریر فرمائی تھی میں اس کا ایک حصہ یہاں پڑھوں گا۔ نمائندہ فرانس مسٹر پروڈی (MR PARODI) نے اس موقع پر کہا تھا ——

"ایک معاملے کو ایجنڈے پر لانے سے انکار کا طریقہ سخت نقصان رساں اور خطرناک ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ کرنے کے کون سے وجوہ ہو سکتے ہیں کہ فلاں شکایت کے لئے مناسب بنیاد موجود نہیں؟ کیا اس کا مطلب

یہ ہے کہ کونسل عام سیاسی صورتِ حال کے متعلق قیاسی علم کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دے گی ایسا کرنا ممکن ضرور ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا اس قسم کی شہادت کے پیشِ نظر کونسل کے لئے اس قسم کا طریقہ اختیار کرنا ایک حد تک خطرناک ہے اس لئے کہ جب تک کونسل پورے مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض نہ کرے گی اسے شہادت کے بارے میں صحیح اندازے کا موقع کیونکر مل سکے گا؟ اندیشہ ہے کہ ایسے معاملات میں کونسل عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو جائے گی اور ان مقاصدِ انصاف کا پورا خیال نہ رکھ سکے گی۔ جو پیش کردہ مسئلے کے سلسلے میں ملحوظ رہنے چاہئیں"

فرانس بہت بڑا ملک ہے۔ وہ حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ہے۔ یعنی ان پانچ ارکان میں سے ایک ہے جنہوں نے انجمن اقوام متحدہ کے پورے نظام کے نفوذ و اقتدار میں حصہ لیا تا کہ انصاف، مساوات اور آزادانہ غور و بحث سے مسائل کا تصفیہ ہو سکے۔ لیکن آج اسی فرانس کا وفد (اسی ملک کے ایک سابق نمائندے کے الفاظ میں) عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو گیا ہے اور اس نے انصاف کے وہ مقاصد پیشِ نظر نہیں رکھے جو اس خاص مسئلے میں پیشِ نظر رہنے چاہئیں تھے۔

جس حد تک میرے معزز دوست نمائندہ فرانس اور اس بحث میں اس کی حکومت کی مداخلت کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا چاہیئے۔

میں نے سلطنت متحدہ (برطانیہ) کے معزز نمائندے اور اپنے دوست سر گلیڈون جیب (SIR GLADWYN JEBB) کی تقریر سنی۔ اس سے بطورِ خاص مایوس ہوا۔ معزز سر گلیڈون جیب کی تقریر میں متعدد خوشگوار باتیں تھیں۔ جن میں میں بھی ان کا شریک ہوں۔ ان میں انگریزی زبان کے لئے محبت اور عزت بھی شامل ہے۔ مجھے گلہ ہے کہ

سلطنت متحدہ کے معزز نمائندے نے آج ہمارے اس مشترکہ مجوزہ کی بے حرمتی کر دی ہے انہوں نے یہاں اس خط میں سے کچھ اقتباسات سنائے جس کے مطابق گیارہ ملکوں نے یہ معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا تھا اور جب وہ اس فقرے پر پہنچے جس میں حکومتوں نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ موجودہ حالت کو ختم کرنے کی غرض سے وہ تمام ضروری تدبیریں منشور کے مطابق اختیار کرنے کے لئے اجلاس منعقد کیا جائے تو نمائندے نے فرمایا کہ یہ جملہ مبہم ہے دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک اس جملے کے متعدد مفہوم تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں پریشانی لاحق ہوئی۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مفہوم کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی شاید یہ صورت ہو گی کہ یہ کیا جائے تو میں حفاظتی کونسل سے معقول اور متوازن طریق پر درخواست کرتیں اور کونسل کو پورا موقع دیتیں کہ وہ اس مفہوم کے مطابق کم یا زیادہ جیسا مناسب سمجھے انتظام کرے۔ میں نمائندہ برطانیہ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں تو کوئی ابہام نہیں الا یہ کہ ہم انگریزی زبان کی بے حرمتی پر کمر باندھ لیں۔

سر گلیڈون نے یہ بات کہہ کر بے تکلفی سے آگے بڑھے اور فرمایا کہ کم از کم برطانوی وفد کی رائے یہ نہیں کہ فرانس یا تونیسیہ پر کوئی حل ٹھونسا جا سکتا ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ زیر بحث جملے میں ایک بھی ایسا الفاظ موجود ہے جس سے قوت یا جبر کا مفہوم پیدا کیا جا سکے یا سمجھا جا سکے کہ کوئی چیز ٹھونسنا مقصود ہے؟ اگر سلطنت متحدہ کے وفد کو صرف اس بات پر اعتراض تھا تو وہ ایسی تجویزیں یا سفارشیں پیش کر سکتا تھا جو فریقین پر کوئی حل ٹھونسنے سے بالکل پاک ہوتیں۔ سلطنت متحدہ کا وفد کہہ سکتا تھا کہ آئیے اس مسئلے پر بحث کریں، ہمیں تونیسیہ یا فرانس پر کوئی حل ٹھونسنا نہ چاہیئے۔ محض یہ سفارش کر دینی چاہیئے کہ وہ مل کر بیٹھ کر جھگڑے کا تصفیہ کر لیں کیونکہ

فیصلہ ٹھونسنے سے تعبیر کیا جاسکتا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اپنا نقطۂ نگاہ جس انداز سے پیش کیا اس سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ ہم نے حفاظتی کونسل میں جو شکایت پیش کی وہ مبہم اور لغو تھی۔ ساتھ ساتھ ایک دھمکی بھی موجود تھی اور ہماری درخواست میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی بنا پر حفاظتی کونسل کے لئے لازم ہو جاتا کہ وہ اپنا حل تونیسیہ یا فرانس پر خواہ مخواہ ٹھونس دے یہ امر حقیقت سے منزلوں دور ہے۔

سلطنت متحدہ کے نمائندہ کا بیان ایک مسلمہ پالیسی کا بھی اہم اور الم انگیز نقص ہے۔ قبل ازیں انجمن اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ اس قسم کے مسائل ایجنڈے میں شامل کئے جائیں یا رد کئے جائیں؟ اس موقعہ پر سلطنت متحدہ کے وزیر خارجہ نے اپنے نظریات پیش کئے تھے۔ میں حفاظتی کونسل میں سرکاری دستاویزوں سے اقتباسات پیش کروں گا۔ جب روس کے خلاف ایران اور احوال یونان کے متعلق روس کی شکایتیں زیر غور تھیں ــــــ مسٹر بیون (MR. BEVIN) نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو فرمایا تھا ــــــ

"میں دل سے چاہتا ہوں کہ حفاظتی کونسل ان تمام معاملات کے متعلق شکایت کرنے والوں کی باتیں سنے خواہ وہ کوئی ہوں اگر کوئی حکومت محسوس کرتی ہے کہ کسی چھوٹی یا بڑی طاقت کے خلاف شکایت کے بعد وہ اس کونسل میں نہیں آسکتی اور اپنا نقطۂ نگاہ بیان نہیں کرسکتی تو میرے نزدیک یہ غلط ہے جس حکومت کا میں نمائندہ ہوں۔ اسے بھی امن کو خطرے میں ڈالنے کا ملزم گردانا گیا ہے۔ یونان کے معاملے میں جس حد تک میری یا کم از کم میری حکومت کی خاص ذمہ داری کا سوال ہے۔ اس کی پوری تحقیقات کرلی جائے اور اس پر بحث بھی ضرور

کی جائے۔ میری طرف سے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ . . . . اگر حکومت ایران کو حکومت روس کے خلاف کوئی شکایت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایران کو ضرور موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آئے اور اپنا معاملہ پیش کرے اس وقت ہم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ شکایت درست تھی یا نہ تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو ٹھنڈے پر رکھا جائے اور اس پر بر سر عام بحث کی جائے اس لئے کہ مجھے یقین ہے حقائق کو دنیا کے سامنے لانے ہی پر امن کا انحصار ہے۔ خواہ وہ حقائق صحیح ہوں یا غلط۔ (سرکاری ریکارڈ سال اوّل سلسلہ اول صفحہ ۱)

آج یہ گراں بہا الفاظ بھلا دیئے گئے ہیں۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو بروئے کار لانے سے انجمن اقوام متحدہ کے اصول کو تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان سلطنت متحدہ کے نمائندے کی تقریر میں ہے ——— اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانا اور اس پر آزادانہ اور عام بحث کا موقع بہم پہنچانا انجمن اقوام متحدہ پر بہت بڑا اثر ڈالے گا۔

اگر کسی معاملے کے متعلق آزادانہ بحث سے اقوام متحدہ پر برا اثر پڑتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا میں اقوام متحدہ کا اور کونسا بڑا وظیفہ رہ جاتا ہے۔ سلطنت متحدہ کے نمائندے کے نزدیک اقوام متحدہ کو انحطاط سے بچانے اور گیارہ قومیں اس پر جو بُرا اثر ڈالنا چاہتی ہیں۔ ان سے بچاؤ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام بحثیں ختم کر دی جائیں اور ہم سب امن و سکون کی زندگی بسر کریں ساتھ ساتھ اس نئی عمارت کو تاکا کریں جس میں ہم جمع ہیں۔

سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اور میں سمجھتا ہوں کہ نیدرلینڈز کے نمائندے نے ایک بات بڑے خلوص اور دیانت سے کہی اور وہ یہ کہ اگر ہم نے اب کوئی

قدم اٹھایا یا اس مسئلے پر حفاظتی کونسل میں بحث کی تو تونیسیہ میں جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ناکام ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات چیت کس سے ہو رہی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ایک فریق فرانس ہے۔ دوسرا فریق کون ہے جو بات چیت کر سکتا ہے؟ تمام ارکان وزارت جیل میں ہیں اور یہ آخری عوامی وزارت تھی جو تونیسیہ کو ملی۔ تمام قومی لیڈروں اور کارکنوں کو اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو جس نے قومی مقاصد سے کم یا زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا یا تو ہٹا دیا گیا یا کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ تونیسیہ میں اس وقت وسائل حمل و نقل پر شدید پابندیاں ہیں۔ پھر فرانسیسی اس وقت کس کے ساتھ معاملات پر بحث و تمحیص کر رہے ہیں؟ کونسی گفت و شنید ہے جو حفاظتی کونسل میں بحث کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے گی؟ ریذیڈنٹ جنرل تونیسیہ میں کونسا صد درجہ نازک کام انجام دے رہا ہے جو یہاں ہماری لب کشائی سے معرض خطر میں پڑ جائے گا؟ اگر اقوام متحدہ میں اس مسئلے پر بحث تونیسیہ کے اندر ریذیڈنٹ جنرل کے کام کو تباہ کر دے گی اور اگر اس بین الاقوامی عدالت میں آزادانہ بحث اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی تو ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کسی برے کام ہی کے درپے ہو گا۔ جس میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ کسی اچھے کام میں رکاوٹ کا امکان ہی نہیں اور میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اقوام متحدہ میں کوئی بحث بہبود انسانی پر ایسا مہلک اثر ڈالے گی۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اس مسئلے پر بحث کی تو اس سے تونیسیہ میں بے چینی کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ یہ بات شروع ہی سے کہی جا رہی ہے۔ یہ پہلو سب سے پہلے نمائندہ فرانس نے پیش کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے نمائندوں نے بھی خلوص کے ساتھ خطرہ محسوس کیا کہ ہمارے الفاظ کسی نہ کسی طرح وہاں کے عوام کو مشتعل کر دیں گے۔

تونیسیہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل وہاں کے اصل باشندے، دوسرے فرانسیسی۔ فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتار دی ہیں۔ ان کے ساتھ ٹینک ہیں توپیں ہیں اور ہر قسم کے آلات و اسلحہ ہے جس حد تک مجھے علم ہے اہلِ تونیسیہ کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارگاہ۔ لہذا اگر ہمارے الفاظ کسی کو مشتعل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی موثر طریق پر مشتعل ہوں گے اہلِ تونیسیہ میں کیونکر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ کبھی کبھار ایک بم پھینک سکتے ہیں یا وقتاً فوقتاً شور مچاتے رہتے ہیں لیکن وہاں کی پوری فوجی قوت فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ ہم انہیں اس وقت فوجی کارروائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ ان افعال کے مرتکب نہ ہوں جنہیں "مظالم" سے تعبیر کیا جا رہا ہے ـــــ یہ ایسا لفظ ہے جو نمائندہ فرانس کے کانوں پر یقیناً گراں گزرے گا۔ تونیسیہ میں فی الحال اور کچھ نہیں ہو رہا۔ البتہ ریذیڈنٹ جنرل سر توڑ کوشش کر رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے تاکہ دنیا کو بتا سکے کہ بات چیت از سرِ نو شروع ہو گئی ہے۔

سلطنتِ متحدہ کے وفد کی طرف سے یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ اس لئے کہ سلطنت متحدہ کے سوا دنیا کا کوئی ملک نہیں جسے اس قسم کے حالات کا زیادہ تجربہ ہو۔ اس وفد کو خوب معلوم ہے کہ پاک و ہند کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کی دست کشی سے پیشتر قومی لیڈروں کو بار بار جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور ان کی جگہ مقامی معززین، نے حکومتیں بنالی تھیں (یہ وہی اصطلاح ہے جو فرانس نے تونیسیہ میں اپنے پٹھوؤں کے لئے استعمال کی) زیادہ معتدل اور زیادہ معقول عناصر سے سمجھوتے ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی سمجھوتہ کارآمد ثابت نہ ہوا جب تک عوامی خواہشات سے اعراض جاری رہا۔ اصلاحات کی کوئی قسط اطمینان و صلاحیت سے کامیاب نہ ہو سکی۔ انجام کار ایک ایسے طرزِ عمل کی بنا پر

جو میرے نزدیک تاریخ میں ہمیشہ شاندار اور برتر رہے گا۔ سلطنت متحدہ نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے بات چیت کرے جنہیں ایک موقع پر جیلوں میں ڈالا گیا تھا اس کے بعد ہی پاک و ہند اور سلطنت متحدہ کے درمیان پائیدار امن و دوستی کی بنیاد پڑی۔ اس دوستی پر ہمیں فخر ہے۔

تاہم یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوا جب تک سلطنت متحدہ نے ایک جرات مندانہ اور خیال انگیز قدم نہ اٹھایا روز بروز وقت گزارانہ تدبیروں سے کام لینے اور دنیا کو اپنے ارادوں اور روش کے متعلق دھوکہ دینے کی کوشش کے بجائے سلطنت متحدہ جرات مندانہ اقدام سے اصل کام پر متوجہ ہو گئی اور عوام کے حقیقی نمائندوں کے ساتھ بات چیت کر لی۔ فرانس تونیسیہ میں یہ طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہمیں امید تھی کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے حکومت فرانس کو یہی مشورہ دیں گے جو ماضی قریب کی تاریخ میں خود ان کے اپنے تجربے پر مبنی تھا۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوئی دو ہفتے پیشتر فرانس کے وزیر صحرات کے درمیان بات چیت ہوئی تھی اور موضوع گفتگو تونیسیہ تھا۔ اگر سر گلیڈون کا بیان اسی مشورے پر مبنی ہے جو کہ مملکہ کی حکومت کو یہ معاملہ ایجنڈے میں شامل کرنے کے لئے دیا گیا۔ تو مجھے افسوس ہے کہ ان دو معزز اصحاب کی یکجائی سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سر گلیڈون جیب نے انگریزی زبان پر قابل رشک دسترس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کچھوے اور مجھے خرگوش سے تشبیہہ دی۔ اس طرح مجھے جلد بازی کا ملزم گردانا۔ موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں جس کے ساتھ وابستگی کی عزت انہیں ہے اور ہمارے ملکوں کو حاصل ہے بھانت بھانت کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے یہ تو غالباً درست ہے لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں شتر مرغ بھی موجود ہیں تو میرے

ملک میں نہیں پائے جاتے۔

اب میں اس معاملے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جو میرے نزدیک حد درجہ پسندیدہ اللہ گہا ؤ ہے یعنی اس مسئلے کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا موقف۔ جس حد تک آزادانہ بحث و تجسس کا تعلق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے زیادہ عزت مندانہ ریکارڈ پیش کر سکتا ہے۔ اس وقت تک امریکہ کی پالیسی ہر ابہام سے پاک رہی اور وہ حد درجہ بلند آہنگ تھی۔ گزشتہ برسوں میں اس معاملے کے متعلق آزادی تقریر کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جو کچھ کہا ان میں سے بعض حصوں کو دہراتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے ـــــ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بہتر سے اصحاب کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض حصے بڑے روح افروز ہیں ـــــ میں ان حصوں کو اس غرض سے یہاں پیش کروں گا۔ تاکہ اندازہ ہو سکے آج اقوام متحدہ کے بڑے ارکان کی روش میں کتنا نمایاں تغیر آچکا ہے۔

کیا مجھے ۱۹۴۶ء کی طرف توجہ کی اجازت دی جائے گی۔ جب مسٹر سٹیٹنیس (MR - STETTINIUS) نے روس کے خلاف ایران کی شکایت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:ـــــ

"اگر ہم کونسل کے آئندہ اجلاس میں بحث کی غرض سے ایسے مسائل کو ایجنڈے میں لانے پر راضی ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں اس طرح صورت حال ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو یقین ہے اگر اقوام متحدہ کے ارکان میں سے کوئی ملک شکایت لے کر آتا ہے تو یہاں اسے اپنی بات

سنانے کا حق حاصل ہے۔"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسی نمائندے نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونان کے اندر برطانوی افواج کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"جب مختلف ملکوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو بہتر یہی ہے وہ اپنے معاملات کو اس کونسل میں لے آئیں۔"

امریکہ کے ایک اور معزز نمائندے مسٹر جانسن (MR. JOHNSON) نے یونان کے خلاف جمہوریۂ شورائیہ یوکرین کی شکایت پر ستمبر ۱۹۴۶ء میں بحث کرتے ہوئے کہا:

"اس نظام (حفاظتی کونسل) کی تاسیس کے وقت سے میری حکومت کا موقف برابر رہا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا کوئی رکن کہتا ہے ایسے حالات موجود ہیں جن سے بین الاقوامی امن و حفاظت کے لئے خطرہ درپیش ہے تو کونسل اسے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ میری حکومت اس اصل کو بہت اہم سمجھتی ہے۔"

امریکہ کے اسی نمائندے یعنی مسٹر جانسن نے ۱۹۴۷ء میں پھر کہا:۔

"یہ واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ دنیا کے اس خطے میں گولی چل رہی ہے اور آدمی مارے جا رہے ہیں۔ لہذا حفاظتی کونسل کو اس پر توجہ کا حق حاصل ہے۔ خواہ سیادت کا تصور کچھ ہی ہو۔ اور انجام کار اس بارے میں کچھ ہی فیصلہ کیا جائے"

روس نے چیکوسلواکیہ کی آزادی میں مداخلت کی تھی اور اس پر چلی کی طرف سے شکایت کی گئی تھی۔ مسٹر وارن آسٹن (MR. WARREN AUSTIN) نے اس سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"جو مسئلہ سامنے ہے اس کے متعلق فیصلہ اصل معاملے کا فیصلہ نہ ہوگا اسے معاملے کے مادہ و ماعلیہ پر فیصلہ نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جب ایک

مسئلہ پیش ہو۔ جیساکہ یہاں ہوا یعنی یہ کہ کوئی معاملہ بحث کے لئے ایجنڈے پر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے تو اس معاملے کی نوعیت پر ضرور غور کر لینا چاہیئے۔ تاکہ معلوم ہو سکے حفاظتی کونسل کی دسترس میں وہ آتا ہے یا نہیں آتا۔"

مسٹر آسٹن نے مزید کہا:۔۔۔۔

"کیا حفاظتی کونسل اس ذمہ داری سے اعراض یا اغماض کر سکتی ہے جو اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے کہ ان تمام الزامات کی سماعت کرے؟ ان وجوہ سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس امر کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں ووٹ دے گی۔"

میں وہ تمام اقتباسات پیش نہیں کروں گا جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے رفیقوں کو تھکا دینے کا خواہاں نہیں۔ امریکہ کی حکومت زمانہ ماضی میں اس مسئلے کی حمایت میں بڑی بلند آہنگ اور علمبردار رہی ہے۔ میں جیسپ (MR. JESSUP) کے بیانات میں سے بعض اقتباسات چھوڑتا ہوں اور اس اقتباس پر آتا ہوں جو میرے ذخیرے کا آخری اقتباس ہے۔ یہ مسٹر وارن آسٹن کے بیان سے ماخوذ ہے جو اس شکایت کے سلسلے میں دیا گیا تھا کہ حکومت ایران عالمی بین الاقوامی عدالت کی مؤقت تجاویز پر عمل کرنے میں ناکام رہی۔ موصوف نے فرمایا:۔۔۔

"اقوام متحدہ اصولاً کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی۔ تاہم دخل دینے سے انکار اس وقت پیش نظر آسکتا ہے، جب ایجنڈا منظور کر لیا جائے اور اس پیش کردہ معاملے پر غور و خوض ہو جائے یہ انکار پیشتر نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ انکار کے معقول وجوہ موجود ہوں۔"

تاہم یہی روش ان متعدد وفود نے اختیار کی جو اس موقعہ پر ہمارے نقطۂ نگاہ کو قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اختیار کے معاملے کی طرف اشارے ضرور کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان پر بحث نہیں کی گئی۔ بعض نمائندوں نے کہا کہ جب تک اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کی رضامندی نہ دی جائے گی وہ کونسل کے اختیار یا عدم اختیار کی بحث میں نہیں پڑیں گے۔

اس طرح امریکہ نے سالہا سال تک واضح روش پر قائم رہنے کے بعد اپنی پالیسی بالکل بدل لی ہے مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ طرزِ عمل ہمارے لئے بہت بڑی مایوسی کا باعث ہوا۔ اس تبدیلی کے ابتدائی آثار گزشتہ موسم خزاں میں جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے دوران نمایاں ہو چکے تھے۔ اس اجلاس میں مراکش کا مسئلہ پیش ہوا تو امریکہ نے اسے جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کرنے سے اختلاف کا فیصلہ کیا۔ ہمیں اس معاملے میں امریکہ کے افکار اور طرزِ عمل کی سرگزشت کا علم تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ امریکہ کے اس راستے سے ایک خفیف سا انحراف ہے جو اس نے اپنے لئے چن رکھا ہے۔ محض یہی نہیں ہم یہ سمجھتے ہوئے خوش تھے ــــــ اور اس کے لئے مجھے امریکہ کے وفد کو انتہائی تحسین کا مستحق سمجھنا چاہیئے۔ کہ امریکہ نے کسی بھی معاملے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اگرچہ اس میں خود امریکہ ہی کو شدید الزامات کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی سرگزشت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ سمجھا کہ مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ کو ایک منفرد مثال سمجھنا چاہیئے۔ غالباً بہت سی مصلحتیں پیشِ نظر تھیں جو مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ پر اثر انداز ہوئیں لیکن پیشِ نظر مسئلے کو کسی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید ایک مصلحت یہ تھی کہ ہمارا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا جو نمائندے یہاں تشریف فرما ہیں انہیں یاد ہوگا کہ فرانس کے وزیرِ خارجہ

نے جو تقریر کی تھی۔ ویسی عجیب وغریب تقریر اقوام متحدہ میں کبھی نہیں سنی گئی۔
اس نے مقام تقریر پر پہنچ کر اسمبلی سے درخواست کی کہ مسئلہ مراکش کو ایجنڈے
میں شامل کرنے سے متعلق ووٹ دینے سے احتراز کیا جائے اس لئے کہ دوسرے
معاملات کے علاوہ اسمبلی اس وقت فرانس کی مہمان ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے
کہ جو وفود اس موقعے پر موجود تھے ان میں سے متعدد نے اس مروت اور خوش
خلقی کو اپنے اوپر لازم کر لیا جس کے متعلق وزیر خارجہ فرانس نے یاد دہانی کی
تھی۔ اس قسم کی مروت و خوش خلقی پر کاربندی دنیا میں آج بھی مزید حوصلہ
افزائی کی موجب ہوتی۔ اگر لاکھوں مراکشیوں کی زندگی اور آزادی معرض خطر میں
نہ ہوتی۔ جس طرح آج لاکھوں تونیسیوں کی زندگی معرض خطر میں ہے۔

آج ہم کس کے مہمان ہیں کہ وہی روش اختیار کرنے پر مجبور رہوں جو پیرس
میں اختیار کی گئی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کا ووٹ سے احتراز مسئلہ تونیش پر
ووٹ سے احتراز کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہم اس احتراز کا
ماتم کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے امریکی دوستوں اور امریکی وفد کے دوستوں کو یاد
دلانا میرا کام نہیں کہ ان کا فیصلہ دنیا بھر میں آزادی فکر و خیال کے حامی عناصر
کی بہت بڑی تعداد کے لئے باعث رنج ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ حفاظتی کونسل
کے گزشتہ اجلاس سے اب تک یہ مسئلہ بہت سے ملکوں کے باشندوں پر اثر انداز
ہوتا رہا ہے۔ ہر جگہ دلوں کو ٹٹولنے کے بعد اس پر گہرا غور و خوض ہوا ہے۔ کسی
آزاد خیال اخبار سے آگاہ نہیں جس نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلے پر
بحث کا دروازہ بند کر دینا کوئی اچھی پالیسی ہوگی اور امریکہ بھی ان ملکوں میں شامل
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کی حکومت نے خطرات کا پوری طرح محاسبہ و موازنہ

کر چکنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ اور ہم گیارہ ممبر جو اس شکایت کو حفاظتی کونسل میں لانے ——— محض ہمیں نہیں بلکہ آج کی تمام آزادی پسند قومیں ——— کشیدگی اور تناؤ کے اس دور میں زیادہ سے زیادہ اور وسیع سے وسیع اتحاد پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دنیا کو مصائب سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کی خاطر، ہماری اپنی خاطر اور امن و آزادی سے محبت رکھنے والے تمام ملکوں اور جماعتوں کی خاطر اس امر کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ کہ امریکہ کا یہ فعل اصل مقصد کی تلاش میں غیر ضروری رکاوٹ ثابت نہ ہو۔

جس حد تک میں اندازہ کر سکتا ہوں طویل مدت تک ایک واضح طرز عمل اختیار کر چکنے کے بعد یکایک اس کے برعکس کاربند ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جس کی کوئی معقول توجیح امریکہ کے بہترین دوست بھی دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکیں گے۔ یہ تو تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے کہ جس بازار میں سواریاں صرف ایک رخ پر جا سکتی ہیں۔ امریکہ نے اس میں چلتے چلتے اچانک الٹے رخ گامزنی کا فیصلہ کر لیا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرز عمل کے نتائج کیا ہوں گے تاہم میں امریکی وفد کے ارکان کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بیان میں بہت سے حوصلہ افزا الفاظ ادا فرمائے انہوں نے قوت و طاقت کے استعمال کی مذمت کی اور یہ مذمت تونسیوں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ اس میں فرانسیسیوں تک کو شامل کر لیا گیا۔ امریکی وفد کے اصحاب خوب جانتے ہیں کہ قوت و طاقت کے آلات تونسیوں کے پاس نہیں۔ ان ہلاکت بار ہتھیاروں سے فرانس کا پلڑا زیادہ بھاری ہے نہ کہ تونسیوں کا۔ لہٰذا میں ان کے جملے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے قوت استعمال کرنے کے متعلق فرانس کو بر سر عام متنبہ کر دیا ہے۔ فرانس اب تک تونیسیہ میں قوت ہی استعمال کرتا رہا ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ اس وقت تک یہی کرتا ہے

گا۔ جب تک عالمی رائے عامہ کو اس صورت حال کے خلاف بیدار نہ کیا جائے گا۔ فرانسیسی کس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوت استعمال نہیں کر رہے جب حالت یہ ہے کہ ایک بھی قابل ذکر شخص آزادانہ بازاروں میں چل پھر نہیں سکتا؟

لہٰذا میں خیر سگالی کے ان الفاظ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اہل تونیسیہ ان کا خیر مقدم کریں گے۔ ان لوگوں نے بار ہا مدد کے لئے امریکہ پر نظریں جمائے رکھیں۔ اہل تونیسیہ نے جب پہلی مرتبہ امریکہ سے امداد کی اپیل کی تھی تو اس زمانے میں مسٹر ولسن صدر تھے۔ لوگ یہ حقیقت فراموش کر چکے ہیں کہ تونیسیہ میں تین یا چار مرتبہ بڑے انقلاب بپا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ لوگ بھول رہے ہیں کہ موجودہ قومی تحریک کا آغاز قریباً ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا۔ یہ تحریک کل کی پیداوار نہیں ہم نے اس معاملے پر کل، آج اور گزشتہ ہفتے بحث کی۔ اہل تونیسیہ جب یہ الفاظ سنیں گے تو مجھے یقین ہے ان کی ہمتیں بندھیں گی۔

ہم امریکی مندوب کے آخری جملے سے بھی اس حد تک تسکین حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جس حد تک ممکن ہوگا یعنی امریکہ صرف "اس مرتبہ" ووٹ دینے سے احتراز کر رہا ہے جب پیرس کے اجلاس میں مراکش کا مسئلہ مسترد کیا گیا تھا تو اس وقت بھی یہی جملہ استعمال کیا تھا اس وقت کہا گیا تھا کہ "ہم فی الحال" ووٹ دینے سے احتراز کرتے ہیں آج امریکہ نے "اس مرتبہ" کا جملہ استعمال کیا ہے۔

میرے رفیقوں کو معلوم ہے کہ بیشتر ورلڈ پلوٹیکل بولی میں "اس مرتبہ" کے الفاظ محض لیپ پوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس جملے کو کسی فقرے میں ایسی جگہ رکھنا جہاں زیادہ سے زیادہ زور کے ساتھ کم سے کم معنی مقصود ہوں یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ کہنے والے کے دل میں ابھی خاصے تحفظات باقی ہیں۔

ہم اس جملے کے استعمال کو یہ بڑے معنی نہ پہنائیں گے میں سمجھتا ہوں کہ

اس جملے کی تعبیر کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ امریکی ضمیر کی ایک چھوٹی سی کرن اوقیانوسی ڈپلومیسی کے دھندلکے سے پنجہ آزمائی کرتی رہی۔ اس لحاظ سے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ وقت نہ آئے گا جب ہمیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو پابندیٔ قول و عہد نہ کرنے کا طعنہ دینا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ ہماری ناکامی اہلِ تونیسیہ کی ناکامی نہ ہوگی۔

مجھے ایک چھوٹی سی بات اور کہنا ہے پھر میری تقریر کا یہ حصہ ختم ہو جائے گا۔ ہم اس معاملے میں فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے نہ ہم ہمدردی کے ان زبردست روابط سے بے خبر ہیں جو جنگلے کے دوسری جانب بیٹھے ہوتے مختلف ملکوں کے درمیان قائم ہیں۔ ہم فرانس کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے اس کی مثالی شجاعت کا ہمیشہ احترام کیا۔ مصائب و آلام کے دور میں ہمیں اس کے ساتھ گہری ہمدردی رہی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمدردی ابھی تک ختم نہیں ہوتی اور ہم مستقبل میں اس کے لئے امن و خوشحالی کے آرزومند ہیں۔

تاہم، ہم نے یہ مسئلہ اس لئے اُٹھایا کہ ہم بہ صمیم قلب یقین رکھتے ہیں کہ فرانس کے مفاد کا تقاضا اہلِ تونیسیہ کے حقیقی نمائندوں سے پُرامن مفاہمت میں ہے۔ ان پٹھوؤں کے ساتھ مفاہمت نہیں جنہیں خود فرانس بر سرِ اقتدار لایا۔ مسٹر ڈی ہاٹی کلوک (MR. DE HAUTECLOCQUE) (ریذیڈنٹ جنرل) اس وقت انتہائی سرگرمی سے تاش کے پتے پھینٹنے میں مشغول ہیں اور انہیں امید ہے کہ چاروں یکے کسی وقت بھی ان کے ہاتھ آجائیں گے۔ لیکن افسوس کہ جن چار یکوں کی وہ امید لگائے بیٹھے ہیں انہیں مسٹر ڈی ہاٹی کلوک نے قید میں ڈال دیا ہے۔

فرانس کے اربابِ بست و کشاد غالباً یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انھوں نے ہمارے ساتھ ـــــ ان گیارہ قوموں کے ساتھ جو اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل میں لائے ـــــ

شطرنج کی بازی لگا رکھی ہے اور انہیں جلد سے جلد چال چل جانی چاہیئے ورنہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو جائے گا۔ ہم ان سے شطرنج نہیں کھیل رہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ شکایت بڑی مستعدی سے بہت پہلے پیش کر دیتے اور فرانس کے لئے یہ مقدمہ پیش کرنے کا موقعہ نہ رہتا کہ ہم نے اہلِ تونیسیہ کے ساتھ بات چیت جاری کر رکھی ہے۔ یہ معاملہ آج یا کل شکایت پیش کرنے کا نہیں۔ اگر مسٹر ڈی ہالی کلوک کل اپنی آستین سے کابینہ وزارت نکال کر پیش کر دیں تو وہ اپنے سوا دنیا کے کسی آدمی کو مبتلائے فریب نہ کر سکیں گے۔ وہ ہمیں مات دینے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر ایسا ہے تو انہیں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ وہ ہم سے جنگ نہیں کر رہے اور ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ وہ تاریخ سے جنگ کر رہے ہیں اور اگر وہ واقعات کی رفتار سے سر توڑ کر لینا پسند کریں گے تو برابر ناکام رہیں گے۔

لہٰذا میں تونیسیہ کے فرانسیسی ارباب بست وکشاد سے التجا کرتا ہوں کہ وہ جان لیں یہ ہمارے ساتھ شطرنج کھیلنے اور تیز تیز چالیں چل کر ہمیں مات دینے کی کوشش کا موقعہ نہیں۔ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ امریکہ کے جریدے نیشن کے الفاظ میں حیرتناک تیز رفتاری سے وزارتیں بنا دینے سے حل ہو جائے گا۔ یہ معاملہ گہری مفاہمت کا متقاضی ہے۔ اس کا تجزیہ ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انجام کار میرے دوست نمائندہ امریکہ کے الفاظ میں عوام کا ارادہ اور عزم بروئے کار آئے گا۔

ہم فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود فرانس کے ارباب بست وکشاد اپنے وطن کے مفاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ ان مٹھی بھر فرانسیسی آبادکاروں کے مفاد کی حفاظت میں مصروف ہیں جنہوں نے

تونیسیہ میں صدرجہ وسیع مراعات حاصل کر رکھی ہیں اور پیرس کے سیاسی حلقے ان کی حمایت میں صدرجہ پرزور یا ادگرم جوش ہیں۔ فرانس میں بھی آزاد خیال لوگوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جس نے تونیسیہ کی موجودہ صورت حال کو "ذلت خیز" قرار دیا۔ فرانس آزاد خیالی کی عظیم الشان روایات کا حامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تونیسیہ کے ڈیڑھ لاکھ فرانسیسی آبادکاران روایات کی درخشانی کو مدہم کر سکیں گے وہ تھوڑی دیر کے لئے ان روایات کو پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔

لہذا اگرچہ ہم پندرہ قومیں —— پانچ جو حفاظتی کونسل کی رکن ہیں اور جنہیں اس معاملے میں ووٹ دینے کا حق ہے اور دس ہم جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ووٹ کی مجاز نہیں —— ہم اس کام میں ناکام ہو چکے ہیں جسے اپنا فرض سمجھ کر اٹھایا تھا۔ چند قومیں ہمیں شکست دے رہی ہیں۔ دنیا خود بخود اس واقعے سے صحیح نتائج اخذ کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس غمناک صورت حال کے مداوا کی موجودہ مرحلے پر کیا صورت ہے؟ کیا کوئی ایسی چیز باقی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم بحیثیت اقوام متحدہ اپنی عزت ایک حد تک بچا سکتے ہیں؟ اگر حفاظتی کونسل اس مسئلے کو مسترد کر دینے پر تلی بیٹھی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ پیش نظر خطوط کے مطابق کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا۔ صرف ایک چھوٹا سا کام شاید باقی ہے جس پر حفاظتی کونسل مناسب سمجھے تو راضی ہو سکتی ہے۔

جن گیارہ قوموں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا انہوں نے دفعہ ۳ کے ماتحت درخواست کی تھی کہ حفاظتی کونسل اس معاملے کو پیش کرنے کی اجازت دے۔ وہ موقع جس کے بھروسے پر ابتدائی درخواست پیش کی گئی تھی اس وقت تک نہیں آسکتا جب

تک یہ معاملہ ایجنڈے پر نہ آ جائے ہماری درخواست اس وقت رد ہو جائے گی جب ووٹ لئے جائیں گے۔

اندریں اثنا طریق کار کی بحث کے دوران میں ہماری ہتک کی گئی۔ دس قومیں وہ جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ایک قوم وہ جو کونسل کی ممبر ہے ان گیارہ قوموں نے بین الاقوامی امن کی خاطر مسئلہ اٹھایا تھا۔ میرے فرانسیسی رفیق نے ہماری ہتک کی۔ اس نے ہم پر الزام لگایا کہ جو بیانات ہم نے دیئے ان کا مقصد پروپیگنڈا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہم میں سے بعض پر ویسا اعتماد نہیں رکھتا جیسا دوسروں پر رکھتا ہے لیکن میں زیادہ سے زیادہ دور افتادہ ملک کا معاملہ سامنے لاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ فلپینیز کے دل میں پروپیگنڈے کی کونسی غرض ہو سکتی تھی جب وہ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانے پر آمادہ ہوا؟ نمائندہ فرانس نے ان قوموں اور ان کی حکومتوں پر حفاظتی کونسل میں پھبتیاں کسیں جب طریق کار پر بحث ہو رہی تھی اور اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے بارے میں غور و خوض کیا جا رہا تھا لیکن قطعی فیصلہ کوئی نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد دس قوموں اور ان کے نمائندوں نے درخواست پیش کی کہ اگر انجام کار ناکامی ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے تو کم از کم ہمیں از راہ مروت جواب کے اخلاقی حق سے محروم نہ کیا جائے ہم پر الزامات لگائے گئے۔ ان کے جوابات کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہم اقوام متحدہ کے تمام مباحث کے دوران میں اور ان کے علاوہ جواب کا حق اس طرح تسلیم کر چکے ہیں جسے قطعاً آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا۔ شاید حفاظتی کونسل مسئلہ تونیسیہ پر بحث کے بعد دس گیارہ قوموں کی درخواست کو مسترد کر کے کم از کم تلافی کا موقعہ ضرور پیدا کر سکے اور دس قوموں کو کونسل کی میز پر بلائے تاکہ وہ دروغ بافی پروپیگنڈے اور غرض مندانہ بیانات کے سنگین الزامات کا مفصل جواب دے سکیں جو فرانسیسی

نمائندے نے گزشتہ جمعے کے اجلاس میں ہمارے خلاف عائد کئے۔ اس وجہ سے میرے رفیقوں کی تجویز ہے کہ نہر عور مسئلے کے بارے میں فیصلے سے پیشتر ہمیں حفاظتی کونسل کی حیثیت میں ان دس ملکوں کو دعوت دینی چاہیئے جنہوں نے آج کونسل کی خدمت میں تحریر پیش کی ہے اور جن کے خطوط میں بحث کے آغاز میں پڑھ کر سنا چکا ہوں دعوت یہ ہو کہ وہ حفاظتی کونسل میں آئیں اور ان الزامات کے جواب کا اخلاقی حق استعمال کریں جو نمائندہ فرانس نے ان کے خلاف استعمال کئے۔

پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

۳

اس بیان کا متن جو پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفاظتی کونسل میں ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا۔

مسئلہ تونیسیہ کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں پاکستان نے جو ووٹ دیا ہے اس کے ضمن میں ضروری تصریحات کی غرض سے میں مندرجہ ذیل بیان دینے کا خواہ ہوں۔

سال رواں کے تقریباً آغاز ہی سے تونیسیہ میں شدید بے چینی جاری ہے۔ قتل، تشدد، آتش بازی اور وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی خبریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری حکومت نیز اقوام متحدہ کے رکن ملکوں میں سے دس اور حکومتوں کے نزدیک یہ صورت حال بے حد تشویشناک ہے۔ ہمارا قطعی یقین ہے کہ گزشتہ تین ماہ یا اس سے کسی قدر زیادہ مدت کے اندر تونیسیہ میں جو دردناک حالات پیش آئے انہیں محض مقامی ہنگامے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شہریوں میں کچھ فساد ہوا یا معمولی امن شکنی ——— پیش آئی جسے روکنے کے لئے نظم و قانون کے محکمے کو عام اقدامات کرنے پڑے جن لوگوں کے ہاتھوں یہ واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فریقین کے احمق یا بدکردار لوگ تھے۔ اس صورت حال کی جڑیں ماضی میں چلی گئی ہیں۔ فی الحال توازن بڑی ہی نازک حالت میں ہے اور مستقبل

کے دامن میں نا خوشگوار واقعات ہی نظر آرہے ہیں۔ اسی لئے ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے ووٹ اور نقطۂ نگاہ کی توضیح و جواز کے لئے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کروں۔

فرانسیسی حکام اور اہل تونیسیہ کی حکومت کے درمیان جس کش مکش نے حال میں ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ یہ اس کش مکش کا محض تازہ ترین منظر ہے جو سالہا سال سے جاری ہے۔

فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونیسیہ پر قبضہ جمایا تھا۔ جب کہ ایک فرانسیسی فوج (مؤرخ کے بیان کے مطابق) "الجزائر سے اس بہانے تونیسیہ میں داخل ہوئی تھی کہ ایک قبیلے کو سزا دینی مقصود تھی۔ داخل ہوتے ہی اس فوج نے نمائشی نقاب تیزی سے اتار پھینکی دارالحکومت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور حاکم تونیسیہ کو فرانس کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔"

اسی سال معاہدۂ باردو قرار پایا۔ یہ معاہدہ اپنی عمومی وضع میں ان معاہدوں کے عین مطابق تھا۔ جو استعمار کے دورِ عروج میں طاقت وروں اور ناتوانوں کے درمیان ہوتے رہے۔ بہرحال اس کی تمہید میں مرقوم ہے کہ "فریقین دوستی اور خوشگوار ہمسائیگی کے روابط کو مستحکم بنانے کے آرزومند ہیں جو ان دو حکومتوں کے درمیان ہمیشہ سے چلے آتے ہیں" اس معاہدے کی دفعہ ۲ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کا فوجی قبضہ اسی وقت ختم ہو جائے گا جب فرانس اور تونیسیہ کے حکمران اس امر پر متفق ہو جائیں گے کہ مقامی انتظامیہ قیامِ امن بحال رکھنے کی اہل ہے۔

بہرحال معنی تصور جس کا مدعا یہ تھا کہ نظم و قانون بحال رہے۔ بدستور اب تک

قائم ہے اور اس کی کڑیوں میں ڈھیل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ تونیسیہ پر فرانس کی گرفت برابر سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔

فرانس کو تونیسیہ میں قدم جمائے دو سال ہو چکے تھے جب ۱۸۸۳ء میں ایک کنونشن پر دستخط ہوئے جو لا مرسیٰ (LA MARSA) کی کنونشن کہلاتی ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ تونیسیہ کے لئے "زیرِ حمایت علاقے" کا جملہ استعمال ہوا تاہم اس سے اس ابتدائی معاہدے کی بنیادی حیثیت میں نہ کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ اسے بدلا گیا۔ جو "دو حکومتوں کے درمیان" ہو چکی تھی۔ اس کا مفاد یہی تھا کہ دو حکومتوں کے درمیان رہے گا۔ یہ نہ تھا کہ فرانس اختصاصیکا براہِ راست ذمہ دار ہوگا۔ تاہم عملاً یہ تونیسیہ کی محکومی کا آغاز تھا۔ کیونکہ اس کے بعد صدر جمہوریہ فرانس نے یک طرفہ حکم جاری کر کے پہلے حکمران تونیسیہ سے اجرائے فرامین کے تمام اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے پھر بہت جلد یک طرفہ حکم نامے ہی کے ذریعے تونیسیہ میں فرانسیسی نمائندے کے اختیارات اور بھی مستحکم کر دیئے اور وہ نمائندہ بطور خود تونیسیہ میں فرانسیسی جمہوریت کے اختیارات کا تحویل دار بن گیا۔

کسی علاقے کو زیرِ حمایت لے لینے کی وجہ جواز یہ پیش کی جاتی ہے کہ پسماندہ اقوام کو خود اختیاری حکومت کے راستے پر چلایا جائے۔ لیکن تونیسیہ کے تعلق میں اس کے برعکس عمل ہوا یعنی اس آزاد ملک کو آہستہ آہستہ آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی قیادت اور برتری کھا کھا کر ختم کر دی گئی اور جو خود مختاری اسے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے حاصل تھی وہ غیر ملکی اقتدار میں بدل دی گئی۔

پھر تونیسیہ میں غیر فرانسیسیوں کو آباد کرنے کا مسلک اختیار کیا گیا۔ ان آبادکاروں

کو زمینیں بھی دی گئیں اور مالی امداد سے بھی نوازا گیا۔ تونیسیہ کے نظم و نسق میں فرانسیسی کارندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بہترین زمینیں ان آباد کاروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہیں۔ جو براہِ راست فرانس سے آئے تھے یا ماضی قریب میں انہیں تونیسیہ میں قومی حقوق مل گئے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کو خواہ جنگلات قرار دے کر حکومت قابض ہو گئی۔ ایک اور قانون کے ذریعے سے ان تمام جنگلات کی درجہ بندی کر کے خالص آباد کاروں کے فائدے کے لئے از سرِ نو تقسیم کر دیا گیا۔ تونیسیہ کی آبادی تینتیس لاکھ کے قریب ہے۔ ان کے مقابلے میں فرانسیسی صرف ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ تیس ہزار چھوٹے بڑے افسر ملک کا نظم و نسق سنبھالے بیٹھے ہیں۔ گویا ایک سو باشندوں کی ہر جماعت کے لئے ایک افسر مقرر ہے۔ ان افسروں میں سے تین چوتھائی فرانسیسی ہیں۔ تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو مدرسوں میں جانے والے تونیسی طلبا کا تناسب ½۱۲ فیصد ہے اس کے مقابلے میں فرانسیسی طلبا کا تناسب ۷۰ فیصد ہے۔

سب پر مستزاد یہ کہ فرانس کی طرف سے جو ریذیڈنٹ تونیسیہ میں مقرر ہے اس نے حکمران کے تمام اختیارات غصب کر لئے ہیں اور اس غریب کی برتری کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض اس کی مہر استعمال کی جاتی ہے۔ تونیسیہ کے باشندوں کی کوئی قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ نہیں جس کے ممبر رائے عامہ سے منتخب ہوئے ہوں اور جسے کم از کم داخلی معاملات کے متعلق ہی قانون بنانے کا اختیار ہو۔ اگرچہ وہاں وزیر مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ تاہم احکام نافذ کرنے کا پورا اختیار فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اہلِ تونیسیہ نے فرانسیسی استبداد کو کبھی بطیبِ خاطر قبول نہیں کیا۔

موجودہ صدی کے آغاز سے تونیسیہ کی قومی تحریک میں زیادہ سے زیادہ

قوت و حرکت پیدا ہو گئی اور اس نے وہی شکل اختیار کر لی جو دنیا کے دوسرے حصوں کی محکوم اقوام نے دورِ حاضر کی سیاسی فضا میں اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی وہ بیدار ہو گئے آزادی کے لئے جد و جہد شروع کر دی اور بعض حالتوں میں اپنے ملک اجنبی اقتدار اور لوٹ مار کے خلاف سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

اہلِ تونیسیہ کو بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو دوسرے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ یعنی جن اجنبیوں نے وسیع وسائل ملک پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ان کی طرف سے مخالفت اور استعماری طاقت کی طرف سے قوت کا کوتاہ اندیشانہ استعمال۔ قوم پرست لیڈر پے در پے یا تو جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے یا جلا وطنی پر مجبور ہو گئے اور یہ تمام لوگ بصیرت اور دانش و ہمت کے مالک تھے۔ ان میں سے بعض جلا وطنی ہی میں وفات پا چکے ہیں۔ تاہم عارضی پسپائیوں کے باوجود تحریک تجربہ کار ترقی کرتی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم اور پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات کے بعد اہلِ تونیسیہ کے دل نئی امیدوں کی روشنی سے چمک اٹھے۔ جریدہ اکانومسٹ (ECONOMIST) کے بیان کے مطابق عین اسی وقت فرانسیسی حکومت نے اپنے افسروں اور چھوٹے آباد کاروں کی تعداد بڑھانے کا منظم سلسلہ شروع کر دیا اور فرانس کے سیاسی گروہ مختلف فریقوں کی حمایت میں لگ گئے بعض سیاست دان بائیں بازو کی ترقی پسند جماعت "دستور" کے ساتھ ہو گئے۔ بعض نے آباد کاروں کی پشتی بانی اختیار کر لی۔

پیرس میں حکومتیں بدلتی رہیں مگر حکومت کی ظاہری حیثیت کے ساتھ اہلِ تونیسیہ کی امیدوں اور آرزوؤں میں بھی نشیب و فراز کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۳۸ میں ایک طرف نو دستور پارٹی خود بخود مایوس ہو گئی اور اس نے

آخری فیصلے کا ارادہ کر لیا۔ دوسری طرف آبادکاروں کے حامی فرانسیسی حکام کمر باندھ کر تیار ہو گئے۔ اس طرح وسیع پیمانے پر کش مکش کا اکھاڑہ قائم ہو گیا۔ قریبا ایک ہزار قوم پرور جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ فرانسیسی حکام نے اعلان کر دیا کہ تونیسیہ میں عام رائے کی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ صورتِ حال ابھی تک ختم نہیں ہوئی اگرچہ چودہ سال کے لیل و نہار گزر چکے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی۔ کہ تونیسیہ میں فرانس کا نظم و نسق نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نظم و نسق نہ تو دو حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر جائز تھا نہ سے انصاف و آزادی کے اصول کی بنا پر حق بجانب ثابت کیا جا سکتا تھا۔ میں یہاں پھر جریدہ اکانومسٹ سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جریدہ مذکور مظہر ہے:۔

"جس حکومت کو بدلنے پر وہ (تونیسی اور فرانسیسی) اصرار کر رہے تھے اس کے اجزائے ترکیبی اس وقت یہ تھے۔ بے (حکمران) ایک کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا۔ جس میں سات فرانسیسی اور چھ تونیسی شامل تھے۔ لیکن اس کابینہ کے فیصلوں کو اوپر بھیجنے سے پیشتر ایک فرانسیسی کی توثیق لازم تھی۔ کابینہ کو معاشی اور مالی معاملات میں مشورے دینے کے لئے دو بڑی منتخب کونسلیں مقرر کر دی گئی تھیں۔ جن کے ارکان کی تعداد یکساں تھی (ایک تونیسیوں پر مشتمل تھی اور دوسری فرانسیسیوں پر) لیکن ان کونسلوں کی حیثیت محض مشیروں کی سی تھی۔ لوکل گورنمنٹ برائے نام تونیسیوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عملاً پورا اقتدار

فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ ایک فرانسیسی افسر تمام
اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا۔ حکمران تونیسیہ کے ہر حکم پر کسی فرانسیسی کے
دستخط بھی ضروری تھے۔ سب سے آخر میں اس لئے کہ جن فرانسیسیوں
کے ہاتھ میں عام ملکی اختیارات تھے وہ بلدی اور دیہاتی اداروں
کے بھی نگرانِ اعلےٰ تھے۔"

۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں ۱۹۴۹ء کے واقعات نے دو اہم نتیجے پیدا کئے۔
فرانسیسی آبادکاروں کے سخت اصلاح دشمن عناصر کی مخالفت کے باوجود نئے
فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ تین بڑی اصلاحات جاری کردی
جائیں اور اگر ممکن ہو تو اس بارے میں اہلِ تونیسیہ کی حمایت حاصل کی جائے
اوّل فوراً وزارت از سرِ نو ترتیب دی جائے۔ دوم سول سروس میں داخلے
کی شرطیں تبدیل کردی جائیں تاکہ اہلِ تونیسیہ بھی مقررہ تعداد میں لئے جا سکیں
اور مقابلے کا امتحان ضروری نہ رہے جسے فرانسیسی آبادکار ترجیح دے رہے
تھے۔ سوم بلدیاتی خودمختاری جاری کردی جائے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ریذیڈنٹ
جنرل نے حکمران کے مشورے کے بعد ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی کوئی مثال پہلے
موجود نہ تھی۔ اس نے نئی وزارت کی ترکیب کا اعلان کیا جس میں پہلی مرتبہ تونیسیوں
اور فرانسیسیوں کی تعداد مساوی رکھی گئی اور اس کی صدارت تونیسی وزیر اعظم
ایم شینک (M. CHENIK) کے حوالے کی گئی۔ سات تونیسی ارکان مختلف
پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ صرف کمیونسٹوں اور قدیم دستور پارٹی میں سے کوئی
نمائندہ نہ لیا گیا۔ اس لئے کہ آخر الذکر بھی مشرق ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
بہرحال نو دستور پارٹی اس کابینہ میں خدمت گزاری پر راضی ہوگئی۔
فروری ۱۹۵۱ء میں تونیسیوں اور فرانسیسیوں نے باہمی رضامندی سے

کئی تبدیلیاں کر لی ۔ ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ وزارت جو فیصلے کرے گی۔ انہیں حکمران تک پہنچانے سے پیشتر کسی فرانسیسی کی نفرت انگیز توثیق ضروری نہ ہوگی۔ اب فرانسیسی آبادکاروں کے سوا سب اس صورت حال پر خوش تھے۔

پھر سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں خرابی کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے: ماضی قریب میں جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان کی اصل واساس یہ ہے کہ نو دستور پارٹی نیز تونیسیوں کی بہت بڑی تعداد ان اصلاحات کو جلد سے جلد کامل خود مختاری حاصل کرنے کی تمہید سمجھتی ہے اس کے برعکس فرانسیسی آبادکاروں کی رائے یہ ہے کہ ان حدود سے آگے پیرس کو ایک قدم بھی نہ بڑھانا چاہئے۔"

وزیراعظم تونیسیہ نے ۔ ۳ مارچ ۱۹۵۱ء کو فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے نام ایک خط بھیجا: "موجودہ وزارت اس وجہ سے بہت بے بس ہے کہ جو نیا قدم یہ اٹھانا چاہتی ہے اس میں مسلسل مداخلت ہوتی ہے ...... مذاکراتی وزارت کا قیام اس قسم کے دباؤ کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہوسکتا خاص طور پر اس لئے کہ مہینوں سے یہ وزارت تونیسیہ اور پیرس دونوں مقامات پر فرانسیسیوں کی تحقیر آمیز اور معاندانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ تونیسیہ اور پیرس میں فرانسیسی نمائندوں کی اکثریت نیز فرانسیسی حکام کی روش اور ان سب کی کوششیں کہ گفت وشنید ناکام ہو جائے ایک کھلے ہوئے راز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تمام ذرائع استعمال کئے گئے جن کی بنا پر حکومت تونیسیہ اور اسمبلی کے تعاون کو ناممکن بنا دینا منظور تھا۔ مثلاً اجتماعی طور پر استعفے دے دیئے گئے خاص سیاسی نقطہ نگاہ سے قراردادیں پیش کی گئیں۔ وزیراعظم نے ترمیموں کے سلسلے میں جو مطالبہ کیا تھا اسے مخلوط مندوبین کے

سامنے پیش کر دیا گیا۔" ۲۲ر اپریل ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم نے پھر ایک چٹھی ریذیڈنٹ جنرل کے نام بھیجی جس میں ان تمام کارروائیوں کی قلعی کھولی گئی جو وزارت سے پہلے اور اس کے بعد اختیار کی گئیں۔ اس میں بڑی مجلس کے فرانسیسی حصے کے استعفے بھی شامل تھے جو فرانسیسی حکومت اور پارلیمنٹ سے بھیجے ہوئے وفدوں کے روبرو پیش کئے گئے۔ دباؤ کی کارروائیوں کا بھی ذکر تھا۔ مثلاً پیرس تار بھیجے گئے۔ مختلف انتظامی محکموں میں جو فرانسیسی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے معاندانہ شعار بھی مقرر کر لیا تھا۔ میں ان نازیبا اشاروں کا ذکر نہ کروں گا۔ جن کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہوا۔ ان فروگزاشتوں کو یاد دلا دوں گا جنہیں میں سراسر غیر ارادی سمجھنے کے لئے تیار ہوں ـــــ البتہ میں آپ کی توجہ ان چند نمایاں واقعات کی طرف ضرور منعطف کرانا چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہلِ تونیسیہ کی طرف بعض لوگوں کی غلط اندیش عداوت اور تونیسیہ میں فرانسیسی مفاد کے عجیب و غریب تصورات کس حد تک وسعت اختیار کر سکتے ہیں تاہم اب بھی ہر چیز کا مداوا ہو سکتا ہے، سمجھوتے کے امکانات موجود ہیں۔ دیانتدارانہ اور خیر خواہانہ گفت و شنید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ غیر سگال لوگ جن پر وزارت مشتمل ہے مایوسیوں اور وعدہ بازیوں کے باوجود گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے تیار ہیں اگرچہ بار بار اس میں مداخلت ہوتی رہی۔ اس مداخلت کے ذمہ دار وہ چند لوگ تھے جنہیں سیاسی اور انتظامی تعطل ہی میں فائدہ نظر آتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۰ء کی روح ان فرانسیسیوں نے کاملاً کچل کر رکھ دی جن کی غرضیں تونیسیہ سے وابستہ تھیں۔ تونیسیہ کی وزارت جو اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ حکمران اور اہلِ تونیسیہ کی خود مختاری بحال کرنے کے لئے

حکومت فرانس سے گفت وشنید کرے۔ اسے غلط طریق پر محروم اختیارات کردیا گیا۔ فرانسیسی آباد کاروں کی سازشوں اور جا و بے جا مداخلتوں نے وزارت کو بے اصل بنا دیا۔ تونیسی وزیروں کو مسلسل ذلت کا نشانہ بننا پڑا۔

یاس و ناامیدی کی یہ فضا تھی جس میں تونیسی وزیر ۱۹۵۱ء کے آخری حصے میں عازم پیرس ہوئے تاکہ حکومت فرانس کو از سر نو عہد و پیمان کی یاد دلائیں۔ فرانس کے وزیر خارجہ نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جو جواب دیا اس نے امیدوں کا ہر آئینہ ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اس جواب میں بلدی اصلاحات کی ضرورت کے سوا اور کوئی چیز تسلیم نہ کی گئی۔ باقی جو کچھ تھا صرف یہ تھا کہ فرانس نے تونیسیہ میں تہذیب کے لئے جو کام کیا اس کی خوب قصیدہ خوانی کی گئی اور بتایا گیا۔ تونیسیہ میں فرانس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے اس جواب نے اہل تونیسیہ کو صدور جہ مایوس کر دیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ بس رہے تھے ان کے دلوں میں بھی شدید خطرات پیدا ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں ایم رابرٹ شومان (M. ROBERT SCHUMAN) نے کہا کہ "فرانسیسی یونین کے تمام علاقوں کے لئے ہمارا نصب العین آزادی ہے" اس سے اہل تونیسیہ کے دل مسحور ہو گئے۔ تاہم ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مکتوب میں یہ اعلان کر کے تاریخ کا رخ بدلنے کی کوشش کی گئی۔ "حکومت فرانس، موجودہ ادارے (گرانڈ کونسل) میں ترمیم پر غور و خوض سے نفور نہیں لیکن اس کے نزدیک ہر طاقت نس ہے کی حکومت میں فرانسیسی نمائندگی کے اجرا کی حفاظت سراسر ناگزیر ہے۔"

اس ہمت شکنی اور مایوسی سے اہل تونیسیہ کو جو صدمہ ہوا، اسے اس خط سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا جو تونیسی وزیر اعظم نے حالات کی

اس اچانک تبدیلی پر حیرت زدہ ہو کر صدر فرانس کو لکھا:۔

" تونیسیہ میں فرانس کے مفادات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا حکومت تونیسیہ نہ صرف ان مفادات کو تسلیم کرتی ہے بلکہ ان کی ضمانت دینے کے لئے بھی تیار ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ بے اور اہلِ تونیسیہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہی ہے لیکن ان مفادات کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں سیاسی حقوق کی صورت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جن کے تحت اہلِ فرانس کو تونیسیہ کے انتظامی اور نمائندہ اداروں میں دخل دینے کا حق مل جائے ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں تک فرانس کی طرف سے مالی امداد کا تعلق ہے اس امر کی پوری پوری وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس کی حیثیت قرضے کی ہے جس کا اصل اور سود دونوں واجب الادا ہیں اور جس کے اندراجات سالانہ بجٹ میں بسلسلہ قرضہ زیر عنوان " قرضہ تونیسیہ " کئے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قرضے سے ملک اور عوام کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس امداد سے جو مفادات سب سے زیادہ نفع حاصل کر رہے ہیں وہ قدرتی ذخائر، نقل و حمل کے وسائل اور بجلی وغیرہ کی تیاری کے لئے مراعات ہیں۔ ایسے مفادات میں تونیسیوں کا حصہ عملی طور پر صفر کے برابر ہے۔ جنابِ صدر! صاف گوئی سے یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اہلِ تونیسیہ پر فرانس کے احسانات کا تو بے انتہا چرچا کیا جاتا ہے لیکن تونیسیہ نے آڑے وقت میں فرانس کی جو

مدد کی اسے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے ٹال دیا جاتا ہے۔۔۔
کیا یہ سب کچھ بھلا دیا گیا ہے؟ کیا تونیسہ کو واقعی فرانس کا
ہمیشہ کے لئے دستِ نگر تصور کر لیا گیا ہے؟""

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا کسے علم نہیں؟ تونیسہ کے ہر دل عزیز
محب وطن حبیب بورقیبہ (HABIB BOURGOIBA) اور دوسرے
قومی لیڈر جنہیں تونیسہ کے عوام عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔
۱۳ جنوری کو گرفتار کر لئے گئے فسادات رونما ہوئے گولیاں برسائی
گئیں۔ جان و مال کا نقصان ہوا، ہزاروں تونیسیوں کو اور انجام کار تمام تونیسی
وزیروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ سب حال ہی کی باتیں ہیں۔

ماضی کے حالات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے سے میری غرض محض یہ ہے۔
کہ کش مکش کے گزشتہ تین مہینوں میں دونوں طرف جو واقعات رونما
ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی جا سکے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر فرانس کے اس
دعوے کو کہ وہ امن و قانون بحال کرنا چاہتا ہے۔ اس افسانوی کردار
کے آئینے میں جانچیئے جس نے ایک مظلوم کا گلا صرف اس جرم کی
پاداش میں شدت کے ساتھ دبایا کہ دم گھٹنے کے باعث اس کی
آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میری حکومت تونیسہ کی صورتِ حال کو محض
ایک معمولی مقامی یا داخلی مسئلہ نہیں سمجھتی۔ حکومت فرانس کا یہ کہنا
کہ وہ اصلاحات کا نیا منصوبہ رائج کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے دلوں میں
اطمینان یا اعتماد کس طرح پیدا کر سکتا ہے۔ جب کہ اس نے تونیسہ کے

ان تمام قومی لیڈروں کو جیل میں ڈال رکھا ہے جن سے اس قسم کے منصوبوں کے بارے میں بات چیت ہوسکتی ہے ؟

تونیسیہ سے حال ہی میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ۔ وہ بہت اضطراب انگیز ہیں ۔ نیویارک ہیرلڈ ٹربیون "تونیسیہ کی کابینہ" کے زیرِ عنوان ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع شائع کرتے ہوئے کہ ۱۲ اپریل کو تونیسیہ میں نئی کابینہ قائم ہوگئی لکھتا ہے :-

"اس کابینہ کو کوئی قابلِ ذکر اختیار حاصل نہیں ۔ فرانس کی طرف سے اعلان اصلاحات کی جو تقریب قریب ہی قرطاجنہ میں سنائی گئی اس میں شریک ہونے والوں نے بیان کیا کہ شمالی افریقہ کے "زیر حمایت" علاقے تونیسیہ کے برائے نام حکمران بے کے چہرے پر اس وقت تبسم کے کوئی آثار موجود نہ تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجبور کرکے یہ کردار ادا کرایا جا رہا ہے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل جین ڈی ہاٹی کلوک (JEAN DE HAUTECLOQUE) نے وزارتِ خارجہ کا عہدہ سنبھال لیا ہے ۔ تونیسیوں کو اپنے ملک کے دفاع سے بھی سروکار نہ ہوگا ۔ بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی فوج ملک پر حکومت کر رہی ہے ۔ جن خطوں میں خالصتاً عرب آباد ہیں وہ اس وقت عسرت کی حالت میں ہیں .....

ہفتہ وسادہ سے بے سیدی محمد الامین پاشا پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مسٹر باکوش (MR. BACCOUCHE) کو بحیثیت وزیر اعظم قبول کر لیں یا وثوق عرب ذرائع کا کہنا ہے کہ تیس لاکھ تونیسیوں کی غالب اکثریت اور خود بے کے بارے میں

اس جھک جانے پر برا فروختہ ہو گئے ہیں۔ پیرس کے بیشتر اخباروں نے بھی باکوش کی موجودہ حکومت کو کٹھ پتلیوں کی کابینہ قرار دینے میں تامل نہیں کیا اور فرانس نے تونیسیہ کی جد و جہد آزادی کو جس انداز میں نمٹانے کی کوشش کی اس پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت فرانس پھر ایک مرتبہ اصل کی جگہ ظل کو لانے کی خواہاں ہے بار ہا دہرائی ہوئی استعماری صورتِ حال کو از سر نو دہرانا چاہتی ہے جس میں قوم کے جذباتِ خود مختاری کو دبا کر ایک موہوم اور شعیدہ کارانہ سکون پیدا کرنا چاہتی ہے تاکہ یہ استعماری طاقت کی کوتاہ اندیشانہ پالیسی کے لئے سازگار نظر آئے۔ استعماری طاقت کے لئے دانش مندی کا واحد راستہ یہ ہے کہ اپنے نقطۂ نگاہ میں وسعت پیدا کرے۔ محکوم قوم کے ان جذبات کے احترام میں متامل نہ ہو جنہیں دوسرے مقامات پر شاندار اور جواں مردانہ حب وطن کا مظہر سمجھا جائے گا۔

ایک مشہور امریکی رسالے میں ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے:۔

"یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ افریقہ سے دست کشی کے مسائل اولاً اور عموماً فرانس کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو اوقیانوسی طاقتوں میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ اب برطانیہ اپنی نصف سلطنت ختم کر چکا ہے اور مقالہ نگار کے قول کے مطابق فرانس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت بنا ہوا ہے اس نے آٹھ کروڑ افراد کو محکوم بنا رکھا ہے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اتنے بڑے خطے میں آباد ہیں جو رقبہ میں ریاست ہائے

امریکہ سے ڈیڑھ گنا ہے۔۔۔۔ فرانس کے لئے اب بھی موقعہ ہے کہ افریقہ میں دانش مندی کی پالیسی اختیار کرے۔ استعماری نظام کی جگہ تعاون رائج کردے اور مقصد یہ ہو کہ بہرحال وہ افریقہ سے دست کش ہو جائے گا۔ اس طرح فرانس تمام اوقیانوسی ممالک کے لئے دوستی کی حیثیت میں عمل پیرا ہوگا۔"

یہ دست کشی نہ تو موجب شرم ہے اور نہ اسے شکست قرار دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ اگر اقوام متحدہ کے منشور کے کوئی معنی ہیں تو استعماری طاقتوں کے لئے انجام کار اس سے زیبا تر روش اور کوئی نہ ہوگی کہ اپنی نوآبادیوں کو چھوڑ جائیں۔ تمام امن دوست قوموں کی دلی خواہش یہی ہے۔ کہ یہ دست کشی امن و نظم کے ساتھ پوری ہوگی۔ اس میں کم سے کم اخلاقی یا جسمانی بربادی کا موقع آئے گا اور فریقین میں ایسی خوشگوار یادیں باقی رہ جائیں گی جن سے دنیا میں امن کو تقویت پہنچے گی۔

اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں میرے وفد کے مقاصد یہ تھے:۔

۱۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر تونیسیوں کو بے عزتیوں اور پریشانیوں سے بچایا جائے ان کے اموال و نفوس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے ان کے شہری حقوق کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور یہ سب مصیبتیں ان پر اس قصور کی پاداش میں نازل کی جا رہی ہیں کہ انہیں اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی سے محبت ہے۔ اس مقصد کو ہمارے نزدیک سب پر تقدم حاصل ہے۔

۲۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر اس تعطل کو ختم کیا جائے جو فرانسیسیوں اور تونیسیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو تیزی

سے برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔

۳۔ افریقہ اور ایشیا میں عوام کے جذبات یہ منظر دیکھ کر برانگیختہ ہو رہے ہیں۔ کہ ایک کمزور مہیب یا رعدد گار اور شریف قوم اور ایک عددرجہ قوی یورپی طاقت کے درمیان خونریز جدوجہد جاری ہے وہ یورپی طاقت بدرجہا زیادہ قوی ہے اور دوسری قوم کے زاد بوم پر قبضہ و تصرف کے لئے آج کوئی اخلاقی وجہ جواز پیش نہیں جا سکتی۔ باشندگانِ افریقہ و ایشیا کے جذبات کی برانگیختگی کو جلد سے جلد روکنا ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میری حکومت اور میرے ملک کو فرانس کے ساتھ انتہائی محبت ہے اور وہ فرانس کی عظیم الشان آزادی پسندانہ روایات کو مخلصانہ احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے ایک ممتاز روزنامے "ڈان" نے لکھا ہے :—

"بعض سیاسی مسائل میں ہمیں فرانس کے ساتھ کتنے ہی اختلافات ہوں لیکن ہم فرانس کی انتہائی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ وہیں سے حریت، اخوت اور مساوات کے بلند پایہ نعرے اُٹھے تھے۔ ہم فرانس کو آزاد دنیا میں اپنا دوست دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ اور فرانس و پاکستان کے درمیان علائق کو مستحکم کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔"

اگر ان اعلیٰ اصول کا علم بلند رکھنے کی کوشش میں جس کا سہرا تاریخ نے فرانس کے سر باندھا ہے۔ میں نے اپنے رفیقوں اور ممتاز نمائندہ فرانس کے صبر و تحمل پر زیادہ بار ڈالا ہے تو میں بصمیم قلب معذرت خواہ ہوں۔

تقریر ماڈل جنرل اسمبلی

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ سفیر احمد شاہ بخاری کی اس افتتاحی تقریر کا متن دیا جاتا ہے جو انہوں نے ہنٹر کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے پچیسویں اجلاس میں ۷ر اپریل ۱۹۵۲ء کو فرمائی:-

جناب صدر! سب سے پہلے میں آپ کی اجازت سے رئیس تدریسات میک انٹاش[۱] پروفیسر پیرڈون[۲] مسٹر ولیم ہنڈرسن[۳] اور مس روتھ شیکٹر[۴] کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے طفیل مجھے آج شام یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اقوام متحدہ کی اس ماڈل اسمبلی سے مقرر خصوصی کے طور پر خطاب کرنا ہے تو ایک لحظہ کے لئے مجھ پر صورت حال کے ابہام نے تحیر کی کیفیت طاری کر دی۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ اجتماع جس نے اپنے لئے "ماڈل اسمبلی" کا نام تجویز کیا ہے اپنا نظام اقوام متحدہ کی اسمبلی کے نمونے پر تیار کرے گی جو دریائے ایسٹ پر

مختصر سی جگہ واقع ہے یا اقوام متحدہ کی اسمبلی کے متعلق یہ توقع قائم کر لی گئی ہے کہ وہ تدریجاً اپنے طرز عمل کو آپ کے نمونے کے مطابق بنا لے گی۔ آپ یقین مانیں کہ ہم لوگ جو اقوام متحدہ میں ہیں اور یقیناً وہ مقرر بھی جو آج شام آپ سے مخاطب

---

۱ MACINTOSH ۲ PEARDON

۳ WILLIAM HENDERSON ۴ MISS RUTH SCHACTER

ہے اپنے طرزِ عمل اور طریق کار کو آپ کے طرزِ عمل کے نمونے پر ڈھالنا پسند کرے گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایسا کرنے سے وہ دنیا میں بھی اپنی زندگی سنوارے گا اور آخرت میں بھی۔

میں یہ پیش گوئی تو نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ اس اسمبلی میں جو "مباحثے" کریں گے۔ ان کا انداز کیا ہوگا لیکن اگر انہیں اسی مثال پر قائم رہنا ہے جو اقوام متحدہ میں پیش ہوتی ہے تو پھر میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو آپس میں اختلاف رائے سے بھی سابقہ پڑے گا اور میں یہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہوں کہ ان اختلافات کی بنا پر آپ کبھی کبھار اور شاید بسا اوقات اپنے آپ کو شکست کے کنارے لڑکھڑاتا ہوا بھی پائیں گے پھر آپ کے سامنے بار بار سوال آئے گا کہ آیا یہ تنظیم چل سکتی ہے؟ اختلاف کی کئی صورتیں ہوتی ہیں لیکن میں ایک لمحے کے لئے فقط دو ہی صورتوں پر زیادہ توجہ کروں گا۔ ان میں سے پہلے اختلاف کی توضیح بالکل سہل ہے اور مجھے اس پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ اختلاف بنیادی حیثیت کا ہے جس کی تانیں اقوام متحدہ کے ایوانوں میں بارہا ٹوٹی ہیں اور جس کے نعرے اس مجلس میں بارہا بلند ہوتے ہیں۔ اسے مشرق و مغرب کی آویزش کہا جاتا ہے۔

میرے نوجوان امریکی سامعین کو تفصیل سے بتلانے کی ضرورت نہیں کہ یہ آویزش کیا ہے؟ کیونکہ اگر کوئی امریکی نوجوان، مرد یا عورت، اس کش مکش کے ما لہ و ما علیہ سے آگاہ نہیں اور اپنی رائے پر ثابت قدمی سے قائم نہیں رہ سکتا تو اور کس سے ایسی توقع رکھی جا سکتی ہے؟

لہٰذا میں دوسرے اختلاف کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو اقوام متحدہ میں روز بروز نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اختلاف زیادہ اہم نہیں اور اس کی حیثیت ایسی ہے کہ اگر یہ جمہوری طریق کار کے دائرے کے اندر رہے تو اس کے لئے تضحیک کا باعث

بننے کے بجائے انجام کار تقویت و استحکام کا موجب بنے گا۔

آپ نے انسانوں کے ایک ایسے گروہ کا حال اکثر سنا ہوگا جسے اخبارات اپنی شہ سرخیوں میں "عرب ایشیائی بلاک" کہتے ہیں۔ اس کے لئے "بلاک" کا لفظ یقیناً اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ یہ لفظ مختصر ہے اور اخبار کی ایک کالمی سرخی میں کھپ جاتا ہے ویسے لفظ "بلاک" کے مفہوم میں کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں۔ نہ یہ کسی خاص قسم کا سیاسی گروپ ہے۔ یہ چند ایسے مفادات کا ایک عام سا اجتماع ہے جو بعض قوموں میں ماضی کی تاریخ اور روایات کے باعث مشترک ہیں۔ میں خود ایک ایشیائی ملک کا نمائندہ ہوں اسی لئے شاید آپ کو کچھ بتا سکوں گا کہ یہ اختلافات کیا ہیں؟ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اور انہیں رفع کرنے کی تدبیر کیا ہے؟

یہ اختلافات دو فریقوں میں ہیں۔ ایک فریق تو وہ ہے جسے عام طور پر مغربی یورپی اقوام کہا جاتا ہے اور دوسرا فریق یہی مشرقی اقوام ہیں۔ یہ لوگ آپس میں کس نقطہ نگاہ پر متحد ہوتے اور ان میں قدر مشترک کیا ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ میں نے نقطہ نگاہ کہا ہے؟ میرے لئے آسان تھا کہ میں فرسودہ محاورہ بندی کا لعنت استعمال کر کے اسے نظریہ یا تصور کا نام دیتا۔ آج کل نظریہ یا تصور کا لفظ نہایت مسرفانہ طریق پر بیجا اور بےجا استعمال کیا جا رہا ہے۔ مغربی یورپی قوموں کے اس گروہ میں جو بحر اوقیانوس کے کنارے آباد ہیں۔ تین چار اختلافات تو انداز فکر و نگاہ ہی کے ہیں ـــــــ میں عقائد نہیں کہتا اور نظریہ کا لفظ تو ہرگز استعمال نہیں کرتا۔

ان میں پہلا اختلاف دنیا کے نسلی مسائل کی جذباتی تعبیر کے متعلق اٹھتا ہے آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم یا ان میں سے اکثر و بیشتر اقوام ماضی میں شدید نسلی امتیازات کا شکار رہی ہیں اور بعض اب بھی اسی امتیاز کا تختۂ مشق

بنی ہوئی ہیں۔ اگر وہ ان بے انصافیوں کو ہمیشہ کے لئے فراموش نہیں کر سکتیں جو نسلی امتیاز کا عقیدہ رکھنے والوں سے سرزد ہوں اور ان کے جذبات مشتعل کرنے کا سبب بنیں تو آپ انہیں قابلِ عفو سمجھیں۔ وہ نسلی امتیاز کے احساس کی علامات جہاں بھی دیکھیں گی۔ شدید مخالفت کریں گی۔ آپ ازراہ کرم میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھیں میری مراد ان چھوٹے موٹے حادثات سے نہیں جو آپ کے ملک یا میرے ملک میں ہوتے رہتے ہیں۔ میں اکا دکا انفرادی واقعات کی جانب قطعاً اشارہ نہیں کر رہا۔ وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب کوئی ملک سینہ تان کر یہ دعوے کر سکے گا کہ اس کے حدود میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا میں اس نسلی امتیاز کا ذکر کر رہا ہوں جو وسیع بین الاقوامی پیمانے پر کیا جا سکتا ہے اور جو نہ صرف وقارِ انسانی کے منافی ہے بلکہ امن عامہ کے لئے بھی خطرے کا باعث ہے آپ نے اخباروں میں کئی ملکوں کی خبریں پڑھی ہوں گی۔ جہاں نسلی امتیازات کے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے واقعات افریقی ملکوں میں بھی رونما ہوتے ہیں اور چند دوسرے ملکوں میں بھی مجھے مغربی یورپ یا اوقیانوسی ممالک کا کوئی ایسا نمائندہ نہیں ملا جس کے خیالات ویسے ہی نہ ہوں جیسے ہمارے ہیں۔ البتہ فرق ہے تو صرف صورت حال کے جذباتی ردِ عمل کا ہے۔

دوسرا مسئلہ جس پر اقوام کے اس گروہ کے احساسات بڑے شدید ہیں اسے عام طور پر استعمار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ گروہ اقوام دنیا کی نصف سے زائد آبادی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک وقت تھا جب مجھے یہ بات یاد دلانا پڑتی تھی اور لوگ اس سادہ سی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہ ہوتے تھے۔ جب تک اعداد و شمار کی دستاویزیں دیکھ کر اپنا اطمینان نہ کر لیتے تھے۔ میرا خیال

سے ہے کہ آج دنیا اتنی ناواقف نہیں کہ اس سادہ سی حقیقت کا اندازہ نہ کرسکے۔ یعنی یہ کہ دنیا کے نصف سے زیادہ نفوس ایشیا میں رہتے ہیں اور اگر انسان ہونے کی کیفیت وحیثیت کے اعتبار سے نہیں تو کم از کم مقدار و عدد کے اعتبار سے وہ بہت وزن رکھتے ہیں۔ ان کے احساسات ہماری تعداد کے مطابق المضاعف ہو کر عالمی حیثیت میں بڑی اہمیت و قوت رکھنے والا عامل بن جاتے ہیں۔ متعدد ممالک ایسے ہیں جو قریب ترماضی میں استعماری اقتدار کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کمرے میں بیٹھنے والے سب کو نہیں تو آپ میں سے بہتوں کو خدا نے استعماری نظام حکومت کا مزہ چکھنے سے بچا لیا ہے ایک وقت تھا جب آپ کے آبا و اجداد اپنے آپ کو انگلستان کا محکوم اور اس کی نوآبادی سمجھتے تھے۔ ان کے سینوں میں اس کے خلاف طوفان اٹھتے تھے۔ لیکن ایک نسل پر دوسری نسل کے غلبے و اقتدار سے پیدا ہونے والے بعض مکروہ پہلو ایسے ہیں جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ یہ قیاس تو آپ آسانی سے کرسکتے ہیں کہ جب کبھی استعمار کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس گروپ کے جذبات بے انتہا شدید ہوتے ہیں۔ استعمار — ہم نے تو اسے نہایت قریب سے دیکھا ہے — دوہری لعنت ہے۔ یہ اس کے لئے بھی لعنت ہے جو حاکم و مقتدر بنتا ہے اور اس کے لئے بھی جسے غلام و محکوم بنایا جاتا ہے۔ استعمار میں متعدد وجوہ مادی فائدے تو اٹھاتا ہی ہے مصیبت یہ ہے کہ ساتھ ہی انسانی فطرت کو اس طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا جاتا ہے جس کے بعد انسانیت کا وقار خاک میں مل جاتا ہے اور استعمار زدہ لوگ اس نوع میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتے جس کے افراد ہونے کے وہ دعوے رکھتے ہیں۔ استعمار محکوموں اور حاکموں دونوں کی نفسیات

برباد کر دیتا ہے اس لئے کہ ہر استعماری حکمران، بشرطیکہ وہ روشن دماغ ہو محسوس کرے گا کہ یہ کیفیت اسے شعوری طور پر فائدہ پہنچانے کی بجائے لاشعوری طور پر بے طرح نقصان پہنچا رہا ہے یہی مسائل ہیں جن پر آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ استعمارزدہ ملکوں کی بھاری تعداد کسی صورت حال کے شدید جذباتی ردِ عمل کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگوں کے لئے بسا اوقات اس کا سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ ممالک دنیا کے غریب ترین باشندوں کے نمائندے ہیں میں نے اپنے امریکی دوستوں سے غربت و افلاس کے بارے میں بارہا گفتگو کی ہے وہ اس کے معنی تو جانتے ہیں لیکن ان کے لئے اس حالت کا فہم و تصور تقریباً ناممکن ہے جس کے لئے یہ لفظ وضع کیا گیا تھا وجہ یہ ہے کہ معیشت کے معیار مختلف ہیں۔ امریکہ میں جس شخص کو مفلس کہا جاتا ہے ہمارے بہت سے ملکوں میں ایسے آدمی کو خاصا خوش حال قرار دیا جاتا ہے۔ امریکی دوستوں کو یہ سمجھانا بے حد مشکل ہے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں آدمی کی سالانہ آمدنی سالہاسال تک پچاس ڈالر سے زائد نہیں ہوتی۔ انہیں یہ یقین دلانا دشوار ہے کہ بعض ملک ایسے بھی ہیں جہاں انسان کا اوسط عمر ۲۷ سال سے زیادہ نہیں اور خواندگی کا تناسب صرف پانچ سے دس فیصد تک ہے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ یہ غریب ممالک بین الاقوامی تبدیلی احوال کے باعث اچانک اپنے آپ کو عالمی سٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ جہاں ان سے کہا جاتا ہے کہ عالمی برادری کے فرد کی حیثیت سے دوسروں کے برابر ذمہ داریاں اٹھائیں۔ یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ایسی ذمہ داریاں قبول

کریں اس میں کوتاہی ان کے لئے انتہائی شرم و ندامت کا باعث ہوگی۔ لیکن انہیں جو وسائل میسّر ہیں ان کے ساتھ وہ عالمی کوائف سے عہدہ برآ ہونے ہیں اس اہلیت اور صلاحیت کا ثبوت نہیں دے سکتے جو ان سے بعض ترقی یافتہ رفیق ملک پیش کر سکتے ہیں۔ یہ ممالک کہتے ہیں کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کر کے دنیا سے شدید اقتصادی نامساوات دور کی جائے۔

ایک وقت تھا ـــــــ اور تاریخ کا کوئی طالب علم ہی اس کی تاریخ بتا سکے گا ـــــــ جب ہر ملک اور ہر قوم کے زیادہ آمدنی والے لوگ سمجھ ہی نہ سکتے تھے کہ مفلس اور بے روزگار لوگوں کی امداد کے لئے زیادہ آمدنی والوں سے بھاری ٹیکس کیوں وصول کئے جائیں؟ یہ لوگ بھاری ٹیکس کی مخالفت اسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ غریبوں اور بے روزگاروں کو اپنے برابر رائے دہی کا حق دینے کے مخالف تھے۔ اس دور میں اسی قسم کے مسائل حقیقی اور واقعی طور پر در پیش تھے اور اصلاح کے علمبرداروں کو سیاسی اور اقتصادی انصاف کے اصول کا پرچار کر کے عوام کو ترغیب دینی پڑتی تھی۔ کہ وہ اس اصول کو مان لیں۔ آج ہمیں ایسا نہیں کرنا پڑتا۔ اب کسی بھی متمدن ملک میں یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت نہیں کہ امیر لوگوں سے غریبوں کی نسبت زیادہ ٹیکس کیوں وصول کرنا چاہیئے؛ گویا یہ باتیں تسلیم کر لی گئی ہیں اور معاشرے کا ہر فرد اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ تاہم یہ صورت ابھی بین الاقوامی معاشرے میں پیدا نہیں ہوئی۔ آج اگر برادری کا کوئی رکن پسماندہ ہے، ناخواندہ ہے، بیماریوں کا مارا ہوا ہے، افلاس اور قحط میں مبتلا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے تو کم و بیش ہی

تصوّر کر لیا جاتا ہے کہ اسے یہ امداد خیرات کے طور پر دی جائے یہ وہی جذبہ ہے جو آج سے ایک یا دو صدی پہلے ٹیکس دینے والے دولت مندوں میں کا فرما تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو اپنی دولت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے۔ ہم اس امداد کو خیرات تصوّر نہیں کرتے۔ ہم اسے بین الاقوامی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس عام مسلمہ اصول کی تکمیل ہے کہ ہر شخص سے اس کے مقدور کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ لیکن جب زیادہ ترقی یافتہ ممالک سے یہ امداد ان ملکوں کو ملتی اور احسان مندی کے ساتھ قبول کی جاتی ہے، تو کئی دوسرے سوال اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی امداد سیاسی مصالح کی حامل تو نہیں؟ کیا اس کے ساتھ شرائط و قیود کی پابندیاں تو نہیں؟ آخر اس امداد کا مقصد و مدعا کیا ہے؟

یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نفسِ مضمون سے ذرا ہٹ کر اس حقیقت کی یاد تازہ کراؤں کہ ان میں سے اکثر ممالک جب استعماری اقتدار اور غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ تو طویل عرصے تک خام مال مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ وہی تھے اب دو صدی سے یہ کیفیت چلی آتی ہے کہ تمام صنعتیں اور ہر قسم کی حرفتیں دنیا کے ان ملکوں میں مرتکز ہو گئی ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ جب تک کوئی ملک خام مال مہیا کرتا رہتا ہے اس وقت تک وہ خود کفیل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ہمارے ملک میں کوئی ایسی ترقیاتی سکیم پیش ہوتی ہے جس کا انحصار خام اشیا کی زیادہ سے زیادہ

پیداوار پہ ہو، تو اس کے متعلق شک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے خام مال سے فائدہ اُٹھانے کے لئے خود اس ملک میں صنعت رائج کی جائے، دوسری طرف ہمیں جو امداد باہر سے ——— مثال کے طور پر اقوام متحدہ ہی کو لیجئے ——— ملتی ہے اس سے ہمارے دلوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس امداد کو خام مال مہیا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے بجائے اپنی صنعتی ترقی میں صرف کریں گے تو دنیا ہمیں احمق کہے گی۔

لہذا جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے؟ تو میں نہایت ادب سے یاد دلاؤں گا کہ سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد ان وجوہ کی بنا پر کرنی چاہیئے جو میں واضح کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ان ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے جو ملک صدیوں سے زرعی دور کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں اور ایسے ملکوں میں جو بھاپ کی دریافت کے بعد صنعتی ترقی کے میدان میں سبقت لے چکے ہیں۔ اتنا ہی وسیع اور بنیادی تفاوت ہے جتنا پتھر کے زمانے اور زراعت کاری کے زمانے میں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ یہ ممالک جس کیفیت سے گذر رہے ہیں اسی میں ان کو ترقی دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی اور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی طرف صحیح رہنمائی کی جائے۔

ان تین چار معاملوں کے بارے میں اختلافات ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اختلافات کبھی شدید اور کبھی کم تر ہوں گے۔ یہ ان ممالک میں بھی رہیں گے جن کے درمیان

بنیادی اصول پر کامل اتفاق رائے موجود ہے۔

میں کسی ایسے آزاد فکر، حسن ظن پر مبنی کسی ایسے عقیدے اور آزادی کے لئے کسی ایسے تصور سے واقف نہیں جس کے لئے امریکہ کی بہت سی ممتاز اور قابل قدر ہستیوں نے جدوجہد نہ کی ہو یا اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں ختم نہ کردی ہوں۔ ہم اپنی امیدوں کے محل اسی بنیاد پر استوار کر رہے ہیں۔ آپ کا ملک بڑا وسیع ہے آپ پسند کریں یا نہ کریں پھر بھی دنیا کے متعلق آپ کی ذمہ داریاں بھاری ہیں جہاں تک مجھے علم ہے تہذیب و تمدن کے مستقبل کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ اس ذمہ داری کو کس درجہ خوش دلی سے قبول کرتے ہیں؟

اب مجھے اپنی بات ختم کر دینی چاہئے کیونکہ مجھے معلوم ہے اس اجلاس کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں نیز میں آپ کے لئے ناصح مشفق بننے کا بھی خواہاں نہیں جیسا کہ میں نے کہا۔ میں آپ کی طرف دیکھ رہا ہوں آپ کی سرگرمیاں ہمارے لئے محرک ثابت ہوں گی آپ میں صرف ایک وفد ایسا ہے جسے میں کچھ نصیحتیں کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں اور وہ پاکستان کا وفد ہے میں اس وفد کو مشورہ دوں گا کہ وہ ہمیشہ یہ حقیقت پیش نظر رکھے وہ ایسے پسماندہ ملک کا نمائندہ ہے جسے آزادی کی دولت حاصل کئے ابھی صرف چار ہی سال گزرے ہیں۔ اسے اپنے آپ کو کسی بڑی طاقت کا نمائندہ نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ ایسا نہیں ہے البتہ اسے کوشش کرنی چاہئے کہ عالمی مشکلات کے بہترین حل میں اپنا فرض انتہائی خلوص سے بہترین طریق پر ادا کرے ہوسکتا ہے کہ کسی وقت بین الاقوامی معاشرے کے مفاد کو اپنے ملک کے نسبتاً محدود مفادات تابع کرنے کی ترغیب اس کے سامنے آجائے۔ ایسے

موقعے کے لئے میرا مشورہ یہ ہے اس قسم کی ذہنی کش مکش طبعی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ ایسی کش مکش کے موقع پر انجام کار بین الاقوامی معاشرے کی بہبود کو ضرور ترجیح دیں گے۔

پاکستان کے وفد کے لئے میری ایک چھوٹی سی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہو تو ضرور کہیں، لیکن جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو براہ کرم خاموش رہیں۔

شاعری

فہرست

نقشِ گم گشتگی

شدی تا باعثِ آرامِ جاں آرامِ جاں گم شد
حدیثِ نامِ تو بر زباں آمد زباں گم شد

مپرس از جستجو و نارسائی ہائے مجنونے
چو آوازِ جرس ہر سو دوید و ہر زباں گم شد

نشانِ سجدہ ام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوقِ من آستاں گم شد

مرا جز خامشی محرم نبود و وائے ناکامی
بہ اظہارِ سخن چوں لب کشودم رازداں گم شد

مگر آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را
کہ از گمراہی خود ہم ز راہ گمرہاں گم شد

مخزن۔ نومبر، دسمبر ۱۹۲۱ء

غزل

ہم آں داغے کہ بر دل از تو دارم حرز جانم شد
ہم آں چشمے کہ نامندش سخنگو راز دارم شد

دلے بود و در آغوشم نگنجید و جہانم شد
خیالے داشتم از سرگذشت و آسمانم شد

بپرس اے داورِ محشر چہ مے پرسی نمی پرسی
نگاہ حسرت آلایم کہ مے بینی بیانم شد

نگہ دزدیدہ افگندی بدل چوں راز جاں دارم
نظر کردی بہ بیباکی و فصل داستانم شد

دگر قدح جنوں در دہ کہ ہم در منزل اوّل
خیالِ وحشتم وا ماند و گردِ کاروانم شد

ہزار داستان، ۱۰ ستمبر ۱۹۲۲ء

فرمودۂ پطرس

اے حسن تو زیاد تماشہ کنم ترا
عمرم دراز بادِ تمنا کنم ترا
برہم نظر مکن من ناکردہ کار را
گر التجائے بوسۂ بے جا کنم ترا

بہ تبسم چہ تسلی بہ نگاہے چہ قرار
شکر آرزوئے از لبم انگیختہ
بر سرِ خاکِ من تشنہ لبے ریختہ باد
قطرۂ مے کہ تو از لغزشِ پا ریختہ

دوراہہ

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترا ہی دلبری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہرِ احمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریے پر
یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے
ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم بہار
تری ہی زلف سے ہر آنند معطر ہے
ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شاہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے
یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لرزش خفی بھی ہے
تو میرے دعوئے الفت کی آن پر مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے
وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے

تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شبِ وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آ کے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبحِ زیست بھی ہے موت کی گھڑی بھی ہے

میکدے میں

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں

بس خُم کے سائے میں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں

جو بے ثبات ہے دنیا تو بے ثبات سہی
فریبِ مے سے اسے اور بے ثبات کریں

اگر منارۂ کسرے سے یہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

(سویرا)

دو شعر

اُٹھ گیا اپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کر ملے گا اگلی جون

اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی بچ بچ
یہ چمن یونہی رہے گا اور —— الخ

یہ دو شعر پڑس نے شملہ سے (حکومت ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی کوچ کے ساتھ) رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے۔ جون کے ہر دو معنی کی رعایت بھی خوب ہے لیکن الخ کا قافیہ یوں اور کون لا سکتا ہے۔

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا اور دہلی گیا

وہاں جو پہنچا تو دیکھا
کہ اس جا کے لڑکے ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گنّے ہیں ویسے ہی لمبے
اور اس جا کی برفی ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بلّی ہے ویسی ہی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس ہیں بیس اور بیس
اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تکتا رہا
اور تکتا رہا اور حیراں ہوا

(پھول)

پطرس کے خطوط

فہرست

بنام عبدالمجید سالک

۱

نیویارک

۱۳ اگست [illegible]

برادر محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ لاہور کا نقشہ واقعی بدل گیا ہوگا۔ آپ کی (کا؟) شہر آشوب پڑھ کر افسوس ہوا۔ آپ کو خط لکھنا مبارک ہوا۔ کیونکہ اسی دوران میں ن۔م۔ راشد کا خط بھی ملا۔ جس میں حفیظ (ہوشیارپوری) کی تازہ تاریخ گوئی کا لطیفہ شگفتگی کا باعث ہوا۔ نہ سنا تو سنا دوں۔ راشد نے جدید شعرا پر ایک مضمون لکھا۔ جس کے بعض فقرے حفیظ صاحب (جالندھری) کو گراں گذرے۔ انہوں نے تاؤ کھا کر راشد کو یہ شعر لکھ بھیجا ؎

خبث دروں دکھا دیا ہر دہن غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا

اس پر حفیظ (ہوشیارپوری) نے اس واقعہ کی تاریخ کہی۔ "خبث دروں" ([illegible]) راشد نے چند اردو کی کتابیں بھی بھیج دیں۔ جن سے شب و روز میں کچھ رنگینی پیدا ہوگئی۔ آپ کو خط لکھنے سے طبیعت کا "ریخ" ٹوٹا تو سلیمان صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا۔ اگر انہیں جواب کی توفیق ہوئی۔ تو دل میں لہو کی ایک اور بوند نظر آنے لگے گی۔ بہرحال

محض انہیں مخاطب کرکے بھی ذریعِ ملاقات کا مزہ تو آ ہی گیا۔ اگلے
دن ایک کتب فروش کے ہاں ملک راج آنند کی ایک تازہ تصنیف
انڈین تھیٹر نظر آ ئی۔ کتاب مختصر ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے پڑھ
لی۔ بڑے طمطراق اور شان و شکوہ سے چھپی ہے۔ لیکن جہل اور
تعصب کا عجیب و غریب مرقع ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بنگالی تھیٹر
کو بہت سراہا ہے۔ لیکن ہندوستانی تھیٹر کے عنوان کے تحت میں
بہت کچھ زہر اُگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس اور پرتھوی راجکپور کو تھیٹر
کا امام قرار دیا ہے۔ آغا حشر کے متعلق کہا ہے کہ - - - - - - -
"A HACK WRITER CALLED AGHAHASHR
A THIRDRATE POETASTER."
اور اسی قسم کی اور خرافات بک کر آغا حشر کو تین چار سطروں میں ٹرخا
دیا ہے۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سالہا سال سے امتیاز سے التجا
کرتا چلا آیا ہوں۔ کہ آؤ ہم مل کر اُردو تھیٹر پر ایک کتاب لکھیں۔
اُردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ ہمارے انتقال کے بعد کوئی یہ کام نہ کر
پائے گا۔ جو مسالہ ہمارے پاس موجود ہے اور جتنی جوانی ہم نے تھیٹر پر
چھڑکی ہے۔ کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ لیکن انہوں نے توجہ نہ کی
فلم سازی انہیں ایسی چمٹی ہے کہ ان کی علم دوستی خواب اور افسانہ بن کر
رہ گئی ہے۔ ان کے بغیر یہ کام مجھ اکیلے کے بس میں نہیں۔ ذخیرہ سب
ان کے پاس ہے اور وہ متعدد کھیلوں سے واقف ہیں۔ جن کا مجھے صرف
نام معلوم ہے۔ آپ کو یہ داستان درد اس لئے سُنا رہا ہوں کہ اگر
ان کی طبیعت میں اُکتاہٹ پھر سے نہ پیدا ہو سکے۔ تو آپ اس کام
کا بیڑا کیوں نہیں اُٹھاتے۔ مانا کہ آپ کراچی میں ہیں اور میں نیویارک
میں اور نہ معلوم یہ بُعد کب تک رہے گا۔ تاہم یہ مشکل ایسی نہیں کہ

اسے چاند نہ سکیں - جب تک ہم لوگ زندہ ہیں - یہ امر محال نہیں -
موت رستے میں حائل ہوگئی - تو کوئی اسے نہ پھاند سکے گا - لیکن "حالیا
غلغلہ" تو "پھینک" سکتے ہیں -

ہندوستان سے جو تناؤ ہے - اس کی خبر محض سرکاری ذرائع
سے ہم تک پہونچتی ہے - تفصیلات سے تشنہ رہتے ہیں - اس لئے
طبیعت متفکر رہتی ہے - نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا
سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں
بند کرلی ہیں - شائد آئندہ الیکشن کی ہوس نے عمل و فکر میں
کجی پیدا کر دی ہے - اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹنڈن نے ان
کے ڈنڈ نا کر رکھا ہے - خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو - پاکستان
کی ہمت اور پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور تدبر کے سب لوگ
یہاں قائل ہیں اور بیش از بیش کالم نویس ان کے معترف بنتے چلے
جاتے ہیں - لیکن کوئی خدا کا بندہ ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا - سب
اپنا الو سیدھا کرتے ہیں -

مجید لاہوری صاحب کا سلام پہنچا - خدا انہیں خوش رکھے - ان
سے ملاقات افسوس کہ بہت مختصر ہوئی ہے - تاہم یار زندہ صحبت
باقی - انہیں میرا سلام شوق بھی پہنچا دیجئے -

خاکسار

بخاری

نیو یارک

۱۶ ستمبر ۵۱ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون! امید ہے آپ مع الخیر لاہور پہنچ گئے ہوں گے -

انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہوں گے۔ تاہم جب کبھی شہر جانا ہو اور دونوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہیئے گا۔ چند دن ہوئے۔ میں نے اقبال کو خط لکھا تھا۔ جواب سے حسب معمول محروم ہوں۔ اور شاید محروم رہوں اور۔ کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہنچا دیجئے کہ عشق کے کاروبار میں اس سے بھی بسا اوقات فائدہ پہنچتا ہے۔ کیا صوفی صاحب بدستور نیو ہاسٹل میں حکمران ہیں۔ یا کچہری روڈ کی سرکاری کوٹھیوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں۔ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی۔ اور کیا شریف صاحب کراچی میں ہیں یا لاہور واپس آگئے؟ ان سوالات سے محکمانہ معاملات کو کریدنا مطلوب نہیں، محض احباب کے مستقر و ماحول کا نقشہ ذہن میں بنانا چاہتا ہوں۔ اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کر لئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظر سے بھی بے خبر ہوں۔ اس لئے کھیل کا خاکہ تک سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی کہ وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈمی پنپ رہی ہے اور لاہور میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے "اسلامی کلچر" پر یہاں کے ایک مقتدر مؤلف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا۔ وہ عنقریب اور فلسفیانِ عالم کے دشحاتِ قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا۔ اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے۔ یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذاہب قدیم اور حقوقِ انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے بے حد سعی کی کہ اسلام کی

نمائندگی وہ کریں - آخر اس میں کامیاب ہوا - خلیفہ صاحب کا کرایہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی - کینیڈا کی (MCGILL) یونیورسٹی وظیفے دے کر اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے - عنقریب وہاں کے پروفیسر سمتھ انتخاب اشخاص کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے - میں نے اُن سے کہا ہے وہ آپ سے بھی ضرور ملیں - سمتھ پہلے بھی ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں "MODERN ISLAM IN INDIA" کے مصنف ہیں - آغا حمید وغیرہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں - چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب آج کل یہاں ہیں - مباحثہ کشمیر کے آنے والے سین کے لئے سٹیج تیار کر رہے ہیں اور بے انتہا تگ و دو میں مصروف ہیں - خدا کرے ہم اس قضیے سے عزت کے ساتھ اور بوجہ احسن عہدہ برا ہوں - ایک اور یونیورسٹی خشک علاقوں میں آب پاشی پر ریسرچ کرنا چاہتی ہے - لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں - میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں - اغلباً کام بن جائے گا - بس اپنی حکومت اور پنجاب یونیورسٹی کے اشارے کا منتظر ہوں کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں یا نہیں - ڈاکٹر داتیس (سابق پرنسپل فارمن کالج) میرے ممد ہیں اور خوب زور لگا رہے ہیں -

آپ کے لاہور میں پھر براجمان ہونے کا خیال آتا ہے - تو کئی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں - تاہم جب تک آپ کراچی میں تھے - آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے ایک اطمینان تھا سب لوگ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں - لاہور کا (بقول ملاپ پرتاپ) اب کیا بنے گا ؟

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اغلباً اب بھی اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر علی الصباح سانپ مارنے کے لئے جنگل میں گشت لگاتے ہوں گے۔ انہیں بھی میرا سلام کہیئے گا۔

آج اتوار کا دن ہے۔ ردی چھانٹ رہا ہوں۔ یہ مشغلہ ہر ملک اور ہر زمانے میں سوہانِ رُوح ہوتا چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پیرس کے سفر کے لئے ٹیکے لگوانا شروع کر دوں گا۔ پچھے ٹیکے سب کے سب زائد المیعاد ہو چکے ہیں۔ کل شام ٹیلی ویژن پر میری انٹرویو نشر ہوگی۔ کچھ کشمیر کچھ جاپانی عہدنامہ کچھ کور یا۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ غرضیکہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔

خاکسار

بخاری

نیویارک

۲۲ مارچ ۵۲ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون! نہ معلوم آپ کا کیا حال ہے۔ عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ یہ آپ کا شیوہ نہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق تشویش ہے۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چند دنوں سے بیماری ہی بیماری سننے میں آئی ہے۔ سلمان نے جارے کو نمونیہ ہو گیا۔ انور کا خط آیا تھا کہ آپ بہتر ہیں۔ اسے بھی ایک دو ہفتے گذر گئے۔ نہ معلوم اب ان کا کیا حال ہے۔ میں پیرس سے یہاں ۸ فروری کو پہنچا۔ بالکل چور۔ پہنچتے انفلوئنزا ہو گیا۔ اس سے صحت بہ پائی تو خون کا دباؤ یک لخت کر گیا۔ سر میں چکر آنے لگے اور صاحب فراش ہونا پڑا۔ اب بالکل تندرست ہوں۔ زبیدہ کو سوئٹ سے اوئی بیریا کی شکایت

ہے۔ وہ آج کل پنجاب میں ہیں۔ اُمید ہے آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ (بشرطیکہ آپ کراچی نہ آگئے ہوں) آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں۔ سیکورٹی کونسل اور ڈس آرمیمنٹ کمیشن میں ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے کئی صوبے آگ میں ہیں۔ ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کوئی نوٹا ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ اسد صاحب بحیثیت وزیر کے میرے معاون مقرر ہوتے ہیں۔ جنوری کی پہلی تا مارچ میں یہاں پہنچے۔ وزیر خارجہ انہیں اپنے ساتھ بلادِ اسلامیہ کے دورے پر لے گئے تھے۔ جب کراچی واپس پہنچے تو کہیں سیڑھیوں پر سے رپٹے۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئیں اور ان کے آنے میں اور تاخیر ہوئی۔ غرضیکہ بوجوہ پریشان رہا۔ اب زندگی کا نقشہ پھر کچھ بننے لگا ہے۔

لاہور کی خبر صرف اتنی ملی کہ ہاشمی صاحب امریکہ آئیں گے۔ یہ مژدہ سلطان نے سنایا سا ہے بھی کئی ہفتے ہونے میں آتے۔ مزید کوئی اطلاع نہ آئی۔ صوفی صاحب کا ایک نادر سلام حمید الدین (ابنِ مولوی صدر الدین مرحوم) کی وساطت سے پہنچا۔ حمید یہاں کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفیات پڑھ رہے ہیں۔ عنقریب واپس جائیں گے۔ عباس کو بی.بی.سی سے یو این بلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ آجائیں تو بہت ہی خوب ہو۔ خلیفہ عبدالحکیم یہاں اپنی لیکچر بازی ختم کر چکے ہیں۔ اب واشنگٹن میں سستا رہے ہیں۔ اگلے ہفتے نیو یارک آئیں گے۔ اور دو چار دن کے بعد کراچی کا عزم کریں گے۔

اخبار و اطلاعات تو ختم ہو لیں۔ اب موسم توں کا ذکر باقی ہے۔ پرسوں یہاں برف پڑ رہی تھی۔ یہ مارچ کا آخری سنبھالا تھا۔ یوں جنتری کے حساب سے بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ عنقریب مکان

کی دیوار پر جو بیلیں سرما میں مضمحل اور بے رونق تھیں ۔ وہ ہری بھری ہوں گی ۔ وطن یاد آتا ہے ۔ طالب علم تھے ۔ تو مارچ کے مہینے میں امتحان کے خیال سے رعشہ طاری تھا ۔ معلم ہوئے تو مارچ میں تعطیلات کا انتظار رہتا تھا ۔ بہار کی ہوائیں یوں بھی چلتی تھیں اور یوں بھی ۔ اور کاروباری عشق بہر نوع جاری رہتا تھا ۔ کیا اب بھی راوی کے اس پار مقبرہ جہانگیر کے باغ میں کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے ؟ کیا اب بھی فالودے کا موسم قریب آرہا ہے ؟ جب بخاری کے عالم میں بالکل خالی الذہن تھا ۔ تو شباب لاہور اور لاہور شباب کے کئی موقع تھوڑی تھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھتے تھے ۔ دارالاشاعت کی بزم عشاق، دہلی مسلم ہوٹل میں وارفتگان کا ہجوم ۔ بے دل مرحوم ۔ فرزند علی (جو ہر وقت پان کی وجہ سے رطب اللسان رہتے تھے) منشی نعمت علی کی " ہیتیئے یو " پرانی انارکلی میں حکیم احمد شجاع کا مکان اور باپ کا گناہ ۔ تاثیر کی فیس بائی اور تتھنی چراغ حسن حسرت ("خدا کی قسم وہ یہیں ہیں") ڈیگ پر مچھلی کا شکار جنگل کی پر اسرار معتیں ۔ پھر گورنمنٹ کالج لاج کا دور ۔ صوفی کی پنجابی غزلیں ۔ شب دیگ کی تقریبیں ۔ اے کاش کوئی از سر نو ان اوراق پریشان کا شیرازہ باندھ دے ۔

دوش بر یادِ حریفاں بخرابات شدم
خم مے دیدم و خوں در دل و پا در گل بود
بس بگشتم کہ بپرسم سبب درد فراق
مفتیٔ عقل دریں مسئلہ لایعقل بود

آپ کی خیریت کا طالب ہوں اور آپ کے خط کا منتظر ۔

ہر آنکہ جانب اہلِ وفا نگہ دارد — خاکسار
خداش در ہمہ حال از بلا نگہدارد — بخاری

نیویارک

۲۸ اپریل ۵۲ء

برادر محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ بے تاریخ لیکن غالباً اوائل اپریل شرف صدور لایا۔ آپ خط نویس نہیں برجستہ نویس ہیں۔ ایک ہی مکتوب سے آپ خبروں کا ایسا چرکا ڈکر دیتے ہیں کہ مہینوں کی تشنگی مٹ جاتی ہے۔ جب سے پیرس آیا۔ مسئلہ تیونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس بارے میں مجھے ایسا سرخرو کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی حیلہ تو باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو این میں کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت نامی اخبار نے (نام ابھی نہ لوں گا) خاص مجھ پر ایک آرٹیکل لکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے طریق کار کے مطابق ایک نامہ نگار میرے ساتھ متعین کر دیا ہے جو رات دن میرے ساتھ پھرتا ہے۔ اور بے شمار سوالات پوچھ پوچھ کر نوٹ کرتا جاتا ہے۔ پندرہ دن یہی شغل رہے گا۔ اس کے بعد وہ دو صفحے کا آرٹیکل لکھے گا۔ یہاں کے صحافت باز لوگ بھی عجیب والہانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں پر ایک آرٹیکل لکھنے کی خاطر چھ مہینے ان کے ساتھ ایک انشا پرداز کو متعین کر دیتے ہیں۔ سنا ہے میرے والے آرٹیکل پر ان کا دس ہزار ڈالر خرچ آئے گا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پاکستان کی اس خدمت کے لئے مجھے منتخب کیا اور پاکستان کی طفیل مجھ پر بھی اپنی رحمت فرمائی۔ قضیہ تیونس کیوں کر یو این میں لایا گیا۔ اور معاملے نے کیا کیا پلٹے کھائے اور دنگل میں کیا کیا تماشے ہوئے

یہ داستان ایک ڈرامہ سے کم نہیں۔ عندالملاقات انشاء اللہ کبھی عرض کروں گا۔ آپ جانتے ہیں میں تقریر بغیر نوٹ کے کرتا ہوں۔ ہر مرتبہ تقریر کے ابتدائی فقروں کے دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے۔ مجلسِ امن کے سامعین (ریڈیو وغیرہ ملاکر) کروڑ دو کروڑ سے کم نہیں ہوتے۔ اور پھر دائیں بائیں بھی گڑ سگے اور جفا داری قسم کے لوگ۔ لیکن وہ لطف رہا کہ کیا عرض کروں۔

پاکستان آنے کے لئے بے قرار ہوں ستمبر اکتوبر سے لے کر جنوری تک جنرل اسمبلی کی وجہ سے میرا نیویارک میں رہنا ضروری ہے۔ آیا تو یا ستمبر اکتوبر سے پہلے یا جنوری فروری میں۔ تاریخ کے تعین میں توقف یوں ہے کہ ہارون میاں چاہتے ہیں۔ میں ان کی شادی کے موقع پر کراچی میں ضرور موجود ہوں۔ شادی کی تاریخ بھی انہوں نے مقرر نہیں کی۔ خان بہادر میاں عبدالعزیز مرحوم کی صاحبزادی کے لئے پیغام بھیجا ہے۔ خاتون کا نام روشن ہے اور ہر شخص سے اس بچی کی تعریف سُنی ہے۔ زبیدہ یقیناً آپ سے بات کریں گی۔ اُمید ہے آپ اپنے برادرانہ مشورے سے اُسے مجھے اور ہارون کو محروم نہ رکھیں گے۔ کبھی فرصت ملے تو ذوالفقار سے عام معاملات پر بھی تبادلہ خیالات کیجئے۔ اس کا اکثر باتوں میں رویہ کچھ غیروں کا سا ہے۔ میں تو متوکل انسان ہوں۔ البتہ زبیدہ کو جو خاندانی یک جہتی کی عادی ہے۔ دُکھ ہوتا ہے۔ نہ زبیدہ ہی صبر شکر سے کام لیتی ہے۔ نہ ذوالفقار ہی کا دل پسیجتا ہے۔ اس بدمزگی سے میں اکثر پریشان رہتا ہوں۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔ تاہم عجب نہیں کہ کسی لمحے آپ کا کلام ذوالفقار کے دل میں

جائز ہیں ہو جائے۔ اور اس کی کدورتیں (واللہ اعلم کیا کدورتیں ہیں)
دور ہو جائیں۔

آپ بھی اب کراچی کے ہو گئے۔ خدا کرے آپ کو مکان خاطر خواہ مل جائے۔ مسلم ٹاؤن کی کوٹھی کے بعد بھائی بے چارے کو ہوٹل میں زندگی کا کیا لطف آئے گا۔ آپ کے کراچی آنے سے میں خوش ہوں۔ کراچی میں لاہور کا سا رس نہیں۔ لیکن جب حلقۂ احباب کے باقیات الصالحات سب کراچی میں ہیں۔ تو لاہور سے بہتر ہے۔ کم از کم آشنا صورتیں تو نظر آئیں گی۔ شریعت (محکمہ تعلیم) آج کل امریکہ میں ہے۔ ڈاکٹر وحید بھی (حقوق انسانی کے کمیشن کے سلسلے میں) یہاں ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم اس وقت بلاد اسلامیہ میں مزار مولانا مدم پر فاتحہ پڑھ رہے ہوں گے۔ یا غضنفر کے ہاں پلاؤ کھا رہے ہوں گے۔ عنقریب کراچی پہنچیں گے۔ مجید ملک اور آمنہ کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی۔ فلیمنگ روڈ کے ایام کے بعد ان سے ملنے یا لطیع ہونے کے موقعے کم ملے ہیں (بجز دوران جنگ اور دہلی میں) سلیمان یقیناً صحت مند ہوں گے۔ کیونکہ عرصہ سے ان کا خط نہیں آیا۔ سنا ہے امتیاز کراچی آئے تھے۔ چند محفلیں دلکش کرکے پھر لاہور چلے گئے۔ ان کی جانب سے تو کبھی خط آتا ہی نہیں۔ ہمارے دوست ماشاء اللہ اہل القلم سے بڑھ کر اہل اللفظ ہیں۔

خط لکھتے رہا کیجئے اور چو با حبیب نشینی و ——— الخ۔

خاکسار

بخاری

نیویارک
۳۱ اگست ۶۲ء

برادرم محترم!

سلام مسنون! یہ بھی میری ژولیدہ ایام زندگی کی ایک مثال ہے کہ جب آپ کا خط ملا۔ میں ایک کانفرنس میں تھا۔ کھول کر صرف آنکھیں سیراب کیں۔ اور پھر جیب میں رکھ لیا کہ فرصت میں پڑھوں گا۔ نہ معلوم وہ کون سی جیب کس کوٹ کی تھی۔ تین دن سے تلاش کر رہا ہوں۔ آخر ارادہ کیا کہ "منہ زبانی" ہی جواب لکھ دوں۔ اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ آپ میری خاموشی کے شاکی ہیں اور خط کا خاتمہ اس پُرمعنی فقرے یا جملے پر ہوا تھا کہ آپ "عقب ریڈیو سٹیشن" رہتے ہیں۔ عقب بھائی نہ چھوٹی!

جولائی اگست کے مہینے یہاں مشکل سے کٹتے ہیں۔ گرمی اور رطوبت یعنی بالکل کلکتہ اور گاہے گاہے مدراس۔ اس دوران میں کام برابر جاری رہا۔ کشمیر کے مسئلے کو یہاں سے جینوا روانہ کیا۔ تو ڈس آرمیمنٹ کمیشن اور سیکورٹی کونسل کے اجلاس دھڑا دھڑ ہونے لگے۔ ۱۸ اگست کو جنرل اسمبلی ہے۔ اس کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ معاونین سے جو توقع تھی کہ رستم کی گور پر لات ماریں گے۔ وہ توقع محروم ہوئی۔ ہم سمجھے تھے کہ

؎ "مبارک باد اسد غم خوار جان درد مند آیا"

لیکن انہیں فرصت کشاکش غم پنہاں ہی سے نہ ملی۔ کئی مرتبہ تکان کے مارے بُرا حال ہو گیا اور ہفتہ بھر صرف بستر میں لیٹ کر ناول پڑھنے کا ارادہ کر لیا "پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا" بہر حال اب دسمبر تک تو یونہی باربرداری کرنی

پڑے گی۔ اِس کے بعد چھٹی لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چھٹی "ایک سے دو مہینے" تک کی ہے گھر رہنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ لیکن قواعد کی رُو سے جتنا عرصہ پاکستان رہوں۔ اتنا عرصہ فارن الاؤنس چھن جاتا ہے۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو کراچی پہنچنے کے نقشے دماغ میں ڈھل رہے ہیں۔

اس دوران میں غضنفر یہاں آئے۔ کسی تیل کے بادشاہ کے مہمان تھے۔ چنانچہ اس ٹھاٹھ سے رہے کہ ہماری میزبانی کے متوقع بھی رہے اور اس سے بے نیاز بھی۔ حسب دستور کچھ ہم سے خوش کچھ خفا گئے۔ غلام محمد چند دن سے یہاں ہیں۔ ایک دو مرتبہ ماحضر تناول فرمایا اور وطن کے حالات سُنائے۔ امجد بھی موجود تھے۔ وطن کے حالات سے میں بیشتر بے خبر رہتا ہوں۔ بس اتنا ہی علم میں آتا ہے۔ جو سرکاری اطلاعات کے ذریعے پہنچتا ہے۔ ڈان پڑھنے کی کبھی فرصت ملتی ہے۔ کبھی نہیں ملتی۔ جو سیاح یہاں آتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی افسر کی بیماری کا حال سُنا جاتا ہے۔ غلام محمد بیمار تھے۔ پھر محمد علی بیمار ہوئے۔ اب سُنا ہے عبدالقادر صاحب فراش ہیں۔ کراچی کی آب و ہوا کیسر بدل ڈالنے کا تہیہ کر لینا چاہیئے۔ سلمان ملے تو ان سے کہیئے کہ ان کی جانب سے ایک مسودہ عرصہ ہوا موصول ہوا ہے۔ جس میں نیازی صاحب اور کسی اور قانسین کی آپس میں تُو تُو میں میں کا حال مفصل درج تھا۔ پھر ایک اور مسودہ شرف الصدور لایا۔ جو خود ان کی ایک ریڈیو ٹاک کا مسودہ تھا۔ حاشیے پر چند کیڑے مکوڑے "بقلم خود" منقوش تھے۔ اسی کو ان کا گرامی نامہ سمجھ کر خوش ہو لیا۔ لیکن اس سے اتنی اکتاہٹ پیدا نہ ہوئی۔ کہ "لانیو تو قلمدان" کہہ اٹھتا۔ بہرحال انہیں

عنقریب نئے سازو سامان کے ساتھ خط لکھوں گا۔

ہارون کی شادی دسمبر کے آخر میں ہوگی۔ میں وسط دسمبر سے کسی صورت پہلے نہ پہنچ سکوں گا۔ نہ معلوم ایسی تقریبوں پر کیا کیا انتظامات پیش از وقت کرنے پڑتے ہیں۔ اُمید ہے آپ زبیدہ کی اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً رہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ اور دیگر احباب اگر اس کام میں بقدر فرصت حصہ لیں۔ تو بتقاضائے نیاز مندی بے حد ممنون ہوں گا۔ ہارون منصور ماشاء اللہ جوان ہیں لیکن ناتجربہ کار ہیں۔ آپ کی ہدایت کی انہیں بے حد ضرورت ہوگی۔ سلمان کی خدمت میں بھی میری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجئے۔ ذوالفقار کو بھی خط لکھوں گا۔ لیکن نہ معلوم وہ کس حد تک توجہ کریں۔ آپ اور سلمان پر بھروسہ ہے اور خدا آپ کو خوش رکھے۔

امریکہ سے کچھ منگوانا ہو۔ تو ابھی سے لکھ بھیجئے۔ یہاں کا شاپنگ ازحد صبر آزما ہوتا ہے۔

خاکسار

بخاری

۶

نیویارک

۹ فروری ۱۹۵۳ء

برادر محترم!

سلام مسنون۔ جب نیویارک پہنچا تو جہاز سے بیمار اُترا ـــــ

رہے آرامی میں ایک قیمتی اوور کوٹ بھی جہاز ہی میں رہ گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی اُمید نہیں۔ سخت نزلہ اور بخار سیدھا ہسپتال لے گیا۔ اب افاقہ ہے۔ لندن میں چوبیس گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ جہاز والوں نے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ جو مضافات میں واقع تھا۔ بڑی سی عمارت جیسے کسی انگریز رئیس کا محل ہو۔ اردگرد وسیع باغ، دن بھر ہوٹل ہی کے آفتاب خانے میں بیٹھا رہا۔ کسی دوست آشنا سے جو لندن میں رہتے ہیں۔ ملاقات یا ٹیلی فون کی کوشش نہ کی۔ موسم صاف تھا۔ خیال تھا کہ نزلے میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ لیکن نہ ہوئی۔ قاہرہ کسی کو گذرنے کی اطلاع نہ دی تھی۔ البتہ روم کے ایئر پورٹ پر اسلم ملک اور ان کی بیوی ملنے آئے۔ گھنٹہ بھر کا وقفہ ان کی معیت میں گذرا۔ کراچی سے میرے ہی جہاز میں طیب حسین واپس قاہرہ جا رہے تھے۔ قاہرہ ایئر پورٹ پر ان کی بیگم صاحبہ (مرزا محمد سعید کی صاحبزادی) انہیں لینے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ گپ رہی۔ نیویارک ابھی خالی خالی ہے۔ ابھی تک کسی دوست سے تجدید مراسم کی مہلت نہیں ملی۔ چوہدری ظفراللہ خاں یہاں سے جینوا جا چکے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ دفتر گیا۔ جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مجبوراً کچھ دل بہلانے کے لئے۔ مصروفیت دافع تفکرات ہوتی ہے۔ آج ہارون کا خط آیا ہے کہ میں شادی مارچ کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اسے میں نے لکھا ہے کہ زبیدہ اور منصور کے ساتھ مشورہ کر کے خرچ کا تخمینہ لکھ بھیجے۔ منصور کی شادی کے اخراجات کا نقشہ اسے میں نے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اس سے مدد ملے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادی بجائے اپریل کے مارچ ہی کے مہینے میں مناسب ہو گی۔ خدا کرے اس وقت تک میں کچھ پونجی جمع کر سکوں۔ فی الحال تو تجوری جمائیاں لے رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ گھر کے لوگ اس وقت منتشر ہوں گے۔

اور زبیدہ اکیلی ہوں گی۔ خیریت دریافت کرتے رہیئے گا۔ جب میں کراچی سے روانہ ہوا تھا۔ تو اسے بھی زکام اور بخار تھا۔ شادی کی بھاگ دوڑ نے کافی تھکا دیا۔ منصور اور زرینہ اغلباً تعطیل منانے وہاں چلے گئے ہوں گے۔ ہارون لاہور میں ہے۔ بلکہ آج کل دورے پر ہے۔ وہ ۲۳ فروری تک دورے پر رہے گا۔ ذوالفقار کے اوقات جیسے مصروف ہیں۔ وہ آپ جانتے ہیں۔

کراچی آنے کا وہ لطف نہ آیا جس کی اُمید تھی۔ لوگ پژمردہ اور ان کی گفتگو اکثر متفکر تھی۔ علاوہ بریں شادی کے تفکرات بیشتر دماغ پر حاوی رہے۔ دو مرتبہ لاہور تو گیا۔ لیکن لاہور سے مخلّی بالطبع ہونے کی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ سب احباب سے (بجز ایک عابد علی کے جو برات میں بھی شامل نہ ہوئے) ملاقات تو ہو گئی۔ اب دیکھیئے اگلے دو ایک سال میں زمانہ ہر ایک سے کیا سلوک کرتا ہے۔ آپ کی صحبت بدستور فیض کا سرچشمہ تھی۔ جو قہقہے نصیب ہوئے وہ آپ ہی کی بدولت نصیب ہوئے۔ اور شادی کے انصرام میں آپ ہی کی ذات سے بہت کچھ ڈھارس بندھی رہی ورنہ میں بالکل ہی بچک گیا ہوتا۔ خدا آپ کو سلامت و شاداں رکھے۔ مجید لاہوری کی صحبت بھی حاصلِ وطن تھی۔ ان سے میری جانب سے معذرت کر دیجیئے گا۔ کہ وہ خدا حافظ کہنے آئے۔ تو میں گھر پر موجود نہ تھا۔ ان کی طباعی اور بذلہ سنجی اور سب سے بڑھ کر ان کے اخلاق اور ان کی الفت کی یاد سے طبیعت تا ابر سیراب رہے گی۔ خدا ان کے دماغ کو اور جِلا دے۔ ان پر سلام ہو۔ نیز ندوی صاحب پر بھی جن کی کتاب پڑھی (جو آپ کو انہوں نے تحفتہً دی تھی) اور وہ میرے گھر پر ہے آپ وہاں سے وصول کر لیجیئے گا۔

شاہد سہروردی نیویارک میں آ کر مقیم ہو گئے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی

ہیں ان کا منصب آرٹ لیکچرار کا ہے۔ ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں یہاں کے سب سے بڑے عجائب خانے میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہے۔ ڈائرکٹر اور اس کی بیوی نے مجھے نمائش سے پہلے کھانے پر بلایا ہے۔ ارادہ ہے کہ شاہد کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ انہیں وہاں سے بہت سے ہم سخن اور ہم زبان ملیں گے۔ سنا ہے کہ ان پر انحطاط آگیا ہے۔ اور ان کا دل بژمردہ ہے۔ آخری عمر میں تنہائی کا عالم اور تلاشِ معاش میں وطن سے اس قدر دوران پر ترس آتا ہے۔ طبیعت بھی ان کی حساس ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی سی خوش دلی ان میں نہیں (رہائے وہ نرسنگھ داس گارڈن کی زریں سہ پہر!) یہ محض نیویارک پہنچنے کا خط ہے۔ اس لئے اختصار مدِنظر ہے۔ باقی آئندہ!

ترجمے کے لئے اردو کے مختصر فسانوں کا انتخاب۔ عباس کو یاددہانی کراتے رہیئے گا۔ حسرت کو سلام۔ پڑھا انہوں نے کہ ایران میں بھی محتسب بیدار ہو رہا ہے؟

خاکسار

بخاری

نیویارک

۱۹ فروری ۴۳ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون۔ آپ نے جیسے چاہا تھا۔ اسی کے مطابق آپ کا ۱۵۔ فروری کا لکھا ہوا گرامی نامہ آج ۱۹۔ فروری کو نہیں بلکہ ۱۸ فروری کو یہاں پہنچ گیا۔ میرا یہ خط آپ کے خط کا جواب نہیں۔ بلکہ "خود بخود" خط ہے۔ اور ایک ضرورت سے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ "جنگیوں کی

توپ" کے مکمل حالات مطلوب ہیں ۔ کس نے بنائی ؟ کہاں بنائی ؟
کیا توپ ساز کا نام اور کوائف معلوم ہیں ؟ توپ کا اصل مالک کون تھا ؟
توپ کی عمر کتنی ہے ؟ ہوتے ہوتے لاہور کے عجائب خانے کے
سامنے کیسے پہنچ گئی ؟ ۔

اس ریسرچ کا محتاج یوں ہوا کہ ایک جرنیل کی اشمالت کرنی ہے ۔ ان حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی کسی چیز کا مطلقاً کوئی علم نہیں ۔ بجز بھنگیوں کی توپ کے ۔ اور اس توپ کے بارے میں ایسا شغف ہے کہ عشق و جنون کی حد تک ۔ کپلنگ کی کتاب "کم" KIM میں اس کا حال انہوں نے پڑھ رکھا ہے ۔ (اسے کہتے بھی "کم کی توپ" ہیں) ۔ اس کے مفصل حالات ان تک پہنچا سکا ۔ تو وہ پھولے نہ سمائیں گے ۔ بلکہ شاید انہیں مطلاّ و مجلّا کاغذ پر لکھوا کر اپنی لائبریری میں محفوظ رکھوا دیں ۔ پہلے خیال آیا کہ لاہور کے عجائب خانے کے مہتمم صاحب کون ہیں اور جواب جلد دینا ۔ انہیں گوارا ہوگا ۔ یا میرا خط ٹھکانی مسلوں ہی میں کہیں چکر لگاتا رہے گا ۔

اول تو مفصل حالات آپ کو خود ہی معلوم ہوں گے ۔ (آپ کا حافظہ اور دماغ عمر عیار کی زنبیل سے کم نہیں) اور نہ معلوم ہوئے تو آپ کراچی میں کسی ماہر سے حاصل کر لیں گے ۔ جواب ذرا جلد بھیج دیجئے ۔ غالب کا ہندی ترجمہ خوب رہا :

"نو بجے کا کاج کام کیا گیا ہے" ۔ :

یعنی ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۔ "کاج کام" کی داد دیجئے ۔
نشاط کا ہندی ترجمہ "کام" اور (اردو کے) کام کا ہندی ترجمہ "کاج"

لہذا "نشاط کار" "کاج کام" ہوا۔ یہ ترجمہ ہندی معزّمرّہ میں بھی مفید ہوسکتا ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ "آج کل کام کاج میں کاج کام نہیں ملتا" مگر یہ تو فرمائیے "نندرا کیوں راتری بھر نہیں آتی"۔ میں بحر (یا سمندر کہوں ؟) کون سی استعمال اصلی ہے۔ "مارچ میں شادی" پر ہارون نے مجھے خط لکھا ہے۔ تجویز درا اصل کسی کی ہو۔ وہ اس سے بہر نوع متفق بلکہ مصر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے جواب بھیجا ہے کہ مجھے اعتراض نہیں۔ البتہ زبیدہ سے مشورہ کرکے اس کی رضامندی حاصل کرلے۔ روپے کا جو انتظام کرنا ہے۔ اس کے اعتبار سے میرے لئے آخر مارچ یا آخر اپریل دونوں برابر ہیں۔ لہذا اس کے متعلق تشویش نہ ہونی چاہیئے۔ اور محض اس خیال سے مارچ کو رد نہ کرنا چاہیئے۔ روپیہ کا انتظام انشا اللہ ہوجائے گا۔ باقی حالات آپ پر اور زبیدہ پر چھوڑتا ہوں۔ ہارون کے نزدیک شادی کا اپریل تک التوا خود اس کے (یعنی ہارون کے) لئے خوشگوار نہیں۔ بلکہ ذہنی پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس کے خط سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپریل پر خواہ مخواہ اصرار نہ کرنا چاہیئے۔ البتہ کوئی دیگر حالات مانع ہوں۔ تو کوئی اور بات ہے۔ ان کا مجھے علم نہیں۔ اگر تیاری میں کوئی کوتاہی رہ گئی۔ تو اس کا الزام ہم پر نہ آئے گا۔ لہذا اس بارے میں زبیدہ کو کوئی ہراس اپنے اوپر طاری نہ کرنا چاہیئے۔ ہارون کا خط کچھ "دردیلا" سا تھا۔ اس لئے میں نے مزاحم ہونا قرین مصلحت نہ سمجھا۔ صحیح حالات آپ کو منصور سے معلوم ہوں گے۔ جب وہ کراچی واپس آئے گا۔

احباب کی یاد ابھی تازہ ہے۔ مجید لاہوری اور دیگر کرم فرماؤں کو سلام پہنچے۔

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شام سوادِ وطن میں تھی

"شام" سے مراد وہ شام ہے جو آپ کے ہاں کٹتی تھی۔ اور "سواد" پنجابی کا "سواد" ہے۔

خاکسار

بخاری

نیویارک
۱۶ اپریل ۵۳ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ نمکدان بھی کتاب کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ خیال تھا اس کے متعلق علیحدہ خط لکھوں گا۔ لیکن فرصت نہ ملی۔ مجید صاحب کو بہرحال میرا دلی شکریہ پہنچا دیجئے۔ نمکدان کی وجہ سے کئی دن اور شامیں روشن ہوگئیں۔ اور صحبتِ یاراں سرِ پل کا مزہ آگیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ نسیم کا ایسا جھونکا کبھی کبھار وطن سے آجائے۔ تو میں کتنی دیر تک یہاں مست رہتا ہوں۔

تنخواہ میں جو تخفیف ہوئی ہے وہ پندرہ سو روپے ماہوار کے برابر ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ تخفیف کی ضرورت اس حد تک محسوس ہوگی۔ میں سمجھتا تھا۔ یہ عہدہ اتنا اہم ہے۔ اور یہاں ہم نے رستم کی گور پہ وہ لات ماری ہے کہ ہم مامون رہیں گے۔ بہرحال ہماری خوش فہمی صحیح ہی کیوں ثابت ہوتی؟ اور یہ بھی خیال تھا۔ کہ جو لوگ خود فارن سروس سے متعلق نہ ہوں۔ اور باوجود اس کے سفیر وغیرہ مقرر ہوں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کہیں ساٹھ برس

کی عمر میں ہوتی ہے ۔ میں نہ تو فارن سروس میں ہوں ۔ نہ ابراہیم رحمت اللہ ، ڈاکٹر عمر حیات ، غضنفر وغیرہ کی طرح سیاسی زندگی سے سفارت پر آیا ہوں ۔ مجھ پر کون سا قانون لگے گا ؟ ہم پھر خوش فہمی میں رہے تا آنکہ حکم آیا کہ یکم اکتوبر ۵۳ء سے تم بہر حال سبکدوش کر دیئے جاؤ گے ۔ عرض معروض کی ہے کہ مجھ پر فارن سروس والوں کا قانون وارد نہ کیا جائے ۔ تو مجھے توسیع ملازمت ارزانی فرمایئے ۔ ضابطے کا جواب ابھی نہیں آیا ۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر کچھ نہ کچھ نوازش ضرور ہو گی ۔ اور مجھے ایک سال کی توسیع یعنی یکم اکتوبر ۵۴ء تک مل جائے گی ۔ خدا کرے ایسا ہی ہو ۔ تاکہ مجھے کچھ مہلت مل جائے اور اپنا مستقبل قدرے سہولت کے ساتھ شکست و ریخت سے بچا سکوں ۔

ساتھ ہی ساتھ تلاشِ معاش جاری ہے اور اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا ہوں ۔ آثار قدرے اُمید افزا ہیں ۔ سرکاری ملازمت پر اب مزید تکیہ کرنا فضول ہے ۔ کب تک کوئی میری معروضات پر غور کرتا رہے گا ۔ ضابطے کا چکر بے پناہ ہوتا ہے ۔ بار بار اپنے آپ کو مستثنیات میں سے ثابت کرنا طولِ عمل ہے ۔ معاش کی تلاش امریکہ یورپ میں ہی کرنی پڑے گی ۔ وطن میں بجز سرکاری ملازمت کے کیا ہے ۔ جس کے ہم منشی لوگ قابل ہوں ۔ اور جب سرکاری ملازمت سے ہل گئے ۔ تو باقی کیا رکھا ہے ۔ پنشن کی معیاد کے ساتھ ہی ساتھ کہولت بھی وارد ہو جاتی ۔ تو کسی بستر پر پڑا رہتا ۔ لیکن سخت جانی کا کیا علاج ؟ " ابھی تو میں جوان ہوں " یا کم از کم ستر ا بہتر ا نہیں ۔ وہ بے چارا کیا کرے جو ضابطے کا بوڑھا ہو ۔ اور دل و دماغ کا بوڑھا نہ ہو ۔

زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا ۔ کہ ہارون کی شادی ستائیس اپریل

کو ہوگی اور آپ اس میں شریک ہوں گے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی راہنمائی زبیدہ اور بچوں کو حاصل ہوگی۔ تو میں پریشان کیوں ہوں۔ تاہم دل وہیں اٹکا رہے گا۔ ہوسکتا تو آتا۔ لیکن جو کچھ پس انداز کیا تھا۔ منصور کی شادی پر خرچ کر ڈالا۔ جو کھرچن باقی تھی۔ اسے جوں توں کرکے ہارون کے لئے بھیج دیا۔ اب محض قلندر ہوں۔ آیندہ معاش کا ابھی کچھ یقین نہیں۔ عمر بھر جو کچھ کمایا تھا۔ وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ کسی دن فرصت سے اس پر غور کروں گا۔ ممکن ہے۔ میں نے کہیں دفن کر رکھا ہو اور بھول گیا ہوں۔ میں نے عرصے تک آپ کو خط نہ لکھا۔ خیال تھا کہ آپ شاید مرزا غالبؔ کے سلسلے میں سفر پر ہوں۔ خبریں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں اور جو پہنچتی ہیں۔ ان کا مالہٗ وما علیہ اکثر پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ بہرحال کچھ سمجھنے کی ایسی جلدی بھی نہیں۔ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔

آپ کی بہبود کا طالب خاکسار

بخاری

نیویارک

۵ مئی ۱۹۵۳ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون۔ آپ کا بے تاریخ خط آج ملا۔ اس سے پیشتر وہ خط بھی موصول ہوا جس میں عزیزی اعجاز کے کوائف شامل (مشمول؟) تھے۔ اعجاز صاحب کے سلسلے میں میں نے سب سے پہلے بالواسطہ تحقیقات کی۔ کہ ایسے گریڈ میں کھپنے کی کیا کیا گنجائشیں ہوتی ہیں کیونکہ ابھی تک ہمیں ان سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ (آپ نے فرمایا ہے کہ

"ان کا ایک ساتھی حال ہی میں مقرر ہو کر امریکہ جا چکا ہے۔"
معلوم نہ ہوا کہ وہ کون ہے؟ تفصیل مل جائے تو اس سے ہمیں
اپنی مساعی میں مدد ملے گی) جو حالات سرسری طور پہ معلوم ہوئے
ہیں۔ وہ یوں ہیں۔ کہ نمبر ا گریڈوں میں ہمیں اپنے کوٹے سے
زیادہ حاصل ہے۔ نمبر ۲ کلرک عموماً مقامی طور پہ بھرتی ہوتے ہیں
ورنہ آنے جانے کا خرچہ تنخواہ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ گویا
یا تو امریکیوں کو بھرتی کیا جاتا ہے یا ان لوگوں کو جو غیر ممالک
سے آئے ہوں۔ لیکن یہاں موجود ہوں۔ نمبر ۳ بطریق مغرب
ایسے کام عورتیں کرتی ہیں۔ امریکی ذہنیت کے لئے ایسے کام پر
کسی مرد کو مامور کرنا ایسے ہی اچنبھے کی بات ہے۔ جیسے ہم اپنے وطن
میں چپڑاسی کے عہدے پر کسی عورت کو مقرر کرنا چاہیں۔ حالانکہ
ظاہر ہے کام وہ بھی کرے گی۔ یہ تو ہوئیں معمول کی باتیں۔ اب
میں خود کسی با اختیار افسر سے ملا تو اپنے طور پر پوچھوں گا کہ
باوجود ان رسمی مواقعات کے کیا پھر بھی کوئی گنجائش موجود ہے۔
اور آپ کو بلا تاخیر اس سے مطلع کروں گا۔

تنخواہ تو یکم اپریل سے کم ہو گئی۔ توسیع کے متعلق ابھی کوئی باضابطہ
حکم موصول نہیں ہوا۔ آخری خبر یہ ہے کہ وزیر خارجہ نے توسیع کی
سفارش کی ہے۔ اور وزیر اعظم نے اس پہ حکم صادر کیا ہے۔ مگر
وہ سابقہ وزیر اعظم تھے۔ نہ معلوم اب صورت حال کیا ہے۔ افسوس
آپ شادی پر نہ جا سکے۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات کا کہ
بھابی کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں نے آپ سے کراچی میں بھی عرض
کیا تھا۔ کہ یہاں کسی ڈاکٹر سے بذریعہ خط و کتابت مشورہ کرنا ہو
تو بلا تامل مجھے لکھ بھیجئے۔ خدا کرے کہ ان کی طبیعت سنبھل گئی ہو۔
شادی کے بعد زبیدہ کا خط نہیں آیا۔ اس لئے تفصیلات سے

بے خبر ہوں۔ البتہ عین شادی کے دن منصور کا لاہور سے تار آیا تھا کہ کام بخوبی سرانجام پا گیا۔ اب زبیدہ کے خط کا انتظار ہے نہ معلوم اس ترتیب کو کس قدر کوفت ہوئی۔ لیکن بہو کا گھر لانا اس کے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہوگا۔ افسوس کہ زمانہ اب وہ نہیں کہ شادیاں بطرز قدم چاؤ چونچلوں سے کی جائیں۔ دولہا بدل گئے۔ دلہن بدل گئیں۔ خوشی یہاں نہ رہیں غرضیکہ "عبوری دَور" مجھے اکثر اس بات کا شدید احساس رہتا ہے کہ زبیدہ کو کس قدر ذہنی شکست و ریخت کا سامنا ہوتا ہے۔ آج ذوالفقار کا خط آیا کہ پروین کی منگنی پشاور کے رئیس خان بہادر صفدر خاں کے صاحبزادے افضل سے ہوگئی ہے۔ الحمد اللہ۔ خدا کرے اس بچی کی زندگی کامران ہو۔ اس خبر سے بہت خوشی ہوئی۔

سلمان کو نیا گھر مبارک۔ میں تو میرا پیغام تہنیت پہنچا دیجئے گا۔ نگران کے پرچے ملے ان کے صفحات پر بھی دوستوں سے مل گیا اور مجید صاحب کے ساتھ مل کر جلس لیا۔ مجید صاحب کو خدا نے شرافت اور شرارت کا جو نسخہ بنایا ہے۔ وہ دل کی گرمی اور دماغ کی ٹھنڈک کے لئے بہترین نسخہ ہے۔ انہیں میرا اسلام شوق کہیئے گا یقین مانیئے نگران پہنچا تو میں نے اس کے بعض حصے پانچ چھ مرتبہ پڑھے۔ اور سنائے۔ ان کی بدولت میں تو بالکل ہی نمک خوار ہو گیا ہوں۔

سرفراز کا پنجاب چلے جانا حیرت کا باعث ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کا یہ عہدہ ان کے لئے بہت ہی موزوں تھا۔ لیکن شاید وہاں تنخواہ زیادہ ہو یا خدمت کی گنجائش زیادہ ہو۔ میرے نور احمد نہ معلوم اب کیا کرتے ہیں؟ اختر صاحب کو بھی میرا اسلام کہیئے گا اور ہاں وہ مرد مومن کو جس کا نام "مگر نہیں وصل تو" ہے آج کل کسی شغل میں مصروف ہیں؟ ان کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی؟ اگر سالک بے خبر نہیں تو وہ ضرور

سجادہ رنگین کر رہے ہوں گے۔ خدایا ان کا کیفت کم نہ بادا!

خاکسار

بخاری

نیویارک

۴ جولائی ۵۳ء

برادرِ محترم!!

سلام مسنون! توسیع کے متعلق آپ کو اطلاع مل چکی ہو گی۔ وزیر اعظم اور گورنر جنرل دونوں نے از حد محبت اور اخلاق کے خط لکھے۔ ایک سال کی توسیع منظور ہو گئی ہے۔ اب کاش کسی کو اس سے پہلے ایسے با اخلاق خط لکھنے کی توفیق ہوتی۔ اکثر لوگ ضابطے کا خط لکھتے ہیں۔ تو یہ تہیہ کرکے لکھتے ہیں کہ اس میں مکتوب الیہ کو اچھی طرح رگیدا جائے چنانچہ پیوست اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا۔

معاش کی یہاں دو صورتیں ہیں۔ تعلیمی ادارے اور یو۔ این امکانات دونو ہیں۔ لیکن جب سے لوگوں کے کانوں میں بھنک پڑی ہے کہ میں قومی خدمت سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ دروازے پر کئی لوگوں نے دستک دی ہے۔ یو۔ این کا کام دفتری ہے۔ صبح نو بجے سے شام کے چھ بجے تک میز پر نشست۔ لیکن تنخواہ نسبتاً زیادہ ہے۔ تعلیمی اداروں کا کام (از قسم مشقت) ہلکا ہے۔ لیکن تصنیف و تالیف کی کئی دل کش گنجائشیں اس میں نکلتی ہیں۔ البتہ تنخواہ نسبتاً کم ہے۔ جسے بقدر لب و دندان تصنیف کی آمدنی سے پھیلانا پڑے گا۔ آج کل اسی گومگو میں ہوں۔ رجحان تعلیمی کام

کی طرف ہے۔ تصنیف کی ہوس عمر بھر سے ہے۔ کچھ حالاتِ زمانہ اور بیشتر اپنی غیر صالح طبیعت کی بدولت وہ ہوس کبھی ٹھیک طرح پوری نہ ہوئی۔ خدا کرے آخری فیصلہ یہی ہو کہ تعلیمی کام کیا جائے۔ جب خدا سے دُعا کی ہے۔ کبھی نیکی کی ہدایت نہیں چاہی۔ کیونکہ وہ اس نے پہلے سے دے رکھی ہے اور دل و دماغ صراطِ مستقیم سے ہمیشہ آگاہ رہے ہیں۔ جب دُعا کی ہے یہی کہ خدایا ہم کمزور ہیں۔ نیکی کو ہمارے لئے دلکش بنا۔ جہاں ثواب کا امکان ہو۔ وہاں تھوڑا سا مزا رکھ دے۔ بہت نہیں تھوڑا سا۔ ہم گدھے ہیں۔ تیرے اشارے کو تو سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اپنی کمزوریوں میں پاگل ہیں۔ اس لئے دُور سے کبھی کبھار گاجر دکھا دیا کر۔

خیر آخری فیصلہ تو ہوتا رہے گا۔ ابھی تفصیلات پر بہت کچھ غور کرنا ہے۔ اس دوران میں تصنیف کی طرف رجوع ہونا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے یہاں مشورہ دیا ہے کہ دو کتابیں تم فوراً لکھ ڈالو (انگریزی میں) ایک امریکیوں کے لئے اُردو سکھانے کی کتاب۔ دوسرے امریکنوں کے لئے (ایک مختصر) تاریخ ادب اُردو۔ ان کتابوں سے جو پیسے وصول ہوں گے۔ وہ آئندہ بہتر کتابیں لکھنے کے کام آئیں گے۔ اب آپ کے ذمے کام یہ ہے کہ پاکستان سے ان کے لئے مصالحہ بھیجئے۔ تاریخ ادب کے لئے تو بہت سی کتابیں جمع کرنی پڑیں گی۔ لہذا پہلے اُردو سکھانے کی کتاب کا مصالحہ بھیجئے۔ اور وہ مصالحہ یہ ہے۔ عبدالحق کی قواعد اُردو، اور وہ پانچ چھ کتابیں جو کسی زمانے میں صاحب لوگوں کے لئے لکھی گئی تھیں۔ (ذوالفقار اور شمس عارف دونوں اس کے ماہر ہوں گے) اس سلسلے میں مجھ سے مزید تبادلہ خیالات کرنا ہو۔ تو وہ بعد میں۔ پہلے جو کتابیں ہاتھ آئیں۔ وہ بھجوا دیجئے۔ مصارف میں ادا کردوں گا۔ اس کے ساتھ

ساتھ تاریخ ادب کے لئے فہرست کتب بھی مرتب کرنا شروع کر دیجئے۔

یہ کام یارِ خاطر تو نہ ہوگا اور کس سے کہوں؟ امتیاز کا بار بار خیال آتا ہے۔ لیکن وہ ایسے کاموں کے لئے مدت سے بے کار ہو چکے۔ وہ سستی نہ کرتے تو اُنہوں نے اور ہم نے مل کر تاریخ ڈرامہ پر ایک نہایت معقول کتاب آج سے دس پندرہ سال پہلے لکھ لی ہوتی۔ عباس صاحب اکثر کرم فرمائی کرتے ہیں۔ لیکن وہ کچھ اپنے مخمصوں میں ایسے گرفتار ہیں۔ کہ پہلی سی اچپلاہٹ ان میں نہیں رہی۔ باقی آئندہ!

خاکسار

بخاری

نیویارک

۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء

برادر محترم!

سلام مسنون! آپ کا یکم جولائی کا خط چند دن ہوئے ملا۔ کتابوں کا پارسل بھی مل گیا۔ بے حد شکریہ۔ جانتا تھا کہ کراچی میں کتابوں کا جمع کرنا جرِ ثقیل ہے۔ تاہم آپ کو تکلیف دینے سے باز نہ آیا۔ اور کیا کرتا؟ رشید (ریڈیو والے) سے یہاں کئی صحبتیں ہوئیں۔ ان سے کتابوں کے بارے میں مَیں نے اپنی مشکلات بیان کی۔ انہوں نے کہا۔ ہم آپ کے لئے کراچی میں ایک ایجنسی قائم کریں گے۔ جو آپ کے حسبِ ضرورت آپ کو اُردو کی کتابیں بھیج دیا کرے۔ تاکہ اگر آپ نیویارک میں بیٹھے بیٹھے تصنیف و تالیف کا شوق پورا کرنا چاہیں۔ تو بے کتابی سدِ راہ نہ ہو۔ میں نے کہا۔ اس ایجنسی کا مہتمم

کون ہو گا۔ یعنی میں یہاں سے خط کسے لکھوں؟ انہوں نے اپنا نام پیش کیا۔ یعنی میں انہیں لکھوں گا۔ اور وہ احباب کو بے گا رمیں پکڑ کر جیسا جس سے ہو سکا۔ کتابیں حاصل کر کے مجھے بھجوا دیا کریں گے۔ اس وعدے بلکہ دعوے کی بنا پر میں انہیں کبھی آزماؤں گا۔ لیکن وہ بھی آخر آپ ہی کی طرف رجوع کریں گے۔ اور اگر ان کی توجیہ کبھی کارگر ہوئی۔ تو اس میں آپ کا ہاتھ ہو گا۔ ان سے ملاقات ضرور کیجئے۔ یہاں آکر ان کی طبیعت میں چند شگوفے پھوٹنے لگے۔ اور ان کے ذہن کو ایسی جلا ہوئی۔ جس کی انہیں سالہا سال سے ضرورت تھی۔ واپس پہنچ کر پھر پھپھوندی لگنے لگے۔ تو میں کہہ نہیں سکتا۔ آپ کی جولاں فکری کا اکثر تذکرہ رہا۔ گورنمنٹ کالج کے علم پرست اور سخن سنج گروہ یعنی راشد، رشید، حمید، امتیاز وغیرہم چند سے شعلوں کی طرح روشن ہوتے۔ لیکن کچھ عجب ہواؤں کا سامنا ہوا کہ شعلے سے زیادہ دھواں ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ کوئی گلگیری کا سامان بھی نظر نہ آیا۔ چنانچہ سالہا سال سے بس سلگ رہے ہیں۔ آپ کو جن چشموں نے سیراب کیا ہے۔ ان کی تازگی کبھی کم نہ ہونے پائی۔ اس پر میں اور رشید گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ آخر آپ کو ہزارہا دعائیں دے کر آپ نے عہد محبت پھر تازہ کیا۔ اس نے بھی میں نے بھی۔ یہ لمحے رشید اور میری زندگی کے بہترین لمحے تھے۔ اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی۔

کتابوں کا پھر شکریہ! تاریخ ادب کی مسمّیٰ کتابوں میں سے صرف آبِ حیات میرے پاس ہے۔ باقی جب میسر ہوں۔ بھجوا دیجئے۔ پہلے ایک سرسری خاکہ بنا لوں۔ اس کے بعد اصل کتابوں کی ضرورت بھی پڑے گی۔ یعنی "سب رس" سے لے کر انارکلی تک۔ لیکن یہ مرحلہ ابھی دور ہے۔ ابھی تو پہلے چند قدم تول رہا ہوں۔

اب کے آپ نے طویل خاموشی کے بعد خط لکھا۔ خط لکھنے کے معاملے میں آپ نے کچھ موسموں کا سا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ دو چار دن سے زیادہ اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ اس لئے بارانِ کرم میں غیر معمولی تاخیر ہو۔ تو ہم مرجھانے لگتے ہیں۔ آج کل آپ کے کام کاج کا کیا حال ہے۔ کیا اب بھی آپ کا وہی منصب ہے جو سابق وزارت کے زمانے میں تھا؟

مجید لاہوری، رشید اختر ندوی اور حسرت اور دیگر احباب کو سلام پہنچے۔ اُمید ہے بھابی کا مزاج اب بخیر ہوگا۔ اور تشویش کی کوئی وجہ باقی نہ ہوگی۔ انہیں میرا مؤدبانہ سلام کہیے۔

خاکسار

بخاری

نیو یارک

۲۲۔ اکتوبر ۵۳ء

برادرِ محترم

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ بیماری میں آپ اکثر یاد آئے۔ جہاں گردی سیر و سیاحت کے لئے خوب ہے۔ لیکن قدرت کو کوئی ایسا انتظام ضرور کرنا چاہیئے۔ کہ انسان بیمار ہو تو اپنے وطن ہی میں۔ اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ علاج تو یہاں سے بہتر ساری دنیا میں نہیں لیکن روح کے زخم بھرنے نہیں پاتے۔ رُوح کی مسیحائی احباب ہی سے ہو سکتی ہے۔ آپ خط جلدی لکھتے تو اچھا ہوتا۔ میں جواب نہ دے سکتا لیکن آپ کی آواز تو سُن لیتا۔ بہرحال اب بھی آپ کا خط برکت کا موجب ہوا۔ یہ آپ نے خوب پوچھا کہ علالت کیا تھی۔

جو ہم جیسے اہل دل ہیں۔ وہ کب تک دل کو سنبھالے رہیں گے۔ اس سے پہلے تو کوئی آثار نہ تھے۔ لیکن یہ پچھلا سال مجھ پر بہت گراں گذرا۔

•

پاکستان کا سفر اتنا مختصر تھا کہ اس سے جسم کو کچھ آرام نہ ملا۔ اخراجات بہت زیادہ ہوئے۔ واپس پہنچا تو بعض بزرگوں کی تنگ نظری سے جو خطرے لاحق تھے۔ وہ صحیح ثابت ہوتے پھر تنخواہ کم ہوئی۔ پھر ریٹائرمنٹ کا نوٹس ملا۔ جب مجھ سے مایوس ہوئے۔ تو امریکیوں نے اپنا ایک آدمی کھڑا کیا۔ اور اسے منتخب کروایا۔ پھر ہمیں سرکار پاکستان سے ایک سال کی توسیع ملی۔ اس میں تلاش معاش شروع کی۔ کچھ تدبیریں کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں۔ تو بیمار پڑ گیا۔ اب اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ پھر کوشش شروع کر دوں گا۔

•

لاہور کے کاٹے کا علاج نہیں۔ آپ ہر دلعزیز انسان ہیں۔ جہاں جاتے ہیں۔ آپ کے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ ایک مستقل عرس شریف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم آپ کے لبوں سے بھی اکثر لاہور کے نام پر آہ نکلی۔ خلیفہ حکیم کو میں نے ایک خط کئی مہینے ہوئے لکھا تھا۔ دست بستہ عرض بھی کی تھی۔ کہ جواب ضرور لکھیئے گا۔ لیکن وہ بے کار با کار انسان خط کے معاملے میں حد درجہ کاہل ہے۔ اعجاز سے بھی سلسلہ پیام کچھ عرصے سے بند ہے۔ بشیر ہاشمی کا ایک خط (از حد رقت امیز) البتہ چند دن ہوتے آیا تھا۔

لیجئے ایک اور کام آپ کے کرنے کا نکل آیا۔ ایک پبلشر نے مجھ سے ایک بچوں کی کہانی مانگی ہے۔ (تخمیناً ایک ہزار الفاظ) یہ ایک مجموعہ میں شامل کی جائے گی۔ جس میں سب دیگر اقوام کے بچوں

کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی۔ کہتے ہیں۔ کہانی ایسی ہو جو قدیم OLKLORE پر مبنی ہو۔ دس بارہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے موزوں ہو اور ممکن ہو تو ایسی ہو کہ اس سے صلح و آشتی کا سبق اخذ کیا جا سکے۔ نہ قتال و جدال کا۔ یعنی وہ جو شیشہ دلیسی کہانی ہو بھی بچوں کے کام کی۔ اور یو۔این کے نصب العین پر بھی پوری اُترے۔ اب ایسی کہانی کا انتخاب وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جن کی کودکی اخبار بچوں میں مشغول قا ملاقن کرنے کند۔ن ہو۔ پہلے خیال آیا۔ اقبال تو سے پوچھوں۔ لیکن ان سے جلد جواب کی توقع نہیں۔ اس لئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس بھی تو کراچی ہی میں ہیں۔ آپ دونوں مل کر ایسی کہانی انتخاب نہ کر سکے تو اور کون کرے گا۔ کہانی اُردو میں بھجوا دیجئے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں کر لوں گا۔ اور عباس سے کہیئے کہ ان کی کہانیوں کا ترجمہ بھی جاری ہے (یعنی بیماری تک جاری تھا اب پھر متوجہ ہوں گا) امین الدین کے انتقال کی خبر آپ کے خط سے ملی۔ زبیدہ نے میری بیماری کے پیش نظر اسے مجھ سے پوشیدہ رکھا۔ حسرت کاشمیری اور مجید لاہوری دونوں کو میرا سلام۔ وہ کاشمیری اور لاہوری ایسے ہی ہیں۔ جیسے میں پاکستانی ہوں۔ ہم تینوں کی قسمت ایک ہی فرشتے نے تصنیف کی تھی جس دیار کو فخریہ ہم نے اپنایا۔ اسی سے اخراج ہوا۔ عنقریب ایک اور خط لکھوں گا۔ پیاسش نہیں بجھی۔

خاکسار

بخاری

نیو یارک
۲۱ نومبر ۵۳ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ یکم نومبر کا لکھا ہوا ملا۔ مختصر بیسکن
بہرحال مکتوب محبوب۔ دِل سیر نہ ہوا۔ آنکھیں تو روشن ہوئیں۔ اس
اثنا میں بشیر ہاشمی کا خط بھی ملا۔ جن دنوں آپ لاہور میں تھے۔
اور دھڑا دھڑ ضیافتیں آپ کے اعزاز میں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں
وہ بے چارہ ٹائیفائیڈ میں مبتلا تھا۔ اور ماتم کر رہا تھا کہ آپ کی
صحبت سے محروم رہا۔ ان کے میرے درمیان خط و کتابت نے حال
ہی میں ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بھی بیمار میں بھی
بیمار۔ وہ بھی برلبِ پنشن میں بھی برلبِ پنشن۔ دونوں کے خط
ایک ہی زمین میں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں سوز مجھ سے
زیادہ ہوتا ہے۔ اور نزاکتِ طبع بھی مجھ سے وافر۔ چغتائی کے خطوط
بھی حال میں مسلسل آئے۔ وہ اپنے گنبد علاج میں میری بیماری سے
بے خبر رہے۔ چنانچہ ان کے خطوں کا لہجہ بے حد تندرست ہے۔
اور اکثر مقوی ثابت ہوا ہے۔ ایک کہانی اُنہوں نے اس دوران
میں لکھ لی ہے۔ (یہ بات بصیغۂ راز ہے۔ آپ ہی سے ذکر کر رہا
ہوں۔ بات باہر نکلی تو وہ برہم ہو جائیں گے) کسی فلم ساز کمپنی
کو یہ افسانہ بخشنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ خدمت سونپی ہے۔ کہ اس
کا پہلے انگریزی میں ترجمہ کردوں۔ اور پھر دوستانہ دلالی کروں۔ خدا
کرے ایسا ہی ہو۔ اور ان کی سب توقعات پوری ہو جائیں۔ لیکن
میرے اختیار و اقتدار و رسوخ کا اندازہ لگانے میں حاتمی دکھائی ہے۔
ڈائریکٹر شپ کا نام تجویز کر ڈالا ہے۔ کہ وہ ہی اس قسم کے افسانے

کو نبھا سکے گا۔ اور اس آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ بلکہ دانت کاٹے
کی روٹی ——— وغیرہ وغیرہ۔

آپ کا اور عباس کا شکریہ! یہ بچوں کی کہانی جس کی مجھے
تلاش ہے۔ محض خیراتی کام ہے۔ یو۔ این کی بعض ادھیڑ عمر کی
عورتوں نے ایک مضمون کا "گلدستہ" بنایا ہے۔ اس سے پہلے مختلف
اقسام کے کھانوں کے ترکیبی نسخے شائع کر چکی ہیں۔ اب کہانیوں کی
طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ بین الاقوامی پن، مادریت، اور تصنیف
تینوں پرندوں کو ایک پتھر سے مارنا چاہتی ہیں۔ امتیاز کو کیا ہوا
کبھی خط لکھنے کا نام نہیں لیتے۔ کئی مرتبہ میں نے پہل کی۔ مگر ہر
مرتبہ تھک کر بیٹھ گیا۔ پھر چندے اور احباب کی وساطت سے ان
کو سلام شوق بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول نہ ہوا۔ تو اسے بھی ترک کر
دیا۔ اس بے چارے پر کچھ عجیب سی کہولت سی چھا گئی۔ سٹوڈیو
اور گھر کے آنگن سے باہر نہیں نکلتا۔ زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا۔
کہ حجاب اور یاسمین کو ٹائیفائیڈ لاحق ہوا۔ خدا رحم کرے۔ یہ خبر
سن کر بہت رنج ہوا۔ لیکن کیا کروں۔ امتیاز تک عرض نیاز
کرنے کے سبب رستے بند معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی آپ سے عشق اللہ
ہو تو میرا سلام کہیئے گا۔

دو تین دن ہوتے حمیدالدین (ابن ڈاکٹر صدرالدین مرحوم) امریکہ
پھر وارد ہوئے۔ ان سے لاہور کا ذکر دیر تک رہا۔ صوفی کی
بے عنائیوں سے ملوم تھے۔ کچھ تو اس میں حمیدالدین کی اپنی تنگ نظری
بھی شامل تھی۔ لیکن اس سے قطع نظر کچھ حقیقت بھی ان کے بیان میں
ضرور تھی۔ حمید کے خیال میں لاہور بے حد خزاں زدہ ہے۔ گیارہ بجے
کے بعد محتسب تنگ کرتے ہیں اور ہر راہرو کو آوارہ سمجھتے ہیں۔ کچھ
حال عابد علی عابد کا بھی بیان کیا۔ اس کی زندگی بھی سدا نوحہ وَ سَ

رہتی ہے۔ لیکن اکثر ماند شیے ماند کا ورد کرتے معلوم ہوتے ہیں۔
چاہتا ہوں کوئی پبلشر ہم سے ٹیکسٹ بک لکھوائے۔ عمر بھر
یہ کام نہیں کیا۔ لیکن اب یہ گناہ کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ کسی
کو ٹٹول کر تو ذرا دیکھیے۔ میں نے ہاشمی سے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔
آپ لوگ خیال رکھیں تو ممکن ہے۔ کوئی سبیل نکل آئے۔ تاکہ
اس عمر میں جیب میں خود یونیورسٹی وغیرہ میں نہیں۔ میری قیمت
کر گئی ہو گی۔ تاہم کوئی عقل کا اندھا نہیں گانٹھ کا پورا مل جائے تو
عجب نہیں عمر بھر میں "نہ" کہتا رہا۔ اب "ہاں" کہنے کو تیار ہوں۔
ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

اور بھی باتیں کہنے کی ہیں۔ لیکن آئندہ خط میں ان کا ذکر کروں
گا۔ آپ کو جب بھی خط لکھنے بیٹھتا ہوں۔ جبراً اسے ختم کرتا ہوں۔
ورنہ عاشق کی داستان اے محبوب کب ختم ہوتی ہے۔ حسرت اور
حمید لاہوری اور اختر ندوی اور عباسی اور دیگر احباب کو میرا نام
اور شوق یاد دلا دیجیے گا۔ تازہ تازہ خبر آئی ہے کہ ڈان پر عتاب
نازل ہوا۔ ڈان اور حکومت کے باہمی عشق کے رموز آج تک سمجھ
میں نہیں آئے۔ موہانی کا شعر یاد آیا کہ ؎

عشق کامل کے دونوں ہیں مرغوب
سحرِ وصل و شامِ تنہائی

خط لکھتے رہیے۔

خاکسار

بخاری

نیویارک
۲۱ نومبر ۵۳ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون! تجویز ہے کہ میں ایک کتاب ایڈٹ کروں جس کا عارضی نام فی الحال "A STUDY OF PAKISTAN" قرار پایا ہے۔ پندرہ ابواب ہوں گے۔ ہر باب میں پاکستان کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مصنف ایک نہیں بلکہ کئی ہوں گے۔ پبلشر کولمبیا یونیورسٹی پریس یا اسی پائے کا کوئی اور امریکی ناشر ہوگا۔ کئی تصاویر اور نقشے وغیرہ بھی کتاب میں شامل ہوں گے۔ مالیات کا باب غالباً محمد علی وزیرِ خزانہ لکھیں گے۔ بعض تاریخی موضوعات پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو دعوت دی گئی ہے۔ چند ابواب راقم الحروف لکھے گا۔ ایک باب پاکستان کے جرنلزم پر ہے۔ دو ہزار الفاظ سے پانچ ہزار الفاظ تک۔ میرا خیال ہے۔ کہ آپ سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ ہوگا۔ آپ اردو میں لکھ ڈالیں۔ انگریزی میں ترجمہ یہاں ہو جائے گا۔ ثواب تو ظاہر ہے۔ شاید خرچے کی صورت بھی نکل آئے۔ ابھی کہہ نہیں سکتا۔ کتاب بہر حال دُنیا بھر میں مشہور ہوگی۔

مضمون عالمانہ ہونا چاہیئے اور آپ کے قلم سے توقع بھی یہی ہے۔ قارئین کے دو پہلو مدِ نظر رہیں۔ اوّل وہ پاکستان کے جرنلزم سے محض بے خبر ہوں گے۔ دوم وہ خود جرنلزم کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ کچھ سلسلہ کلام اس قسم کا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ تقسیم سے پہلے ہمارے ہاں اخبارات کی کیا حالت تھی۔ تعداد کیا تھی۔ اشاعت کیا۔ لکھنے والے، ایڈیٹر اور مالک کون؟۔ اخبارات کی چال ڈھال کیا تھی؟ سیاست کے

کون سے پہلو اڈیٹر کو مرغوب تھے؟ تقسیم کے بعد جرنلزم میں کیا انقلاب آیا۔ پریسوں کی کیا حالت ہوئی۔ انقلاب کے بعد توازن کہاں کہاں آن کر ٹھہرا۔ اُردو کے کتنے اخبار ہیں۔ انگریزی کے کتنے؟ بنگالی کے کتنے؟ اشاعتیں کیا ہیں؟ موضوعات کیا ہیں؟ اس پانچ چھ سال کے عرصے میں سب سے زیادہ بحثیں اخباروں میں کن موضوعات پر ہوئیں اور کس قسم کے خیالات کا اظہار ہوا اور اخبارات کی تیاری کیوں کر ہوتی ہے۔ (ریتھو ٹائپ وغیرہ) اشاعتیں کیا ہیں۔ حلیہ اور نقشہ کیا ہے۔ روزانہ ہفتہ وار ایڈیشن، ادبی مضمون، شعر، مجید لاہوری وغیرہ وغیرہ) پریس کے قوانین کس قسم کے ہیں؟ کیا اخباروں کی زد میں آتے ہیں۔ یا اکا دکا (ایسی باتیں احتیاط سے لکھنی پڑیں گی۔ لیکن نہ اس قدر کہ بالکل ہی بے ذوق ہو جائیں۔ اسی لئے آپ کا خیال آیا کہ آپ میانہ رو مضمون اعلیٰ درجے کا لکھ سکتے ہیں) مضمون بہرحال معلومات سے پُر ہونا چاہیئے۔ اور یہ آپ کے لئے مشکل نہیں۔ آپ کے مختصر سوانح میں خود لکھوں گا۔ کہیئے کیا خیال ہے؟ خدا کرے آپ کا جواب اثبات میں ہو۔ مضمون کے لئے آپ کو کتنی مہلت درکار ہوگی۔ اوروں کو ایک، دو مہینے کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ کم نہیں اور اُمید ہے کہ آپ کو بھی منظور ہوگی۔ جواب سے سرفراز کیجیئے۔

ایک باب ادبی رجحانات پر ہے۔ وہ خود لکھنے کا ارادہ ہے۔ لیکن مواد اور مصالحہ یہاں ناپید، یہ تو ایک طرف، یہاں مجھے یہ تک معلوم نہیں، کہ رسالے کون کون سے اور کتنے نکلتے ہیں۔ باقی ایسے مضمون کے لئے جو معلومات درکار ہیں۔ اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ عباس کو بیگار میں پکڑیئے اور ان سے کہیئے کہ

میری مدد کریں۔

جرنلزم کے سلسلے میں خیال آیا۔ کہ اگر کوئی مزے دار اخباری نظمیں پیشِ نظر ہوں۔ تو ان کا ترجمہ بھی غوننتہ شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور یہاں کا رٹونوں کا ذکر بھی کیجئے گا۔

ذوالفقار سے ریڈیو پر لکھواؤں گا۔ لیکن ذرا وقفے کے بعد۔ وہ آج کل پپو کی شادی کے انتظام میں منہمک ہوگا۔ شادی مورخہ ۲۵۔دسمبر کو ہے۔ آج ذوالفقار کا خط آیا ہے۔ آج ہاشمی کا خط بھی آیا۔ درسی کتابوں کا بازار مندا معلوم ہوتا ہے۔ بقول ہاشمی کے ہزاروں لاکھوں کا زمانہ گیا۔ اب تو کوئی دو تین ہزار روپیہ سال کا بھی لے مرے۔ تو غنیمت ہے۔ لیکن اس نے مزید تفتیش کا وعدہ کیا ہے۔ ایک کتاب "PUNJAB PRELUDE" نامی میرے پاس ریویو کے لئے آئی ہے۔ مصنفہ کا نام مِس "PRIOR" ہے۔ جو کچھ عرصہ ہوا۔ ایچی سن کالج میں پڑھاتی تھیں۔ شاید اب بھی پڑھاتی ہوں۔ پاکستان اور پنجاب پر فدا ہیں اور ہندوستان سے متنفر۔ بار بار ثابت کرتی ہیں کہ پنجابی اور انگریز دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک باب ہاشمی صاحب کے خاندان پر (بہ تغیر اسما) ہے اور پیار سے لکھا ہے۔ ہیرا منڈی کے جلوے سے بھی واقف ہیں۔ ایک حصہ "بوائے اینڈ گرل ٹربل" کے متعلق ہے۔ حصہ "بوائے اینڈ بوائے ٹربل" کا حال بھی بیان کیا ہے۔

خاکسار

بخاری

آج یہاں کے اخبار میں خبر چھپی ہے۔ کہ کابینہ میں رد و بدل ہونے والی ہے۔ نیز یہ کہ فوج کے افسروں میں بددلی ہے۔ اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر قسم کی آفت سے بچائے۔

ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب و اقربا کی بہبود اور سلامتی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔

نیویارک
۹ر دسمبر ۵۳ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ جو ۳۰ر نومبر کا تھا۔ یہ آپ کے مفصل تر خطوں میں تھا۔ لہذا بہت لطف آیا۔ اور ذہن نے لمبی چوڑی مسافت مزے لے لے کر طے کی۔ مضمون کے متعلق عرض یہ ہے۔ کہ قبل پاکستان کے ان اخباروں کا تذکرہ دل سے خالی نہ ہوگا۔ جو موجودہ پاکستانی علاقہ سے شائع ہوتے رہتے تاکہ اس علاقے کی صحافتی مدوجزر کا کچھ حال معلوم ہو۔ نیز ان اخباروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ جو پاکستانی علاقے سے شائع تو نہ ہوتے تھے۔ لیکن جن کا پاکستانی تحریک سے گہرا تعلق تھا۔ مثلاً "ڈان" اتنا کہنے کے بعد یہ بھی کہنا لازم ہے کہ میرا یہ مشورہ کچھ فضول سا ہے۔ دراصل پاکستانی صحافت کا حال بیان کرنا ہے۔ اب ان کا پس منظر بیان کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ آپ کے حُسنِ مذاق اور احساسِ ربط پر چھوڑتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر کسوٹی بھی کوئی نہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ قارئین انگریز اور امریکن ہوں گے۔ اور جس نہج سے یہ باب کتاب میں شامل ہوگا۔ اس سے پاکستانی معاشرت پر روشنی ڈالنا مقصود ہوگا۔ غیر ملکوں کے لوگ ایشیائی ممالک کے بارے میں اکثر باتوں سے بے خبر ہیں۔ اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیا کے "لوگ"، کس قسم کے لوگ

ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ کیا سوچ رہے ہیں۔ کس رُخ جا رہے ہیں۔ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کے زیرِ عنوان صحافت کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اس آلۂ جمہور کا ایشیا میں استعمال کیا ہے۔ کون کر رہا ہے؟ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی باتیں کہ کتنے لوگ اخبار خریدتے ہیں اور (اگر ہر اخبار کئی ہاتھوں سے گزرتا ہے) کتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ کس طبقہ کے ہیں۔ کس قسم کی خبریں زیادہ جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔ کس قسم کی خبریں نادر یا مفقود۔ کون سے طبقے اخبار سے بالکل ہی مامون (یا محروم ہیں) اس نوع کی باتیں یہاں لوگوں کے لئے از حد دلچسپ ہوں گی۔ لوگوں کو یہاں کرید رہتی ہے کہ ایشیائی ممالک جنہوں نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ اپنی آزادی کو کیا لباس پہنا رہے ہیں۔ اس کے تحت میں آپ جانتے ہیں۔ صحافت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لوگ اکثر اس کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب میں کراچی میں تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آئین کے متعلق اچھی بُری جتنی بھی بحثیں ہو رہی ہیں۔ وہ اخبارات کے کالموں ہی میں ہو رہی ہیں اور ممالک میں اس کے علاوہ انجمنوں، سیاسی جماعتوں، جلسوں اور لیکچروں میں بھی مختلف آراء کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے یا تو لوگوں نے دوستوں کے حلقوں میں بحثیں کیں۔ یا اخبارات میں آئینی اقدامات کے مالۂ وما علیہ پر بحث ہوئی اور بس۔ اب اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس قسم کی کئی باتیں آپ کے بہار آفریں دماغ کو خود ہی سوجھیں گی۔ آفتاب کو چراغ

کیا دکھاؤں "ماہِ نو" والا مضمون مجھے بھجوا دیجئے۔

"ادبی رجحانات" کے متعلق عرض کیا تھا۔ کہ میری جانب سے عباس سے استمداد کیجئے۔ اس کے متعلق آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ آپ کہیں تو میں اس سے براہِ راست خط و کتابت کروں۔ شاید آپ کو اس میں سہولت ہو۔ بچوں کی کہانی کے متعلق آپ کی مساعی کا شکریہ! اعجاز کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔

ہاشمی کہتا ہے۔ کتابوں والی بات یہ ہے کہ حالات قطعی وہی ہیں۔ جو اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ہاں سالک صاحب کراچی کے امریکن پبلشرز کو اور ٹٹول لیں تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ ہاشمی صاحب کا ارشاد آپ کے گوش گذار کر رہا ہوں۔

اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عنقریب ایک اور خط بلا وجہ لکھوں گا۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔ صحت بہت خراب ہے۔ آج چوہدری ظفر اللہ خاں یہاں سے رخصت ہوئے۔ سیاحت کرتے کراتے ۵ ر جنوری کو کراچی پہنچیں گے۔ اسمبلی ختم ہوئی۔ اب نسبتاً ذہن پر بوجھ کم ہوگا۔

خاکسار

بخاری

خط کے پتے پر میرا نام لکھ دیا تو منصب لکھنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھا آپ کو اس کے لئے بہت ہی خفی قلم استعمال کرنا پڑا۔ اس سے مجھے خفت ہوئی۔

نیویارک

جانِ برادر!

سلام مسنون! کئی دن سے آپ کا خط نہیں آیا۔ خدا کرے

آپ خریت سے ہوں۔ آپ کا آخری خط اغلباً وہ تھا جس میں آپ نے "زمزمہ" کے تاریخی حالات لکھ بھیجے تھے۔ اس کا میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اچھا خاصا پُر از معلومات مقالہ بن گیا۔ اور اس کی بدولت میں مفت میں تاریخ دان بن گیا۔ ہینگ لگی نہ پھٹکری۔ ترجمہ بھی کیا نعمت ہے۔ اسی لئے تو احباب سے عرض کرتا ہوں کہ ترجمہ کے لیے مصالحہ فراہم کیجیے۔ عباس نے اس بارے میں دستگیری کا وعدہ کیا تھا۔ ایک خط بھی اس مضمون کا انہوں نے لکھا تھا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ میں تو یاد دہانی کرا دیجئے گا۔ آج کل پژمردہ رہتا ہوں۔ تخفیف کی زد میں آگیا ہوں۔ تجویز ہے کہ اس عہدے کو فوراً یعنی اپریل سے سفیر سے گھٹا کر وزیر کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مجھے یہاں سے بدر کیا جاتا۔ لیکن اربابِ اقتدار نے اتنا کرم ضرور کیا کہ اگر مجھے وزیر بننا بھی منظور ہو تو یہاں سے نہ نکالا جاؤں گا۔ میرے حالات آپ جانتے ہیں۔ جس عارضے یعنی سرطان کا خطرہ لاحق ہے۔ اس کی وجہ سے میں یہاں سے ہل نہیں سکتا۔ چنانچہ یہی منظور کر لیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اب نہ معلوم یہ بھی کب تک ہے۔ اکتوبر میں اپنی مستقل ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ (وقت گذر گیا۔ اور ہمیں اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ ریٹائر ہونے کا سال اور مہینہ بھی یاد نہ تھا۔ خط لکھ کر وزارتِ تعلیم سے دریافت کیا۔ جواب آیا۔ تو چونک اُٹھا) نہ معلوم اکتوبر کے بعد کیا حشر ہو۔ توسیع ملے نہ ملے اور ملے تو کیا شرائط پر اور کیا کام مجھ سے لیا جائے۔ میں بھی عجیب خوش فہم ہوں۔ اب تک یہی غرّہ تھا کہ اس عہدے پر ہم نے وہ خدمت گذاری کی ہے۔ اور رستم کی گور پر وہ لات ماری ہے کہ ہمیں یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آئے گا۔ لیکن ملازمت تو ایک

چکی ہے ۔ چکی میں دالنے کی کیا حیثیت ہے کہ چاہے تو پسے اور چاہے تو نہ پسے ۔ عرض معروض تو کی ہے ۔ دیکھئے کیا حشر ہو۔ آپ جانتے ہیں ۔ میں عمر بھر جنبہ داری سے دُور رہا ہوں ۔ محض خدمت گذاری اور خدا پر اعتماد رہا ہے ۔ کون ہوگا ۔ جو اپنی مصلحتیں چھوڑ کر میری بہبودی کا بیڑا اٹھائے ۔ بہر حال مترس از بلائے کہ شب درمیان است ۔ محمود نظامی یہاں سے گذرے ۔ دو شامیں ان کی صحبت میں بسر ہوئیں ۔ زندہ دل انسان ہیں ۔

"اس بازار میں" کا نسخہ ملا ۔ بعض مقامات اس میں نہایت دل چسپ ہیں ۔ بعض خطیبانہ ہیں ۔ دونوں کا لطف اپنی اپنی جگہ آیا ۔ بعض لطیفے اس میں نادانستہ وارد ہوئے ہیں ۔ مثلاً صفحہ ۱۱۰ "بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے گوشت کی چاٹ پڑ چکی ہے" جو معنی فوراً ذہن میں آگئے وہ اسفل کی طرف راجع تھے ۔ لیکن دوبارہ غور کیا تو اصل معنی روشن ہوئے ۔ آخری باب میں جو پنجابی گیت شامل کئے ہیں ۔ ان میں سے بعض کئی روز دماغ میں گونجتے رہیں گے ۔

ے میری لگدی کسے نہ ویکھی، تے ٹٹدی نوں جگ جاندا

ع اگ بال کے دھوئیں دے پج رد داں

ع ماہیے دیئے بند بوتلے ۔

ے تیرے لونگ دا پیا لشکارا ۔ تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

کتنا تشنہ ان بے ساختہ جملوں میں بند ہے ۔ پج کے معنی مجھے نہ آتے تھے ۔ معلوم ہوا "آڑ" کے مترادف ہے ۔ چلیئے یہ بھی معلومات میں اضافہ ہوا ۔ اس خط کی رسید فوراً بھیج دیجئے گا ۔

اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستان میں ہر طرح امن و امان ہے ۔ خدا ہم سب کا نگہبان ہو ۔

خاکسار

بخاری

برادرِ محترم!

سلام مسنون! اس ڈاک میں دو خط ملے ۔ ایک آپ کا ۔ ایک والد کا ۔ دونوں کے جذبات ایک سے تھے ۔ گو مضمون مختلف تھے ۔ دونوں کا اثر طبیعت پر ایک سا ہوا ۔ فی الحال انفلوئنزا میں مبتلا ہوں ۔ تیز بخار ہے اور ڈاکٹر کے مفصل معائنے کے بعد معلوم ہوا ۔ کہ اس جسمِ فانی میں کئی اور نقائص پیدا ہو چکے ہیں ۔ جن کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا ۔ قلب کی حرکت ، خون کا دباؤ ، جگر و معدے کی حالت ، ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ۔ بہرحال اب یہ توقع تو ہمیں بھی نہ تھی ۔ کہ زندگی ابدی ہے ۔ نہ اس بات سے لاعلم تھے ۔ کہ جوانی آنی جانی چیز ہے ۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کشاکشِ غمِ پنہاں نے وقت سے پہلے بے کار کر دیا ۔ بہرحال بقول ایلا وہیلر ولکاکس کی اس نظم کے جس کا ترجمہ آپ کسی زمانے میں مشاعروں میں نعرہ و شور کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ۔ رونا تنہائی پسند ہے ۔ اس لئے اب کیا آپ کی سمع خراشی کروں ۔ بہتیری کر چکا ہوں ۔

آمدم بر سرِ مطلب ۔ حالات وہی ہیں ۔ جو آپ نے بیان کئے ہیں ۔ پالاں اور طوقِ زریں کے متعلق آپ نے جو نظریہ بیان کیا ہے ۔ وہ بھی حرف بحرف صحیح ہے ۔ میری صرف اتنی درخواست تھی ۔ کہ آپ کو میرے اخلاص یا مستعدی پر کبھی شبہ نہ ہونا چاہیئے ۔ میرے خط کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہ تھا ۔ کہ آمنداییب مل کر کریں آہ و زاریاں ۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا ۔ جب بن پڑا ۔ میں دریغ نہ رکھوں گا ۔ اس میں کوتاہی ہو تو اپنی روسیاہی سمجھوں گا ۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اس وقت بُری طرح بندھے ہوئے ہیں ۔ اس لئے میری بے بسی کو میری ہی محرومی سمجھیئے ۔ اس بے اعتنائی پر محمول

نہ کیجئے۔ فی الحال اتنا کیجئے۔ کہ لاہور میں جو صاحب اختیار ہیں۔ ان سے کسی وقت ملیئے۔ اغیار کی معیت میں ملنا ہو تو اور بھی بہتر ہوگا۔ دو ایک دن میں انہیں بھی پیغام بھیجوں گا۔ اور جو ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ وہ انہیں سمجھاؤں گا۔ ملتے وقت میرا نام بھی لے دیجئے اور کہیئے کہ میں اس کے ایما سے مل رہا ہوں۔ برادر محترم ان کشمکشوں میں کئی معرکے اور مرحلے پیش آتے ہیں۔ لا محالہ مسلسل کوشش اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ قسمت یاور ہو تو کامرانی جلد نصیب ہو جاتی ہے۔ ورنہ بعض اوقات شکیب آزما صبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو آپ کہیں اور میں سنوں۔ برعکس اس کے میں آپ کو نصیحت کر رہا ہوں۔ میں مجبور بلکہ معذور نہ ہوتا۔ تو آپ کو اس معاملے میں ذرا بھی تشویش نہ ہونے دیتا۔ لیکن کیا کروں ؎

نہ کبوتر حرم من نہ بدست جام جم من
کہ نہ بام من بلندے نہ کمند من درازے

مجھے اس خط کا جواب ضرور دیجئے۔ خواہ جواب پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو۔ کم از کم اپنی پریشانی میں مجھے ضرور شریک کر لیا کیجئے۔

آپ کی محبت، شفقت، علو فطرت کی بدولت بسا اوقات مجھے تقویت نصیب ہوئی ہے۔ جب آپ پریشان ہوں۔ تو یہ گوارا نہیں کہ مجھے اس پریشانی کا حصہ نہ ملے۔ میرا اختیار ہوتا۔ تو میں آپ کے پاس اس کا عشر عشیر بھی نہ رہنے دیتا۔

میرا وہاں کا معاملہ فی الحال از حد نازک اور بہت مخدوش مرحلے میں سے گزر رہا ہے۔ کبھی فرصت ہو تو من موہن سے مل

لیجیے۔ شاید وہ آپ کے مشورے یا مدد کے محتاج ہوں۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں۔ کہ سعی کر سکوں۔ صوفیا کا توکل بزدل اور کمزور ہی سہی۔ لیکن کمزور کے پاس اس کے سوا اور مسلک بھی کیا ہے۔ آپ کی بھابھی سلام کہتی ہیں۔ آپ کو بھی اور گھر کے لوگوں کو بھی۔

خاکسار

بخاری

---

۱۳ تغلق روڈ نئی دہلی

۱۹ دسمبر

برادرِ محترم!

سلام مسنون! فی الحال نیوز ایجنسیاں غیر انگریزی اخبارات کو بھی خبریں انگریزی ہی میں بھیجتی ہیں۔ اور اخبارات خود اپنے مترجموں سے ان کا ترجمہ کرا کر چھاپتے ہیں۔ اس سسٹم کے نقائص یہ ہیں۔

۱۔ نیوز ایجنسیوں کو خبریں جمع کرنے کے لئے لا محالہ ایسے کارسپانڈنٹ رکھنے پڑتے ہیں۔ جو انگریزی سے کماحقہ واقف ہوں۔ محض دیسی زبانیں جاننے والے کارسپانڈنٹ (خواہ انہیں اپنی زبان میں کتنی ہی مہارت حاصل ہو) کارسپانڈنٹ نہیں بن سکتے۔

۲۔ تمام واقعات کی خبریں انگریزی ہی میں جمع کی جاتی ہیں۔ حالانکہ مضافات میں کئی ایسے دلچسپ واقعات پیش آتے ہیں۔ جو دیسی زبانوں ہی میں بخوبی ادا ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ہر غیر انگریزی اخبار کو ایک دو تین مترجم رکھنے پڑتے ہیں۔ بضاعت کم ہو تو مترجم تھوڑے اور کم سواد ہوتے ہیں۔ اور خبروں کی ہیبت ناقص ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ترجمے میں وقت صرف ہوتا ہے۔

ان نقائص کو رفع کرنے کے لئے نیز دیسی زبانوں کی عزت افزائی کے پیشِ نظر کیا یہ نہ بہتر ہوگا کہ نیوز ایجنسیاں اپنے کارسپانڈنٹوں سے خبریں دیسی زبانوں ہی میں منگوائیں۔ اور انہی زبانوں میں اخبارات کو بھیج دیں۔ یعنی ایسوسی ایٹڈ پریس کا نامہ نگار جھنگ (مثلاً) اپنے ہیڈ آفس کو خبر اردو میں بھیجے۔ اور نیوز ایجنسی کا ہیڈ آفس آپ تک وہ خبر اُردو ہی میں پہنچا دے، جو آپ بعینہٖ یا انتخاب و اختصار کے بعد بغیر مترجم کی ضرورت پیش آنے کے اخبار میں چھاپ سکیں۔

اب اگر آپ کو اس میں کوئی فائدہ یا سہولت نظر آتی ہے۔ تو پھر دُوسرا سوال یہ ہوگا کہ ایسی خبریں ٹیلی پرنٹر پر کیوں بھیجی جائیں گی۔ اس کا جواب سوائے رومن رسم الخط کے اور کچھ نہیں۔ رومن حروف اور دیسی زبانوں کے حروف کی آپس میں پوری پوری تطبیق ممکن نہیں۔ لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دیسی زبانیں اچھی خاصی آسانی کے ساتھ رومن حروف میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ شاید کہیں کہیں ابہام رہ جائے۔ لیکن سیاق و سباق اکثر ابہام کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔ جہاں اس سے بھی کام نہ چلے۔ شاید دقت ہو۔ لیکن ابہامات کا خطرہ تو موجودہ سسٹم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ بعض تراجم اصل سے بہت دُور جا پڑتے ہیں۔

اس مسئلے پر اپنی رائے سے مستفید فرمایئے اور اگر ہو سکے تو یہ بھی فرمایئے کہ عام طور پر دوسرے دیسی اخبار کس حد تک اِس بدعت یا جدت کا خیر مقدم کریں گے۔ ممکن ہے یہ مسئلہ پہلے بھی آپ کے زیرِ غور رہ چکا ہو۔ اور آپ اس کے نشیب و فراز پر دماغ سوزی کر چکے ہوں۔ مجھے اس میں ترقی کے بہت سے امکانات

نظر آئے ۔ اس لئے آپ کی طرف رجوع کیا۔ کہ آپ کی رائے دریافت کر لوں ۔ جواب کا منتظر

بندۂ خاکسار

بخاری

برادرِ محترم!

سلام مسنون!

گرامی نامے کا شکریہ! میاں صاحب کی معاملہ فہمی اور آپ کی معاملہ فہمائی کی بدولت خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا۔ کل محکمہ کے نام چیٹرجی کا خط پہنچا کہ پرنسپل کا عہدہ یکم مارچ سے خالی ہو گا ۔ لہٰذا مجھے بر وقت سبکدوش کر دیا جائے ۔ چیٹرجی کے ایک نجی خط اور میاں صاحب کے ٹیلیفون سے معلوم ہوا ۔ کہ ڈکنسن یکم مارچ سے رخصت لے گا ۔

اپنا ارادہ اب یہ ہے کہ جنوری فروری کی چھٹی لے لوں ۔ بہر حال دسمبر کے آخر تک قطعی طور پر اس عہدے سے فارغ ہو جاؤں گا ۔

آپ کی تگ و دو کا شکریہ دوست وہ ہے جو کہ ۔۔۔۔۔ الخ ۔
اس مصرعے کے مطابق پکڑنے کے جو معنی نکلتے ہیں ۔ ان کے مطابق دھکڑنے کے کیا معنی ہوئے؟ اور " پکڑ دھکڑ " کس کو کہتے ہیں ۔ ایک نسخہ مثلاً یہ ہے کہ دوست وہ ہے جو کہ دھکڑے دوست کو ۔

لطیفہ :۔ انگریزی روزمرہ میں رخصت کے وقت ٹا ۔ ٹا کہتے ہیں ۔ جس کے معنی گڈ بائی کے ہیں ۔ یار لوگوں نے تجویز کیا ہے کہ چونکہ دہلی کے اربابِ اقتدار پر آج کل کے سرمایہ دار چھائے ہوئے ہیں ۔ اس لئے دہلی میں جس طرح السلام و علیکم

کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹٹا۔ ٹٹا کے جواب میں اسی لہجے میں برلا۔ ڈالمیا بولا جائے۔ جو لوگ دیندار ہندو ہیں اور جے رام جی کی وغیرہ کہتے ہیں۔ انہیں چاہیئے اب سری رام (یعنی سرشری رام مالک دہلی کلاتھ مل) کہا کریں۔ غصے کے اظہار کے لئے موزوں ترین لفظ "گاندھو" ہے اور اسے "قومی" گالی بنا لینا چاہیئے۔ جاہے گاندھو۔

نومبر کے تیسرے ہفتے میں لاہور دورے پر آنے کا ارادہ ہے۔

ملاقات ضرور ہوگی۔ سُنا ہے اقبال لاہور واپس آگیا ہے۔ نہ خط لکھتا ہے نہ ملتا ہے۔ دہلی سے شمال جنوب کو گذر جاتا ہے۔ اور ہم سے نہیں ملتا۔ جیسے عصمت بچائے پھرتا ہو۔ ملے تو ڈانٹئے گا۔

خاکسار

بخاری

برادرِ محترم!

سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا آپ نے جو زحمت اُٹھائی۔ اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ مجھے میاں صاحب کے دہلی آنے کا علم نہ تھا۔ کل (یا ممکن ہے آج ہی) چیٹرجی کے یہاں ملاقات ہوگی۔ وہ اور میاں صاحب دونوں کا سفر دہلی ایک دوسرے سے غیر متعلق ہو۔ بہرحال میں میاں صاحب سے بھی مل لوں گا۔ اور آپ کو جملہ کوائف سے مطلع رکھوں گا۔

زبیدہ نے آپ کا خط پڑھا۔ آبدیدہ ہو کر آپ کے بچوں کو

دُعائیں دیں۔ کہنے لگیں۔ سالک صاحب نے اس خط میں ہماری واپسی پر ذرا بھی اظہارِ خوشنودی نہیں کیا۔ میں نے کہا میرا خط بالکل کاروباری تھا۔ اس کا ویسا ہی جواب ضروری تھا۔ باقی حسابِ دوستاں در دل۔ بہر حال عرض نہیں کر سکتا۔ کہ لاہور واپس آنے کے خیال سے زندگی میں ابھی سے کتنی تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ جانتا ہوں۔ کہ دس سال کا عرصہ اپنی طبیعت میں اور حالات میں کئی ایسی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔ جس سے وہ پہلے کا سا نقشہ نہ جم سکے۔ با ایں ہمہ کئی مرتبہ اور کئی موقعوں پر دل کو ٹٹول کر دیکھ لیا ہے۔ اور سب نشیب و فراز دیکھنے، کئی تلخیاں چکھنے اور کئی غلطیاں کرنے کے بعد بار بار اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مے ناب و سفینہ غزل است

لاہور میں جو دوست تھے۔ وہ سب اپنے محور پر قائم ہیں۔ جگل لاہور میں نہ جانے کب تک ہے۔ امتیاز کی یکسوئی کی کئی داستانیں سُنتا ہوں۔ لیکن ایک سالک ہے جس کا حسن کلوپیٹرا کی طرح بقول شکسپیر کے مرورِ زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ میرے لئے لاہور اگر کسی شخص کا نام ہے تو وہ آپ ہیں۔ یہ سوچ کر کے ایک بار پھر آپ کی طویل صحبتیں نصیب ہوں گی۔ اور فراغت بے خلل ہو گی۔ طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا ہے۔ بہت تھک گیا ہوں۔ دس سال میں کوئی چھٹی نصیب نہ ہوئی۔ آپ ہوں گے۔ ہاشمی ہوں گے۔ بے خودی و خرمی بے خلل ہو گی۔ اور اگر خرمی بے خلل اس دنیا میں کسی کو نصیب نہیں۔ تو بہر حال اس کے قریب ترین کیفیت جو نصیب ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے لاہور ہی میں ہو گی۔ جذباتی سی باتیں ہیں۔ لیکن محض اضطراری نہیں۔ ان باتوں پر میں سفنے

بہت کچھ دماغ سوزی کی ہے۔ کوئی اور بات علم میں آئے تو مجھے مطلع رکھیئے گا۔

خاکسار

بخاری

۱۴، تغلق روڈ نئی دہلی

۱۰ جنوری

برادرِ محترم!

سلام مسنون! کل ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ اس خط کو اس کا ضمیمہ سمجھیے۔ رات میرے ہاں یارانِ طریقت کھانے پر جمع تھے۔ تاثیر اور ذوالفقار بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ آغا حمید، حفیظ، فیض، راشد، حسرت، عباس، مجید ملک سب موجود تھے۔

میں نے سب کو ایک طرح کا مصرعہ دے رکھا ہے۔

گماں اور ہی تھا مجھے بدگماں پہ

شرط یہ تھی کہ ہر ایک چند اشعار اس طرح پر ضرور لکھ کر لائے۔ چنانچہ سب نے حتیٰ کہ میں نے اور آغا حمید نے بھی طبع آزمائی کی۔ جب اس طرح شیاطین جمع ہوئے۔ غزل بھی کہی گئی۔ ہزل بھی لکھا گیا۔ اور دونوں اصناف میں خوب خوب شعر ہوئے۔ اس طرحی مشاعرے کے بعد سنجیدہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ ذوالفقار، تاثیر، حفیظ اور فیض نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ پھر خوش گپیاں ہوئیں۔ رات کے ڈھائی بجے مجمع برخاست ہوا۔ اور میں دور دور رہنے والوں کو موٹر پر گھر پہنچا کر سوا چار بجے خود گھر پہنچا۔ ممکن نہ تھا کہ یہ سب لوگ جمع ہوں اور آپ کا ذکر ایک

مرتبہ نہیں ہزار بار نہ ہوا ہو۔ جب یہ خبر سُنی کہ آپ ۲۰ جنوری کے لگ بھگ آ رہے ہیں۔ تو مُصر ہوئے کہ آپ کے آنے پر پھر ایک ایسا مجمع اور ایک ایسا مشاعرہ ہو طرح تجویز ہوئی کہ "وہ کون سی زمین ہے جہاں آسماں نہیں"۔ (قافیہ جہاں، آسماں) اور مجھ سے کہا گیا۔ کہ سالک صاحب کو مطلع کر دوں۔ کہ وہ اس طرح پر غزل بزل دونوں لکھ کر لائیں۔ اور قیام کی تاریخیں بتائیں۔ تاکہ باقاعدہ پروگرام بنایا جائے۔ آپ کے آنے تک تاثیر یہاں ہوں گے۔ ذوالفقار لاہور اور بعد ازاں بمبئی جا رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے وہ بھی اس وقت تک لوٹ آئیں۔

اس طرح پر آپ کو طبع آزمائی ضرور کرنی ہوگی۔ ورنہ سب کو مایوسی ہوگی۔ اور بزل کو نظر انداز نہ کیجئے۔ ورنہ مایوسی کے علاوہ صدمہ ہوگا۔ آپ کو فرصت ممکن ہے کم ہو۔ لیکن یہاں بھی ایک تاثیر کو چھوڑ کر باقی سب عدیم الفرصت ہیں۔ آپ ہی میں کیا سرخاب کا پَر لگا ہے۔

اور آنے اور ٹھہرنے کی تاریخیں ضرور بتائیے۔ ایک آدھ دن کا قیام ہمیں پسند نہیں۔ ایک آدھ دن کو آنا ہو۔ تو آنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیے۔ وہیں سے اپنی ٹاک کا ریکارڈ بھروا کر بھجوا دیجئے۔ ہمیں یہ از حد ناگوار گذرے گا کہ آپ آئیں بھی تو اس طرح کہ گھڑی دو گھڑی کو مل کر بیٹھنا بھی نصیب نہ ہو۔ دن بھر سب لوگ معاش کے مخمصوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ جب تک ایک دو تین شامیں میسر نہ ہوں۔ ہم تشنہ کاموں کی کیا تسلی ہوگی۔ یاد رکھیئے کہ آپ کے قیام کی آخری شام محض بیکار ہوگی۔ کیوں کہ نو بجے کے قریب گاڑی جاتی ہے۔ مکان اسٹیشن سے نو میل ہے۔ آٹھ بجے تو آپ روانہ ہو ہی جائیں گے۔ چنانچہ آخری شام کو

ہمارے حساب میں شمار نہ کیجئے۔

خاکسار

بخاری

۲۰۔جنوری

برادرِ محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ معاملہ کے متعلق روک تھام کی مساعی ابھی تک جاری ہیں۔ اور اس میں بہت کچھ دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور عزم جزم کا اظہار کیا تو ممکن ہے بلا کسی حد تک ٹل جائے۔ کیوں کہ یہاں تو مقابلہ ہٹ کا ہٹ سے ہے۔ ابھی تک کلّی فیصلہ نہیں ہوا۔ دونوں طرف سے کچھ ضد کچھ اخلاق کا اظہار ہو رہا ہے۔ خدا کرے اخلاق محض ہماری طرف سے اور ضد محض ان کی طرف سے نہ ہو۔ اس میں کچھ شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے ابھی مطلع صاف نہیں ہوا۔ اور نتیجے کے متعلق اندازہ نہیں لگایا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ کچھ تاخیر ہو رہی ہے۔ لیکن بہرحال اپنی تیاری مکمل کر رکھنی چاہیئے۔ مجھے نتیجے کے متعلق کچھ البیاحسن ظن نہیں۔ یہاں بابائے اُردو سے بھی چند در چند مشورے ہوئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ معاملہ حسب منشاء طے نہ ہوا۔ تو وہ علاوہ یہاں کام کرنے کے فوراً لاہور بھی آجائیں گے۔ اور اہلِ صحافت کو مالہٗ وما علیہ سے آگاہ کریں گے۔ اور لائحہ عمل کے متعلق مشورہ دیں گے۔ اس پلان کو تیار کر لیا گیا ہے۔

میرے بڑے ران میں عرصے سے ایک مسا نکلا ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے پون انچ کے قریب ہو گیا اور اس کی بیخ بھی کوئی پون انچ کے

برابر ہو گئی۔ مدت سے ارادہ تھا۔ کہ اِسے کٹوا ڈالوں۔ "گٹھلی"
ہونے کی وجہ سے تکلیف دینے لگا تھا۔ مصروفیتوں نے مہلت نہ
دی۔ اب رخصت لی ہے۔ تو یہ خرخشہ بھی پاک ہو گیا۔ کاٹنے کے
بعد دو تین ٹانکے لگانے پڑے۔ اس لئے نرسنگ ہوم میں چلا
گیا۔ وہاں پانچ چھ دن ڈریسنگ گاؤن میں فرصت اور یکسوئی
نصیب۔ پھر واپس آگیا۔ کوئی تشویش کی بات نہیں۔ جو مضغۂ
گوشت کٹا تھا۔ اس کا معائنہ کرا رہا ہوں۔ شبہ ہے کہ سرطان نہ ہو
ڈاکٹر اس شبہ پہ ہنستے ہیں۔ لیکن دودھ کا جلا ہوں۔ اس لئے
احتیاط کرتا ہوں۔ صحت اچھی ہے رخصت کے ایام میں برسوں
سے جو کام معرضِ تعویق پڑے ہوئے تھے۔ ان کو نبٹانے کی
کوشش کر رہا ہوں۔ اب احساس ہوتا ہے کہ اس دس گیارہ سال
میں اپنی ذاتی مفاد اور بہبود سے کس قدر غفلت برتی ہے۔ ساتھ
ساتھ مطالعے کا شوق بھی اُمنڈ کر آیا ہے۔ تاریخ اسلامیہ کے
بارے میں میرے مطالعے میں کئی رخنے ہیں۔ ان کو بھرنے کی کوشش
کر رہا ہوں۔ ادھر ہسپانیہ کی تاریخ پڑھ چکا ہوں۔ ادھر عباسیوں
کے آخر تک پہنچ چکا ہوں۔ شعر العجم کے بھی پانچوں حصے پڑھ ڈالے

فسانۂ آزاد کا خلاصہ کر رہا ہوں۔ تاکہ ایک تنہائی میں سما جائے۔ اور
اس کی لذت وہی رہے۔ دوستوں کی صحبت سے پھر روح رواں
کو سیراب کرنے کے لئے بے قرار ہوں۔ اور دن گن رہا ہوں۔

خاکسار

بخاری

۱۹۔ اکتوبر

برادرِ محترم!

سلام مسنون! میرے تقرر کی معیاد پانچ سال تھی۔ جو اپریل ۱۹۴۶ء کو ختم ہوگی۔ وائسرائے کے مشورے سے فیصلہ ہوا ہے۔ کہ مجھے مزید پانچ سال کے لئے رکھا جائے۔ اب پنجاب گورنمنٹ سے پوچھا جائے گا۔ ایک آدھ ہفتہ کے اندر یہاں سے خط روانہ ہوگا۔ ٹھیک کس تاریخ کو اور مکتوب الیہ کون ہوگا۔ یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جب معلوم ہوا تو آپ کو مزید اطلاع دوں گا۔ بہرحال ممکن ہے۔ مجھے کوئی علم نہ ہو۔ اور خط روانہ ہو جائے۔ پنجاب کے ارباب حل وعقد کا سنبھالنا اب آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ گو یقین نہیں۔ وہ معترض ہوں۔ میرے واپس آنے سے کئی اصحاب کو ترقی معکوس ملے گی۔ اس لئے افسروں میں سے کون ایسا ہوگا۔ جو مجھے دُور نہ رکھنا چاہے۔

دو ایک نقطے قابلِ غور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ میرے جیسے افسر کے معاملے میں معیاد کا مقرر کرنا محض ایک اخلاقی اور رسمی بات ہوتی ہے۔ میں کمٹریکٹ آفیسر نہیں مستقل سرکاری ملازم ہوں۔ نہ میں آئی۔سی۔ایس وغیرہ کا رکن ہوں۔ جن کا صوبوں سے مرکز اور مرکز سے منتقل ہونا خاص قواعد وضوابط سے منضبط کر دیا گیا ہے۔ میں خواہ پانچ سال صوبوں سے باہر کام کروں۔ خواہ دس سال کے لئے بہرحال اور ہر وقت پوزیشن یہی رہتی ہے کہ میرا LIEN قائم رہتا ہے۔ یعنی مرکز صوبہ اور میں خود۔ ہم تینوں میں جو جس وقت چاہے میری واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تقرر کی معیاد کا معین کرنا در اصل کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بجز اس کے کہ اس سے سب متعلقہ لوگوں کے ذہن میں ایک اندازہ

سا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب میں میرا LIEN SUSPENDED
ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے میری آسامی
پر حکومت پنجاب کو کسی اور شخص کے مستقل کرنے میں کوئی امر مانع
نہیں۔ مجھے مزید پانچ سال کا آفر حکومتِ پنجاب سے پوچھنے کے بعد
کیا جائے گا۔

آپ اس معاملے میں کس طرح جنبانی کریں گے۔ یہ آپ پر چھوڑتا
ہوں۔ وہ نہ ہو کہ آپ کی کسی سعی سے لوگ یہ اندازہ لگائیں کہ کوئی
بہت اہم بات ہے۔ جس پر کھینچا تانی کا امکان ہے۔ حالانکہ دراصل
یہ صورت نہیں۔ اگر بر سبیلِ تذکرہ یہ بات ہو جائے۔ اور کوئی اس پر
دو ہفتوں کے دوران میں نگاہ رکھے۔ تو مفید ہوگا۔

میں آج P.E.N کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے جے پور جا
رہا ہوں۔ وہاں "THE URDU WRITER OF OUR TIMES"
پر ایک پیپر پڑھ رہا ہوں۔ دو تین دن ہوئے بمبئی سے واپس آیا ہوں
وہاں امتیاز حجاب سے ملاقات ہوئی تھی۔ امتیاز کو سوائے فلم کے اور
کسی چیز کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ نہیں رہا۔ اس سے کچھ رنج ہوا۔
وہاں یہ خیال آیا کہ آپ کو کبھی محض سیر و آرام کی غرض سے بمبئی جانا
چاہیئے۔ وہاں آج کل ذوالفقار ہیں۔ آپ کا قیام یقیناً ان کے
پاس ہوگا۔ مرنے سے پہلے ایک دفعہ سمندر تو دیکھ لینا چاہیئے۔ گو آپ
ابھی دو سو سال زندہ رہیں گے۔ تاہم۔

خاکسار

بخاری

۴۔ جولائی

برادرِ محترم!

سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا میں بمبئی میں تھا۔ آپ کا خط دہلی میں
میرا انتظار کرتا رہا۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

انتخاب افکار و حوادث کے باب میں مجرم و نادم ہوں۔ کچھ کسالت، کچھ مصروفیت اور پریشانی علاوہ بریں میں نے یہ کام توقع سے زیادہ محنت طلب اور وقت طلب پایا۔ آپ کی برہمی اور بے قراری حق بجانب۔ ۲۵ جولائی کی صبح کو لاہور آ رہا ہوں۔ تین چار دن ٹھہروں گا۔ تمام فائل بعد از تکمیل کار ساتھ لیتا آؤں گا۔ یہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا۔ تو آپ مجھے حلقۂ دوستاں بگوشاں سے خارج تو کیا کریں گے۔ کچھ اور ڈانٹ لیں گے۔ وہ میرے سر آنکھوں پر۔ کام تو یہ مجھے ہی کرنا ہے۔ اور ضرور کروں گا۔ لیکن مذاق برطرف اس مہینے میں یہ کام ضرور ختم ہو جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دو بکریاں جو آپ نے پال رکھی ہیں۔ ان کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ میں انشاء اللہ ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔

ا۔ب صاحب اپنے بارے میں بغیر شعوری طور پر مبالغہ کرتے ہیں۔ جب عہدہ ہی عارضی ہے۔ تو جو اس عہدے پر مقرر ہے۔ وہ کیوں کر مستقل ہو سکتا ہے۔ اور عہدہ عارضی یوں ہے کہ ابھی اس کام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہ کام رہنے نہ رہے۔ ادب ہی قسم کے اہل علم کی ضرورت ہو۔ یا کسی اور قسم کی آدمی کے ذمے یہ کام سپرد کیا جائے۔ یہ تمام معاملے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اور اس فیصلے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس دوران میں ا۔ب صاحب کا کام اکثر کمزور پایا گیا۔ اس میں کسی کی شرارت مضمر نہیں۔ کیونکہ ان کوتاہیوں کا علم براہِ راست مجھ کو ہے۔ تاہم ان کو ہم گھسیٹے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ استدلال ان کا عجیب و غریب ہے۔ کہ چونکہ مجھے برخواست نہیں کیا۔ اس لئے میں مستقل ہونے کا حقدار ہوں۔ اگر چھڑی دی ہے۔ تو دودھ بھی دینی چاہئیں! وہ خواہ مخواہ اپنا طلبی کرتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو سیکھتے ہی نہیں۔ سفارش اور دستگیری کے علاوہ

ہو چکے ہیں۔ دوسروں کو ظالم اور بے انصاف اور اپنے آپ کو مظلوم اور ہمدردی کا مستحق سمجھتے رہتے ہیں۔ لہذا اکثر ان کی بصیرت کام نہیں دیتی۔ کبھی خدا کا شکر نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر شاکی ہی رہتے ہیں۔ ایسے شخص کا مطمئن کرنا یا ان میں ہمت پیدا کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ایسا شخص ہر وقت مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اور جب تک زندگی ان کے لئے وقف نہ کی جائے۔ وہ خوش نہیں ہوتا۔

باقی عندالملاقات۔ کیا آپ کو دہلی بلایا جائے ؟ ہے موقع ؟

خاکسار

بخاری

برادرِ محترم !

سلام مسنون !

استاذی۔ پہلے غزل کا قصہ طے کرلیں۔

۱۔ ابھی قائم ہے محفل عاشقانِ محفل آرا کی
کہ ان کی خانماں بربادیاں رونق ہیں صحرا کی

آپ محفل آرا کو دشت پیما کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عاشق جو محفلوں کی زینت تھے۔ اب برباد ہو چکے۔ لیکن محفل آرائی ان کی فطرت میں ہے۔ اس لئے باوجود خانماں برباد کے وہ محفل آرا ہیں۔ اور وہ یوں کہ برباد ہوئے تو صحرا کی رونق بن بیٹھے۔ دشت پیما سے معنی بدل جائیں گے۔ لیکن آپ کو اس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی تو یقیناً معنی اُلجھے ہوئے ہوں گے۔ المعنی فی بطن الشاعر سے بہتر ہے کہ معنی صاف ہو جائیں۔ لہذا دشت پیما منظور گو اس سے شعر کا مطلب وہ نہ رہے گا۔

۲۔ ---- ---- ---- چشم گل کی تمنا کی

آپ فرماتے ہیں یہ شعر وضاحت طلب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اصلاح طلب نہیں۔ لہذا منظور۔

۳۔ کھلے موتیا ------- منظور

۴۔ درِ مے خانہ وا ہے چشم ساقی میں ہے بے باکی

میں نے کہا تھا۔ درِ مے خانہ وا ہے آنکھ میں ساقی کی بیباکی۔

آپ فرماتے ہیں۔ ایک ہے کی کمی ہے۔ آپ کی اصلاح مجھے منظور ہے۔ گو میں اس بات کا ابھی قائل نہیں ہوا۔ کہ ایک 'ہے' کی کمی ہے۔ کئی فقرے یا محاورہ ایسے ذہن میں آتے ہیں۔ جہاں بالکل یہی شکل ہوتی ہے۔ اور صرف ایک ہی استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال اصلاح منظور۔

مختصر یہ کہ کلی اتفاق اور بہتر بھی یہی ہے۔ وہ نہ ہو غزل ہی سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ آپ کی اصلاح سے متفق نہ ہوں۔ جب بھی اتنا ضروری ہے کہ آپ کے اعتراض سے ایسا قوی شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اتفاق کے بغیر چارہ نہیں رہتا لہٰذا اس کو حسنِ اتفاق کہتے ہیں)۔ بہر حال دماغ سوزی کا بہت شکریہ!

۳۰ جون سے (تاریخ یاد رہے) میں نمبر ۹ اشوکا روڈ نئی دہلی جا رہا ہوں۔ انگریزی میں اس کو 9, ASOKA ROAD لکھتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اور امتیاز چند دن کے لئے آجائیں۔ برسات جوبن پر ہے۔

او بھائی نماز بخشوانے گئے تھے ------- الخ من موہن کا معاملہ طے ہوتے ہوتے میرا معاملہ ایسا غائب ہوا کہ خبر شش بازنیامد۔ یہ تو کہئے کہ کیا مہر صاحب اور میاں صاحب کی گفتگو میرے مسئلے کے متعلق بھی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو کیا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پہ تو

برسوں سے آپ نے کچھ لکھا نہ مہر نے۔

خاکسار

بخاری

---

۲۰ پرتھوی راج روڈ نئی دہلی۔

۲۰ر اکتوبر

برادرِ محترم!

سلام مسنون! گورنمنٹ کو اس سال کے بجٹ میں کچھ خسارہ نظر آتا ہے۔ اس لئے خالی آسامیوں کی بھرتی یک قلم رُک گئی ہے۔ اور معلوم نہیں کب تک رُکی رہے گی۔ اس لئے ہر کام میں تاخیر لابدہے۔ یہ جواب ہے آپ کے اس خط کا جو عرصہ ہوا آپ نے لکھا تھا اور جس کے جواب سے آپ مایوس ہو گئے ہوں گے۔

پچھلے دنوں ابوالکلام سے ہم کلامی کا فخر حاصل ہوا۔ بڑی صحبتیں گرم ہوئیں۔ آپ کا ذکر اور ذکر خیر بار بار آیا۔ اور مولانا ممتاز علی مرحوم کا ذکر بھی آیا۔ اور امتیاز کا ذکر بھی آیا۔ اور حمید علی صاحب کا ذکر بھی آیا (جو سٹائل یہ تتبع خواجہ حسن نظامی ہے) ایشیائی علم و ادب و تاریخ پر زوروں کی بحثیں ہوئیں۔ شعر خوانیاں ہوئیں۔ بذلہ سنجی ہوئی۔ علامہ اقبال کی یاد تازہ ہوگئی۔ کیونکہ بجز اقبال اور ابوالکلام کے اور کوئی شخص ایسا نہ ملا۔ جو عالم اسلام اور اس کی نیرنگیوں اور رنگ آفرینیوں کا آئینہ دار ہو۔ یہ نسل ہی اب مٹتی جاتی ہے۔

اس خط کو دیکھتے ہی رائے بہادر من موہن صاحب سے ملئے۔ اور ان سے پوچھیے کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں اگر ہو تو اس کا مداوا کیجئے۔ تفصیلات انہیں سے معلوم ہوں گی۔ ضرورت ہو تو حمید علی

صاحب کو بھی شامل کر لیجیے۔

اب کے کرسمس میں پھر ایک چکر رہے۔ بشیر ہاشمی غالباً والدہ پرستی کے سلسلے میں دہلی آئیں گے۔ ممکن ہے امتیاز بھی بحیثیت ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے آ جائیں۔ آپ ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے دوست کی حیثیت سے آ جایئے۔

زبیدہ سلام کہتی ہے۔

خاکسار

بخاری

بھئی انقلاب بھیج کر فی الواقع بہت احسان کرتے ہو۔ جس دن انقلاب نہ پہنچے۔ دن خالی معلوم ہوتا ہے۔ کل یہ عنوان نظر آیا۔

لاہور میں گداگروں کی اکثریت۔

یہ اکثریت کی بھی ایک ہی کہی۔ مگر اس کے لیے سند موجود ہے۔ "اقلیت مال و اکثریت عیال" مشہور فقرہ ہے۔

ابوالکلام نے شاد عظیم آبادی کا ایک شعر سنایا تھا۔ آپ بھی سنیں۔ بیحد خوب ہے۔

لبوں پہ دم ہے تڑپتے ہیں دردمند تیرے
وہ اعد کوئی نہیں عاشقانِ چند تیرے

بخاری

۲۳۔ دسمبر

برادرِ محترم!

سلام مسنون! یاد آوری کا شکریہ ما خط کے مفہوم سے آگاہ

ہوا۔ اور اس کو ذہن میں محفوظ کیا۔ کام کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے اکثر فروعی فرائض ماتحتوں کے سپرد کر رکھے ہیں۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ ان میں حتی الوسع دخل نہیں دیتا۔ تا آنکہ کوئی اہم نکتہ اس میں پوشیدہ نہ ہو۔ آپ نے جس امر کا ذکر کیا۔ وہ بھی اپنی فروعات میں شامل ہے۔ تاہم اس سے غافل نہ رہوں گا۔ اگر فیصلہ حسب الخواہ نہ ہوا۔ تو مجھے دوبارہ تاکید کرتے ہیں تامل نہ کیجئے گا۔ کہ میرا منصب ہی موکد ہوتا ہے۔

ہمشیرہ کے رشتے کے متعلق کچھ آپ نے سلسلہ جنبانی کی تھی پھر معلوم نہ ہوا کہ بات کہاں تک پہنچی۔ یا کہاں رُک گئی۔

ایک خط ایڈیٹر انقلاب کے نام ملفوف ہے۔ انہیں پہنچا دیجئے گا۔ تاکہ ان کو افکار و حوادث کے لئے مصالحہ مل جائے۔ یا کم از کم ان کی اپنی ضیافت کا باعث ہو۔

میں کل صبح ہفتے بھر کے لئے لکھنؤ جا رہا ہوں۔ نہ معلوم اس میں کتنے دن ریل میں گذریں گے۔ لیکن سُنتا ہوں کہ ریلیں اب چلنے لگی ہیں اور چلتی ہی کا نام گاڑی ہے۔ احباب کو میرا سلام پہنچے۔ اور بالخصوص مہر صاحب، امتیاز صاحب اور حمید علی صاحب کو۔ زبیدہ آپ کو اور بھابی کو سلام کہتی ہے۔

یہاں میرے پہلے جنم کے اہلِ قلم اور احباب تو بہت جمع ہیں۔ لیکن دہلی شہر نہیں صحرا ہے۔ فاصلے بہت ہیں۔ کچھ جسمانی۔ کچھ رُوحانی پٹرول بھی کم ہے۔ دل بھی خشک۔ دہلی کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ ہر شخص دفتری کشمکش اور ہوس رانی میں مبتلا۔ اُردو مجلس کے احیا کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھیئے۔

بخاری

ہوٹل ماریاکرسٹینا میکسیکو

۲۱ ۔ جنوری

برادرم !

سلام مسنون ! نوازش نامہ ملا۔ آپ کے سوا کسی اور دوست کا خط اب تک نہیں آیا ۔ صوفی ہاشمی ، فیض ، تاثیر سب نے گویا مجھے دریا برد کر دیا ۔ زبیدہ اور ہارون کے خط مسلسل آتے رہتے ہیں ۔ ان سے بالواسطہ کچھ احباب کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے ۔ اور گھر کے حالات سے تو باقاعدہ مطلع رہتا ہوں ۔ ورنہ بالکل ہی رابن سن کروسو بن جاتا ۔ سیاسی حالات سے باخبر نہیں ۔ ریاض احمد کو کراچی سے خط آتے ہیں ۔ ان سے دو چار اُڑتی اُڑتی باتیں معلوم ہوئیں ۔ ادبی دُنیا کی کوئی خبر نہیں ۔ نہ معلوم کون سے رسالے بند ہو گئے ۔ کون سے کھل گئے ۔ کن پر کھل بندن کی کیفیت طاری ہے ۔ کس کس شاعر نے غالب کے گور پر لات ماری ۔ آپ نے انقلاب کا ایک ورق بھیج کر میرے کم از کم چوبیس گھنٹے رنگین کر دیئے ۔ سلور جوبلی پر آپ کو بہت بہت مبارک ہو ۔ لاہور میں ہوتا تو دوستوں کے اجتماع کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ جاتا اور سب شاعر دوستوں سے بزل لکھواتا ۔ اور شب دیگ پکتی ، خیر ، گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم ۔ انقلاب کے مدوجزر کا حال پڑھ کر میں کچھ مغموم ہو گیا ۔ عمر بھر کی بذلہ سنجی ، بذلہ گوئی اور چہکتی ہوئی صحافت کے بعد آپ کو یہ سخت مرحلے پیش نہ آنے چاہئیں تھے ۔ لیکن آپ نے اخبار کا نام ہی معلوم ہوتا ہے ۔ لسان الغیب کے کہنے پر رکھا ہے ۔ بہر حال آپ طبعاً قلندر ہیں ۔ قلندری کو کام میں لائیے ۔

کانفرنس کہنے کو تو انجینئر بازی تھی ۔ لیکن آنے کے ساتھ ہی

معلوم ہو گیا۔ کہ ریڈیو بھی سیاسی کھینچ تان کا اکھاڑہ ہے۔ چھوٹی لہریں بجز دو دھار اسلحے کے اور کچھ نہیں۔ دو مہینے تک کانفرنس کا تکیہ کلام یہ تھا کہ اصول وضع ہونے چاہئیں۔ چھوٹی لہروں کی تعداد کل (۱۸۰) ہے۔ دن رات کے گھنٹے چوبیس ہیں۔ دونوں کو ضرب دیجئے۔ تو تقریباً ساڑھے چار ہزار "لہر گھنٹے" بنتے ہیں۔ سب ملکوں سے ان کی "ضروریات" دریافت کی گئیں۔ تو ضروریات کا میزان بہتر ہزار تک جا پہنچا۔ ہر ایک نے حرص سے کام لیا اور بعض سینکڑوں بلکہ ہزاروں سے بھی اُوپر "لہر گھنٹے" پہلے سے دبائے بیٹھے ہیں۔ ایک انار صد بیمار۔ تقسیم کیوں کر ہو۔ رات دن لوگ اصول اصول پکارتے ہیں۔ اور اس بارے میں ہر ملک "غلام محی الدین" بنتا پھرا۔ اور ڈھائی مہینے کی جھک جھک کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اصولوں کی کمی نہیں۔ بلکہ بھرمار ہے۔ ہر ملک اپنے مطلب کے اصول وضع کر لیتا ہے فیصلہ ہوا کہ ہمہ گیر اصول جن پر سب کا یا اکثریت کا اتفاق ہو۔ وضع نہیں ہو سکتے۔ روس اور اس کے بعد امریکہ (ریاست ہائے متحدہ) دو بنے بنائے ہزار ہزار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار صفحے کے PLAN تر شے ترشائے لے آئے۔ روس نے اپنے PLAN میں اپنے حواریوں کو مٹھیاں بھر بھر کر لہر گھنٹے دیئے۔ امریکہ نے لاطینی امریکنوں (یعنی جنوبی امریکہ کی ریاستوں) کو بڑی بڑی رعائتیں دیں۔ غرضیکہ ہر ایک نے اپنا سیاسی اُلو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ جس مرحلے پر کانفرنس اس وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں سودے ہوں گے۔ غریب پاکستان کس برتے پر کسی سے سودا کرے۔ سوچا کہ ہمارے پاس بجز شخصیت کے اس میدان میں کچھ نہیں۔ خدا کا نام لے کر شروع ہی سے اسے چمکانے کی کوشش کی۔ لیکن اس طرح کہ اسے بالکل ہتھیلی پر ہی نہ لئے پھریں۔ جب یہاں آئے تو کوئی ہمیں

جانتا نہ تھا۔ بلکہ اکثر لوگ تو پاکستان سے بھی بے خبر تھے۔ خدا کی
مہربانی سے پہلے ہی ہفتے کے اندر دو تین زوردار تقریروں کا
موقع مل گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے ہسپانوی بھی سیکھنی شروع کر
دی۔ کچھ بحث بازی میں کرتب دکھائے۔ موقع پاکر محض تقریر کے
زور سے ایک دن انگریزوں کو وہ شکست دی۔ کہ انہیں ۷۰ میں
۵ سے زیادہ ووٹ حاصل نہ ہوئے۔ چنانچہ لوگوں کو خیال ہوا۔ کہ
بحث وتمحیص میں پاکستان دوستی مفید ہے۔ بہرحال اس کی دشمنی
مضر ہو سکتی ہے۔ گاہے گاہے لطیفہ بازی سے بھی کام لیا۔ ایک
مزاحیہ نظم انگریزی میں کانفرنس کے بارے میں لکھی۔ جو پارٹیوں کے
رستے سے کانفرنس کے روزانہ سرکاری اخبار میں چھپ گئی۔ اور
لوگوں نے پاکستانیوں سے موقع بے موقع مسکرا مسکرا کر مصافحے کرنا
شروع کیے۔ ہندوستان والوں نے اپنا وفد محض انجنیئروں سے
مرتب کیا ہے۔ وہ لوگ انجنیئر تو اچھے ہیں۔ باقی صورت نہ شکل ـــ آخ
انگریزی مدراسی لہجے میں بولتے ہیں۔ جس پر ترجمان تھوکتے ہیں اور
خون بھی تھوکتے ہیں۔ اب میں ہسپانوی بلا تکلف بول لیتا ہوں۔
اور اخبار وغیرہ پڑھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ارادہ ہے کہ
رخصتی تقریر ہسپانوی میں کروں گا۔ میری اس لسان دوستی پر جنوبی
امریکہ اور میکسیکو کے لوگ بہت خوش ہیں۔ غرضیکہ سب ہتھکنڈے
استعمال کر رہا ہوں۔ باہر آکر انسان پہلے سے بھی زیادہ پاکستانی
ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت ہماری ہے۔ اب خدا کرے کہ آخری
مرحلوں میں بھی کامیابی نصیب ہو۔ اور دو تین مہینے کی محنت
کہیں ٹھکانے لگے۔ کانفرنس کا کام توقع سے بہت زیادہ نکلا۔
اجلاس صبح دس بجے سے شام کے سات بجے تک اور بعض اوقات

رات کے دس بجے تک رہتے ہیں۔ ایک دن تو صبح کے دو بج گئے۔ سوائے سنیچر کے آدھے دن اور اتوار کے کوئی تعطیل نہیں ہوتی۔ اور یہ اوقات اور اکثر کی ساعتیں سازشوں اور مشوروں میں صرف ہو جاتی ہیں۔ کانفرنس کی دستاویزات کا بھی باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ان کی تعداد اس وقت تک چھ سات ہزار صفحوں تک پہنچ چکی ہے۔ انجنیئر بازی کے مسئلے بھی سمجھنے پڑتے ہیں۔ ریڈیو کی تعلیم جو دس سال میں حاصل کی ہے۔ وہ ایسے وقت میں کام آتی ہے۔ تاہم بعض باتیں بچوں کی طرح بیٹھ کر سمجھنی پڑتی ہیں۔ آپ خوش ہوں گے۔ کہ میں کئی مرتبہ اتفاق رائے صدر منتخب ہو چکا ہوں۔ اور بلند طبقوں کے مشوروں میں مجھے بلایا جاتا ہے۔

میکسیکو مجھے بے حد پسند آیا۔ پہاڑی ملک ہے آب و ہوا بھی خوشگوار ہے۔ لوگ رنگین طبع، با اخلاق، رنگین پوشش ہیں۔ پابندی اوقات کو رذیلوں کا شیوہ نہیں سمجھتے۔ موسیقی، ناچ اور سواری کے بیحد شوقین ہیں۔ (کانفرنس کا افتتاح آرکسٹرا سے ہوا) گفتگو میں آپ، جناب، حضور وغیرہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ رذیل سے رذیل آدمی آپ کا شکریہ شاعرانہ ادا نہ کرے۔ اور آپ شکریہ ادا کریں تو انکسار کے دو تین فقرے جواب میں نہ کہے۔ یہاں اکثریت اصلی باشندوں کی ہے۔ ان سے کم دوغلے لوگ ہیں۔ دراصل خالص ہسپانوی نژاد لوگ اقلیت میں ہیں۔ پچاس سال سے یہاں ایک نئی نیشنلزم ابھرتی آ رہی ہے۔ جو اپنے آپ کو صرف میکسیکو سے وابستہ کرتی ہے۔ اور ہسپانیہ کو بہت سرعت سے بھلا رہی ہے۔ چنانچہ ہسپانوی اقتدار کی دو تین صدیاں جو میکسیکو پر گزری تھیں۔ انہیں تاریخ سے محو کیا جا رہا ہے اور موجودہ دَور کا

سلسلہ قبل از ہسپانیہ دور سے ملایا جا رہا ہے۔ جب یہاں کے اصلی باشندے برسرِ اقتدار تھے اور ان کی ایک عظیم الشان سلطنت اور تہذیب تھی۔ اور ہسپانوی لیڈروں نے اگر ان کو تہس نہس کر دیا تھا۔ میکسیکو شہر کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔ اور ہمارے نقطہ نظر سے بالکل جدید شہر ہے۔ گو اہلِ یورپ کو اس میں کئی غریب باتیں نظر آتی ہیں۔ پچھلا انقلاب یہاں تیس سال تک رہا جس میں میکسیکو کے ذکور آدھے سے زیادہ مارے گئے۔ اب یہاں REPUBLIC ہے۔ (بطرز امریکہ) تعلیم کا بہت شوق ہے اور امریکہ نے ناخواندگی کو ترقی دینے میں جتنا کام کیا ہے۔ اس کی مثالیں دُنیا میں کہیں نہیں ملتیں۔ وزیر تعلیم پاکستان نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ اس پر ایک رپورٹ لکھنا۔ میں نے بہت کچھ مصالحہ اس پر جمع کیا اور اسے اس قدر خیال انگیز پایا کہ دل میں ایک کتاب (خواہ انگریزی خواہ اُردو خواہ دونوں زبانوں میں) پاکستان کی خاطر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن افسوس کہ کانفرنس کی وجہ سے فرصت بہت کم ملی۔ وزیر تعلیم اور اس کے افسروں سے تبادلہ خیالات کے لئے کئی مرتبہ وقت مقرر کیا۔ مگر وعدہ ایفا نہ کر سکا۔

اور کیا لکھوں میں کئی دلچسپ خط لکھتا۔ اگر دوستوں کے خط اس کے محرک ہوتے۔ بس تحریک ہی کا انتظار طبیعت کو رہا۔ وہ نصیب نہ ہوئی تو سہل انگاری غالب آئی۔ فرصت بھی بہت کم ملتی ہے۔ تاہم آپ لوگ اُکساتے تو لکھنے کو یہاں اخباروں کے انبار لکھ ڈالتا۔

دوستوں کو میرا سلام دیجئے گا۔

خاکسار

بخاری

ہوٹل مرینا کرسٹینا میکسیکو
یکم اپریل

برادرم !

سلام مسنون ! آپ کا تیسرا خط ملا۔ یعنی جس خط کے متعلق آپ کو شبہ تھا۔ وہ بھی مل گیا تھا۔ جواب لکھنے کا مجرم ہوں۔ فرصت ہی نہ ملی نیز فرصت کے جو چند لمحے ملتے ہیں۔ اس میں اتنے خط لکھنے پڑتے ہیں کہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ذوالفقار، زبیدہ، سرکارِ پاکستان، فیض، تاثیر سب کو خط لکھے۔ کسی کو صرف ایک اور کسی کو مثلاً سرکارِ پاکستان کو ہر ہفتے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ یہاں رُت بدل گئی ہے اور اپریل میں بھی وہ حال ہے جو ہمارے ہاں مارچ اور اوائل میں ہوتا ہے۔ آنکھیں دھوپ سے گریز کرنے لگی ہیں۔ اور کوٹ پہننے کو دل نہیں چاہتا۔ کانفرنس آخری مرحلے پر ہے۔ لوگ تھک کر چور ہو گئے ہیں اس لئے مباحثے میں یا تو چڑچڑا پن دکھاتے ہیں۔ یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ لیکن جو قومیں اشیلی ہیں۔ وہ اب بھی ختم نہیں تنے دتیں اور آنکھ تک نہیں جھپکتی۔ ہمارا کام خدا کے فضل سے بہت ہی ٹھیک رہا ہے۔ دو تین دن ہوئے یہ طے پایا۔ کہ یہاں کی کانفرنس تو عنقریب ختم کر دی جائے گی۔ کیونکہ اصول وغیرہ طے ہو چکے ہیں۔ باقی اصل پلان سازی کا کام جو تفصیلی کام ہے اور جس میں کم از کم چھ مہینے اور لگیں گے۔ ایک مختصر سی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ جو ۱۵ جولائی کو پیرس میں جمع ہو۔ جب پانچ چھ مہینے میں وہ اپنا کام ختم کر لے۔ تو کانفرنس پھر جمع ہو۔ لیکن چند دن کے لئے۔ اور پلان کمیٹی کے کام پر نظر ڈال کر معاہدے پر دستخط کر دیئے جائیں۔ اس پلان کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے ہر ملک نے ہاتھ پاؤں مارے۔ جیسے بندیاں ہوتیں۔ سودے ہوتے۔ رُعب گانٹھے گئے۔ تقریریں ہوئیں۔ آنکھیں

دکھائی گئیں۔ چوماچاٹی ہوئی۔ غرضیکہ سیاست کے سب حربے استعمال ہوئے۔ خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ جب ستر ملکوں میں سے صرف پندرہ ملکوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں پاکستان کو شامل پایا۔ یہ فیصلہ ایک دن صبح کے ڈھائی بجے کئی گھنٹوں کی گرماگرم بحث اور تقریر بازی کے بعد ہوا۔ جب ڈھائی بجے میں گھر واپس آیا تو عجیب اطمینان اور مسرت کی کیفیت تھی۔ بازار خاموش اور ویران تھے۔ اور اپنے قدموں کی آہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جب ۲۲۔ اکتوبر کو ہم یہاں پہنچے۔ تو کوئی ہمیں جانتا نہ تھا۔ پاکستان کے نام سے بھی لوگ ناواقف تھے۔ ستر قوموں میں سے سب سے نئی قوم۔ ستر قوموں میں سے سب سے ناتجربہ کار ملک۔ نہ ٹرانسمیٹر پاس ہے۔ نہ کہنہ سال انجینئر۔ ریڈیو کی صنعت میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لیکن پانچ ہفتے کے عرصے میں پاکستان کو خدا نے یہ عزت دی کہ ہر اہم کمیٹی اور اہم مشورے میں اس کی حیثیت صدر یا نائب صدر کی ضرور رہی۔ اور اب جب کہ کانفرنس نے دنیا بھر کی ایک مختصر کمیٹی بنائی ہے۔ تو اس میں بھی پاکستان اس خوبی سے دھرا ہے کہ کسی کو اس کے حقِ شمولیت پر شبہ کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔ وزارتِ تعلیم پاکستان کا ارشاد ہے۔ کہ کانفرنس کے بعد کچھ عرصہ ٹھہر جاؤں۔ اور میکسیکو کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرکے اس پر ایک رپورٹ لکھوں۔ یہاں کے عوام بھی ہماری طرح نادار اور ان پڑھ تھے۔ میکسیکو کی انقلابی جماعت نے برسرِ اقتدار آتے ہی۔ تعلیم کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا۔ تمام دنیا انگشت بدنداں ہوئی۔ اس میں سالوں کی تاخیر نہیں۔ ہفتوں کی، وہ بھی ابھی پوری طرح طے نہیں ہوا۔ دیکھئے پہلے لوگ پاکستان کو ہندوستان کا شاگرد اور برخوردار سمجھتے تھے۔ اور جب بھی انتخاب کی نوبت آتی لوگ سمجھتے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں

میں سے صرف ایک کا ہونا کافی ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ہندوستان کا چھوٹا بھائی نہیں۔ تمام مسلم ممالک کا بڑا بھائی ہے۔ پھر اس کے بعد یہاں تک نوبت آئی کہ لوگ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کا ہونا ازحد ضروری سمجھنے لگے۔ اب آئندہ خدا کے فضل سے کم از کم ریڈیو کے بین الاقوامی میدان میں پاکستان کو کرسی ہمیشہ صفِ اوّل میں ملا کرے گی۔ ہم پاکستانیوں نے اس پہ ایک جشنِ صغیر کیا۔ اور سب آبدیدہ ہو گئے۔

خاکسار

بخاری

یکم جولائی ۱۹۵۱ء

برادرِ محترم!

سلام مسنون! آپ کے خط سے دُہری ندامت ہوئی۔ جب آپ کا خیال آتا ہے۔ تو شرم کے مارے لمحہ بھر کو ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے تھے۔ لیکن بیقین مانئے۔ کہ اپنی خاموشی کی سزا بھی سب سے زیادہ مجھ کو ہی ملتی رہی۔ احباب بعید تر ہوتے گئے۔ اور میری تنہائی بڑھتی گئی۔ مہینوں کی غفلت کے بعد کسی کو خط لکھا بھی۔ تو جواب نہ آیا۔ کیونکہ وہاں توجہ کا چشمہ اس عرصے میں خشک ہو چکا تھا۔ مجھے ندامت اور توبہ کا صلہ بھی نہ ملا۔ لیکن سالک کی وفا شعاری ہمیشہ استحقاق سے تجاوز کر جاتی ہے۔ خدا آپ کو زندہ سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ آئین دوستی آپ ہی کے دم سے زندہ ہے۔ ورنہ دائیں بائیں الفتیں مر رہی ہیں۔ جو مر نہیں چکیں۔ وہ زندہ در گور ہیں۔

جولائی سنہ ۴۸ء میں یہاں پہنچا۔ تو ذیابیطس کا شکر اپنے ساتھ لایا۔

کئی ہفتہ روزانہ پیشاب کا مطالعہ کرتا رہا۔ اور زندگی کے باقی اوراق سب تہ کرکے رکھ دیئے۔ کہ شفائے شافی ہوے۔ تو زندگی کا دھارا پھر ٹھیک سے بہنے لگے گا۔ لیکن جب تک اس میں شکر شامل ہے۔ باقی شیرینیاں حرام ہیں۔ ٹیکے کی پچکاریاں اور قطرہ پیمانیاں دن رات اسی نوع کے شیشہ آلات کی نظر ہو گئے۔ اس عرصے میں مکان کی تلاش رہی۔ یکے بعد دیگرے دو اپارٹمنٹ بدلے۔ دونوں عارضی تھے۔ لیکن یقین ہو گیا۔ کہ اپارٹمنٹ میں رہنا ہم تنہا پسندوں کے لئے ناممکن ہو گا۔ ایک پہاڑسی عمارت اس میں درجنوں ڈربے کوئی چھوٹے کوئی بڑے، پھر ہمسایہ مقفل اور پر اسرار، آٹومیٹک لفٹ میں پندرھویں منزل پر رہتا تھا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ اگر "۱۵" کا بٹن دبانے کے بعد رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے۔ تو یہ لفٹ کا منقش کمبخت بے حس وبلا تامل پندرھویں منزل تک چڑھتا چلا جائے گا۔ اور وہاں پہنچ کر اس کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اسے اتنی بھی تمیز نہ ہوگی کہ جس نے یہ بٹن دبایا تھا۔ وہ اب محض ایک لاش ہے۔ اور دروازہ کھلنے پر بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ تو عجیب وحشت ہوتی تھی۔ انسان کو ہر وقت یہ توقع رہتی ہے۔ کہ اس کے مرجانے پر کچھ غلغلہ ہوگا۔ کوئی تھامے گا۔ کوئی اُٹھائے گا۔ کوئی روئے گا، کوئی چلائے گا۔ جب یہ توقعات یک لخت مفقود ہو جائیں۔ تو ہم ایشیائی لوگوں کو چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں آکے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی زندگی جماعت کی کتنی عادی ہے۔ اس عرصے میں ملازم بھی کوئی نہ تھا۔ کھانا ہمیشہ باہر کھاتا تھا۔ بجز صبح کے ناشتے کے۔ چنانچہ انڈے پکانے میں مہارت حاصل کرلی لیکن وہ جو بازار سے دوسرے تیسرے دن سودا سلف کے بنڈل اُٹھا کر گھر لانے پڑتے تھے۔ اس میں کبھی مہارت حاصل نہ ہوئی۔ ہمیشہ

اپنے آپ پہ ترس آتا تھا۔ کہ اللہ اللہ جن کے طریلے بیچ گئی دن کی بات ہے ـــــ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ زندگی اختجاج اور افسردگی کا مجموعہ تھی۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں مکان کرائے پر لے لیا۔ ایک حبشن کو ملازم رکھ لیا۔ لیکن ساتھ ہی جنرل اسمبلی کا زمانہ آگیا۔ ڈیلیگیشن کا قافلہ پاکستان سے آن پہنچا۔ رات تو شہر میں گذرتی تھی۔ لیکن صبح نو بجے سے شام کے سات آٹھ بجے لیک سکیس میں رہتے تھے۔ جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ دن کم ڈیپش فجر کے وقت شروع ہوتا تھا۔ کیونکہ ظفر اللہ خاں صاحب جو یہاں سے اور بھی تیس میل دور رہتے تھے۔ باوجود اس فاصلے کے صبح فریبے سب سے پہلے آن پہنچتے تھے۔ ہم شب زندہ دار ٹھہرے۔ کچھ نہ پوچھئے۔ کہ دنیا وعاقبت دونوں میں سرخروئی حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ حال تھا کہ رات ہی زمزم پیے اور صبحدم دھوئے دھلے جامۂ احرام کے۔ اسمبلی ختم ہوئی۔ تو کشمیر کا شعلہ پھر بھڑکنے لگا۔ اسمبلی کے ڈیلیگیٹ اسمبلی ختم کرنے کے بعد موٹروں اور فریجیریٹروں کا سودا چکانے کے بعد پاکستان لوٹے تو محمد علی اور ان کا قافلہ آن پہنچا۔ وہ گئے۔ تو ڈاکٹر گراہم کا قضیہ لٹکتا ہوا چھوڑ گئے۔ خدا خدا کرکے پچھلے ہفتہ گراہم یہاں سے روانہ ہوئے۔ تو پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن یہ بھی کب تک رات دن چکر میں ہیں ساعت آسمان۔

رفتہ رفتہ نئی زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا تو دفتر کو اپنے معیار کے مطابق مُردہ پایا۔ اس سے متقدمین کی گستاخی یا مذمت مقصود نہیں۔ ہر طبیعت کا تقاضا الگ ہوتا ہے۔ میری طبیعت ایسی ہے۔ کہ بے حسی سے کام کر ہی نہیں سکتا۔ ہلکا ہلکا سا بخار چڑھا ہے۔ تو سمجھتا ہوں۔ کہ حرارت غریزی سے محروم

ہوں ۔ اور جمود طاری ہے۔ یہاں حالت یہ تھی کہ یو۔این کا فیصلہ کراچی پہنچا دیا۔ کراچی کے کہنے پر ووٹ دے دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ یہ مشن محض ایک ڈاکخانہ بن کر رہ گیا ہے۔ "کارِ دارِ خاص" بجز ہرکارے کے کچھ نہ تھا۔ کام پھیلایا تو خود اس کا بوجھ میرے کندھوں پر کھڑا تھا اپنی دقت پسندی کی شکایت کس سے کروں۔ یہاں کا کام وقت بہت زیادہ مانگتا ہے۔ ساٹھ ملکوں کے ساٹھ وفد۔ ہر ایک کا ووٹ کسی نہ کسی موقع پر اہم بن جاتا ہے۔ سفارتی گفت وشنید عجیب سست رفتار ہوتی ہے۔ ساٹھ وفدوں میں سے ہر ایک کو سلام کیجئے۔ مناسب وقفے کے بعد خیریت دریافت کیجئے۔ بیوی بچوں کا حال پوچھیئے۔ کھانے کی دعوت دیجئے۔ موسم کا ذکر بالتفصیل کیجئے۔ حرفِ مطلب زبان پر یوں لائیے۔ کہ بار نہ ہو۔ پھر ہفتوں جواب کا انتظار کیجئے۔ اس دوران میں مسکراتے رہیئے۔ اور نگاہ رکھیئے کہ پہیئے چل رہے ہیں کہ کہیں رک گئے۔ رک گئے ہوں تو روغن تاز، آتشِ سیال، یا قطرہ تیزاب جیسا حکیم بتائیے۔ کام میں لائیے۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں حاضری دیجئے۔ یہ کاک ٹیل پارٹیاں بھی خدا جانے کس موذی نے ایجاد کی تھیں۔ جب حکومت شخصی ہوا کرتی تھیں تو کبھی باتیں دسترخوان پر پوری ہو جاتی تھیں۔ محمد شاہ ایسی دعوت دے کر نادر شاہ کا دل کھینچ جائے۔ تو یہ ہوئی سیاست۔ لیکن یہاں تو کوئی بغیر اپنی حکومت کے اشارے کے انگلی تک نہیں ہلاتا۔ پھر بھی کم بخت ضیافتوں پر وقت اور روپیہ ضائع کرتے رہتے ہیں۔ شراب کا بھی کبھی دلدادہ نہ تھا۔ لیکن عصمت بچانے کے لئے ایک گلاس ضرور ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ دو منٹ کے بعد ملئی نہ کوئی آپ سے تواضع برتے گا۔ اور آپ جواب دیتے دیتے دامن بچاتے بچاتے تھک جائیں گے۔ پھر بھیڑ ہمیشہ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ

گھوڑے سے گھوا چلتا ہے۔ (اور یہ تصادم محض گھوڑوں تک ہی محدود نہیں ہوتا) وقت ایسا ہوتا ہے۔ کہ آپ شام کا کھانا نہ اس سے پہلے کھا سکتے ہیں۔ نہ بعد میں۔ لیکن جو لوگ سفیر یا وزیر بن جائیں۔ ان کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔ کہ ہفتے میں دو تین مرتبہ یہ سزا ضرور بھگتیں۔ میں کاک ٹیل کا یوں منتظر رہتا ہوں۔ جیسے کوئی کسی اپریشن کا منتظر ہو۔ کہ تکلیف بھی ہوگی۔ لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ جس دن کاک ٹیل پارٹی ہو۔ میری شام غارت ہو جاتی ہے۔ دو گھنٹے مسکرا مسکرا کر گلے اکڑ جاتے ہیں۔

خوبیٔ قسمت سے مجھے مکان ایسا مل گیا ہے۔ کہ طبیعت اس میں خوش رہتی ہے۔ مکان سرکار دیتی ہے۔ لیکن ملازموں کا خرچ خود برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ رتبہ بڑا ہے۔ تنخواہ تھوڑی۔ اس لئے تنخواہ کے مطابق مکان لیجئے۔ تو پاکستان کی توہین ہوتی ہے۔ اور رتبہ کے مطابق ٹھاٹھ کیجئے، تو جیب ساتھ نہیں دیتی۔ ہفتوں اس کشمکش میں گذرے۔ بالآخر ایسا مکان مل گیا جس میں ڈیڑھ ملازم سے کام چل سکتا ہے۔ اور پاکستان کے نام کو بھی بٹہ نہیں لگتا (ملازم کی تنخواہ چھ سو روپے ماہوار ہے۔ اس کی خوراک اور رہائشی کمرہ الگ) چھ کمرے ہیں۔ لیکن تین منزلوں پر، بالکل لب دریا ہے اور رات دن آنے جانے جہازوں کے نظارے سے تنہائی کا احساس کم رہتا ہے۔ ایک ہزار کے قریب کتابیں اور چند سرخ پتھر کے مجسمے چغتائی کی تین تصویریں اور ایک اونٹ کی اوجھڑی کا لیمپ اور تین پاکستانی پھلکاریاں، ایک تانبے کا آفتابہ۔ یہ سب ساتھ لایا تھا۔ ان کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند نظر آتی رہتی ہے۔

میرے شغل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو سیاسی یعنی شطرنج اور ملاقاتیں

اور جاسوسی اور دعوتیں اور بحثیں اور گفت و شنید ہیں اور کراچی کے ساتھ تلغرافات بازی اور تعمیل احکام ۔ دوسرے پبلسٹی یعنی مسلسل تقریریں بیشتر کشمیر پر ۔ بعض پاکستان کے عام حالات پر ۔ چند ادب اور دیگر کلچرل معاملات پر ۔ میری مانگ بہ نسبت اور حلقوں کے کالجوں، اسکولوں یونیورسٹیوں اور گرجوں میں زیادہ ہے ۔ اور روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۔ اب تک کوئی سو دو سو لیکچر دے چکا ہوں ۔ اور اس سلسلے میں اکثر سفر میں رہتا ہوں ۔ دُنیا میں ہمارا دشمن بجز ہندوستان کے اور کوئی نہیں ہے ۔ لیکن ہندوستان کا نام بڑا ہے ۔ گاندھی اور سانپ اور ساڑھی اور بہان متی اور شیر اور ہاتھی سب اس کے حصے میں آتے ہیں ۔ پاکستان سے لوگ کم واقف ہیں ۔ کما حقہٗ پبلسٹی کے لئے کھربوں روپیہ چاہیئے ۔ اس لئے جو موقعے مل جاتے ہیں ۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں ۔ اکثر لوگ صاف دل لیکن ہندوستان سے بے حد مرعوب ملتے ہیں ۔ تاہم معقول بات کہیئے تو اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں ۔ ایک گرجے میں لوگ پاکستان کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لیکچر کے بعد سب نے زانوؤں کے بل کھڑے ہو کر پاکستان کی بہبود کے لئے دعا مانگی ۔ اور ایک مذہبی HYMN میں پادری صاحب کے تصنیف کردہ دو بند پاکستان کے متعلق شامل کر لئے ۔ کالجوں اور سکولوں کے بیشتر طالب علم میرے گھر کے طواف کرتے رہتے تھے اور پاکستان کے ٹکٹ اور تصویریں اور پمفلٹ مجھ سے لے جاتے ہیں ۔ ان دو شغلوں سے فراغت ملے تو ادبی ذوق کی آبیاری کرتا ہوں ۔ یہاں پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہیں ۔ علماء کم دیکھنے میں آتے ہیں ۔ مزاجیں اس قدر مختلف ہیں کہ گھنٹوں ہمزبانی کے بعد بھی ہم خیالی کم نصیب ہوتی ہے ۔ بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امریکہ کے پاس سب کچھ موجود ہے تو اسے لوگ اپنے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے ۔

کلچرل دُنیا میں سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ بجز حسین مذاق کے۔ چنانچہ حسن کو لپ اسٹک اور ہوائی جہاز میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ روپیہ اور سامان کی بہتات ہے۔ جتنا کما سکتے ہیں۔ اس سے دگنا پھینک دیتے ہیں۔ دکانیں اٹا اٹ سامان سے بھری رہتی ہیں۔ اشتہاروں کی وہ بھرمار ہے کہ سورج چاند نظر نہیں آتے۔ ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں اتنا کاغذ لگاتے ہیں کہ پاکستان کے سب اخبار دس سال تک اس پر چھپ سکتے ہیں۔ تاہم خوش نہیں رہتے۔ کسی چیز پر قانع نہیں ہوتے اور ایک بے قراری سی ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہے۔ جب موقع ملے ایک آدھ دن ہاورڈ یونیورسٹی میں جا کر گزارتا ہوں۔ وہاں رچرڈز صاحب انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ کیمرج میں میرے استاد تھے۔ ان کی مروت کی وجہ سے وقت وہاں اچھا کٹ جاتا ہے۔

ان ہی کی بدولت میرے وہاں چند لیکچر بھی انگریزی اور امریکن اساتذہ کے متعلق ہوئے۔ نیویارک میں دوست مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ذہنی اور مادی دونوں فاصلے زیادہ ہیں۔ دوستوں کا جمگھٹا جس کے ہم عادی ہیں۔ وہ یہاں میسر نہیں۔ بجز اس کے کہ ایک "پارٹی" کا ایک وقت۔ لیکن میں نے پارٹیاں صرف سیاست دانوں کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے بعد پیسہ ہی اتنا پاس نہیں ہوتا کہ انسان پاؤں پھیلا سکے۔ لیکن دو تین مصنفوں اور ایک آدھ تھیٹر کے ارباب حل و عقد سے ملاقات ہے۔ ان کی بدولت کبھی کبھار شام رنگین ہو جاتی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں دوستی کے جو رشتے شباب میں قائم ہو جائیں۔ ان کا بدل باقی تمام عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تشنہ رہتا ہوں۔ اب کچھ اُردو کی کتابیں بھی منگوائی ہیں۔ تین چار مہینے اُردو کی صورت سے محروم رہا۔ پیاس کے مارے زبان باہر لٹکنے لگی تھی۔

صحت کے متعلق پریشانی رہتی ہے۔ ڈاکٹروں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ خدا حکومت پاکستان کا بھلا کرے۔ کہ علاج معالجے کے اخراجات وہ برداشت کرتی ہے۔ ورنہ یہاں کی فیسیں ایسی ہیں کہ خود ادا کرنی پڑتیں تو مرنے ہی خراب ہوتا۔ ذیابیطس مجھے نہیں۔ مگر احتیاط ضرور کرنا پڑتی ہے۔ پھر کچھ سرطان کے عود کا شبہ ہوا۔ مگر جگر میں خرابی پیدا ہوئی۔ چنانچہ ہر ہفتے ایک نہ ایک ٹسٹ ہوتا رہتا ہے۔ ناک میں دم آگیا ہے۔ (ان باتوں کا ذکر زبیدہ سے ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا۔ وہ بیچاری ناحق پریشان ہوگی)۔

احباب سے محض بے خبر ہوں۔ تاثیر کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ آغا حمید کی شادی پر تہنیت کا ان کو ایک تار دیا۔ جواب نہ آیا۔ حسرت، صوفی، ہاشمی، عابد کسی نے بھی خط نہیں لکھا۔ (مجرم میں بھی ہوں)۔ ذوالفقار مجھ سے بلا وجہ رنجیدہ ہے۔ اس کی بچیوں کو یہاں سے کچھ تحائف بھیجے۔ اسے بھی ایک دو خط لکھے۔ لیکن کسی چیز کا جواب نہ آیا۔ جو پاکستانی یہاں آتے ہیں۔ ان سے داستانیں سُنتا رہتا ہوں۔ لیکن وہ اپنی دُنیا کا حال بیان کرتے ہیں۔ میری دُنیا کی بات کوئی نہیں کرتا۔ نیا شعر ایک برس سے نہیں سُنا۔ بار بار وہی شعر گنگناتا رہتا ہوں۔ جو عہدِ رنگیں میں فردوسِ گوش ہوئے تھے۔ ہارمونیم ساتھ لایا تھا۔ کبھی کبھی اس پر قوالی گاتا ہوں۔ پاکستانیوں میں سے محمد علی، آفتاب، عبدالقیوم، زبیدہ۔ ایچ خاں، عبدالقادر، غلام محمد وغیرہم یہاں آتے جاتے ہیں۔ ان سے چند مجلسیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن بلا نوشوں کو اس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔

بڑھاپا بھی آرہا ہے۔ اس کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا۔ لیکن آثار تو اندھے کو بھی دکھائی دیکھتے ہیں۔ وزیرِ اعظم کے ساتھ جو امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ اس سے صحت پر سخت چوٹ پڑی۔ کسی دن

دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سویا۔ اور عظیم ذمہ داری کی وجہ سے میرے اعصاب پر بھی سخت اثر پڑا۔ اس کے بعد آج تک تعطیل نصیب نہ ہوئی۔ اکتوبر، نومبر میں تین مہینوں کے لئے پیرس جانا ہوگا۔ کیوں کہ جنرل اسمبلی اس سال وہاں ہوگی۔ ارادہ ہے کہ بیچ میں کرسمس کے لگ بھگ دو تین ہفتوں کے لئے کراچی کا چکر لگاؤں۔ لیکن دیکھئے حالات کیا کروٹ لیتے ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی انقلاب کی وفات سے انقلاب آ گیا ہوگا۔ خدا کرے۔ آپ کی ہمت میں خم نہ آئے۔ اپنے حالات سے مجھے مطلع رکھیئے گا۔ انشا اللہ اب میں خط و کتابت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ خط ضرور لکھیئے کوئی شعر مل جائیں۔ تو وہ بھی بھیج دیجئے گا۔ کوئی کتاب کام کی ہو تو وہ بھی۔ منصور سے کہیئے۔ فارن آفس کی معرفت ڈپلومیٹک بیگ میں بھجوا دے گا۔

خاکسار

بخاری

اس خط پر نظر ثانی کی۔ تو احساس ہوا۔ کہ رونا رو دیا ہے اور پژ مردگی کے سوا کم کسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ اسے مکمل تصویر نہ سمجھیئے۔

پہلا خط ہے۔ اس لئے دکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔

بخاری

بنام مولانا غلام رسول مہر

یہ مکاتیب مختصر سی تمہید کے متقاضی ہیں۔

۱۔ یہ اس زمانے کے ہیں۔ جب بخاری صاحب کی خدمات آل انڈیا ریڈیو نے مستعار لے لیں تھیں۔ حکومت پنجاب کے رُو برو ان کے گریڈ کا معاملہ پیش ہوا۔ تو یہ اعتراض اٹھا۔ کہ جن اصحاب کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی سابقہ تنخواہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ نئے محکمے میں ترقی کے زیادہ مواقع ہوں گے۔ تو ان سے فایدہ اٹھاتے ہیں۔ ادھر سابقہ محکموں میں نہ صرف اپنی ملازمتوں کا رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ گریڈ سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں۔ جس طرح اصل محکمے میں رہ کر رہتے ہوئے مستفید ہوتے۔ ان حالات میں اس وقت کی حکومت پنجاب کا رجحان یہ تھا۔ کہ کسی ایسے شخص کو گریڈ سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے جو اصل محکمے میں برسر کار ہوں۔

۲۔ اس وقت سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے وزارت قایم کر رکھی تھی۔ اور میاں عبدالحیٔ مرحوم وزیر تعلیمات تھے۔ کسی نے میاں صاحب اور سردار صاحب دونوں سے عرض کیا تھا۔ کہ اوّل جس شخص کی خدمات سے کوئی دوسرا محکمہ فایدہ اٹھانے پر آمادہ ہو جاتے۔ لازماً وہ وسیع صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔ اور اسے ان خوبیوں کی سزا نہ دینی چاہیئے۔ دوسرے بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت پیش کی تھی۔ اور کہا تھا کہ ان کے معاملے

کو منتخب کیا جائے۔ دونوں نے میری یہ استدعا قبول کرلی اور بخاری صاحب کو گریڈ مل گیا۔

۳۔ مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور جن اصحاب کو ان سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ وہ اعتراف کریں گے کہ موصوف بلند قابلیت اور بلند اخلاق کے افسر تھے۔ آج یہ حقیقت عرض کر دینا غالباً غیر مناسب نہ ہو کہ مسٹر من موہن کے خلاف سب سے زیادہ شکایات جنوبی و مشرقی پنجاب کے جاٹ ممبروں نے پیش کی تھیں جو اتحاد پارٹی کا ایک اہم عنصر تھے۔ اور چوہدری چھوٹو رام کو اصرار تھا کہ مسٹر من موہن کو ڈپٹی ڈائریکٹری سے ہٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ چھوٹو رام کی خدمت میں بھی تمام تفصیلات عرض کر کے انہیں راضی کیا گیا۔ کہ مسٹر من موہن وقت کے لحاظ سے بہترین شخص ہیں۔ مسٹر من موہن، بخاری صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کے عزیز دوست تھے۔ ان سب نے اس دورِ ابتلا میں موصوف کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ بخاری صاحب نے ان کے معاملے کو اپنے معاملے پر بھی مقدم رکھا۔ اس کا نتیجہ بھی حسبِ مراد نکلا یعنی مسٹر من موہن اپنے عہدہ پر برقرار رہے۔

۴۔ دھرم پور میں ملاقات نہ ہو سکنے کا یہ معاملہ ہے۔ کہ بخاری صاحب اپنے حقوق کے سلسلے میں ڈائریکٹر صاحب تعلیمات نیز وزیر تعلیمات وزیر اعظم سے ملنے کے لئے شملہ گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کے پاس سناور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جو دھرم پور (کوہستان شملہ) سے قریب ہے۔ فون کے ذریعے سے طے ہو چکا تھا۔ کہ میں دھرم پور پہنچ کر ان سے مل لوں گا۔ بخاری صاحب کو شملہ سے آنے میں دیر ہو گئی۔ اور کسی قدر اندھیرا ہو گیا۔ میں دھرم پور

اسٹیشن پر بیٹھا رہا۔ جب کوئی موٹر آتی۔ کسی آدمی کو بھیج کر دریافت کرا لیتا۔ بخاری صاحب اسٹیشن سے آگے نکل کر اس سڑک پر میرا انتظار کرتے رہے۔ جو کسولی اور سناور کی طرف جاتی ہے۔ میں مایوس ہو کر سناور چلا گیا۔ وہ مایوس ہو کر کالکا پہنچے۔ اور وہاں سے سناور ٹیلی فون کرتے رہے۔ چونکہ میں دھرم پور میں تھا۔ اس لئے فون پر گفتگو نہ ہو سکی۔ سناور پہنچنے پر ان کے فون کا علم ہوا۔ تو وہ کالکا سے ٹرین میں سوار ہو کر دہلی جا چکے تھے۔

۵۔ بخاری صاحب نے ایک مکتوب کے آخر میں لکھا ہے کہ اول اس کی رسید بھیج جائے۔ دوسرے اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیا جائے۔

اس آخری ارشاد کا مدعا یہ تھا۔ کہ خط کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ کہ اس کی اشاعت سراسر خلاف مصلحت تھی اور میں نے اسے چاک نہ کیا اور یہ ارادتاً نہیں۔ بلکہ اتفاقیہ محفوظ رہ گیا۔ اب اس کی اشاعت کسی بھی مصلحت کے خلاف نہیں۔ اور یہ اس عزیز دوست کی نگارشات کا ایک مرقع ہے۔ جس پر تحریر کو اس وقت ایک بیش قیمت تحفے کی حیثیت حاصل ہے۔

۲۰۔ پرتھوی راج روڈ نئی دہلی۔
بروز اتوار

مشفق محترم!

نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ دھرم پور میں آپ دکھائی نہ دیئے۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ کالکا پہنچ کر آپ کو سناور ٹیلی فون

کیا۔ اور ساڑھے نو بجے تک تین مرتبہ ٹیلی فون کیا۔ لیکن آپ سناور میں تشریف فرما تھے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ضرور دھرم پور تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور وہاں میرے منتظر ہوں گے۔ مجھ سے نہ مل کر آپ کو بے انتہا کوفت ہوئی ہوگی۔ جس کے لئے میں بہت نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ میری بصارت نے مجھے دھوکا دیا۔ آپ ضرور سڑک پر ہوں گے۔ لیکن مجھے نظر نہ آئے تھے۔

بہر حال شملے کی داستان سن لیجئے۔ ڈائرکیٹر صاحب سے ملا پھر میاں صاحب قبلہ سے ملا۔ دونوں نے حامی بھر لی کہ تمہیں سلیکشن گریڈ دے دیا جائے گا۔ اس مسئلے پر کہ میں پنجاب میں واپس آؤں۔ یا آؤں تو کب آؤں۔ بحث ہی نہ ہوئی۔ بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ آیا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو میاں صاحب کو گونا گوں دقتیں پیش آئیں گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس وقت مشکلات میں مبتلا کیا جائے۔ جب انہوں نے مجھے بغیر واپس بلانے کے سلیکشن گریڈ دینے کا وعدہ کر لیا۔ تو اس پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ میاں صاحب کا رویہ از حد مشفقانہ اور ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ انہوں نے ہر طرح سے میری تسلی کر دی۔ وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا۔ انہوں نے بھی امداد کا وعدہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ کو شملہ جانے کی تکلیف دی جائے یا نہ۔ بظاہر تو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن فی الحقیقت اس کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔ جانے سے فائدہ نہ ہو۔ لیکن نہ

جانے سے اغلباً نقصان ہوگا۔ اس لئے مجھ پر اتنا کرم کیجئے۔ کہ ایک دن کے لئے شملہ چلے جائیے۔ میاں صاحب سے مل کر پوچھئے۔ کہ سلیکشن گریڈ کے متعلق انہوں نے کیا فیصلہ کیا۔ اور میرے واپس پنجاب آنے کا تذکرہ نہایت سرسری (وہ بھی اگر ضرورت پڑے تو) کیجئے۔ ورنہ خیر۔ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے من موہن سے ضرور مل لیجئے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام ہے اور وہ شائد میرے کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض شریر لوگ اور بعض نیک مگر غلط فہمی میں مبتلا لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ من موہن کو موجودہ عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ ڈائریکٹر ان کے کام سے خوش ہیں۔ میاں صاحب خود ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ من موہن پر کلنک کا ٹیکہ لگایا جائے؟ لیکن اہلِ غرض کا دباؤ دُور تک پہنچ چکا ہے۔ جب میں شملہ سے روانہ ہوا۔ حالات تشویش ناک تھے۔ آپ سے ملاقات ہو جاتی تو بیشتر وقت میں اسی بات پر صرف کرتا۔ اب حقیقت یہ ہے۔ کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو خواہ ہندوؤں کی۔ ہندو افسروں کا وجود تو ضروری ہے۔ مگر یہ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے ہندوؤں کی حمایت نہ کی جائے۔ جو لائق، فہیم اور ایماندار ہیں۔ اور خدا گواہ ہے۔ کہ من موہن سے بہتر آدمی اس وقت کسی مذہب میں بھی نہیں مل سکتا۔ ان کا ریکارڈ خبیث سے خبیث شے سے بھی پاک ہے اور ان کی دیانت اور اصابت مسلم ہے۔ اور پھر کوئی ایسا مسلمان افسر بھی موجود نہیں۔ جو ان کی جگہ مقرر کیا جا سکے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے اور وہ اس قدر دلگیر ہیں۔ کہ استعفا تک دینے پر آمادہ ہیں۔ ذرا ان سے مل لیجئے۔ اور اس کام کو میرے

کام سے بھی ضروری سمجھ کر ان کی مدد کیجئے۔ میں آپ کی عنایتوں کا بے انتہا ممنون ہوں۔ آپ نے میرے لئے بہت زحمت برداشت کی۔ اور آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ آخر میں دو ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔ ایک تو اس خط کی رسید ضرور بھیجئے۔ دوسرا اسے پڑھ کر چاک کر دیجئے۔

خاکسار

بخاری

۲۰۔ پرتھوی راج روڈ، نیو دہلی

۵۔ جون

محترم دوست

سلام مسنون! میں ایک معافی کی عرضی پہلے آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ اب گرامی نامہ آنے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں۔ یقین مانئے کہ میں ازحد شرمندہ ہوں۔ کہ آپ کو ازحد زحمت ہوئی۔ واللہ اس میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ دھرم پور میں آپ کو تلاش کیا۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر طویل انتظار کیا۔ کالکا پہنچ کر دو تین مرتبہ آپ کے نام سے آپ کو پرسنل ٹیلی فون کیا۔ اور ایک تو نہ ملنے کا اور دوسرے آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا۔ ان دونوں باتوں کا انتہائی افسوس دل میں ہے کہ آپ بار للہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں ازحد نادم ہوں کہ آپ جیسے مشفق کرم فرما کو اس قدر رنج پہنچایا۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ میرے کام کے لئے اس قدر تکلیف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی۔ اور ہر پیش قدمی کی۔ لیکن میری بدقسمتی

اور انتہائی بدقسمتی کہ بجائے اس کے کہ آپ کا شکریہ خود اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں ادا کرسکتا۔ الٹا آپ کو پریشان کیا۔

میں کل ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ اب اپنے کسی کام یا غرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کس منہ سے آپ کو کہوں کہ آپ مجھے درخورِ اعتنا سمجھیے۔ بہرحال اگر آپ جو گستاخی یا غفلت میری طرف سے سرزد ہوئی ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔

دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ میں از حد نادم اور معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا قصور میری بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں اور آپ کی پریشانی کی کوئی قیمت میں ادا نہیں کرسکتا۔ سوائے اپنے عجز و انکسار کے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خط مکان کے پتہ پر لکھا کیجیے۔

خاکسار

بخاری

۲۰۔ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

برادرِ محترم

سلام مسنون!

پے در پے آپ کو دق کر رہا ہوں۔ لیکن آج گرامی نامہ مورخہ ۵۔ جون ملا۔ اس میں ایک فقرہ آیا ہے کہ

"بہرحال اس معاملے میں آپ کی طرف سے جواب کا انتظار ہوگا"

بمقتضا اس فقرے کے آج پھر آپ کی خدمت میں پیش

ہو رہا ہوں۔ واپسی کا مسئلہ اس وقت چھیڑنا اس لئے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

۱۔ گریڈ اور واپسی بیک وقت دو مسئلے سامنے آ جانے سے صاحب موصوف کو پریشانی ہو گی۔ اور ایک کے پیچھے دوسرا بھی معرضِ خطر میں پڑ جائے گا۔

۲۔ اگر میں واپس نہ آؤں اور یہیں گریڈ مل جائے تو اس گریڈ میں وہاں کوئی اور قائم مقام ہوگا۔ چنانچہ ایک کی بجائے دو آدمیوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اغلباً صاحبِ موصوف کو یہ شکل زیادہ مرغوب ہو گی۔

۳۔ بعض کوائف یہاں ایسے ہیں کہ اگر میں فی الحال کچھ عرصے یہاں اور ٹھہر جاؤں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

۴۔ واپسی کا مسئلہ ہر وقت چھیڑا جا سکتا ہے۔ بلکہ واپسی کا حق میرے پاس ہے۔ جب چاہوں واپس کر سکتا ہے۔ کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔ اور کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ جب واپسی کا موقع آئے گا۔ تو اس وقت اس مسئلے کو بھی چھیڑا جا سکتا ہے۔ کہ کس عہدے پر واپس آؤں۔

۵۔ گریڈ کا مسئلہ جولائی کے شروع میں ختم ہو جانا چاہیئے۔ اس کے بعد اگر اکتوبر تک بھی واپسی کا سامان ہو گیا۔ تو جو مصالح آپ کے پیشِ نظر ہیں ان کو گزند نہ پہنچے گا۔

۶۔ فی الحال میری واپسی کی وجہ سے صاحبِ موصوف کو یقیناً بعض دقتیں پیش آئیں گی۔ جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوں گے اور ان کی قوتِ فیصلہ تذبذب ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد حالات میں زیادہ سہولت کی گنجائش ہو گی۔

ان سب باتوں پہ اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فی الحال باقی سب باتوں سے قطع نظر کر کے گریڈ کے معاملے کو پختہ اور بہت پختہ کر لینا چاہیئے۔ اصل چیز یہی ہے۔ واپسی کا مسئلہ ایسا ہے کہ اسے ہر وقت اُٹھایا جا سکتا ہے۔ جتنا کہ آج۔ البتہ آج اُٹھانے سے گریڈ کے معاملے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی۔ اور ممکن ہے کہ غلط مبحث کی رو میں اصل مقصد بھی بہہ جائے۔ چنانچہ میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ آپ اپنی جانب سے گریڈ کی گفت وشنید کو خاطر خواہ طور پر منتج کرائیے۔ واپسی کے مسئلے کو ہلکے سے چھیڑ دیجئے۔ اور کہیئے کہ اس پہ انشا اللہ تعالیٰ سردیوں میں مفصل بحث ہو گی۔ یا ایسی ہی کوئی بات کہہ دیجئے۔ تاکہ اس پر گفتگو کرنے کا حق بھی آئیندہ کے لئے برقرار رہے اور گریڈ کا کام فی الحال یکسوئی سے ہو جائے۔

جن مصالح کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ بہت اہم ہیں اور یقین مانیئے کہ میں اس قدر خود غرض نہیں کہ مجھے ان کا بحیثیت مصالح ملی کے کبھی خیال ہی نہ آیا ہو۔ لیکن میں نے اہلِ رائے سے جب اچھی طرح مشورہ کر لیا۔ تو طریقِ کار وہی بہتر معلوم ہوا جو میں عرض کر چکا ہوں۔

جب صاحب موصوف سے آپ مل چکیں تو مجھے اس کے نتیجے سے ضرور مطلع فرمائیں۔ کہ میں چشم براہ رہوں گا۔

دھرم پور میں ملاقات نہ ہونے کا واقع عمر بھر کے لئے ایک لطیفہ بن کر رہ جاتا۔ بشرطیکہ اس میں مجھے ندامت کا احساس نہ ہوتا۔ بہر حال جب آپ کی کوفت دُور ہو جائے گی اور آپ بالکل معاف کر دیں گے۔ تو مجھے بھی اس واقع پر ہنسنے کی جرأت ہو گی۔ کیونکہ واقع فی الواقع مضحکہ انگیز ہے۔ کہ دو عاقل و بالغ جو سوئمبر کی غرض

سے ایک دوسرے کے منتظر تھے۔ ایک دوسرے کو باوجود تلاش کے نہ دیکھ سکے۔

زخود در جستجوئے خویش رفتم
غبارم سرمۂ چشم عاشقاں را

بندۂ خاکسار
بخاری

۹۔ اشوکا روڈ، نئی دہلی
۱۳ نومبر

برادرِ محترم سلام مسنون و تہنیتِ عید۔

گرامی نامہ ملا۔ جس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ بیس فیصدی کا اضافہ تو غیر معمولی بات نہیں۔ جب خدمات مستعار لی جائیں۔ تو عموماً یہی ہوتا ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ یہ ہو لیا تو بہر حال مستقبل کیا ہے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد فیصلہ کیا تھا۔ کہ واپسی پر کالج کا تقرر ہونا چاہیئے۔ لیکن پوزیشن سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیئے۔ لیکن جو پوزیشن اب آپ نے بیان کی ہے۔ اس سے تو مستقبل کے سب دروازے اغلباً بند ہو جائیں گے۔ نہ معلوم آپ نے اس پہلو پر غور کیا یا نہیں۔ اس لئے قدرے تامل ہے۔ لیکن تامل کرتے ہوئے بھی متامل ہوتا ہوں۔ کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ "تامل اربابِ نظر کے لئے تکدر کا باعث ہوگا۔" اس فقرے نے کچھ خائف کر دیا۔ اس کی تفصیل اگر

۱۔ آپ کر سکیں تو سوچنے میں آسانی ہوگی۔ اس لئے آپ کے مزید خط کا منتظر ہوں۔

۲۔ کیا یہ صورت تو نہیں کہ واپسی پر میرا کہیں کھپانا مشکل نظر آرہا ہے سوا بجز اس کے کہ اوروں کو متزلزل کیا جائے) اس لئے یہ تجویز ہو رہی ہے ؟

۳۔ علاوہ بریں اب تک سیلکشن گریڈ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کا انتظار لمبا اوقات مایوسی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے پہلے وہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ان تینوں امور پر آپ روشنی ڈال سکیں۔ تو میں کچھ رائے بھی دے سکوں۔ اور ضرورت ہو تو خود بھی آجاؤں۔ گو ہفتہ اتوار سے پہلے آنا مشکل ہوگا۔ میں نے اپنا پتہ خط کی پیشانی پہ لکھ دیا ہے۔ اسی پتہ سے خط بھیجئے گا۔ تاکہ ملنے میں تاخیر نہ ہو۔ سلام شوق۔

خاکسار

بخاری

۱۔ تیرے وعدے پر جیئے ہم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

۲۔ سالک سے مہر کو آتے دیکھا ہے میری بدقسمتی کہ آپ کا گھر رستے میں حائل تھا ہے

بخاری

۳۔ آپ خط کا جواب ہمیشہ کسی ایسے کاغذ پر دیتے ہیں۔ جو انگریز لوگ حوائج ضروریہ کے سلسلے میں استعمال کرتے ہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ عدیم الفرصتی کی وجہ سے بیت الخلاء میں بھی خط لکھتے رہتے ہیں۔ لہذا ایک سادہ کاغذ بھی ارسال خدمت ہے۔

ؔ۱ مراد یہ ہے کہ سالک اکیلے تھے۔ میرے ساتھ نہ تھا۔ دوسرے معنی ظاہر ہیں۔

ؔ۲ بخاری صاحب اس زمانے میں بیڈن روڈ پر اس مکان میں رہتے تھے۔ جو شاہ ابوالمعالی والے چوک اور فلیمنگ روڈ والے چوک کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں اس کے قریب رمضان بلڈنگ میں موجودہ قومی دواخانے کی بالائی منزل میں رہتا تھا۔ سالک صاحب بُل روڈ پر مقیم تھے۔ بخاری صاحب اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ دُور سے دیکھا کہ سالک صاحب آ رہے ہیں۔ لیکن وہ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔

ؔ۳ جو کچھ لکھنا ہوتا تھا۔ پنسل سے مضمون لکھنے کی سلپوں پر لکھ دیتا تھا۔ بخاری صاحب کے نزدیک وہ کاغذ حوائجِ ضروریہ میں استعمال کا مستحق ٹھہرا۔

ؔ۴ تاکہ جواب اس پر لکھوں۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
کے نام

۱

نیو یارک

عزیزی و محبی!

سلام مسنون!

ابھی ابھی ایلیس کا خط ملا۔ جس سے آپ کی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کا علم ہوا۔ عین مصروفیت کا زمانہ ہے۔ اسمبلی کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۲۵ میل دور ہے۔ صبح جاتے ہیں۔ رات کے ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ یک لخت ارادہ کیا کہ آپ کو تار دوں۔ کسی زمانے میں تار مستعدی اور جذبہ فرمائی کی علامت تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں اتنے تار بھیجے ہیں، کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے۔ کہ تار کاہلی اور اتمام حجت کی ایک ترکیب معلوم ہونے لگا ہے۔ اس لئے اس اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا۔ تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ جو صدمہ آپ کو پہنچا ہے۔ اس کے متعلق میں کیا بات ایسی کہہ سکتا ہوں۔ جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا

نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ کی بے فکری، آپ کی ضیافتیں، آپ کی مجلسیں انہی کی طفیل تھیں۔ نہ معلوم اب آپ پر کیا گزرے گی۔ یقیناً آپ کو بار بار ایک ایسا خلا محسوس ہوتا ہوگا۔ جس کو اب آپ کسی طرح پُر نہیں کر سکتے۔ میری ہمدردی بے کار ہے۔ تاہم اگر اس سے آپ کا غم ذرہ بھر بھی کم ہو جائے۔ تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کر دے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں۔ زندہ کا خیال نہیں کرتے۔

مہینہ بھر ہوا۔ میں نے مستعدی سے ایک نادر لمحہ میں ایلس کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ خیال تھا۔ دوستوں کے دل کو اس سے دستک ہوگی۔ ایلس سے کہا بھی تھا۔ کہ خط احباب میں نشر کر دینا۔ اگر وہ آپ کی نظر سے گذرا ہے۔ تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر آباد کرنا خصوصاً اِس عمر میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں۔ اور دل کا درجہ حرارت تنزل پر ہو۔ ایک مہم ہے۔ بہر حال کچھ صورت سہولت کی پیدا ہو ہی گئی ہے۔ صحت کے متعلق تشویش رہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے۔ یا زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی گود میں بیٹھ رہنا زندگی نہیں۔

حمیدالدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ دو مہینے پرانی بات ہے۔ ذرا اسمبلی کا کام ہلکا ہووے۔ تو پھر ان سے اِن کے دِل کا حال سنوں گا۔

آپ کو خطوں کی اتنی ضرورت نہ ہوگی۔ جتنی مجھے ہے۔ رسالک کو میرا پیار اور سلام کہیئے گا۔ انہیں بھی خط لکھنا ہے۔ ہو سکے تو مجھے کوائف

سے آگاہ کیجئے۔ عابد، ہاشمی، تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر میں شعر کہتے ہیں۔

خاکسار

بخاری

۱۰۔ اپریل ۱۹۵۰ء

صوفی میرے بھائی۔

ایلس فیض کی معرفت آپ کو شاید میرا پیغام پہنچا ہو۔ کہ مجھے یہاں اس سال کے دوران، ایک یونیورسٹی میں اُردو زبان اور اُردو ادب کی تاریخ و ارتقاء پر چند لیکچر دینے ہیں۔ چاہتا ہوں۔ اس کے لئے مکمل تیاری کروں۔ اور آپ کی خدمت میں بوسیلہ ایلس یہ درخواست کی تھی کہ فی الحال ایسی کتابوں کی فہرست (تیس یا چالیس) بھیج دیجئے۔ جنہیں پڑھ لینا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کلیات اساتذہ اور تنقید کی کتابیں (اُردو اور انگریزی) سب شامل ہوں گی۔ چنانچہ آپ یہی فہرست مرتب کرتے وقت اس بات پر نگاہ رکھیئے۔ جب یہ فہرست میرے پاس پہنچ جائے۔ تو دیکھوں گا کہ اس میں کون کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ باقی پاکستان سے منگوا لوں گا۔ فی الحال صرف فہرست کتب مطلوب ہے۔ جو آپ سے بہتر کوئی مرتب نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ اس مضمون کے ماہر بھی ہیں۔ اور مجھے دعوے ہے کہ میرے دوست بھی ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ دو باتیں آپ کے بہ غالب آئیں گی۔ آپ کے بغیر میں بالکل یہاں بے دست و پا ہوں۔

لہٰذا عاجزانہ درخواست ہے کہ اس میں غفلت یا تاخیر نہ کیجئے ممنون ہوں گا۔ لاہور کے چند رنگین ایام ایک ایسا خواب ہے، جو محو ہونے

میں نہیں آتا۔ الحمدللہ کہ یہ دن نصیب ہوئے۔ اور دوستوں کو بولتے ہنستے دیکھ لیا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

ندرت کو میرا سلام کہیئے گا۔ (یہی نام تھا نہ اس دل چسپ اور گرم دل خاتون جو ہوائی اڈے تک آئیں۔ اور جنہوں نے مجھے اپنے خلوص سے نوازا ہے۔

میرا یہ پتہ کافی ہے۔ میرا نام

United Nations, New York U.S.A.

خاکسار

بخاری

نیو یارک

۲۰، اکتوبر ۱۹۵۵ء

برادر عزیز

قلم میں وہ اثر کہاں سے لاؤں۔ جو آپ کے دل کو پگھلا دے۔ باوجود عاجزانہ منت سماجت کے آپ کے خط سے محروم ہوں۔ نہ معلوم آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

سکینہ کی تاریخ ادب اُردو اور مرزا عسکری کی اسی مضمون کی کتاب کی اشد اور فوری ضرورت ہے۔ لیکن کسے لکھوں۔ سب سے زیادہ بھروسہ آپ پر تھا۔ لیکن آپ نے وہ چپ سادھی ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں۔

خاکسار

بخاری

بنام سیّد ہاشم رضا

یونائیٹڈ نیشنز۔ مگزمبرگ (پیرس)

مشفق و مکرمی

سلام مسنون!

روما سے وینس اور وینس سے پیرس پہنچ گیا۔ یہاں سے لندن جاؤں گا اور وہاں سے ہفتے عشرے کے اندر انشاء اللہ، نیویارک۔

وطن کا حج ہمیشہ مبارک ہوتا ہے۔ خواہ حالات تلخ یا باعث تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ اب کے بھی یہی عالم تھا۔ احباب سے مل کر ایسا اطمینان ہوا کہ اب اُونٹ کی طرح اسے کوہان میں برس دو برس اُٹھائے پھروں گا۔ اور تشنگی اس سے پردیس کے صحراؤں میں بجھاتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہوگی۔ اپنی خوش قسمتی پہ ناز تھا۔ قدرے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا۔ کہ اس سے پہلے آپ سے نیاز کیوں حاصل نہ ہوا تھا۔ آپ جس اخلاق اور محبت سے پیش آئے۔ اس کی دل کشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دو حرف شکریے کے لکھ رہا ہوں۔ قبول کیجیے۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

بندۂ خاکسار

مجھے اپنا خادم سمجھیے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو۔ تو ارشاد کیجیے۔ اپنی بیگم صاحبہ سے بھی میرا سلام کہیے گا۔

احمد شاہ بخاری

۲۳۔ نومبر ۱۹۵۴ء

سیّد امتیاز علی تاجؔ

کے نام

۱

۲ ر نومبر

ڈیئر امتیاز!

دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا۔ جو بیشتر دہلی میں اور باقی کسی پہاڑی مقام پر گذاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا چارج لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ دل میں عجیب اُمنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہیجان کے اتنے سال تم سے وابستہ رہ کر گذارے ہیں۔ کہ ہر امنگ کے ساتھ تم آپ ہی آپ دل میں چلے آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نامعلوم اس درمیانی عرصہ میں طبیعتوں کی آب و ہوا بالکل ہی بدل نہ گئی ہو۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رستے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کبھی تن جاتے ہیں۔ لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں اور الحمد اللہ کہ تم اور میں ابھی موت سے بہت دور ہیں۔ اس اُمید کی بنا پر لاہور آنے کے خیال سے بجز مسرت کے اطمینان کے کوئی جذبہ دل نہیں اُٹھتا۔

تابستان کی طویل دوپہریں اور زمستان کی طویل راتیں اور احباب کی طویل پرزہ گوئیاں پھر یاد آتی ہیں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ گیارہ سال بجز بیماری کے ایک دن کی رخصت بھی نہیں لی۔ موسم گرما کی تین مہینے کی چھٹیاں اور دوستوں کی گرم محفلیں پھر بُلا رہی ہیں۔ زبیدہ واپس جانے پر اتنی خوش ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ حجاب کو ہم دونوں کا سلام قبول ہو اور یاسمین کو پیار۔ کل حمید صاحب اور تاثیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ خدا ثریا کی زندگی کو کامران بنائے۔ بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن اب ان کے لئے کئی موقع نصیب ہوں گے۔ ۲۰ نومبر کو چند دن کے لئے شاید دورے پر بھی لاہور آجاؤں۔ کیا تم اس خط کے جواب میں خط لکھو گے؟

خاکسار

بخاری

یکم جون

بادشاہ بخیر!

"ورجینیا" ۳ جون سنیچر کو دہلی سے ہو رہا ہے۔ رفیع پیر اور رشید خود پارٹ کر رہے ہیں۔ اس لئے عین آخری وقت میں انہوں نے پروڈکشن میرے حوالے کر دی ہے۔ وقت تھوڑا ہے۔ مصروفیتں زیادہ۔ اس لئے دادِ فن کاری نہ دے سکوں گا۔ اس کا افسوس رہے گا۔ تاہم ایک آدھ بات آپ ضرور ایسی پائیں گے۔ کہ دل بژمردہ نہ ہوگا۔ فرصت ہو تو سن لیجئے گا۔

اور مجھے اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ فرصت نہ ہو یا ——— RECEPTION بُرا ہو۔ تو لکھ بھیجئے۔ تاکہ آپ کو ریکارڈ بھرا دیں۔ اور آپ کسی وقت لاہور اسٹوڈیو میں جاکر اسے سُن لیں۔ مدت کے بعد کھیل کے سلسلے میں آپ سے پھر تعلق قائم ہوا۔ گو اس کی حقیقت بوسہ بر پیغام جیسی ہے۔ تاہم پرانی یاد تازہ ہوئی اور دل کو جیسے کسی نے دستک دی۔ برسات میں دہلی آؤ گے؟ سالک اور تم دونوں آنے کا پروگرام بناؤ اور یہاں آکر رام پور کے شاہی باغیچے کے آم کھاؤ۔

بخاری۔

گورنمنٹ کالج لاہور

۱۰۔ جولائی

ڈیئر امتیاز!

نیویارک کو میں نے چارج ۱۰۔ جون کو ہی لے لیا تھا۔ خیال تھا کہ اس کے بعد مہینے دو مہینے کے لئے لاہور آؤں گا۔ لیکن مہلت صرف پندرہ دن کی ملی۔ اس میں سے پانچ چھ دن کراچی میں ضائع ہو گئے۔ آتے ہی بیمار پڑ گیا۔ بالآخر پانچ جولائی کو لاہور پہنچا۔ اب پرسوں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔ اور پندرہ جولائی کو وہاں سے انشاء اللہ نیویارک۔ پھر نہ معلوم کب مراجعت ہو۔ گھر کا سامان سب پیک ہو چکا ہے۔ بلبشتہ کراچی جائے گا۔ وہاں ایک مکان کا انتظام ہو گیا ہے۔ منصور وہاں رہے گا۔ اور زبیدہ بھی فی الحال وہیں رہیں گی۔ وہ بھی ہفتے عشرے تک کراچی چلی جائیں گی۔

احباب سے فرداً فرداً رخصت ہوں۔ آپ سے تاثیر صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں یہاں پہنچا۔ تو تاثیر ایک دن پہلے انگلستان روانہ ہو گئے تھے۔ اب آپ سے اور احباب سے نہ ملنے کا افسوس

رہے گا۔ نہ معلوم پھر کب ملاقات ہو۔ میرے امتیاز آمیز منصوبے بدستور جاری ہیں۔ جانے سے پہلے آپ سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ کہ اگر یہ کیا جائے تو کیسا ہو۔ اور وہ کیا جائے تو کیسا خیال ہے۔ چاہتا تھا۔ لاہور سے پھر کچھ تجدید عہد کرتا جاؤں۔ بڑے رنگین دن اور راتیں اس شہر میں اور ریلوے روڈ پر گذاری ہیں۔ لاہور چھوڑنے کا کچھ افسوس سا ہے۔ تسلی کا پہلو صرف اتنا ہے کہ دو سال کی جہاں گردی کے بعد کہیں تو قیام ہوگا۔ میں سفر سے تنگ آگیا ہوں ٹکٹ، پاسپورٹ سوٹ کیس کا خیال آتے ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ لاہور میں جم کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ نہ توقع تھی کہ آئندہ ہوگا۔ یہ آخری لمحے یہاں اس طرح گذر رہے ہیں۔ کہ کچھ آپ ہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ یا آپ یا سالک باقی دُنیائے عشق میں نوادر بس۔ کہاں تک انہیں ہمراز بنائیے۔ کون انہیں بتلائے کہ دہلی مسلم ہوٹل کتابِ زندگی میں کس مضمون کا ورق تھا۔ رحمت علی خاں کا تھیٹر کیسا مردم خیز گوشۂ حیات تھا۔ مچھلی کے شکار کا مولانا عبدالمجید خاں سالک کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا۔ حکیم احمد شجاع خشک ہو گئے۔ حفیظ جوبلی مناکر جیتے جی ملکہ وکٹوریہ سے داخل ہو گئے۔ یوں بھی مدت سے ان کا دین اور ان کی دُنیا ہم سے الگ ہے۔ لو پھر بسنت آئی کا زمانہ یاد کیجیے۔ اور پھر الحمرا میں ان کا شام بھر (رات بھر) نظمیں پڑھنا یہ اس کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ باقی کون رہ گئے؟ آپ کے فلم یونٹ کا حال سُنا۔ آپ ہوتے تو اس میں بطور مشیر کے دخل دیتا۔ مشیری میرا پُرانا پیشہ ہے۔ آپ میرے پُرانے گاہک ہیں۔

یہ کاروبار عادت ہو گیا ہے۔ اب نہ معلوم نشہ کیوں کر پورا ہوگا۔ خلیفہ عبدالحکیم سے بھی خدا حافظ کہنے گیا۔ معلوم ہوا۔ وہ مری چلے گئے ہیں۔

ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں۔ ان کو میرا سلام اور پیار کہیئے گا۔ بلکہ تکلیف
کرکے ان سے بالخصوص مل لیجئے گا۔ (تکلیف کی تکلیف سیر کی سیر)
بعض لوگوں نے یہاں میرے متعلق مجھ سے بدگمانی کا اظہار کیا۔ سند
میں خلیفہ عبدالحکیم کا نام لیا۔ کہ ان کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ نہ معلوم
خلیفہ صاحب نے کیا غیر محتاط باتیں میرے متعلق کم فہم آدمیوں کے
حلقے میں کی ہیں۔ خلیفہ صاحب کو ذرا متنبہ کر دیجئے۔ ان کی دوست
پروری پوشیدہ نہیں مردم شناسی پر ضرور ہے۔ وہ خود بھی کچے ہیں۔
اور کچھ فطرت لوگوں کی بدولت غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں۔ میری
طرف سے ان کے کلّے توبچ کر ان سے کہیئے۔ کہ برخوردار اب تم
بڑے ہوگئے ہو۔ اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است۔ ببانگ
چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است۔ لوگ آج کل شر کا رستہ
ڈھونڈ نکالنے میں بڑے طاق ہیں۔ بات پر بات زبان کٹتی ہے۔
یونیورسٹی وغیرہ کے حالات جس قدر سُنے اتنے ہی کم سمجھ
میں آئے۔ بہرحال اب اُمید ہے اصلاح کے رستے لوگوں کو
سُوجھیں گے۔

خط لکھنے کا شوق آپ کو مدت سے کم ہو رہا ہے۔ مجھے ابھی باقی
ہے۔ لیکن تحریک ہونی چاہیئے۔ رسالک اس معاملے میں وفاکش ہیں۔
خط لکھتے ہی رہتے ہیں۔ جن سے یہاں کی محفلوں کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔
انہیں جواب میں ضرور خط لکھتا ہوں۔ اگر آپ بھی کبھی کبھی کرم فرمائی
کریں۔ تو مجھے دُور افتادگی کا احساس کم ہوگا۔ بہرحال آپ کی خیریت
کی خبر ہمیشہ طمانیت کا باعث ہوگی۔ حجاب سے میرا سلام کہیئے۔ اور
یاسمین کو میری جانب سے پیار۔ میرا پتہ نیویارک میں مختصراً یہ ہے۔

PAKISTAN House New York U.S.A.

ہوائی اڈے سے خط بھیجنا مہنگا پڑتا ہے۔ لیکن نہ اتنا کہ خط وکتابت کے مانع ہو۔ والسلام

آپ کا مری کا پتہ معلوم نہ ہوسکا۔ لاہور کے پتہ پر خط بھیج رہا ہوں۔ سُنا ہے کہ آپ عنقریب آنے والے ہیں۔

خاکسار

بخاری

نیویارک
۲۵۔ اگست ۵۸ء

ڈیئر امتیاز!

تمہارا خط ملا۔ تمہاری پریشانیوں کا حال پڑھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ یہ قدرت کی عجب ستم ظریفی ہے کہ تم جیسا انسان جس نے عمر بھر زندگی کے لطیفے اور مرنجاں مرنج پہلو ہی سے سروکار رکھا۔ اور خاندان میں اپنے فرائض کو تندہی سے سرانجام دیا۔ زمانے کے ہاتھوں یوں تکلیف اٹھائے۔ مجھ جیسا آدمی تو معلوم ہوتا ہے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ کہ وقتاً فوقتاً کسی کی مخاصمت یا ایذارسانی کا ہدف ہے۔ لیکن تمہارے حسنِ طبیعت اور حسنِ اخلاق کا صلہ یہ ہرگز نہیں کہ لوگ تمہاری مخالفت پر آمادہ ہوں۔ یا تم سے انصاف کرنے میں متامل ہوں۔

یہ دَور ایسا ہے کہ اس میں دوستیوں اور رفاقتوں کے خون ہوتے ہی رہیں گے۔ شاید لوگ اس زمانے میں کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے حرص و آز و بے مروتی سب باتوں پر غالب ہے۔ خدا انہیں تقویت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے علو طبیعت اور اپنی بیوی اور بچی کی محبت اور رفاقت کی بدولت اپنی پریشانیوں

پر غلبہ پاؤ گے۔ میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں۔ اور بے بس اور
دور افتادہ لیکن اگر میری محبت تمہارے کسی کام آسکتی ہے۔ تو
یقین جانو کہ وہ تم سے نہ کبھی دریغ رکھ سکتی ہے۔ نہ رکھ سکتا
ہوں۔ میں ایسا شخص نہیں۔ جسے باآسانی سلیم الطبع کہا جا سکے۔ میری
کمزوریاں تم پر اور سب دوستوں پر واضح ہیں۔ کیوں کہ تم سب کو
ان سے پالا پڑ چکا ہے۔ اور تم سب نے وقتاً فوقتاً بلکہ اکثر انہیں
درگذر کیا ہے۔ لیکن میرا عمر بھر کا تجربہ اور خود میرا رجحانِ طبیعت
یہ کہتا ہے۔ کہ دنیا میں دوستی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ اس
لئے کوئی دوست چھن جائے۔ یا دُور ہو جائے۔ تو میں کئی راتیں اور کئی
دن اس کا ماتم کرتا ہوں۔ افسوس کہ ہمارے دوست کم رہ گئے
ہیں۔ تقریباً ہر ایک تفکرات یا ہوس کی گرداب میں آ چکا ہے۔
اور نکل نہیں سکتا۔ تاہم سالک جیسے لوگ معتنماتِ روزگار میں
سے ہیں۔ وہ تمہارے پاس نہ آئیں۔ تو تم ہی چلے جایا کرو۔ اس
سے غم غلط ہوگا۔ اور جو مصائب پہاڑ سے نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے
صبر شکن معلوم نہ ہوں گے۔ فیض اور ایلس بھی واپس آ چکے
ہوں گے۔ ملنسار لوگ ہیں۔ اور ان کی محبت بھی مرہم کا کام
دے گی۔ سب سے بڑھ کر خدا نے تمہیں نیک طینت اور رفاقت
فہم بیوی عطا کی ہے۔ اور ایک بچی جو یقیناً تمہاری بہترین اُمیدوں
کا مجسمہ ہوگی۔ ان کی صحبت میں تفکرات کو بھول جاؤ۔ اگر ہمیشہ کے
لئے نہیں تو کم از کم ہر روز چند گھنٹوں کے لئے ہی سہی۔ جو لوگ
تمہیں اطمینان سے محروم کر رہے ہیں۔ غور سے دیکھیں۔ تو ان کو
خود تم سے آدھا اطمینان بھی نصیب نہیں۔

کتابیں میں نے کتب فروش کی دوکان پر منتخب کی تھیں۔
اور ان ہی سے کہا تھا کہ پارسل بنا کر تمہارے پتہ پر بھیج دیں۔ یہی

وجہ ہے۔ کہ ان کے ساتھ تمہیں کوئی خط یا پرزہ نہ ملا۔ بلیوں کی کتاب میں نے اس خیال سے بھیجی تھی کہ شاید اس کا اُردو میں ترجمہ ہو سکے۔ اور ان بیبیوں کے کام آئے۔ جو بلیاں پالتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود حجاب ہی سب سے پہلے اس کی قدر داں ہوگی۔

اس سال کے آخر تک یو۔ این۔ او سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے پروفیسری کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ سبیل کچھ اور کرنی پڑے گی۔ ورنہ آمدنی میں جو کمی واقع ہوگی۔ اس کا سہارنا مشکل ہوگا۔ دو گھر چلانے پڑتے ہیں۔ ایک یہاں، ایک زبیدہ کے لئے کراچی میں۔ پھر کچھ ڈاکٹروں کی نذر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں کے ڈاکٹر قابل سہی۔ لیکن دُنیا بھر سے زیادہ فیس لیتے ہیں۔ سالک صاحب کا خط آیا۔ اُنہوں نے اطمینانِ قلب کے لئے ترجمے کی راہ نکال لی ہے۔ اور دھڑا دھڑ ترجمے کر رہے ہیں۔ از بس غنیمت ہے۔ ترجموں کے علاوہ موت کا خوف ان پر ضرورت سے زیادہ طاری رہتا ہے۔ شاید انہیں یہ احساس ہے۔ کہ زندگی سے جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ نہ ہوا۔ حالانکہ کم از کم ان کو یہ شکایت نہ ہونی چاہیئے۔ آپ اور وہ دونوں ہمیشہ دوستوں اور سب دوستوں اور سب لوگوں کے منظورِ نظر رہے ہیں۔ یہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ عزت و آبرو سے رکھے۔ کولمبیا میں مجھے اُردو زبان پر بھی لیکچر دینے ہیں۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی کتاب یہاں نہیں۔ ضرورت پیش آئی تو کسی نکتہ رس دوست کی معرفت ایسی کتابیں فی الفور جمع کر لوں۔ تاکہ دسمبر جنوری تک لیکچر تیار کر سکوں۔ صوفی تبسم ذہن میں آئے۔ اُنہوں نے فہرست تو مرتب کی۔ لیکن کتابیں بھجوانے کا کام مستعدی سے انجام

نہ دے سکے۔ چنانچہ معاملہ کہیں ان کے اور بک سیلر کے مابین لٹک رہا ہے۔ آپ مدد کر سکیں اور اس کے لئے فرصت نکال سکیں تو کیا کہنے۔ میں نے تو دانستہ آپ کو تکلیف نہ دی تھی۔ کہ آپ اپنے قصوں میں گرفتار ہوں گے۔ اُردو افسانوں کا ترجمہ میں پھر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔ عبدالحکیم صاحب سے اُمید نہیں کہ وہ میری مدد کریں گے۔ آپ اور فیض صاحب خود ہی افسانوں کا انتخاب کر لیجئے۔ حجاب کو میرا سلام اور یاسمین کو میرا پیام پہنچے خط ضرور لکھتے رہا کیجئے۔

آپکا خادم
بخاری

پاکستان ہاؤس نیویارک
۱۲۔ اگست

ڈیئر امتیاز!

تنہائیوں میں آپ اکثر یاد آئے۔ اور اس ایک سال کے عرصہ میں کئی تنہائیاں مجھ پر گزریں۔ لیکن پے در پے معروفیتوں اور بیماریوں نے کئی شگفتہ ارادوں کو پژمردہ کر دیا۔ کبھی خط لکھنے کی نیت باندھی۔ تو شروع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ حال میں سالک صاحب کے دو تین خط آئے۔ ن۔م۔ راشد نے کچھ ادبی لطیفے لکھ بھیجے۔ اور اُردو کتابوں کا ایک بنڈل۔ ایسے ہی دو تین واقعات سے طبیعت کا یخ ٹوٹا۔ پرسوں آپ شدت سے یاد آئے۔ ایک کتب فروش کے ہاں دل پشاوری کر رہا تھا۔ ملک راج انند کی ایک تازہ تصنیف "انڈین تھیٹر" نظر آئی۔ بڑے طمطراق اور شان و شوکت سے چھپا ہے۔ لیکن کتاب مختصر ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے پڑھ لی۔ جہل اور تعصب کا

طعوبہ ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بنگالی تھیٹر کو بہت سراہا ہے ہندوستانی
تھیٹر کے تحت ہیں بہت کچھ زہر اُگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس
اور پرتھوی راج کپور کو تھیٹر کا امام قرار دیا ہے۔ آغا حشر کے بارے
میں ازحد بخل، بغض اور پستی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا ذکر یوں کیا
ہے کہ A Hack writer called Agha
Hashr a third rate Poetaster
اور اسی طرح کی خرافات بک کر انہیں تین چار سطروں میں نمٹا
دیا ہے۔ پڑھ کر تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اے کاش آپ
اُردو تھیٹر پر اب بھی ایک کتاب لکھ ڈالیں۔ جو مصالحہ آپ کے پاس
ہے اور جتنی جراتی آپ نے تھیٹر پر چھڑکی ہے۔ وہ کسی اور کو ابدالآباد
تک نصیب نہ ہوگی۔ کتاب اُردو انگریزی دونوں میں چھپنی چاہیے۔
بنو پارک اور لاہور میں جو بُعد ہے۔ وہ نہ معلوم کب تک رہے گا۔
لیکن مجھے اس کام میں شریک کرنے کا ارادہ ہو تو یہ بُعد پھاندا جا سکتا
ہے۔ جب تک زندگی ہے کوئی کام محال نہیں۔ البتہ موت رستے میں
حائل ہوگئی تو اسے کوئی نہ پھاند سکے گا۔ لیکن ایک شرکت کا کام
مشکل معلوم ہوتا ہو۔ تو آپ کم ازکم خود ہی اللہ کا نام لے کر اُردو
کی کتاب لکھ ڈالیے۔ آپ کا وسیع تجربہ اور علم تو آیندہ نسلوں کے
لئے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ تھیٹر کا یہ دَور ہمیشہ کے لئے یاد سے
محو ہو جائے گا۔ ایسے آثار بھی باقی نہ رہیں گے کہ ہزار سال کے بعد
موہنجو داڑو کی شکل میں دریافت ہو سکیں۔

لاہور کے حالات سے محض بے خبر ہوں۔ البتہ سالک صاحب کے
خط سے معلوم ہوا کہ وہ ادبی گہما گہمی اب نہیں۔ نہ معلوم سالک صاحب
ہجرت کے بعد لاہور سے بے تعلق ہو گئے ہیں۔ یا دورِ زمانہ نے رنگینی
کو ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بہرحال لاہور ہم سب کا

معشوق ہے۔ اور مرتے دم تک معشوق رہے گا۔ ہماری جوانی اس سے ہے۔ اور کبھی کبھی شباب کے غرّے میں یہ بھی گمان ہوتا تھا۔ کہ اس کی جوانی ہم سے ہے۔ دیارِ محبوب کی ہر خبر طبیعت میں ایک طلاطم پیدا کر دیتی ہے۔ اور کوئی خبر نہ آئے تو زندگی ایک مسلسل فراق معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان سے جو تناؤ ہے۔ اس کی اطلاع ہمیں محض سرکاری ذرائع سے پہنچتی ہے۔ اور تفصیلات کے لئے طبیعت تشنہ رہتی ہے۔ اور اکثر متفکر، نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے۔ کہ حق و ناحق میں انہیں تمیز باقی نہیں رہی۔ شاید آئندہ الیکشن کی ہوس نے عمل و فکر میں کچھ کجی پیدا کر دی ہے۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹنڈن نے اِن کے ڈنڈن کر رکھا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ یہاں کے کالم نویس اور سیاست دان بیش از بیش پاکستان کی ہمت اور حق بینی کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ اور پاکستان لیڈروں کے تدبر اور تن دہی کے قائل۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا۔ سب اپنا اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔

بڑے بڑے فلم دیکھنے میں آئے اور اکثر غائبانہ آپ کو تھیٹر اور سینما میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آپ سے نیا دلہ خیالات کرتا رہا۔ لیکن طبیعت کو اس سے کیا تسکین ہوتی۔ ہندوستان کے متعلق ایک بڑے ٹھاٹھ کا فلم "The River" ستمبر میں یہاں آنے والا ہے۔ "Jean Renoir" نے اسے ڈائریکٹ کیا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں بنا ہے۔ اور ایکٹر امریکن انگریز اور ہندستانی ہیں۔ زوروں کی پبلسٹی ہو رہی ہے۔ پاکستان کے "دستاویزی" فلم بہت تھوڑے ہیں۔ اور اچھے نہیں۔ اس بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا

ہوں۔ لیکن پھر کبھی لکھوں گا۔ قلم زنگ آلودہ ہے۔ آپ کی جانب سے کوئی خط آئے۔ تو طبیعت پھر شگفتہ ہو جائے گی۔ حجاب کو میرا سلام شوق، یاسمین کو پیار۔

خیر و بہبود کا طالب خاکسار

بخاری

نیویارک

۱۱ مئی ۵۸ء

ڈیئر امتیاز!

واپس پہنچنے کے چند دن بعد آپ کو ایک خط لکھا تھا۔ جو ہر چند کہ جواب طلب نہ تھا۔ تاہم بتقاضائے عشق جواب کا منتظر رہا۔ لیکن اب تک آپ کے خط سے محروم ہوں۔ خیال تھا کہ آپ اپنے ادبی عزائم کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ کیا ادھر کیا ہوا۔ دو ایک کتابیں بھی آپ کو بھجوائی تھیں۔ بہت اچھی نہ تھیں۔ لیکن میری وفا شعاری کا ثبوت ضرور۔ ان سے ملا ہوگا۔ افسوس کہ کتابیں مجبوراً سمندر کی ڈاک سے بھجوانی پڑتی ہیں۔ ہوائی ڈاک سے بھجوائیے تو پانچ ڈالر کی کتاب پر کم و بیش اتنا ہی خرچ آئے۔ جیب اجازت دے تو عقل اجازت نہیں دیتی۔ میتھ (MYTH) کے آغاز کے بارے میں میں نے اپنے ماہر دوستوں سے کہا۔ کہ بھائی دو صفحے لکھ دو۔ وہ ضرورت سے زیادہ ماہر نکلے۔ سب کہتے ہیں کہ اس کے متعلق تو کئی نظریئے ہیں۔ میں فلاں کا قائل ہوں۔ اور فلاں تو اس بارے میں بد معاش آدمی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آخر فیصلہ کیا ہے کہ ان سے پوچھ پاچھ کے بس خود ہی کچھ گھسیٹ لوں گا۔ اگلے ہفتے آپ کو ایک کتاب (بذریعہ سمندری ڈاک)

انشاءاللہ بھجواؤں گا۔ حال ہی میں نکلی ہے۔ اس کا نام ہے "نظرِ بد" یعنی "EVIL EYE" ایک ماہر چشم ڈاکٹر نے لکھی ہے۔ اور اس کی آنکھ اور نظر کے متعلق جو جو توہمات لوگوں میں مروج ہیں۔ انہیں یکجا کر دیا ہے۔ "نظرِ بد" بھی ان میں سے ایک ہے۔ اور اس کی تاریخ بھی مختصر طور پر لکھ دی ہے۔ کئی باتیں طبی نقطہ نظر سے مفید اور انوکھی ہیں۔ مثلاً عام خیال ہے۔ کہ بہت پڑھنے سے یا باریک لکھائی پڑھنے سے نظر پر زور پڑتا ہے۔ اور آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں مصنف نے صاف صاف بیان کیا ہے۔ کہ یہ غلط ہے۔ اور اس 'وہم' کا ڈاکٹری میں کوئی جواز نہیں ملتا۔ کتاب کا ثانوی عنوان ہے۔ STUDIES IN THE FOLK LORE OF VISION ——— میرا خیال ہے۔ اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ یا خلاصہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ باقی کتاب پہنچنے پر آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔

مجھے اس سال موسم خزاں میں ایک یونیورسٹی میں چند لیکچر اُردو زبان و ادب کی تاریخ پر دینے ہیں۔ صوفی تبسم سے بوساطت ایلس فیض (کیونکہ صوفی صاحب تو خود گل محمد قسم کے انسان ہیں) مناسب مفید کتابوں کی (انگریزی اُردو دونوں) فہرست منگوا بھیجی ہے۔ وہ آنے پر دیکھوں گا۔ کہ کون سی کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ جو نہ ہوں گی وہ پاکستان سے منگواؤں گا۔ اور غالباً اس میں آپ کی دستگیری کی ضرورت بھی ہوگی۔ اُمید ہے دریغ نہ رکھیں گے۔ کہیئے وہ افسانوں کے ترجموں کا منصوبہ جو آپ کے مکان پر بعد طعام باندھا گیا اور جس میں مجلسِ اقبال کو عموماً اور آپ کو خصوصاً بہلی کرنی تھی۔ اس کا کیا ہوا۔ لاہور سے چلا آیا۔ تو اس کے بعد صدائے برنخاست۔ کچھ اس پر بھی روشنی ڈالیے۔ میں بے چینی سے اس کا منتظر ہوں۔

چند ہفتوں کی بات ہے۔ میں ایک لنچ کے موقعے پر برسرِ عام

یک لخت بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد دو ایک مرتبہ پھر یہی واقع پیش آیا۔ اچھے اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ خاطر خواہ علاج جاری ہے لیکن کچھ ٹھیک تشخیص نہیں ہو سکی۔ کیوں کہ دل وغیرہ بالکل درست ہیں۔ کام اور تفکرات کی کثرت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسی طرح ہملٹ کی بے ہوشی کے اسباب مفسرین میں متنازعہ فیہ ہیں۔ ہماری بے ہوشی بھی آنے والی نسلوں کے لئے مبہم رہے گی۔ لیکن حد ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ "غش کھانا" وغیرہ داستانوں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس رسم کے زندہ رکھنے والے ابھی باقی ہیں۔

سالک، فیض، صوفی اِن تینوں کو جب ملیں میرا سلام کہیئے گا۔ چغتائی صاحب کے ہمکلام ہونے کا موقعہ نکلے تو ان سے کہیئے کہ وہ مجھے فوراً خط لکھیں۔ کہ ان کے یہاں آنے میں کیا رکاوٹ پیش آئی۔ خلیفہ صاحب ملیں تو ا۔ ن۔ گ۔ ل۔ ی کر دیجیئے گا۔ ہاں بھائی آغا بشیر اور رفیع پیر کو بھی سلام کہیئے گا۔ حجاب، یاسمین کو میرا سلام و پیار۔

خاکسار

بخاری

بنام عبدالرحمٰن چغتائی

۱

محترم بندہ جناب چغتائی صاحب

سلام مسنون!

سر عبدالقادر (اور بعد ازاں لیڈی عبدالقادر) نے بہت تاکید کے ساتھ "کاروان" منگوا بھیجا ہے۔ اور مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں۔ کیا آپ انہیں "کاروان" کی ایک جلد بہت جلد بھجوا سکتے ہیں۔

خاکسار

بخاری

اور اگر ناگوار نہ ہو تو "مرقع چغتائی" کی کوئی بھی کبھی جلد مجھے اپنے لئے بھی چاہئیے۔ کیا کہیں سے مل جائے گی؟

---

۱۳ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۱۔ اکتوبر

مشفقی و مکرمی چغتائی صاحب،

سلام مسنون! افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔ معلوم ہوا آپ شکار کو تشریف لے گئے تھے۔

واپسی پر ایک خط ملا۔ جو بعینہٖ ارسال خدمت ہے۔ خط کے دو حصے ہیں، ایک آپ کے نام۔ دونوں بھیج رہا ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی ظاہر ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ لکھنے والے یعنی۔۔۔۔ "E VELY WOOD" صاحب آج کل واٹر تھامپسن کمپنی میں ملازم ہیں۔ جو "ADVERTISING" کمپنی ہے۔ اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دلکش بنانے کے درپے رہتی ہے ـــــ WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لٹریچر اور مصوری دونوں کے طالب علم اور نقاد ہیں۔ اور آپ کے معترف اور مداح معلوم ہوتے ہیں۔ آج کل کلکتے میں ہیں۔ لیکن اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں تھے۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ علاوہ برآں بمبئی کے اہلِ فن میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اکثر تصویروں کی نمائش میں کھنڈال والا مسز دادیا اور اس قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ جو جواب آپ اِن کو بھیجنا چاہیں۔ وہ خواہ براہِ راست ان کو بھیج دیں یا میری معرفت۔

بندۂ خاکسار

بخاری

---

۱۳ تغلق روڈ۔ نئی دہلی

۱۹ اکتوبر

مشفق چغتائی صاحب

سلام مسنون! گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کے خط آنے پر میں نے وڈ صاحب کو لکھ دیا ہے۔ مزید گفت و شنید وہ غالباً براہِ راست آپ سے کریں گے۔ کوئی خدمت میرے لائق ہو۔ تو یہ خیر خواہ دریغ کرنا ہی نہ کرے گا۔ ایچنگ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقش کیے ہوئے

لیمپ شیڈ اب تک میرے مکان بلکہ میری زندگی کی زینت ہیں اور میں ان کا ذکر ہمیشہ فخریہ کرتا ہوں۔ اور آپ کو دعا دیتا ہوں۔ فلم لائنٹیس کا معاملہ میں نے سُنا بہت ٹیڑھا اور وقت طلب ہے۔ ملاقات ہوئی تو تفصیلاً عرض کرتا۔

خاکسار

بخاری

۶۴ رحیل روڈ

۱۸ اگست ۱۹۴۷ء

مشفق من جناب چغتائی صاحب

سلامِ مسنون! بیگم سراج الدین صاحبہ کا جواب آگیا ہے۔ ان کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

"آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔ کہ آپ مجھ پر اس قدر اعتماد رکھتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے کہہ دیجئے۔ کہ میں ان کی بھی بے حد ممنون ہوں۔ کہ وہ باوجود اس امر کے کہ فن کے متعلق میرا علم بہت محدود ہے۔ وہ اپنی کتاب کی تمہید مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت مفتخر سمجھتی ہوں۔ اور کوشش کروں گی۔ کہ ان کے کمال کی کما حقہٗ دادِ تحسین دے سکوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کتنے دن کی مہلت مجھے دی جائے گی۔ علاوہ براں مجھے "مرقع" کی جلد بھجوا دیجئے۔ کیوں کہ میرا نسخہ میرے پاس موجود نہیں۔

آپ ان کو نئے ایڈیشن مرقع کی (یعنی جس شکل میں اب آپ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں) بھجوا دیجئے۔ عبدالرحیم صاحب وہ مجموعہ میرے پاس لائے تھے۔ جس میں صفحے دیباچے کے خالی چھٹے ہوئے تھے۔ وہ بیگم سراج الدین صاحب کو بھجوا دیجئے۔ اس کے علاوہ میرا مشورہ

یہ ہے۔ کہ پہلی ایڈیشن کے دیباچے (یعنی کزنز صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے مقالے) بھی انہیں بھیج دیجئے۔ تاکہ وہ ان کے پیشِ نظر رہیں کہ جو کچھ کیا کچھ کہا جا چکا ہے۔ اگر اس دوران میں آپ کے مرقع پر اخبارات یا رسائل میں کہیں کوئی ریویو چھپا ہو اور اس کی نقل آپ کے پاس موجود ہو تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ ایسی چیزوں سے اغلباً ان کو مدد ملے گی۔

دیگر سوالات کا جواب یا براہ راست آپ ان کو بھیج دیجئے یا جیسا مجھے حکم کریں۔ میں ہر خدمت کے لئے تیار رہوں۔ (ان کا پتہ گرینڈ ہوٹل شملہ ہے) افسوس ہے کہ آج شام آپ کھانے پر نہ آ سکے۔ متعدد دوستوں کی ملاقات تھی۔ لیکن جس کسی نے مجھ سے تقریب پوچھی۔ میں نے یہی کہا کہ "نقشِ چغتائی" کے شائع ہونے پہ مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ خیال تھا کہ آپ آئیں گے۔ تو آپ کو احباب کی طرف سے مبارک باد پیش کی جائے گی۔ خیر میری ایک شکایت آپ کے خلاف رہی۔ آپ اسے یاد رکھیئے۔ اگر آپ اپنے بھائی کی روانگی کا عذر پیش نہ کر چکے ہوتے تو میں شام کو باوجود آپ کے انکار کے خود آپ کو جا کر لے آتا۔ آپ کے نہ آنے سے دوست بہت مایوس ہوئے۔ ہم لوگ، یعنی خاکسار، سالک صاحب، حفیظ صاحب، ہری چند اختر صاحب، جگل صاحب، چراغ حسن حسرت صاحب یعنی جو لوگ کل یہاں جمع تھے۔ وہ بقول آپ کے اس قابل تو نہیں کہ آپ کے آرٹ کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ لیکن آپ کے معتقد اور نیاز مند ضرور ہیں۔ ہمارا دل نہ توڑا کیجئے۔

آپ کا عزم انگلستان آپ کو مبارک ہو۔ میں نے بیگم سراج دین کو لکھ دیا تھا۔ کہ تمہید ایسی ہونی چاہیئے۔ کہ انگلستان میں نقاد ان

کی بدولت چغتائی صاحب کے فن کی قدر کرنا سیکھیں، تاکہ آیندہ قدر دانی کے لئے راستہ صاف ہو۔ اب دیکھیں وہ کیا لکھتے ہیں۔ میں جواب کا منتظر رہوں گا۔

خاکسار

بخاری

پاکستان ہاؤس

۱۲ ایسٹ ۶۵ سٹریٹ نیویارک (یو۔ایس۔اے)

۲۵ اپریل ۱۹۵۲ء

مشفقی جناب چغتائی صاحب

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ بھائی آپ کو ایسے سوالات پوچھنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ جب تک میں یہاں ہوں۔ آپ یہ سمجھئے کہ گویا آپ خود یہاں ہیں۔ جو خدمت میرے لائق ہے۔ بلا تامل فرما دیا کیجئے۔ مسودہ ضرور بھیجئے۔ کم از کم دیکھ تو لوں۔ اس ملک میں کسی بھی مسودے کو خواہ وہ کتاب کا ہو، فلم کا یا ریڈیو کا یا ٹیلی ویژن کا منزل مقصود تک پہنچانا شادی بیاہ یا حملہ یورپ کے انتظامات سے کم نہیں ہوتا۔ ہزارہا (MIDDLE MEN) مشاطگی کے رشتے روکے بیٹھے رہتے ہیں۔ جہاں کروڑوں کا ہیر پھیر ہو اور ہر دنگل میں لاکھوں چھوٹے بڑے پہلوان زور آزمائی کر رہے ہوں۔ وہاں علم و فن، علم و فن نہیں محض بزنس بن جاتا ہے۔ اور بزنس ہی کے طریقوں پر چلتا ہے۔ تاہم آپ کی تجویز سے دماغ کو گدگدی ہوئی۔ فلم کا مرکز نیویارک نہیں۔ کیلیفورنیا (یعنی ہالی وڈ) ہے۔ لیکن آپ مسودے تو بھیجئے۔ آنکھیں تو اس سے روشن ہوں۔ اس کے بعد کاری گر لوگوں سے مشورہ کروں گا۔ اور نشیب و فراز سے

آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

لاہور کا قیام از حد مختصر تھا۔ جہاں برسوں تک شباب رنگین کیا ہو اور بڑھاپے کو بھی شباب بنایا ہو۔ وہاں دل کی تشنگی ہفتے عشرے میں کیا بجھتی۔ لیکن قسمت پر نازاں ہوا۔ کہ احباب کی صحبت میں مسرت بلکہ نشے کی چند گھڑیاں تو گذار لیں۔ آپ سے سالہا سال دل کا سودا رہا ہے۔ آپ کی محبت اور اخلاص برسوں سے دل کا جزو تھیں۔ اور ہیں۔ للہ الحمد کہ آپ سے مل لیا اور آپ کی محبت اور آپ کے کرم سے دوبارہ فیض یاب ہوا۔ واپس آکر امتیاز صاحب سے دو ایک چٹھیوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد پنجاب میں فسادات نمودار ہوئے۔ تو سلسلہ قدرے رک گیا۔ وہ ملیں تو انہیں میرا سلام کہیئے گا۔ ہاشمی صاحب کا بھی ایک بہت محبت آمیز خط ملا۔ ابھی انہیں جواب نہیں لکھا۔ انہیں بھی میرا سلام پہنچا دیجیئے گا۔ اور کس کس کا ذکر کروں۔ پورے گلزار کو حسرت و عشق کا پیغام پہنچانا ہو تو کہاں تک ایک ایک پھول کا نام لوں۔ جو ملے ان سے کہیئے کہ غریب الوطن سلام کہتا ہے۔

جو پتہ اس خط کی پیشانی پر لکھا ہے اسے کہیں نوٹ کر لیجیئے۔ تاکہ آئندہ میں لکھنا بھول جاؤں۔ تو آپ کو تشویش نہ ہو۔

بندہ خاکسار

بخاری

نیویارک

۱۴۔ جنوری ۱۹۵۵ء

مشفقی جناب چغتائی صاحب

سلام مسنون! بھائی آپ کی شکایت بجا ہے۔ مجھ سے سہو ہوا۔ کہ

میں نے مسودے کی رسید آپ کو فوراً نہ بھیجی۔ آپ کو یقیناً تشویش رہی ہوگی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آخر اگست میں سخت بیمار پڑ گیا۔ دو ہفتے مسلسل بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں رہا۔ آٹھ ہفتے ہسپتال میں اور اس کے بعد دو مہینے گھر پر صاحب فراش رہا۔ نقاہت کے عالم میں بھی کام سے مخلصی نہ ہوئی لیکن مصروفیت کو ضروریات تک محدود رکھا۔ اس عرصے میں آپ کا مسودہ پہنچا۔ نہ معلوم ترجمے کے لئے ہمت کب نصیب ہو۔ کوشش کر رہا ہوں۔ کہ ہو سکے تو فروری مارچ میں کبھی پاکستان کا ایک چکر لگا ڈوں۔ اس شدید بیماری کے بعد اہل وعیال مجھ سے اور میں ان سے ملنے کو بے قرار ہوں۔ موت زیست کا کسی کو علم نہیں۔ اگر آنا نصیب میں ہوا۔ تو خوب باتیں ہوں گی۔

آپ کے افسانے میں کئی جدتیں ہیں۔ جنہیں پڑھ کر بہت لطف آیا۔ اور ذہن کو گدگدی ہوئی۔ میں نے ایک دو فلم باز دوستوں سے ذکر کیا۔ اور اس کے چند حصے بھی ان کو سنائے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ کوئی EXPERIMENTAL GROUP اسے فلمائے۔ تو بہتر ہو۔ ورنہ تاجرانہ کمپنیوں کے بس کا نہ یہ روگ معلوم نہیں ہوتا۔ آج کل فلم کمپنیاں عجب مشکل میں ہیں۔ آمدنی سرعت سے کم ہو رہی ہے بڑی طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اکثر ایکٹر فلموں کو چھوڑ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ملازم ہو رہے ہیں۔ مزید سعی کروں گا اور آپ کو اس سے آگاہ رکھوں گا۔ اس دوران میں کیا یہ بہتر نہ ہو۔ کہ آپ سیناریو کو بعینہٖ اسی طرح کسی اردو ادبی رسالے میں چھپوا دیں؟ میں نے اکثر سیناریو انگریزی رسالوں میں چھپتے دیکھے ہیں۔ اور لوگ انہیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ اپنے ہموطنوں کے لئے یہ ایک نئی چیز ہو گی اور اس کا سہرا آپ کے سر رہے گا۔ علاوہ بریں کاپی رائٹ بھی محفوظ

ہو جائے گا۔ کہیئے کیا خیال ہے؟

خاکسار

بخاری

۱۶ر جون ۱۹۵۳ء

مشفقی جناب چغتائی صاحب

سلام مسنون! آپ کی تصاویر کو یو۔ این میں آویزاں کرنے کی رسم چند دن ہوئے بڑے ٹھاٹھ سے ادا کی گئی۔ ہماری سفارت کا سب عملہ نیز ۲۰ تمام پاکستانی جو یو۔ این میں ملازم ہیں۔ اور اخباروں کے نمائندے اور فوٹوگرافر وغیرہ سب جمع تھے۔ میں نے مناسب الفاظ میں آپ کی تعریف و تحسین سے اپنی زبان کو فخر بخشا۔ سیکرٹری جنرل نے جو خود آرٹ کے بڑے ماہر ہیں۔ آپ کے فن کو سراہا تصویریں یو۔ این

کے ڈائننگ روم میں آویزاں کی گئی ہیں۔ اور یہ موقع اور محل ان کے لئے بہت تگ و دو کے بعد حاصل کیا گیا۔ کیونکہ ہر قوم کے نمائندے نے اپنے ملک کی ناموری کی خاطر کوئی نہ کوئی تحفہ بھیج رکھا ہے۔ اور ہر ایک کی خواہش اور کوشش یہی ہے۔ کہ سب سے نمایاں جگہ اس کو حاصل ہو۔ ڈائننگ روم پر سب کی نگاہ تھی۔ کیوں کہ یہاں نہ صرف ڈیلیگیٹ اور سیاست دان ہر روز کھانا کھانے آتے ہیں۔ بلکہ سیاح بھی جن کی روزانہ تعداد دو تین ہزار سے کم نہیں۔ یہیں رجوع کرتے ہیں۔ جس دیوار پر تصاویر لٹکائی گئی ہیں۔ اس کا رنگ ہلکا سنہری سا ہے۔ کوشش کر رہا ہوں۔ کہ دیوار کا رنگ سیاہی مائل کر دیا جائے تاکہ آپ کی تصاویر کے رنگ خوب اچھی طرح اُبھر آئیں۔

آپ کی تکٹوں کے خاکے بھی پہنچے اور حسب ارشاد محکمہ متعلقہ کو

بھجوا دیئے گئے ہیں۔ آپ کی تصاویر کی نمائش کا خیال ایک دن بھی میرے دل سے محو نہیں ہوا۔ لیکن کچھ تو ارشاد ہو کہ کیا حکومت پاکستان تصاویر کو لانے لے جانے اور دیگر اخراجات کی کفیل ہو گی۔ ذرا یہ اندازہ ہو جائے تو ہم اس بار کوشش بھی کریں۔ ورنہ وہ نہ ہو کہ مدعی سست اور گواہ چست۔

حسرت صاحب کی بیماری اور پھر صحت یابی کی خبر ملی۔ جذبات نے اِس بارے میں عجیب نشیب و فراز دیکھا۔ اللہ کا شکر ہے۔ کہ اب وہ پھر جوان ہیں۔ بعض ذرائع سے معلوم ہوا۔ کہ کافی ہاؤس کی رونق اب اِن سے پھر دوگنی ہو گئی ہے۔ خدا انہیں چہکتا اور چہکتا رکھے۔ سالک پھر لاہور آ گئے۔ سب احباب کو مبارک ہو۔ البتہ سنتا ہوں کہ ہاشمی صاحب کراچی ہجرت کر جائیں گے۔ امتیاز کو میرا بہت بہت سلام اور پیار۔ کبھی صوفی ملیں تو ان سے کہیئے کہ دو گھونٹ میری یاد میں بھی پی لیں۔ کمبخت کبھی خط بھی لکھنے کے روادار نہیں اور ہم ہیں کہ ہر راہگیر سے ان کا ذکر فخر سے کرتے ہیں۔ اور ان کی خیریت بے قرار ہو کر پوچھتے ہیں۔ خدا آپ سب کو خوش رکھے۔ اکتوبر میں وطن آنے کا ارادہ ہے۔ انشاءاللہ۔

خاکسار

بخاری

بنام حکیم یوسف حسن

محترم بندہ جناب حکیم صاحب !

سلام مسنون ! آپ کا خط ملا ۔ گویا یاد آوری سلام دوستائی کے سلسلے میں تھی ۔ لیکن پھر بھی ممنون ہوں ۔ ڈاکٹر اقبال کی ذرہ افزائی سے میرا حوصلہ تو بہت بڑھا ۔ لیکن نہ اتنا کہ مضمون کا وعدہ کر سکوں ۔ جون کو میرا پہلا امتحان ہے ۔ اِدھر موسم اس قدر خوشگوار ہو رہا ہے ۔ کہ دریا کے کنارے اِس جھیل کے پاس جہاں بائیرن کے تخیل کو پرواز نصیب ہوئی تھی ۔ کسی پھول سے لدے ہوئے سبزہ زار میں گھنے اور بلند درختوں کے درمیان زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے ۔ اس دوگونہ عذاب کا نتیجہ یہ ہے ۔ کہ امتیاز جیسے عزیز دوستوں کی فرمائشوں کی تعمیل سے بھی معذور ہوں اور سالک جیسے مقتدر شفیق کے خط کی رسید تک بھیجنے سے قاصر ، منزا بھگت رہا ہوں ، عرصہ ہوا دوستوں نے خط لکھنا بند کر دیا ۔

سوچتا ہوں تعطیلات شروع ہو جائیں ۔ وہ خط لکھوں گا ۔ وہ خط لکھوں گا ۔ دوستوں میں کھلبلی مچ جائے ۔ اس ہیجان کے دوران میں ہو سکا

تو نیرنگ خیال کی خدمت بھی کردوں گا ۔

رسالہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں ۔ پھر بھی میری کج بیں طبیعت کو اصلاح کی گنجائش نظر آئی ۔ لیکن اس کا الزام آپ کو نہیں دیتا ۔

ہندوستان کی بدنصیبی ہے اور کیا کہوں ۔ مجھے ذرا لاہور واپس آلینے دیجئے ۔

خاکسار

بخاری ، عمانویل کالج کیمبرج

بنام کلیم الرحمن

نیویارک

۱۲ر دسمبر ۱۹۵۵ء

عزیز و مشفق

سلام مسنون ! گرامی نامہ ملا ۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر ۔ کام دلچسپ معلوم ہوتا ہے ۔ بہرحال ایسی مشقت نہیں کہ ابھی سے کانوں پر ہاتھ دھروں ۔ " I BELIVE THIS " یا اسی قسم کے عنوان سے بو قلموں کتابیں اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ نہ معلوم آپ کے زیر نظر کون سی کتب اس نام کی ہیں ۔ اس لئے نیویارک کے دفتر سے کتابیں پہونچیں گی ۔ تو پورا حال معلوم ہوگا ۔

آپ کا نام جب زبان پر آتا ہے ۔ تو آپ کے والد مرحوم (منشی خلیل الرحمن) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ میں ان کا خادم اور معتقد اور ان کے دستر خوان علم و دانش کا خوشہ چیں تھا ۔ آپ نے جس خاندان میں تربیت پائی ہے ۔ وہ آپ کے حسنِ اخلاق اور علو فطرت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کفیل ہے اور رہے گا ۔ اس کے علاوہ آپ خود بھی ماشاء اللہ روشن دماغ اور شائستگی کا نمونہ ہیں ۔ اس لئے سمتہ صاحب

یا کسی اور صاحب کے سامنے آپ سے اپنائیت جتا کر مجھے فخر ہوتا ہے۔ خدا آپ کی زندگی ہر طرح کامران کرے۔

آپکی بہبود کا طالب
خاکسار بخاری

بنام حامد علی خاں

۱

مشفقی حامد علی خاں صاحب
سلام مسنون!

مجھ سے سہو ہوا کہ میں نے آپ کے خطوط نیز آپ کے مسودوں کی رسید آپ کو نہ بھیجی۔ مسودے بہ مطابق فہرست مجھے مل چکے ہیں اور ان سب پر میں نے نظرثانی کر لی ہے۔ کسی مضمون کو مختصر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ گو ایک آدھ مضمون پیمانے سے ذرا طویل ہے۔ لیکن نہ اتنا کہ قینچی استعمال کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ البتہ ترجموں میں بہت سی جگہ ثقالت تھی۔ جو اکثر ترجموں میں پائی جاتی ہے۔ اسے میں نے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ بسا اوقات تو مطلب ہی فوت ہو جاتا تھا۔

تمہید تقریباً تیار ہے۔ محض انتظار صرف اس بات کا ہے۔ جو آپ نے مزید مسالہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ اسے بھی دیکھ لوں۔ ترتیب کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلا حصہ پاکستانی اور دوسرا امریکن

ہونا چاہیئے۔ پاکستانی حصے میں پہلا مضمون قائدِ اعظم اور امریکن حصے میں پہلا مضمون آیزن ہاور کا۔ باقی مضامین کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو۔ کہ شمع پہلے میرے سامنے کیوں آئی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

ایک بات اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں (خواہ امریکن حصے میں خواہ پاکستانی حصے میں) مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہاں مضمون کے آخر میں قوسین کے اندر بخطِ خفی لکھ دیا جائے — (انگریزی سے ترجمہ) تاکہ لوگ طرزِ تحریر کی اجنبیت کو خود صاحبِ مضمون کی اختراع نہ سمجھیں۔

مضامین نگار میں خود شامل ہونا مناسب نہیں سمجھتا۔ میرے لیے تمہید نگار ہونا ہی مناسب ہے اور بس۔ جواب کا منتظر۔

خاکسار

بخاری

کیا تمہید اور مضامین ابھی بغیر مزید مسالے کے انتظار کے بھیج دوں۔ تاکہ کتابت شروع ہو جائے؟

نیویارک

۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

مشفقی سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا رجسٹری خط مورخہ ۲ ستمبر معہ بقیہ مسودات کے ملا۔

مضامین کی ترتیب کے متعلق میں حال ہی میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ لہٰذا اس کے متعلق جو میرا مشورہ ہے۔ اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ اُمید ہے آپ اس سے متفق ہوں گے۔

اب اگلی ڈاک سے انشاءاللہ دیباچہ ارسال خدمت کروں گا۔

اور مسودات بھی واپس بھیج دوں گا۔

خاکسار
بخاری

مشفقی جناب حامد علی خان صاحب
سلام مسنون!

آج ہی ایک علیحدہ پیکٹ بصیغہ رجسٹری آپ کے نام روانہ کر دیا گیا ہے۔ جس میں ۲۹ پاکستانیوں کے مسودے اور ۳۱ غیر پاکستانیوں کے شامل ہیں۔ نیز ۹ مضمونوں کی اصل انگریزی بھی اسی پیکٹ میں بھیج دی ہے۔ زحمت نہ ہو۔ تو رسید سے ضرور مطلع فرمایئے۔ میں میں متفکر رہوں گا۔ دیباچے کا مسودہ منسلک ہذا ہے۔

ترجموں پر نیز دیگر مضامین پر میں نے حتی الامکان بڑے غور سے نظر ثانی کی ہے۔ مترجمین نے بعض حصے تو اپنی بساط سے بڑھ کر پائے۔ بعض جگہ ذرا گھاس کاٹی۔ مضامین یوں بھی ABSTRACT ہیں۔ اگر ان میں روانی اور سلامت بھی نہ ہو تو ان کا پڑھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب جس حالت میں بھی مسودات آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ امید ہے آپ انہیں خاطر خواہ پائیں گے۔

تاخیر کے لئے میں آپ سے نادم ہوں۔ اول نو اسمبلی کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے الجھاؤ سے فرصت کم رہی۔ پھر ایک طویل دیباچہ لکھا تھا۔ جسے حالات کے تغیر و تبدل نے بے کار بنا دیا۔ دوسری مرتبہ لکھا۔ تو پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آخر تنگ آکر میں نے ایک مختصر سے دیباچے پر اکتفا کی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دیباچے کس وضع کے اور کس موضوع

پر بھٹے۔ اب ان کا موقع نہیں۔

مضامین کو ابجد کے لحاظ سے آپ خود ترتیب دے لیجئے۔ اور اپنے نظم ونسق کے مطابق کتابت موقع پر شروع کرا دیجئے۔ اب تو سب مرحلے طے ہو چکے۔ اب زیادہ تاخیر کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

جب میں نے سُنا کہ مکتبہ فرینکلن کے کرتا دھرتا آپ ہیں۔ تو بے حد مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ہرگز مجھ سے دریغ نہ رکھیں۔ بلکہ خادم دیرینہ سمجھیں۔

خاکسار

بخاری

بنام عبدالقدیر رشک

عزیزی رشک سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون!

آپ جانتے ہیں کہ اُردو ادب سے مجھے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ خیال تھا کہ عمر اسی دشت کی سیاحی میں کٹے گی۔ لیکن شرافت ملاحظہ ہو کہ آنکھیں اُردو کتابیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ اوّل تو کتابیں ملتی ہی نہیں۔ مل جائیں تو فرصت کہاں؟

بھلے آدمیوں کی طرح صبح صبح اُٹھتے ہیں۔ جلدی جلدی کھانا کھایا۔ اور کسی کار پر نکل گئے۔ شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ شام کا رُوح افزا وقت ہو یا صبح کا سُہانا سماں۔ طبیعت مچلتی ہوئی ہو یا افسردہ۔ ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی

سے باتیں کیۓ جا رہے ہیں ۔ اس وقت اس شہر میں ہزاروں لوگ ہوں گے ۔ جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے ۔ لیکن ہم کچھ ایسے برخوردار سعادت شعار واقع ہوئے ہیں کہ نہ نیند کی پرواہ ۔ نہ صحت کا ہوش ۔ خداوندانِ سیاست کا حکم ہوتا ہے ۔ کہ بعض باتیں کہے جاؤ ۔ ایسے ماحول میں رہ کر اردو ادب کو کیا کہوں ۔

بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے

وقتاً فوقتاً اردو ادب کی جو کتابیں نظر سے گذری ہیں ۔ ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے آپ کا اردو ادب فرسودہ اور تقلیدی عناصر سے بُری طرح اُلجھا ہوا تھا ۔ جس میں زندگی کے خدوخال نمایاں تھے ۔ نہ اِن صلاحیتوں کی ترجمانی جو تخیل کی آغوش میں تھیں ۔ واقعات کی دُنیا میں پرورش پاتی ہیں ۔ اِن میں کئی اشعار نشتر پنہاں ہوں گے ۔ اور کئی مصرعے دھڑکتے دِل ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں حیات کے نشیب و فراز زندگی کی لغزش و استقامت اور انسانی منزل کی اُمید افزا کرنیں نہیں پھوٹتیں ۔

جوں جوں زندگی کے تقاضے بدلتے گئے ۔ ہمارے یہاں اکثر ادیبوں نے راہ گریز چھوڑ کر زندگی کو اپنایا ۔ انہوں نے نرم و نازک زبان کے ذریعے ملکی ادب کو یہ آرٹ کی نئی قدروں سے دو چار کر دیا ۔ حالانکہ پاکستان میں جس زمانے کے سائے میں اردو ادب کی نشو و نما ہوئی ۔ تاریخی اور سیاسی اعتبار سے ایک ایسے ابتلا کا زمانہ ہے ۔ جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے ۔

رومانیت کا دور گذر چکا۔ اب اُردو ادب زندگی کے تلخ حقائق اور شعوری محرکات کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ انسانی عظمت اور انسانی کارناموں کے اظہار سے مملو ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دُنیا میں صحت مند ادب جب تک زندہ رہے گا۔ اس کا اہم ترین موضوع انسان ہی ہوگا۔

سماجی زندگی میں ادیب کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہوتی ہے۔ معاشرہ کی سربلندی اور انسانی بہبود کے لئے افکار و تاثرات کو دوسرے افراد کی نسبت انسانی جذبات میں زیادہ آلہ کار ہونا چاہیئے۔ دورِ حاضر کے جن ادیبوں نے اُردو ادب میں زندگی کو اپنایا ہے۔ ملک کے دانش اور عوام ان کی خدمات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔

ہم نہ رُوس کے ہنگامی ادب کی استوار کردہ عمارتوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں اور نہ ایسے ادب کی پُشت پناہی کر سکتے ہیں جو انسانی خدمت کے لئے زیادہ آلہ کار نہ ہو۔

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میں زیادہ کچھ آپ کو بتا سکتا لیکن عدیم الفرصتی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

خاکسار
بخاری

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

نیویارک
۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء

عزیز بہن!

وہ جسے فراغ کہتے ہیں۔ نہ معلوم وہ دنیا سے اُٹھ گیا۔ یا دلوں پہ تکان چھا گئی۔ یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا۔ بہر حال کچھ نہ کچھ

انقلاب ضرور آ گیا ہے۔ دفتری خط اور تار دھڑا دھڑ آتے۔ کسی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجینیر) آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحبِ فراش رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا۔ تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی علالت سے بے خبر نہ رہتا۔ آپ ہی مجھے لکھ بھیجتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں۔ دُعا کیجئے۔ گناہ گار کی دُعا پر آپ تو کیا تکیہ کرتیں۔ لیکن دوستوں، بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دُکھ میں شریک کرنے کا بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا۔ ایک

شناسا سے سرسری سُنا تھا۔ کہ مجید صاحب کو دِل کی تکلیف ہے۔ میں نے سُن کر حسبِ معمول ہنسی میں اُڑا دیا۔ اِن کا یہ وہم یارانِ سرپل کے حلقہ میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنہوں نے خبر سُنائی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے۔ لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا۔ تو بہت تشویش ہوئی۔ اندر میں از حد اُداس ہو گیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آسکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا۔ لیکن یہ نقشہ ذہن میں نہیں آتا۔ کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو۔ اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و مصئون رکھے۔ انہیں میرا بہت بہت پیار دیجئے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ اور ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو لفظ لکھ بھیجئے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر بُعد کا احساس نہ ہو۔ اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا اور ان کا شریک ہو سکوں۔
میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا۔ کہ جس وقت ڈاکٹر گراہم کشمیر کی ابجد سیکھنے میں مصروف ہوں گے میں چپکے سے ایک

مہینہ تعطیل کا کسی گوشۂ عافیت میں گذارنے چلا جاؤں گا۔ اور صحت کچھ رفو کروں گا۔ لیکن گرانہم کے پہنچتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے ہل نہ سکا۔ اب نومبر میں پیرس پہنچا ہے سو ہاں اسمبلی تین چار مہینے رہے گی۔ درمیان میں کرسمس کا وقفہ بھی ہوگا۔

لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نا معلوم پاکستان کب کا نصیب ہو۔ دِل سخت اُداس ہے۔

احباب کی یاد کبھی دِل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ تو طبیعت دن بھر کو رنگیں ہو جاتی ہے۔ ورنہ اکثر یہ کیفیت رہتی ہے۔ کہ اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔

ہم نے دوست خدا کے فضل سے ایسے پائے ہیں۔ کہ کہنے میں تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر عزا اور جانے کیا کیا ہیں۔ لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "عاشقانہ خط و کتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اِس کتاب کی بدولت پہنچے۔ اور سرخرو ہوئے۔ وہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

تمہیں کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے۔ اور وہ کہاں ہیں۔ ہم نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ڈنکا بجایا۔ اِس کی گونج ان تک بھی پہنچی ہوگی۔ لیکن ان کی جانب سے تالی تک نہ سُنائی دی بیگم شاہد حامد صاحبہ (کسی قدر ادب سے ان کا نام لے رہا ہوں) کو

میرا سلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچنے تک آپ کی تشویش مجید صاحب کے بارے میں دور ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا اور احباب و اقربا کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی

بخاری

بیگم فیض کے نام

لنڈن

۲۹ را پریل ۱۹۵۸ء

پیاری ایلیس!

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری" لکھتی ہو۔ نہ مسٹر، نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے برابر کب سے ہوئی ہیں۔ جو یہ بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں کے ہمسر کب سے ہو گئے۔ کب سے-----

لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے پلائی جائے۔ اس کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں۔ کہ تم ابھی سے اپنے کئے پر نادم اور آئندہ کے لئے مؤدب اور محتاط رہنے کا عہد کر چکی ہو۔

تو پیاری ایلیس تمہارے خط سے بہت مسرت ہوئی۔ لاج[1] (LODGE) سے جو خط آتے ہیں۔ ان میں اکثر تم سے قبل ملاقات کا ذکر رہتا ہے کہیں تم نصیری پیرہیلت

---

[1] لاج۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کی رہائش گاہ۔ جہاں اس زمانے میں بخاری صاحب مقیم تھے۔

پلّے تو نہیں باندھ لی۔ کہ میرے بعد 'بو بی' (زبیدہ[1]) کا خیال رکھنا۔ وہ تو یونہی اپنی تشویش کی جانب اشارہ تھا۔ اور مجھے امید ہے تم اس کی پیروی میں بہت وقت نہیں گنوا رہی ہو۔ بہر صورت اہلِ بخارا کے لئے تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں۔ تمہارے گھر کو اکثر احسان مندی سے یاد کرتا ہوں۔ کہ شہر کا سب سے رفیق گوشہ وہی ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ تم نے یاد کر لیا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سے (فیض) گھر لانے کی خبر آئے اور میں جانتا تھا۔ کہ وہ خود تو کبھی لکھے گا نہیں۔ شاعرِ مست جو ٹھہرا، کیوں؟ کہیں سے سُنا تھا۔ کہ اسے جیل بھیج رہے ہیں جہاں سادہ پانی اور نانِ جویں سے اس کی تواضع کریں گے۔ پھر سُنا کہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں۔ اور میزبانی کی پیشکش واپس لے لی ہے۔ ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا۔ کہ کس بات پر زیادہ ہنسی آئی۔ اِس پر کہ اسے بند کر رہے ہیں۔ یا اس پر کہ نہیں کر رہے۔ دوسری بات یہ ہی سمجھو اگرچہ وہ تو راہِ حق میں کام آنا زیادہ پسند کرتا لیکن میں اور تم (کہ حرص و آز کے بندے ہیں) غالباً یہی چاہیں گے کہ وہ ہمارے پاس ہی رہے۔ اِس کے بجائے کہ اسے دیکھنے کے لئے فارم پُر کرتے پھریں۔ ویسے وہ تو تمہارے پاس ہے ہی؟ میرا مطلب ہے پہلے سے زیادہ۔ اب میں جو دلال نہیں ہوں اُمید تو یہی ہے اور یوں نہیں تو پھر؟

یہاں موسم مستقل خوشگوار ہے۔ کیو (KEW) باغ میں "گارڈینیا" میگنولیا اور چیری کے شگوفوں سے آگ سی لگ رہی ہے۔ لیکن یہاں کے لئے تمہارا دل بہت ترسنے لگے تو یہ سمجھ لو کہ یہاں زندگی واقعی کٹھن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جن گھر والوں کی آمدنی آٹھ دس پونڈ فی ہفتہ سے زائد نہیں۔ وہ بسر کیسے کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں کمیاب ہیں اور جو ہیں انہیں پکانے میں غارت کر دیتے ہیں۔ لوگ لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ میرے

[2] بیگم بخاری۔

آپ کے سامنے چیزیں یوں لا کے ٹپکتے ہیں۔ کہ میاں لو جی چاہے تو اٹھا لو ورنہ ہوا کھاؤ۔

آج کل لندن میں لنکا شائر (LANCHISHIRE) والوں کا ہجوم ہے اور شاہی جوڑے کی شادی کی نقرئی سالگرہ کے جلوس (ہائے کیسی پیاری لگ رہی تھی) گذشتہ ہفتے گرولز سکویر میں مسز بندوبیٹ اور ان کے خاوند جیسے کا قصہ تھا (مجسمہ اچھا ہے) تو یونہی چلتا ہے۔ لندن شہر آج کل تھیٹر کے دن نہیں۔ لیکن پھر بھی جوں توں شکسپیر، برنارڈ شا، گوگل اور شاں رکسی کے کچھ کھیل دیکھ لئے۔ اور کچھ نہایت ہی عمدہ اطالوی، جرمن اور فرانسیسی فلمیں کچھ کرزن میں دیکھیں۔ کچھ اکاڈمی اور سٹوڈیو وغیرہ میں۔ تمہیں تو معلوم ہے کہاں کہاں۔ اگلے دن میں آڈن (ANDEN) میں ان کی نظمیں سننے گیا تھا۔ لوئی میک نیس (MACNIEA) نے اہتمام کیا تھا۔ فیض کو سلام بھیجا ہے ــــ کنگزلے مارٹن سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کل شام ایک تقریب میں ان کا انتظار تھا۔ لیکن وہ دکھائی نہیں دیئے۔ ہمارا کام[1] ابھی شروع نہیں ہوا۔ ہندوستانی وفد ابھی نہیں پہنچا۔ تاخیر کی کوئی وجہ تو کسی نے بتائی نہیں۔ یہ باور کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ کہ خسرو پھوٹ پڑی ہوگی۔ یا ایسی ہی معصوم اور قدرتی وجہ کوئی اور ہوگی۔ چنانچہ فی الحال آج کل متفرق کام کر رہا ہوں۔

چھیمی (اچھا بھئی سلیمہ ہی سہی) اکثر یاد آتی ہے۔ اسے میرا پیار پہنچا دینا۔ میرا مطلب ہے واقعی پہنچا دینا۔ اور تمہارے دوسرے بچوں کو بھی یا شاید ایک ہی بچہ ہے یاد نہیں رہتا بھئی۔ یہاں سے کوئی چھوٹی موٹی چیز منگانی چاہیئے تو لیتا آؤں۔ کچھ ہو تو لکھ دینا۔

محبت سے

اے۔ ایس بخاری

---

[1] بخاری صاحب انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔

مینزہ فیض کے نام

۳۰، اوادیو ٹیرس نیویارک

۲۰، نومبر ۱۹۵۸ء

پیاری مینزہ

کافی عرصہ ہوا۔ تمہارا ۲۶، اگست کا خط ملا تھا۔ تم میری طویل خاموشی کے باعث جواب سے مایوس ہوگئی ہو۔ تو حق بجانب ہوگی۔ سچی بات یہ ہے۔ کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی۔ اِس کے باوجود مجھے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اِس لئے خط و کتابت کا سلسلہ بند رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں۔ جو اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں دسویں منزل پر واقع ہے۔ اس عمارت کی اڑتیس منزلیں ہیں۔ ایک مستطیل سا مینار ہی سمجھو۔ دُور سے دیکھو تو ایسی لگتی ہے۔ جیسے ماچس کی ڈبیا اپنے کناروں پر کھڑی ہو۔ مطلع آج اتفاقاً نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکیوں میں سے اندر آرہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں۔ جو اُوپر سے نظر آتا ہے۔ وہ دریائے ہڈسن کی ایک شاخ ہے۔ جو یہاں سے کچھ فاصلے پر بحر اوقیانوس میں گرتا ہے یہاں دریائے ایسٹ کہتے ہیں۔ اسی وقت جب میں لکھ رہا ہوں۔ تو بڑی بڑی کشتیاں اور تیل کے بیڑے دریا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پانی دھوپ میں چمک رہا ہے اور وہ نیچے کی طرف مجھے ایک پلوں میں سے ایک پل نظر آرہا ہے۔ جو دریائے ایسٹ پر باندھے گئے ہیں۔ اِس پل کا نام ولیمز برگ ہے۔ ویسے ان سب میں مشہور پل بروکلان

۸۰۰ ۔۔112479۔۔
22-12-82

ہے۔ یہ اتنا ہی مشہور ہے۔ جتنا ہڈسن کی مغربی شاخ پر جارج
واشنگٹن پل ہے جس کی تصویر تم نے دیکھی ہوگی۔

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ اگرچہ سردی ابھی بہت ہلکی ہے۔
نیو یارک شہر میں ابھی برف نہیں پڑی۔ کہیں دسمبر کے آخر اور جنوری
فروری میں پڑے گی۔ یہاں خزاں کا موسم سب سے دلکش ہوتا ہے
امریکی لوگ اسے "FALL" گرنا کہتے ہیں۔ یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔
اس موسم میں درختوں کے پتے پہلے زرد اور پھر تانبے کی طرح
سرخ ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں
کہیں درخت اُگے ہوتے ہیں۔ وہ جگہ کسی رنگریز کا کارخانہ معلوم
ہوتا ہے۔ جیسے اس نے پیارے پیارے رنگوں میں کپڑے رنگ
کر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف
دور دور تک دونوں طرف قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سڑک
پر گاڑی چلانے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے۔ کہ
گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑے
ہوئے آتشیں رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔
اس سال بھی فصلِ خزاں خوب رہی۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہا
کئی روز تک جنگلوں میں گھوما جا سکتا ہے۔ اور سیر کی جا سکتی تھی۔

جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس
آ چکی تھیں۔ اور ابا ابھی وہیں تھے۔ اب تک تو وہ بھی لوٹ
آئے ہوں گے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور چھمی کو پیار دینا۔ مجھے
یہ بھی بتانا کہ تم نے تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس
کی مشق کرتی رہو۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل نہ کی
جائے تو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا ہینڈ
کلیا تو خوب چلتا ہوگا۔ جب جی چاہے مجھے خط لکھنا

تمہارا پیارا
اے۔ ایس۔ بخاری